ماہنامہ
زندگی نو
نئی دہلی

ماہنامہ

زندگی نو

نئی دہلی

مدیر: سید احمد قادری

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے سے ختم ہو جاتی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے پرچہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا شمارہ انشاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔

(منیجر)

زرِ تعاون

ہندوستان سے

سالانہ	۳۰/-
ششماہی	۱۵/-
فی پرچہ	۳/-

غیر ممالک سے بذریعہ ہوائی جہاز

عرب ممالک سالانہ	۱۰۰/-
یورپین ممالک "	۱۲۵/-
آسٹریلیا و امریکہ "	۱۵۰/-

جلد: ۴ | جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ مطابق فروری ۱۹۸۵ء | شمارہ ۲

اس دائرہ ○ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔

منیجر زندگی نو

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے

جناب سید احمد عروج قادری، مدیر "زندگی نو" گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت آفسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵ سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون ۳۲۷۳۲۸ ، ۲۶۵۳۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

اگست ۱۹۸۴ء کے آخری ہفتے میں جو اشارات لکھے گئے تھے اس میں ملکی حالات پر بھی مختصر تبصرہ ہے اور لوک سبھا کے آئندہ انتخابات کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا گیا تھا لیکن نئے ڈکلریشن کے چکر میں ستمبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ شائع نہیں ہو سکا اس لیے وہ اشارات اکتوبر ۱۹۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔ اتفاق کی بات کہ اسی ماہ اکتوبر کی ۳۱ تاریخ کو شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کے قتل کا سانحہ پیش آگیا۔ خود ان کے محافظ دستے کے دو سکھ جوانوں نے انہیں قتل کر دیا۔ اس پر پورے ملک میں سکھوں کے خلاف شدید ردعمل ہوا اور وہ ہندوؤں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ دہلی میں اور ملک کے دوسرے شہروں میں ان پر جان و مال کی خاصی بڑی تباہی آئی اور ان کو اس سے بھی بڑا نقصان یہ پہنچا کہ ملک کے ساتھ ان کی وفاداری مشکوک ہو گئی۔ دسمبر ۸۴ء کے شمارے میں "بھارت کی وزیر اعظم کا وحشیانہ قتل" کے عنوان سے جو تعزیتی نوٹ شائع ہوا تھا۔ اس میں لکھا گیا ہے:۔

"انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ وزیر اعظم سے پہلے وہ خود اپنی دیانت، ذمہ داری اور وفاداری پر گولیاں برسا رہے ہیں۔ انھوں نے صرف اپنی ذمہ داری اور اعتماد پر گولیاں نہیں چلائیں بلکہ اس فرقے کو بھی مجروح کیا جس سے ان کا تعلق تھا۔"

اس ردعمل سے بھی اس کی تصدیق ہوئی جو اُن کے خلاف ہوا اور دسمبر ۸۴ء کے انتخابات سے بھی اس کی تصدیق ہوئی جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ میں نے اگست میں لکھے ہوئے اشارات میں جو اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئے تھے، یہ لکھا تھا:

"حالات کا رخ تو یہی ہے کہ حکمراں پارٹی جو کچھ کر رہی ہے اس کے نتیجہ میں الیکشن جیت لے گی۔ اس کے

دو بڑے اسباب سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے خلاف کوئی متحدہ محاذ موجود نہیں ہے اور نہ بننے کی توقع ہے۔ اپوزیشن پارٹیوں کے بارے میں حکمراں پارٹی کے لوگ کہتے ہیں کہ ان کے پاس مسائل کا کوئی حل یا منصوبہ نہیں ہے وہ صرف اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ وزیراعظم کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے یہ ایک منفی بات ہے اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا لیکن صورت حال تو یہ بتاتی ہے کہ اپوزیشن پارٹیاں وزیراعظم کو گدی سے ہٹانے پر بھی متفق نہیں ہیں۔ ہر قوم اور ہر پارٹی میں کچھ ایسے بے ضمیر لوگ ہوتے ہیں جو ہر قیمت فروخت ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ حکمراں پارٹی نے اکثریت کی اور تمام مذہبی طاقتوں اور پارٹیوں کو جو اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کو عزت اور ان کی قومی انفرادیت کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتیں، اپنا حامی بنا لیا ہے یہ مذہبی طاقتیں الکشن میں حکمراں پارٹی کی حمایت کریں گی۔ خواہ کھل کر حمایت کریں یا چھپ کر۔ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اپنا مستقبل کانگریس کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ ان کے ووٹ بھی اسی کو ملیں گے۔ (زندگی نو، اکتوبر ۱۹۸۴ء)

حالات کا یہ تجزیہ غلط نہیں نکلا لیکن مجھے بھی اس زبردست کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ اس زبردست فتح کے سوال پر ماہرین سیاست گفتگو کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، میں تو موجودہ سیاست کی الف، ب سے بھی واقف نہیں ہوں لیکن حالات بہرحال سب کے سامنے آتے ہیں اور عام و خاص سبھی لوگ اس سے اپنی رائے بناتے ہیں۔ اوپر کانگریس آئی کی کامیابی کے جو دو سبب بتلائے گئے ہیں ان پر مسز اندرا گاندھی کے قتل کا تیسرا سبب ان دو اسباب پر بھی بازی لے گیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو شاید اتنی زبردست کامیابی نہ ہوتی۔

شریمتی اندرا اپنی زندگی میں الکشن کی جو مہم چلا رہی تھیں اس میں دو نکتوں پر زور دے رہی تھیں۔ ایک یہ کہ اپوزیشن کے پاس کوئی مثبت منصوبہ نہیں ہے بلکہ جنتا پارٹی کی حکومت نے ملک کو تباہ کیا ہے اور دوسرا یہ کہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہے اور اپوزیشن پارٹیاں اس کا سبب بنی ہوئی ہیں وہ آنند پور صاحب کی قرارداد کی حامی ہیں۔ اس دوسرے نکتے پر ان کے قتل نے ایسی مہر لگائی جو دھل نہیں سکی۔ نتیجے کے نشان بیان سے خون نے زبردست چھاپ لگا دی۔

مسٹر راجیو گاندھی نے اس نقشۂ جنگ میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ پورے ملک میں گھوم کر کے عوام کے ذہنوں میں اس خوف کو بٹھانے

ابلاغ کے جدید ترین طریقوں کو استعمال کر کے پورے ملک کی فضا کو اس سے بھر دیا۔ کہنا چاہیے کہ سکھوں کے خالصتان کے قومی خطرے، پاکستان کے منتقل خطرے اور ہندو تنظیموں کے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کے خطرے نے ایسی ہوا باندھی کہ ہندو عوام نے اپنی نمائندہ تنظیموں کے علی الرغم کانگریس آئی کے پلڑے میں اپنے ووٹوں کا پورا وزن ڈال دیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی جو دراصل سابق جن سنگھ ہے۔ ان الکشنوں میں اس طرح ہاری ہے کہ ۲۴ دسمبر سے پہلے اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کو صرف دو نشستیں ملی ہیں۔ ایک حیدرآباد میں اور ایک گجرات میں۔ شمالی ہند کے عوام نے اس کو بالکلیہ مسترد کر دیا ہے حالانکہ یہ پارٹی منظم بھی ہے اور متحد الخیال بھی اور اعلیٰ ہندوؤں کی نمائندہ بھی ہے۔ اس نے کانگریس آئی کے بعد سب سے زیادہ اپنے امیدوار بھی کھڑے کیے تھے ــــــ ۱۹۷۷ء میں کانگریس آئی کو جو شکست ہوئی تھی ۱۹۸۴ء میں اپوزیشن پارٹیوں کو اس سے بھی زیادہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا ۔ ۱۹۷۷ء میں کانگریس آئی نے لوک سبھا میں ۱۵۴ نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ یہ اتنی بڑی تعداد تھی کہ جنتا پارٹی کی حکومت کا تختہ الٹنے میں اس نے اچھا خاصا رول ادا کیا تھا۔ ۱۹۸۴ء کے الکشن میں دوسری تمام پارٹیوں کی سیٹوں کا مجموعہ بھی شاید ۵۴ تک نہیں پہنچے گا۔

لوک سبھا کے انتخابات میں دھن، دھونس اور دھاندلی سے کام لیا گیا ہے یہ بات غلط نہیں ہے۔ یہ تو مغربی جمہوریت کے تحت الکشن میں بالخصوص ہندوستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں ایک لازمی چیز ہے لیکن صرف اسی چیز کو اس زبردست کامیابی کا سبب بتانا غلط ہے۔ کیا ۱۹۷۷ء میں ان چیزوں سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ آخر اس وقت کانگریس آئی کو شکست کیوں ہوئی تھی

انتخابات ہو گئے۔ مسٹر راجیو گاندھی نے حلف اٹھا لیا۔ منسٹری بنا لی۔ اب ہندوستان جیسا طویل و عریض ملک ہے اور وہ ہیں۔ ان کی قابلیت اور صلاحیت کے امتحان کا وقت اب آیا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ اور معقول جوان ہیں۔ تحقیق تو نہیں لیکن ہم نے سنا ہے کہ ان کی عمر ۴۰ سال ہے۔ یہ ایک پختہ عمر ہے اس لیے ان کو لڑکا قرار دینا صحیح نہیں ہے ان کے غیر متعصب ہونے کی بات بھی کہی جاتی ہے اور یہ بھی کہ ان کے مزاج میں سازش اور مکر و فریب نہیں ہے۔ یہ باتیں اچھی ہیں لیکن ابھی ان کا تجربہ باقی ہے۔ اقتدار اور اتنے بڑے ملک کا اقتدار سا آدمی کو اس کے نشے میں مدہوش بھی کر دیتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ ہو۔ اگر وہ چند باتوں کا لحاظ رکھیں تو ان کی حکومت کامیاب ہو سکتی ہے۔

(۱) اپنا مشیر و معاون ایسے لوگوں کو بنائیں جو متعصب، مفاد پرست اور سازشی نہ ہوں۔ (۲) اپنے مشیروں اور معاونین کے غلط مشوروں کو جسے وہ غلط سمجھتے ہوں رد کر دیں۔ (۳) اپنی کیبنٹ کے وزیروں کو ربر اسٹامپ کی حیثیت نہ دیں۔

(۴) الکشن میں ہار جیت کو اپنے فیصلوں کا محور نہ بنائیں بلکہ عدل و انصاف کو بنائیں کسی ملک کے حکمرانوں کے لیے یہ باتیں بے حد ضروری ہیں لیکن بہت کم حکمراں ایسے ہیں جو دل سے ان پر عمل کرتے ہوں۔ عام طور پر ان کی زبان پر کچھ ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور

آیاتِ ترجیع

(سیّد احمد قادری)

قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں بعض آیتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ دہرائی جانے والی آیت کو آیت ترجیع اور ان سب آیات کو آیات ترجیع کہا جا سکتا ہے۔ ترجیع کے معنے لوٹانے اور دہرانے کے ہیں۔ اس طرح کی آیتیں قرآن مجید کی پانچ سورتوں میں ہیں۔ الشعراء۔ الصّٰفّٰت۔ القمر۔ الرحمٰن۔ المرسلٰت۔ یہ تمام سورتیں مکی ہیں۔

ہم یہاں پہلے ان سورتوں کی وہ آیتیں نقل کرتے ہیں جو دہرائی گئی ہیں اس کے بعد اس ترجیع کی حکمت و اہمیت کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

الشعراء اس سورہ میں دو آیتیں بطور ترجیع آٹھ بار دہرائی گئی ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ	اس میں بے شک بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ	میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝	بے شک تمہارا رب غالب بھی ہے، مہربان بھی

یہ دونوں آیتیں اس سورہ کی ابتدائی تمہیدی آیتوں کے بعد آئی ہیں۔ ان دونوں آیتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تشفی بھی ہے اور ان لوگوں کے لیے سخت تنبیہ بھی جو اس ہٹ دھرمی پر اترے ہوئے تھے کہ جب تک وہ عذاب کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی کوئی نشانی نہ دیکھ لیں۔ نہ قرآن کے انذار پر کان دھرنے والے ہیں اور نہ نبوت و رسالت پر ایمان لانے والے ہیں۔ رسول خدا کو تسلی اس لیے دی گئی کہ آپ اپنی رحمۃ اللعالمینی اور مخاطبین قرآن پر غایت شفقت کی وجہ سے جبکہ وہ جہنم رسید ہونے پر اصرار کر رہے تھے۔ بے حد غمگین تھے اور کبھی کبھی اپنی جان دے دینے کا قصد فرمالیتے تھے۔ چنانچہ اس سورہ کی بالکل

ابتدا میں فرمایا گیا ہے :-

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا	شاید تم اپنے آپ کو اس فکر میں ہلاک کر کے رہو گے
مُؤْمِنِيْنَ ٥ (٣)	کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے

آیت ٨ میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ نشانی کا مطالبہ ایمان لانے کے لیے نہیں کر رہے ہیں کیونکہ نشانیاں تو آفاق کے چپے چپے اور ان کے جسم و جان کے ریشے ریشے میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن یہ لوگ ایمان لانے پر آمادہ ہی نہیں ہیں اور آیت ٩ میں بتایا گیا ہے کہ تمہارا رب عزیز ہی نہیں بلکہ رحیم بھی ہے وہ چاہے تو ان کو آن کی آن میں ہلاک کر سکتا ہے۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے لیکن وہ رحیم بھی ہے اس لیے ان کو توبہ و اصلاح کی مہلت دے رہا ہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ و فرعون، حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم، حضرت نوحؑ اور ان کی قوم، حضرت ہودؑ اور عاد، حضرت صالحؑ اور ثمود، حضرت لوطؑ اور ان کی قوم، حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کی سات سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں اور ہر سرگزشت کے آخر میں یہی مذکورہ بالا دونوں آیتیں دہرائی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے بعد ان دونوں آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔

اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کیونکہ آپ اپنی قوم کی تکذیب پر متفکر رہا اور مغموم رہا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو متوجہ کیا کہ تم کو اپنی تکذیب پر کیوں تعجب ہے اور کیا غم ہے۔ موسیٰؑ اور فرعون کی سرگذشت پڑھو۔ فرعون اور اس کی قوم نے کیسے کیسے معجزے اور کیسی کیسی نشانیاں دیکھیں۔ اس کے باوجود ان کی اکثریت حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام پر ایمان نہ لائی۔ اس لیے تم بھی ان کی تکذیب اور ایذا رسانی پر صبر کرو۔ شاید ان کی اصلاح ہو جائے یا تمہارا یہ صبر ان پر حجت تمام کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ تمہارا رب سب پر غالب و قاہر ہے لیکن اسی کے ساتھ رحیم بھی ہے۔ یہ اس کی رحیمی ہے جو انہیں مہلت پر مہلت دیے جا رہی ہے۔ (تفسیر کبیر ج ٦)

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے اس سورہ کی تفسیر کی تمہید میں لکھا ہے :-

"اس میں ہر پیرے کے بعد آیات اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ط وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ٥ بطور ترجیع آٹھ بار وارد ہوئی ہیں۔ اس ترجیع سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ آپ کی صداقت کے ثبوت کے لیے آپ سے کسی نشانی عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے وہ اس میں خاص طور پر مخاطب ہیں۔ ان کو تاریخ کے حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ

وہ رسولوں اور ان کے مکذبین کی تاریخ سے سبق لیں۔ ان لوگوں کی روش کی تقلید نہ کریں جو
خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔ (تدبر قرآن ج ۴ ص ۶۲۷)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے :-

"تیسری بات جو بار بار دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا زبردست، قادر و توانا بھی ہے اور
رحیم بھی۔ تاریخ میں اس کے قہر کی مثالیں بھی موجود ہیں اور رحمت کی بھی۔ اب یہ بات لوگوں کو خود ہی
طے کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے رحم کا مستحق بناتے ہیں یا قہر کا۔"
(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۵۷۴)

"یقیناً اس میں ایک نشانی ہے" اس فقرے کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں :-

"یعنی جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ آنکھیں
کھول کر ذرا اس زمین ہی کی روئیدگی کو دیکھ لے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظام کائنات کی
جو حقیقت (توحید الٰہ) انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین
یا منکرین خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اگنے والی بے شمار انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے
اگ رہی ہیں، جن مادوں اور قوتوں کی بدولت اگ رہی ہیں، جن قوانین کے تحت اگ رہی ہیں
پھر ان کی کے خواص اور صفات ہیں اور بے شمار مخلوقات کی ان گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت
پائی جاتی ہے۔ ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب
کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت اور کسی خالق کے منصوبۂ تخلیق
کے بغیر بس یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے، یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی
ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور
پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی اور ان وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب
مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل
انسان تو، اگر وہ کسی ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصب میں مبتلا نہیں ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر
بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں
ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین

(ایضاً)

نمبر سلسلہ ۲

الصّٰفّٰت اس سورہ میں ذیل کی آیتیں دُہرائی گئی ہیں :-

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ — اور ہم نے اس کے طریقے پر پچھلوں میں ایک گروہ

سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ ۝ — کو چھوڑا ۔ نوح پر سلامتی ہے دنیا والوں میں

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ — ہم خوب کاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں ۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ — بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا

اس میں پہلی آیت کی تشریح مولانا امین احسن صاحب نے یہ کی ہے :-

" یہ ان کی دعوت کی کامیابی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے دشمنوں کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم اللہ نے ان کی دعوت کو فروغ دیا ۔ اخلاف میں ان کے حاملین پیدا ہوئے اور ان کے دشمن نیست و نابود ہوئے ۔ اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری دعوت کو فروغ دے گا ۔ آنے والی نسلوں میں یہ قائم و دائم رہے گی اور جو لوگ آج تمہاری مخالفت میں سرگرم ہیں ان کا کوئی نام لینے والا بھی باقی نہیں رہے گا ۔ (تدبر قرآن ج ۵ ص ۵۰۴)

مفسر ابن کثیر نے جو اقوال نقل کیے ہیں ان کے لحاظ سے اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی پچھلی نسلوں میں ان کی تعریف و توصیف، ذکر جمیل اور ثناءِ حسن کا سلسلہ باقی رکھا ۔

"إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ" کی تشریح تدبر قرآن میں یہ ہے :-

" یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ یہ معاملہ صرف حضرت نوح علیہ السلام ہی کے لیے خاص نہیں ہے ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خوب کار بندوں کے ساتھ ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے اور آئندہ بھی اپنے مخلص بندوں کے ساتھ یہی کرے گا ۔ یہ فضیلت کسی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ صفات کے ساتھ مخصوص ہے جو لوگ اپنے اندر "احسان" کی صفت پیدا کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو اسی طرح کا صلہ دے گا ۔"

یہی آیتیں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ و ہارون اور حضرت الیاس علیہم السلام کے لیے دہرائی گئی ہیں ۔ ان آیات ترجیع کے سلسلے میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر آخر میں ہے ۔ قرآن میں یہاں الیاسین کہا گیا ہے ۔ اس پر مولانا امین احسن نے یہ لکھا ہے :-

" الیاسین میرے نزدیک الیاس کی جمع ہے اور اس سے مراد ان کے تمام آل و اتباع ہیں ۔ عربی میں

اس طرح جب کسی اسم کی جمع آتی ہے تو اس سے اس کے تمام اجزاء و فروع مراد ہوتے ہیں۔ قرآن میں طور سینین، طور کی جمع اسی اصول پر استعمال ہوئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نبی پر جو برکت و سلامتی نازل ہوتی ہے، اس میں اس کے تمام جاں نثار ساتھی بھی شامل ہوتے ہیں۔

(تدبر قرآن ج ۵ ص ۴۸۹)

اس جگہ تفہیم القرآن میں حضرت الیاس کا تعارف اور ان کی مختصر تاریخ لکھی گئی ہے۔ میں اس کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں۔

حضرت الیاس علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کا ذکر قرآن میں دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہ مقام اور دوسرا سورۂ انعام آیت ۸۵۔ موجودہ زمانہ کے محققین ان کا زمانہ ۸۷۵ اور ۸۵۰ ق م کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ وہ جلعاد کے رہنے والے تھے۔ (قدیم زمانہ میں جلعاد اس علاقے کو کہتے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یرموک کے جنوب میں واقع ہے) بائبل میں ان کا ذکر ایلیاہ تشبی کے نام سے کیا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۴)

بنی اسرائیل کی طویل اور عبرت ناک تاریخ کے اس دور میں حضرت الیاسؑ مبعوث ہوئے۔ جب اسرائیلی بادشاہ نے ایک مشرک بادشاہ کی مشرکہ بیٹی سے شادی کی اور اس کے دامِ حسن میں اس طرح گرفتار ہوا کہ خود مشرک ہو گیا اور ایک بڑے بت بعل کی پرستش شروع کر دی اور بنی اسرائیل کی اکثریت میں بت پرستی شروع ہوئی۔ اسی سورۂ صٰفّٰت میں حضرت الیاس کی دعوت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو، اس اللہ کو جو تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے آباء و اجداد کا رب ہے؟ مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا۔ سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں، بجز ان بندگانِ خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا۔ (الصٰفّٰت ۱۲۴ تا ۱۲۸)

القمر اس سورہ میں جو آیت دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○ (۱۷)	اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

یہ پہلی آیت ترجیع حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت کے بعد وارد ہوئی ہے پھر تین بار دہرائی گئی ہے

آیات ۲۲، ۳۲، ۴۰

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :-

مخاطب اس میں وہ مکذبین ہیں جو قرآن کے انذار کی تصدیق کے لیے کسی ایسی نشانی عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جو انہیں قائل کر دے کہ فی الواقع قرآن کی یہ دھمکی سچی ہو کے رہے گی۔ اگر وہ اس کو جھٹلاتے رہے ان کو پچھلی قوموں کی تاریخ، جس کی طرف پچھلی سورہ میں بھی اشارہ ہے نسبتاً تفصیل کے ساتھ سنا کر متنبہ فرمایا ہے کہ آخر ان قوموں کے انجام سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے کیوں مچلے ہوئے ہو کہ جب ایسی کچھ تمہارے سروں پر بھی گزر جائے گا تب مانو گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے تمہیں عذاب کی نشانی دکھانے کی جگہ ایک ایسی کتاب تم پر اتاری ہے جو تمہاری تعلیم و تذکیر اور تمہارے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے ہر پہلو سے جامع و کامل اور تمام ضروری اوصاف و محاسن سے آراستہ ہے۔ لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جگہ تم اس کے عذاب کے طالب بنے ہوئے ہو۔　　　(تدبر قرآن ج ۷، ص ۸۷)

انھوں نے آیت ترجیع کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

اس آیت کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو حفظ کرنے یا نصیحت حاصل کرنے کے لیے نہایت آسان کتاب بنایا ہے۔ یہ بات اگرچہ بجائے خود صحیح ہے کہ قرآن حفظ کرنے کے لیے بھی آسان ہے اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے بھی سہل ہے لیکن آیت کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے۔ لفظ تیسیر عربی میں کسی چیز کو کیل کانٹے سے درست کرنے، پیش نظر مقصد کے لیے اس کو اچھی طرح موزوں بنانے اور جملہ لوازم سے اس کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ لفظ "ذکر" بھی یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی تعلیم، تذکیر، آگاہی، تنبیہ، نصیحت، موعظت، حصول عبرت اور اتمام حجت، سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ ان تمام مفہوموں میں یہ لفظ قرآن میں آیا ہے۔ یہ حقیقت بھی یہاں پیش نظر رہے کہ قرآن مجید ہمارے اوپر کوئی چیز خارج سے نہیں لادتا بلکہ ہماری ہی فطرت، اور ہماری ہی عقل کے اندر اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کے جو خزانے ودیعت فرمائے ہیں لیکن ہم ان سے غافل ہیں، انہی کو ہمارے

سلسلہ پیدا کرتا اور اس سے بہرہ مند ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ (ایضاً ص ۹۹)

قرآن عزیز کو آسان بنانے کے بارے میں ایک غلط فہمی کو مولانا مودودی نے دور کیا ہے
بعض لوگوں نے لیسّرنا القرآن کے الفاظ سے یہ غلط مطلب نکال لیا ہے کہ قرآن
ایک آسان کتاب ہے، اسے سمجھنے کے لئے کسی علم کی ضرورت نہیں حتیٰ کہ عربی زبان سے
واقفیت کے بغیر ہر شخص جو چاہے اس کی تعبیر کر سکتا ہے اور حدیث و فقہ سے بے نیاز ہو کر اس
کی آیات سے جو احکام چاہے مستنبط کر سکتا ہے حالانکہ جس سیاق و سباق میں یہ الفاظ آئے
ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد کا مدعا لوگوں کو یہ سمجھانا ہے
کہ نصیحت کا ایک ذریعہ تو ہیں وہ عبرت ناک عذاب جو سرکش قوموں پر نازل ہوئے اور دوسرا
ذریعہ ہے یہ قرآن جو دلائل اور وعظ و تلقین سے تم کو سیدھا راستہ بتا رہا ہے، اس ذریعہ کے
مقابلے میں نصیحت کا یہ ذریعہ زیادہ آسان ہے، پھر کیوں تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور
عذاب ہی دیکھنے پر اصرار کئے جاتے ہو؟ یہ تو سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اپنے نبی کے ذریعہ
سے یہ کتاب بھیج کر وہ تمہیں خبردار کر رہا ہے، کہ جن راہوں پر تم لوگ جا رہے ہو وہ کس تباہی کی
طرف جاتی ہے، اور تمہاری خیر کس راہ میں ہے، نصیحت کا یہ طریقہ اسی لئے تو اختیار کیا گیا ہے
کہ تباہی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے تمہیں اس سے بچا لیا جائے۔ اب اس سے زیادہ نادان
کون ہوگا جو سیدھی طرح سمجھانے سے نہ مانے اور گڑھے میں گر کر ہی یہ تسلیم کرے کہ واقعی
یہ گڑھا ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۵ ص ۲۲۴)

الرحمٰن اس سورہ میں جو آیت دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے:

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ (الرحمٰن)

پس اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

۷۸ آیتوں کی اس سورہ میں ۳۱ بار یہ آیت دہرائی گئی ہے اس سے بھی اس آیت ترجیع کی اہمیت واضح ہوتی
ہے، اس میں لفظ "آلاء" کی جو تحقیق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اس کے اقتباسات
ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

اصل میں لفظ "آلاء" استعمال ہوا ہے جسے آگے کی آیتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے اور ہم

نے مختلف مقامات پر اس کا مفہوم مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے، اس لئے آغاز ہی میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس لفظ میں معنی کی کتنی وسعت ہے اور اس میں کیا کیا مفہومات شامل ہیں

آلاء کے معنی اہل لغت اور اہل تفسیر نے بالعموم "نعمتوں" کے بیان کئے ہیں، تمام مترجمین نے بھی یہی اس لفظ کا ترجمہ کیا ہے اور یہی معنی ابن عباس، قتادہ اور حسن بصری سے منقول ہیں، سب سے بڑی دلیل اس معنی کے صحیح ہونے کی یہ ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ وہ اس آیت کو سن کر بار بار لا بشیئٍ من نعمک ربنا نکذب کہتے تھے لہٰذا زمانۂ حال کے بعض محققین کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ آلاء نعمتوں کے معنی میں سرے سے استعمال ہی نہیں ہوتا۔

دوسرے معنی اس لفظ کے قدرت اور عجائب قدرت یا کمالات قدرت ہیں، ابن جریر طبری نے ابن زید کا قول نقل کیا ہے کہ فبای آلاء ربکما کے معنی ہیں فبای قدرۃ اللہ ابن جریر نے خود بھی آیت ۳۷-۳۸ کی تفسیر میں آلاء کو قدرت کے معنی ہی میں لیا ہے۔ امام رازی نے بھی آیات ۱۴-۱۵-۱۶ کی تفسیر میں لکھا ہے "یہ آیات بیان نعمت کے لئے نہیں بلکہ بیان قدرت کے لئے ہیں" اور آیات ۲۲-۲۳ کی تفسیر میں وہ فرماتے ہیں "یہ اللہ کے عجائب قدرت کے بیان میں ہے نہ کہ نعمتوں کے بیان میں" اس کے تیسرے معنی ہیں خوبیاں، اوصاف حمیدہ اور کمالات و فضائل اس معنی کو اہل لغت اور اہل تفسیر نے بیان نہیں کیا ہے مگر اشعار عرب میں یہ لفظ کثرت سے اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔"

اس کے بعد مولانا مودودی نے عربی کے متعدد اشعار ترجمہ کے ساتھ نقل کئے ہیں اور اس کے بعد لکھا ہے :-

ان شواہد و نظائر کو نگاہ میں رکھ کر ہم نے لفظ آلاء کو اس کے وسیع معنی میں لیا ہے اور ہر جگہ موقع و محل کے لحاظ سے اس کے جو معنی مناسب تر نظر آئے ہیں وہی ترجمہ میں درج کر دیئے ہیں لیکن بعض مقامات پر ایک ہی جگہ آلاء کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور ترجمہ کی مجبوریوں سے ہم کو اس کے ایک ہی معنی اختیار کرنے پڑے ہیں کیونکہ اردو زبان میں کوئی لفظ اتنا جامع نہیں ہے کہ وہ ان سارے مفہومات کو بیک وقت ادا کر سکے مثلاً اس آیت میں زمین کی تخلیق اور اس میں

مخلوقات کی رزق رسانی کے بہترین انتظامات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے رب کے کن کن "آلاء" کو جھٹلاؤ گے۔ اس موقع پر آلاء صرف نعمتوں کے معنی ہی میں نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات اور اس کی صفات حمیدہ کے معنی میں بھی ہے، یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس نے اس کرۂ خاکی کو اس عجیب طریقے سے بنایا کہ اس میں بے شمار اقسام کی زندہ مخلوقات رہتی ہیں اور طرح طرح کے پھل اور غلے اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور یہ اس کی صفات حمیدہ ہی ہیں کہ اس نے ان مخلوقات کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں ان کی پرورش اور رزق رسانی کا بھی انتظام کیا، اور انتظام بھی اس شان کا کہ ان کی خوراک میں نری غذائیت ہی نہیں ہے بلکہ لذت کام و دہن اور ذوق نظر کی بھی ان گنت رعائتیں ہیں اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی کارکردگی کے صرف ایک کمال کی طرف بطور نمونہ اشارہ کیا گیا ہے کہ کھجور کے درختوں میں پھل کس طرح غلافوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے، اس ایک مثال کو نگاہ میں رکھ کر دیکھئے کہ کیلے، انار، سنترے، ناریل اور دوسرے پھلوں کی پیکنگ میں آرٹ کے کیسے کیسے کمالات دکھائے گئے ہیں اور یہ طرح طرح کے غلے اور دالیں اور حبوب جو ہم بے فکری کے ساتھ پکا پکا کر کھاتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو کیسی کیسی نفیس بالوں اور خوشوں کی شکل میں پیک کر کے اور نازک جھلیوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے (تفہیم القرآن ج ۵)

جھٹلانے سے کیا مراد ہے؟ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

جھٹلانے سے مراد وہ متعدد رویے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی قدرت کے کرشموں اور اس کی صفات حمیدہ کے معاملے میں لوگ اختیار کرتے ہیں مثلاً بعض لوگ سرے سے یہی نہیں مانتے کہ ان ساری چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ محض مادے کے اتفاقی ہیجان کا نتیجہ ہے یا ایک حادثہ ہے جس میں کسی حکمت اور صناعی کا کوئی دخل نہیں، یہ کھلی کھلی تکذیب ہے ــــ بعض دوسرے لوگ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے مگر اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھہراتے ہیں، اس کی نعمتوں کا شکریہ دوسروں کو ادا کرتے ہیں، اور اس کا رزق کھا کر دوسروں کے گن گاتے ہیں، یہ تکذیب کی ایک اور شکل ہے۔ ایک آدمی جب تسلیم کرے کہ آپ نے اس پر فلاں احسان کیا ہے اور پھر اسی وقت آپ کے

سامنے کسی ایسے شخص کا شکریہ ادا کرنے لگے جس نے درحقیقت اس پر وہ احسان نہیں کیا ہے تو آپ خود کہہ دیں گے کہ اس نے بدترین احسان فراموشی کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ اس کی یہ حرکت اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ آپ کو نہیں بلکہ اس شخص کو اپنا محسن مان رہا ہے جس کا وہ شکریہ ادا کر رہا ہے ـــــ کچھ اور لوگ ہیں جو ساری چیزوں کا خالق اور تمام نعمتوں کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں، مگر وہ اس بات کو نہیں مانتے کہ انہیں اپنے خالق و پروردگار کی اطاعت اور اس کی ہدایات کی پیروی کرنی چاہیے، یہ احسان فراموشی اور انکار نعمت کی ایک اور صورت ہے کیونکہ جو شخص یہ حرکت کرتا ہے وہ نعمت کو ماننے کے باوجود نعمت دینے والے کے حق کو جھٹلاتا ہے ـــــ کچھ اور لوگ زبان سے نہ نعمت کا انکار کرتے ہیں، نہ نعمت دینے والے کے حق کو جھٹلاتے ہیں مگر عملاً ان کی زندگی اور ایک منکر و مکذب کی زندگی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا یہ تکذیب بالقول نہیں بلکہ تکذیب بالفعل ہے۔ (ایضاً ص ۲۵۵)

ان مختلف رویوں میں پہلا رویہ ملحدین و منکرین خدا کا ہے دوسرا اور تیسرا رویہ مشرکین و منکرین وحی کا ہے اور چوتھا رویہ بد عمل مسلمانوں کا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے لفظ "آلاء" کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

لفظ آلاء جمع ہے اِلیٰ، اَلیٰ اور اِلیٌ کی، اس کے معنی تمام ائمہ لغت اور ارباب تاویل کے نزدیک نعمت کے ہیں لیکن استاذ امام مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں اہل لغت کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے، مولاناؒ کے نزدیک یہ لفظ صرف نعمت کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کے معنی اس سے وسیع ہیں وہ اس بحث کی تمہید اس طرح اٹھاتے ہیں :۔ "ہر چند لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ "آلاء" کے معنی نعمتوں کے ہیں لیکن قرآن مجید اور کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی، کلام عرب کے تتبع اور لفظ کے مواقع استعمال سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ اس کے اصل معنی کارناموں، کرشموں اور عجائب قدرت و حکمت کے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے کرشموں اور اس کی نشانیوں کا غالب حصہ آیات رحمت پر مشتمل ہے اس وجہ سے لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ آلاء کے معنی نعمت ہی کے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں مولانا نے اس روایت کی بھی توجیہہ کی ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے

کہ انھوں نے اس کے معنی نعمت کے بتائے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جب
ان سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ سوال کے موقع و محل کو سامنے رکھ کر جواب دیتے کہ اس خاص
مقام میں لفظ کا کیا مفہوم ہے اس تمہید کے بعد مولانا نے شعرائے جاہلیت میں سے، طرفہ، میتہ بنت
فرار، مہلہل، ربیعۃ بن مقروم، اجدع الہمدانی، فضالۃ ابن زید، خنساء اور بعض حماسی شعراء
کے کلام سے اپنی تائید میں شواہد پیش کئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مشہور جاہلی شاعروں نے
جن کا کلام لغت اور نحو کا ماخذ ہے، اس لفظ کو صرف نعمت ہی کے معنی میں نہیں لیا ہے بلکہ وسیع
معنوں میں لیا ہے جس کے تحت، نعمت، قدرت، شان، نشانی، کرشمہ، کارنامہ، اعجوبہ اور اس
نوع کے تمام مفہوم شامل ہیں۔ (تدبر قرآن ج ۷ ص ۱۲۰)

اوپر تفہیم القرآن سے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں اس میں صراحت ہے کہ ابن زید، ابن جریر طبری اور
امام رازی نے بھی لفظ آلاء کو صرف نعمت کے معنی میں نہیں لیا ہے بلکہ اس کے معنی قدرت اور عجائب قدرت
بھی بیان کئے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ:۔

اس کے معنی تمام ائمۂ لغت اور ارباب تاویل کے نزدیک نعمت کے ہیں"

صحیح نہیں ہے۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے بھی بعض ائمۂ تفسیر و تاویل نے اس لفظ کو صرف نعمتوں کے
معنی میں محدود نہیں مانا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی آیت ۱۳ جو پہلی آیت ترجیع ہے، اس کی تفسیر میں مولانا اصلاحی نے
تحریر فرمایا:۔

"یہ آیت آگے بار بار آئے گی اور یہ اس سورہ کی اہم ترین آیت ہے اسی وجہ سے ہم نے تمہید ہی میں لفظ
آلاء کی تحقیق بھی بیان کر دی ہے اور اس میں جنوں اور انسانوں سے جو خطاب ہے اس کی نوعیت
پر بھی روشنی ڈالی ہے۔"

اس سلسلے کی بعض آیتوں کی وضاحت کے بعد انھوں نے لکھا ہے:۔

نعمت کے ساتھ منعم کی شکر گزاری اور ربوبیت کے ساتھ مسئولیت کا احساس، انسانی فطرت کا
ایک بدیہی تقاضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے ایک شخص متمتع تو ہو رہا ہے لیکن وہ یہ
تسلیم نہیں کرتا کہ ان کے عوض میں اس کے اوپر نعمتوں کے بخشنے والے کا کوئی حق بھی قائم ہوتا ہے
یا ان کے باب میں اس سے کوئی پرسش بھی ہونی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ان تمام نعمتوں

کو مکذب ہے۔ قرآن نے یہاں اسی تکذیب پر قریش اور ان کے ہم مشرب جنوں کو سرزنش فرمائی ہے
کہ ہر قدم پر تمہارے سامنے تمہارے رب کی وہ نعمتیں موجود ہیں جو تمہیں روز باز پرس کی یاددہانی
کر رہی ہیں لیکن تم اس کا انکار کئے جا رہے ہو تو اس رب کی کن کن نعمتوں اور عنایتوں کی تکذیب کرو گے

(تدبر قرآن جلد ۷)

المرسلٰت اس سورہ میں جو آیت دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے :۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے

یہ آیت دس بار دہرائی گئی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے اس سورہ کی تمہید میں لکھا ہے :۔
"مزاج اور اسلوب کلام میں سورہ رحمان سے اس کی مشابہت یوں ہے کہ جس طرح وہ ترجیع والی
سورتوں میں سے ہے اسی طرح اس سورہ میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ دس بار آئی ہے"

(تدبر قرآن جلد ۸ ص ۱۲۲)

ایک جگہ اس سورہ کی آیت ترجیع (۱۹) کی تفسیر میں مولانا اصلاحی نے لکھا ہے :۔
اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے لفظ وَيْلٌ نے یہاں عذاب کی ان تمام قسموں کو اپنے اندر سمیٹ
لیا ہے جن سے مجرموں کو اس دن سابقہ پیش آئے گا اور جن کی تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے
اگرچہ بظاہر یہ ایک مختصر لفظ ہے لیکن اس کے اختصار و ابہام کے اندر جو ہولناکی مضمر ہے وہ بڑی
سے بڑی تفصیل کے اندر بھی نہیں سما سکتی (ج ۸ ص ۱۲۷)

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورہ کا مرکزی مضمون کفار کی تخویف اور کفر سے ان کی تحذیر کو قرار دیا ہے
اور اس سورہ کی دس آیات ترجیع کو دس انواع تخویف میں تقسیم کیا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بار بار دہرائی جانے
والی آیتوں کو محض تاکیدی تکرار نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک ہر آیت اپنا ایک مستقل مفہوم رکھتی ہے۔ انھوں
نے لکھا ہے :۔

اعلم ان المقصود من هذه السورة	جان لو کہ اس سورہ کا مقصد کفار کو ڈرانا
تخويف الكفار وتحذيرهم عن	کفر سے ان کو بچانا اور اس کے انجام بد سے
الكفر فالنوع الاول من التخويف	ان کو ہوشیار کرنا ہے۔ تخویف (ڈرانا) کی نوع
انه اقسم على ان اليوم الذى	اول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات پر قسم کھائی

یوعدون، بہ وھو یوم الفصل
واقع ثم ھول فقال وما ادراک
ما یوم الفصل ثم زاد فی
التھویل فقال ویل یومئذ
للمکذبین
(تفسیر کبیر ج ۸)

یعنی جس دن کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے اور
وہ یوم الفصل ہے یقیناً واقع ہو کر رہے گا پھر
اس میں ہولناکی پیدا کرنے کے لئے وما ادراک
ما یوم الفصل (اور تم کیا سمجھے کہ فیصلہ کا دن
کیا ہے) کا فقرہ بڑھایا اور پھر اس ہولناکی
میں مزید اضافے کے لئے فرمایا گیا۔ ویل
یومئذ للمکذبین (تباہی ہے اس دن
جھٹلانے والوں کی)

اسی طرح انھوں نے دس آیتوں میں دس انواع تخویف کی الگ الگ توضیح کی ہے۔

ترجیع کی حکمت و اہمیت یہ جو قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں بعض آیتیں بار بار دہرائی گئی ہیں ان کی حکمت و اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب "تدبر قرآن" میں دیا گیا ہے، میں اسی سے اقتباسات پیش کر رہا ہوں اور فی الواقع یہ مضمون مطالعۂ تدبر قرآن ہی کی دین ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے دہرائی جانے والی آیت کے لئے آیت ترجیع کی اصطلاح استعمال کی ہے اور انھیں نے اس کی اہمیت و حکمت واضح کی ہے۔ سورہ القمر کی تمہید میں انھوں نے لکھا ہے:۔

جس سورہ میں کسی آیت کی ترجیع ہو اس کو سورہ میں خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے گویا متکلم تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اپنے دعوے پر دلائل بیان کرتے ہوئے ضدی مخاطب کو بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اپنی ضد ہی پر کیوں اڑے ہوئے ہو اس واضح حقیقت پر کیوں غور نہیں کرتے جو تمہارے سامنے دلائل کی روشنی میں پیش کی جا رہی ہیں (تدبر ج ۷ ص ۸۷)

سورہ الرحمٰن کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:۔

کسی ایک ہی بات کی طرف بار بار توجہ دلانے کا یہ اسلوب ظاہر ہے کہ اس صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب یا تو اتنا ضدی ہو کہ اپنی خواہش کے خلاف کوئی بات ماننے کے لئے تیار ہی نہ ہو یا اتنا غبی ہو کہ جب تک اس کو کان پکڑ پکڑ کر ایک ایک چیز کی طرف توجہ نہ دلائی جائے اس سے کسی معقول بات کے سمجھنے کی توقع ہی نہ کی جا سکتی ہو۔

کلام میں مخاطب کی ذہنیت اور اس کے مزاج کی رعایت ایک ناگزیر شے ہے۔ اگر متکلم یہ چیز ملحوظ نہ رکھ سکے تو اس کا کلام نہ مطابق حال ہوگا نہ بلیغ۔ جو لوگ کلام کے ان تقاضوں سے نابلد ہوتے ہیں وہ اس نوعیت کے کلام کی خوبیوں اور نزاکتوں کے پرکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ ایک ہی آیت کے بار بار اعادے کو تکرار پر محمول کرتے اور اس تکرار کو ایک عیب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سورہ پر بھی بعض کم سوادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں ایک ہی آیت کا بار بار اعادہ ہے، حالانکہ اگر وہ سمجھ جائیں کہ اس میں مخاطب کس ذہنیت کے لوگ ہیں تو وہ پکار اٹھیں کہ اس سورہ کی ایک ایک ترجیع اپنے محل میں اس طرح جڑی ہوئی ہے جس طرح انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے۔ (ایضاً ص ۱۱۹)

وہ مزید تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

سورہ قمر میں قریش کے ہٹ دھرموں کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ سے آخر کیوں سبق نہیں لیتے ؟ کیوں اڑے ہوئے ہو کہ جب عذاب کا تازیانہ دیکھ لوگے تب ہی مانو گے ؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لئے ایک ایسی کتاب اتاری جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے، اس سورہ میں اسی مضمون کو ایک نئے اسلوب اور نہایت اچھوتے انداز سے لیا ہے اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت ہے کہ اس نے تمہاری تعلیم کے لئے قرآن اتارا، تمہاری فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس مقصد کے لئے قرآن ہی اتارا جائے، جب اللہ نے تم کو نطق و بیان کی صلاحیت سے نوازا ہے تو تم بات سمجھ بھی سکتے ہو اور سمجھا بھی سکتے ہو، اس اعلیٰ صلاحیت کا حق یہی ہے کہ اسی کو تمہاری تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے نہ کہ عذاب کے ڈنڈے کو، لیکن تمہاری یہ بدبختی ہے کہ تم اس نعمت و رحمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کوئی نشانی دیکھنے کے لئے مچلے ہوئے ہو، اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کی نشانیوں پر کیوں غور نہیں کرتے جو ہر روز تمہارے مشاہدے میں آتی ہیں اور تمہیں انہی حقائق کے درس دیتی ہیں جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے ان نشانیوں کے ہوتے کسی نشانی کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے بعد زمین و آسمان کی ایک ایک نشانی پر انگلی رکھ کر اور گویا ان ضدیوں کے کان پکڑ پکڑ کر توجہ دلائی ہے کہ یہ نشانیاں نہیں

ہیں تو کیا ہیں، آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے رہوگے۔ (ص ۱۴۰)

سورہ المرسلت کی تمہید میں ایک اور انداز سے انھوں نے وضاحت کی ہے:۔

ترجیع والی سورتوں کے باب میں یہ اصولی حقیقت سورہ رحمان کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان میں خطاب بالعموم ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو ایک واضح حقیقت کو محض مکابرت اور انانیت کی بنا پر جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے کان اور آنکھیں کھولنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ متکلم صرف اپنے دلائل بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر دلیل کے بعد بطور تنبیہ ان کے جرم اور انجام سے ان کو آگاہ بھی کرتا رہے، مخاطب کے اس مزاج کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو جس طرح مریض کے مزاج سے ناواقف معالج کی دوا بے اثر رہ جاتی ہے اسی طرح مخاطب کے مزاج سے ناآشنا متکلم کا کلام بھی بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے، مخاطبوں کے مزاج کا اختلاف ایک امر فطری ہے اس وجہ سے اس کا لحاظ بلاغت کلام کا ایک لازمی تقاضا ہے جو لوگ اس نکتہ سے ناآشنا ہیں وہ قرآن کی اس نوع کی ترجیعات کو تکرار پر محمول کرتے ہیں حالانکہ کلام کے اداشناس جانتے ہیں کہ قرآن میں ہر ترجیع اپنے محل میں انگشتری پر نگینے کا حسن رکھتی ہے۔ (تدبر ج ۸ ص ۱۳۲)

ہم آپ اور جو لوگ بھی قرآن مجید کی تلاوت، ترجمہ کے ساتھ سمجھ کر کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں وہ اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے کہ انھیں دہرائی جانے والی آیتوں کی اہمیت، ضرورت اور حکمت معلوم ہو ورنہ عام طور پر اس کو تکرار ہی سمجھا جاتا اور زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ تکرار، تاکید کے لئے ہے ——— یہ بات بھی سامنے رہنی چاہئے کہ ان پانچ سورتوں کے علاوہ دوسری سورتوں میں بھی بعض آیتیں دو بار وارد ہوئی ہیں ان مقامات کو بھی اوپر دی ہوئی تفصیل کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

تخلیق جن و انس کا مقصد[1]

(سلطان احمد اصلاحی)

اسلام کے مطلوبہ تصور دینداری کو قرآن ایک لفظ 'عبادت' میں سمیٹ کر بیان کرتا ہے۔ صاف اور سیدھے لفظوں میں جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی خدا کے حکم کے مطابق گذارے۔ اور اپنے جملہ معاملات و مسائل میں خدائی مرضیات سے سرمو تجاوز نہ کرے۔ انسانی زندگی کے بے شمار گوشے ہیں اور ان سب سے متعلق ہر دور اور ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفصیلی ہدایات فراہم کی جاتی رہی ہیں۔ جنہیں آخری طور پر قرآن کے صفحات میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ پس زندگی میں خدا کی مرضی کو روبکار لانے کے لیے جو بات جس اہمیت اور جس ترتیب سے کہی گئی ہے اسے اسی ترتیب اور اہمیت کے ساتھ ادا کیا جائے اور زندگی کے کسی دائرے میں خدا کی مرضی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ یہی اللہ کی بندگی اور عبادت ہے۔ جس کے لیے انسانوں اور جنوں کو پیدا کیا گیا ہے اور یہی چیز ہے جسے ان کا وظیفہ حیات اور مقصد زندگی قرار دیا گیا ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ	میں نے جنوں اور انسانوں کو جو پیدا کیا تو ہی
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ مَا أُرِيدُ	لیے کہ وہ عبادت کریں۔ (میرا کہنا مان کریں)
مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ	میں ان سے روزی (کمانا) نہیں چاہتا
أَن يُطْعِمُونِ ٥	نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ (کما کر) کھلائیں

جنوں کی پیدائش انسانوں سے پہلے ہوئی ہے۔ اس لیے آیت کریمہ میں ان کا ذکر پہلے ہے۔ ان دونوں کا مقصد تخلیق اللہ کی 'عبادت' قرار دیا گیا ہے۔ اس عبادت کا مطلب محض پوجا پاٹ اور پرستش نہیں ہے۔ جس کا تقاضا مخصوص عبادات اور تقرب خداوندی کے محدود اعمال کی انجام دہی سے ادا ہو جائے۔ یہ مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ اس کا تقرب و نیاز مندی کا حق ادا کرنے کے ساتھ، جملہ معاملات زندگی میں

---

[1] زیر ترتیب کتاب 'مذہب کا اسلامی تصور' کا ایک حصہ

اس کے عطا کردہ احکامات و ہدایات کی بے لاگ پیروی اختیار کی جائے اور زندگی کا کوئی قدم اس کی اطاعت و پیروی سے ہٹ کر نہ اٹھے۔

حقیقت یہ ہے کہ سچی پرستش، اطاعت کو مستلزم ہے۔ یہ سوچا نہیں جا سکتا کہ ایک شخص ذہن کی پوری یکسوئی اور اخلاص کے ساتھ ایک آستانے پر سر جھکائے اور اسے اپنا آخری ملجا و ماویٰ سمجھے اور زندگی کے معاملات میں دوسروں کا کہا مانے اور انہیں اپنا ہادی و رہبر تسلیم کرے۔ یہی وجہ ہے جو ہمارے مفسرین کرام عام طور پر اس آیت کی تفسیر میں پرستش سے کچھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ عبادت و اطاعت کو وہ لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ ایک بالا و برتر ذات کے سامنے اپنا سر نیاز جھکا دینے کے بعد اوروں کی کہی ماننے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے آیت کے اس اجمال کو کھول بھی دیا ہے۔ چنانچہ وہ عبادت کی تشریح 'اطاعت' سے کرتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ عبودیت و پرستش کے ساتھ جملہ معاملات زندگی میں اللہ تعالیٰ کی بے لاگ پیروی بھی ضروری ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں:-

ومعنی الآیة انه تبارك وتعالیٰ خلق العباد لیعبدوه وحده لا شریك له فمن اطاعه جازاه اتم الجزاء ومن عصاه عذبه اشد العذاب[۱]

آیت کا مطلب ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے بندوں کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ تنہا اسی کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ پس جو اس کا کہا مانے گا اسے وہ اس کا بھرپور بدلہ دے گا اور جو اس کی نافرمانی کرے گا اسے سخت ترین عذاب سے دوچار کرے گا[۱]

امام المفسرین مولانا حمید الدین فراہیؒ "عبادت" کو "عمل صالح" کا نقطۂ عروج قرار دیتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک عمل صالح کے اندر انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام اعمال شامل ہیں جن سے انسان کے مقصدِ تخلیق کی تکمیل ہو اور اس کی فطرت میں ودیعت خفیہ صلاحیتیں بیدار ہو سکیں۔ دنیا میں انسان کے پیدا کیے جانے کا یہی

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: ۴/۲۳۸

[۲] علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بھی ایک موقع پر اس کا ترجمہ اطاعت ہی سے کیا ہے: "اور میں نے جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔"

...مد ہے جسے مختلف الفاظ قرآن کی دوسری بے شمار آیتوں کی طرح سورۂ ذاریات کی آیت زیر بحث میں بھی لفظ عبادت سے واضح کیا گیا ہے۔ والعصر کی فراہی کی تفسیر میں علامہ موصوف کے الفاظ ہیں:

"عملوا الصّٰلحٰت" قول جامع لاشتات الاعمال الحسنة وهذا ظاهر ولكن للفظ دلالة على حكمة عظيمة و هي ان الحسنات لما سماها الله صالحات علم الانسان بان ذلك ان فيها صلاح حاله وقوام امره في معاشه ومعاده وانفراده و جماعته وجسمه وعقله وقلبه فالعمل الصالح ما به حياة الانسان و نماءه حسبما ودع الله في فطرته واستعداد خلقته فيه يتم غاية وجوده حتى ينتهي الى كماله وهو المراد بفطرة الانسان كما قال تعالى "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ" وهو المراد من العبادة كما قال "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" اى بطاعتي

آیت کریمہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ میں "عَمِلُوا الصّٰلِحٰت" ایک جامع کلمہ ہے جس میں تمام اعمال صالحہ سمٹ آئے ہیں۔ یہ مسئلہ واضح ہے لیکن ایک نکتہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے: اللہ تعالیٰ نے اعمال حسنہ کو "صالحات" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ درحقیقت انسان کی تمام ظاہری و باطنی دینی و دنیاوی شخصی و اجتماعی جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمال حسنہ ہی ہیں یعنی عمل صالح وہ عمل ہے جو انسان کے لیے زندگی اور نشو و نما کا سبب بن سکے، اور جس کے ذریعہ انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک ترقی کر سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔ یہی چیز ہے جس کے ذریعہ سے وہ مقصد پورا ہوتا ہے جس کے لیے انسان وجود میں آیا ہے۔ اور جس کو انسان کی فطرت قرار دیا گیا ہے اور جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ: "اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا۔" اور اس آیت میں عبادت سے یہی چیز مقصود ہے "اور میں نے جن و انس...

وبها صلاح نفسه وسائر الخلق له	کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ [2]

امام رازی آیت زیر بحث میں عبادت کے تقاضوں کی تفصیل میں خدا اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ پوری شریعت کی پیروی کو لازم قرار دیتے ہیں۔ پانچویں مسئلے کے تحت عبادت کی حقیقت کے سوال کو اٹھانے کے بعد وہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں:-

اما المسئلة الخامسة ما العبادة التي خلق الجن والانس لها قلنا التعظيم لامر الله والشفقة على خلق الله فان هذين النوعين لم يخل شرع منهما واما خصوص العبادات فالشرائع مختلفة فيها بالوضع والهيئة والقلة والكثرة والزمان والمكان والشرائط والاركان ولما كان التعظيم اللائق بذي الجلال والاكرام لا يعلم عقلا لزم اتباع الشرائع فيها والاخذ بقول الرسل عليهم السلام فقد انعم الله على عباده بارسال	پانچواں مسئلہ۔ وہ عبادت کیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو پیدا کیا؟ جواب یہ ہے کہ یہ (بہمہ وجوہ) اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور تعظیم اور اس کی مخلوقات کے ساتھ شفقت اور مہربانی ہے۔ اس لیے کہ کوئی آسمانی شریعت ان دو قسموں سے خالی نہیں رہا تک خاص عبادات کا سوال ہے تو شریعتیں مختلف رہی ہیں کہ ان کی شکل کیا ہو؟ انہیں کس طرح ادا کیا جائے؟ اسی طرح ان کی تعداد کی کمی بیشی، وقت اور جگہ اور ان کے شرائط و ارکان کے معاملہ میں بھی ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی واقعی بڑائی اور تعظیم کا ادراک عقل سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اس کے سلسلے میں شریعتوں کی پیروی کی جائے اور رسولوں کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کیا جائے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ (ہر دور

[1] تفسیر سورۃ والعصر، ص ۱۵۱، قیمین عام علی گڑھ مسلم ۱۹۸۲ء

[2] ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ۔ سورۃ والعصر ۲۹، ص طبع دوم، دائرۂ حمیدیہ

الرسل وایضاح السبل فی نوعی العبادة[1]

اور ہر زمانہ میں) اپنے رسولوں کو بھیج کر عبادت کی ان دو گونہ صورتوں کے سلسلے میں اپنے بندوں پر انعام و اکرام کی بارش کرتا رہتا ہے۔

زمانۂ حال کے مفسرین میں سید قطب شہیدؒ نے 'عبادت' کے دائرے کو مزید وسعت دی ہے۔ اور اسے انسان کے خلافتِ ارضی اور نفاذِ شریعت کے وسیع اور ہمہ گیر فریضہ منصبی کے قائم مقام بتایا ہے۔ آیت زیرِ بحث کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

ومن ثم یبرز الجانب الآخر لتلك الحقیقة الضخمة ویتبین ان مدلول العبادة لا بد ان یکون اوسع واشمل من مجرد اقامة الشعائر۔ فالجن والانس لا یقضون حیاتهم فی اقامة الشعائر۔ والله لا یکلفهم هذا وهو یکلفهم الوانا اخری من النشاط تستغرق معظم حیاتهم وقد لا نعرف نحن الوان النشاط التی یکلفها الجن ولکنا نعرف حدود النشاط المطلوب من الانسان نعرفها من القرآن من قول الله تعالیٰ "وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ

یہاں سے اس بڑی حقیقت کا ایک دوسرا پہلو ابھرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ضروری ہے کہ (آیت زیرِ بحث میں) عبادت کے مدلول کا دائرہ معروف دینی شعائر کے قیام سے زیادہ وسیع اور گہرا مانا جائے۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ جنات اور انسان اپنی (پوری) زندگی محض ان شعائر کی اقامت میں نہیں گزرتے اور اللہ نے انہیں صرف اسی کا مکلف نہیں ٹھہرایا ہے۔ بلکہ ان کے علاوہ اس نے ان کی دوسری مصروفیات اور ذمہ داریاں بھی قرار دی ہیں۔ اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ ان کی ادائیگی میں بسر ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جنوں کی ٹھہرائی گئی ذمہ داریوں کا ہمیں کچھ زیادہ علم نہیں لیکن انسان کی مطلوبہ ذمہ داریوں کو ہم بخوبی جانتے ہیں۔ قرآن سے ہمیں یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول سے معلوم ہوتی ہے

[1] مفاتیح الغیب المشتہر بالتفسیر الکبیر: ۷/ ۶۶۰

عربی	اردو
اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً	کہ "اور یاد کرو جب تیرے رب نے فرشتوں
فھی الخلافۃ فی الأرض	سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانا چاہتا
باذن عمل ھذا الکائن	ہوں" معلوم ہوا کہ زمین کی یہ نیابت ہی انسانی
الانسانی وھی تقتضی الوانا	وجود کا مطلوبہ وظیفہ حیات ہے جس کے تقاضے
من النشاط الحیوی فی عمارۃ	میں زندگی کی متنوع مصروفیات شامل ہیں
الارض والتعرف الیٰ قواھا	زمین کی آباد کاری اس کی پوشیدہ قوتوں
وطاقاتھا وذخائرھا	اور صلاحیتوں اور اس میں مدفون ذخائر اور وسائل
ومکنوناتھا وتحقق ارادۃ	کی کھوج پھر ان کے استعمال، ان کی ترقی اور ان
اللّٰہ فی استخدامھا و	کی حیات بخشی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی
تنمیتھا وترقیۃ الحیاۃ فیھا	کوشش جس سے ان کے تئیں اللہ تعالیٰ کے منشا
کما تقتضی الخلافۃ القیام	اور اس کی مرضی کو عملی روپ دھارنے کا موقع
علی شریعۃ اللّٰہ فی الارض	مل سکے، نیابت الٰہی کا دوسرا تقاضا ہے کہ زمین
لتحقیق المنھج الالٰہی	پر خدائی شریعت کا قیام عمل میں آئے اور پوری دنیا
الذی یتناسق مع الناموس	میں وہ تشریعی اسلام عملاً برپا ہو جائے جو کہ
الکونی العام [1]	کائنات کے اندر جاری تکوینی اسلام سے
	پوری طرح ہم آہنگ ہو۔

اس کے بعد وہ اس بحث کو دو نکتوں میں سمیٹتے ہوئے فرماتے ہیں:—

عربی	اردو
ومن ثم یتجلی ان معنی	اس سے واضح ہوا کہ عبادت جو انسان کا
العبادۃ التی ھی غایۃ	مقصد وجود ہے یا دوسرے لفظوں میں انسان
الوجود الانسانی او التی ھی	کا اولین وظیفہ حیات ہے اس کا دائرہ مجرد
وظیفۃ الانسان الاولی اوسع	دینی شعائر سے بہت زیادہ وسیع اور ہمہ گیر
واشمل من مجرد الشعائر	ہے نیز یہ کہ خلافت ارضی کی ذمہ داری عبادت

[1] فی ظلال القرآن: ٢٧/٢٨

وان وظيفة الخلافة داخلة في مدلول العبادة قطعا وان حقيقة العبادة تتمثل اذن في امرين رئيسين الاول: هو استقرار معنى العبودية لله في النفس اي استقرار الشعور على ان هناك عبدا وربا عبدا يعبد وربا يعبد وان ليس هناك الا هذا الوضع وهذا الاعتبار ليس في هذا الوجود الا عابد ومعبود والا رب واحد والكل له عبيد - والثاني هو التوجه الى الله بكل حركة في الضمير وكل حركة في الجوارح وكل حركة في الحياة - التوجه بها الى الله خالصة والتجرد من كل شعور آخر ومن كل معنى غير معنى التعبد لله[1]

کے مدلول میں قطعی طور پر شامل ہے۔ پس عبادت کی حقیقت دو کلیدی صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ اول یہ کہ بندگی (عبودیت) کی حقیقت انسان کے باطن میں اچھی طرح جاگزیں ہو جائے یعنی کہ دل میں یہ احساس پورے طور پر گھر کر جائے کہ ایک بندہ ہے اور ایک رب۔ بندہ جو بندگی بجالائے اور رب جس کی بندگی بجالائی جائے اس سے ہٹ کر کوئی دوسری چیز نہیں یہی ایک بات اور یہی ایک حقیقت ہے۔ اس کائنات کے اندر دو کے علاوہ کوئی نہیں۔ بندگی کرنے والا، دوسرا وہ جس کی بندگی کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایک رب ہے بقیہ تمام اس کے بندے ہیں۔ دوم یہ کہ دل وضمیر کی ہر حرکت اللہ کی طرف رخ کر کے ہونے لگے۔ ہمہ وجوہ توجہ صرف اللہ کی طرف رہ جائے۔ بندگی رب کے علاوہ دوسرے تمام احساسات و خیالات بلکہ ہر بات سے ذہن بالکل یکسو ہو جائے۔

اور آخر میں پوری بحث کا خلاصہ یہ بیان کرتے ہیں :۔

بهذا وذاك يتحقق معنى العبادة ويصبح العمل كالشعائر وعمارة الارض كالجهاد في سبيل الله والجهاد في

ان تمام مفاہیم کے بعد ہی عبادت کی حقیقت عملی روپ دھارتی ہے جس کے نتیجہ میں آدمی کا روزمرہ کا کام دینی شعائر کی طرح، دینی شعائر زمین کی آبادکاری کی طرح

---

[1] حوالہ سابق

سبیل الله کالصبر علی الشدائد والرضی بقدر الله.... کلها عبادة وکلها تحقیق للوظیفة الاولی التی خلق الله الجن والانس لها وکلها خضوع للناموس العام الذی یتمثل فی عبودیة کل شیئ لله دون سواه [1]

ہوجاتی ہے اور اللہ کے راستے میں جہاد بالکل ویسا ہی ہے جیسے کہ آدمی کا زندگی کی مصائب مشکلات پر صبر کرنا اور اللہ کی ٹھیرائی ہوئی تقدیر پر راضی ہونا۔ یہ بھی چیزیں عبادت ہوجاتی ہیں۔ اس لیے کہ ان سب کا مقصد اس اولیں اور بنیادی نصب العین کو روبکار لانا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ حق تعالیٰ کی یہ تشریعی بندگی ایسی ہی ہے جیسے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تکوینی طور پر اس کی بندگی اور اطاعت میں لگا ہوا ہے

سب سے زیادہ تفصیلی بحث اس سلسلے میں علامہ ابن تیمیہ رح کے یہاں ملتی ہے جو اسلام کے متعدد ارکان و فرائض کی تصریح کے ساتھ 'عبادت' کے اندر پورے مجموعہ دین کو شامل قرار دیتے ہیں۔ عبادت کیا ہے اس کی شناخت کیا ہے۔ اس کے اندر پورا مجموعہ دین داخل ہے یا اس کا اطلاق کچھ خاص چیزوں پر ہوتا ہے اور عبودیت و بندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں:۔

العبادة اسم جامع لکل ما یحبه الله ویرضاه: من الاقوال والاعمال الباطنة والظاهرة فالصلوة والزکوة والصیام والحج وصدق الحدیث واداء الامانة وبر الوالدین وصلة الارحام والوفاء بالعهود

عبادت ایک جامع عنوان ہے جس میں سب چیزیں شامل ہیں جو اللہ کو محبوب ہیں اور جنہیں وہ پسند کرتا ہے ان کا تعلق اقوال سے ہو یا اعمال سے، خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سچ بولنا، امانت کا ادا کرنا، والدین کے ساتھ وفاداری، صلہ رحمی ایفائے عہد، بھلائی (معروف) کا حکم دینا،

---

[1] حوالہ مذکور

والامر بالمعروف والنهی عن المنکر والجهاد للکفار والمنافقین والاحسان الی الجار والیتیم والمسکین وابن السبیل والمملوک من الآدمیین والبهائم والدعاء والذکر والقراءة وامثال ذالک من العبادة وکذالک حب الله ورسوله وخشیة الله والانابة الیه واخلاص الدین له والصبر لحکمه والشکر لنعمه والرضا بقضائه والتوکل علیه والرجاء لرحمته والخوف لعذابه وامثال ذالک هی من العبادة لله له

برائی (منکر) سے منع کرنا، کفار اور منافقین سے جہاد، پڑوسی، یتیم، مسکین، مسافر اور اپنی زیرِ ملکیت انسانوں (یعنی غلاموں) اور جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک۔ اسی طرح اللہ سے دعائیں کرنا، اس کی یاد (ذکر و تسبیح) (قرآن کی تلاوت وغیرہ دوسری بہت سی چیزیں یہ سب کی سب عبادت میں شامل ہیں۔ اسی طرح اللہ اور اس کے رسول سے محبت، اللہ کا ڈر اور اس کی طرف جھکنا، اطاعت کو اس کے لیے خالص کرنا۔ اس کے حکم پر جمنا، اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہونا، اس کے فیصلے پر راضی ہونا اس کے اوپر بھروسہ کرنا اس کی رحمت سے پرامید ہونا۔ اس کے عذاب سے ڈرنا، یہ اور اس طرح کی سبھی چیزیں عبادت ہی میں شامل ہیں۔

آگے موصوف اس کے لیے آیتِ زیرِ بحث کے علاوہ دوسری متعدد قرآنی آیات سے ثبوت فراہم کرتے اور اپنی گفتگو کو مدلل کرتے ہیں۔

و ذالک ان العبادة لله هی الغایة المحبوبة والمرضیة له، التی خلق الخلق لها کما قال: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ٥ و

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی وہ آخری مقصود اور گوہرِ مطلوب ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اور جسے وہ پسند کرتا ہے جس کے لیے اس نے تخلیقِ عالم کو پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو جو پیدا

لہ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۰/۱۴۹، ۱۵۰ طبع جدید

بها ارسل جميع الرسل كما قال نوح لقومه: اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ وكذالك قال هود وصالح وشعيب وغيرهم لقومهم وقال تعالى: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ وقال تعالى: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ وقال تعالى: وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝ كما قال في الآية الاخرى: يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ وجعل ذالك لازما لرسوله الى الموت كما قال " وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝

کیا تو اسی لیے کہ وہ میری عبادت کریں (کہا مان کر رہیں) یہی ایک پیغام تھا جسے دے کر اس نے تمام رسولوں کو بھیجا۔ جیسا کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ "اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی دوسرا معبود نہیں" یہی بات حضرت ہودؑ، صالحؑ اور شعیبؑ وغیرہ دوسرے تمام پیغمبروں نے اپنی اپنی قوم سے کہی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ" لوگو! صرف اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (غیر اللہ) سے دور رہو۔ تو ان میں کچھ ہوئے جنہیں اللہ نے (ان کی سلامتیٔ روح کے سبب) ٹھیک راہ دکھائی۔ دوسرے وہ تھے جن کا مقدر گمراہی ٹھہری" نیز فرمایا "اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے ان تک ایک ہی بات کی وحی کی کہ: میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری ہی بندگی کرو" مزید ارشاد ہوا۔ (اے پیغمبرو!) یہ میری ایک ہی امت ہے۔ اور میں تمہارا رب ہوں تو تم میری ہی بندگی کرو" دوسرے موقع پر فرمایا "اے رسولو! کھاؤ پاک اور ستھری چیزوں سے اور نیک عمل کرو۔ میں جانتا ہوں جو تم کرتے ہو" اور یہی بات اپنے (آخری) رسول کے لیے لازم قرار دی کہ: اور اپنے رب کی بندگی پر کاربند رہو یہاں تک کہ تم تک یقینی

چیز (موت) آجائے۔

خدا تعالیٰ بندوں سے جو کچھ چاہتا ہے اس کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ آدمی ہر طرف سے کٹ کر اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے اور ذات باری تعالیٰ کے سوا اس کی کوئی دوسری غائیت مقصود و مطلوب نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر جائے اور اس کی والہانہ اطاعت اس کا وظیفہ حیات بن جائے۔ دین کے اسی مقصود غائی کو قرآن اکثر و بیشتر لفظ (عبادت) سے تعبیر کرتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر علامہ موصوف اس کی وضاحت ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

فاذا کان اصل العمل الدینی هو اخلاص الدین لله و هو ارادة الله وحده فالشیٔ المراد لنفسه هو المحبوب لذاته وهذا کمال المحبة لکن اکثر ماجا و المطلوب مسمی باسم العبادة کقوله: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ٥ وقوله "يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" و امثال هذا[1]

پس جب دینی عمل کی اصل و اساس اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرنا قرار پایا یعنی کہ اللہ کی ذات ہی انسان کی غایت مقصود بن جائے اور معلوم ہے کہ جو چیز بذات خود مقصود و مطلوب ہو اسی کو دوسرے لفظوں میں 'محبوب' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی محبت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر اس مطلوب و مقصود کو لفظ 'عبادت' سے ادا کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو جو پیدا کیا تو اسی لیے کہ میری عبادت کریں"، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد "اے لوگو اپنے اس رب کی اطاعت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے۔" وغیرہ دیگر آیات۔

اس کے بعد وہ اس 'عبادت' کے متضمنات اور اس کے عناصر ترکیبی کی وضاحت ان لفظوں میں کرتے ہیں:۔

والعبادة تتضمن کمال الحب ونهايته وکمال الذل

عبادت دو چیزوں کو متضمن ہے۔ آخری اور انتہائی درجہ محبت اور آخری اور انتہائی درجہ

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۰/۵۶ طبع جدید

ونہایتہ، فالمحبوب الذی لا یعظم ولا یذل لہ لا یکون معبودا والمعظم الذی لا یحب لا یکون معبودا لہ	کی سرفگندگی و اطاعت میں محبوب جس کی انتہائی درجہ پر تعظیم اور سرفگندگی اختیار نہ کی جائے معبود نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ ذات جس کی تعظیم تو کی جائے لیکن اس سے (کمال درجہ) کی محبت نہ ہو وہ بھی معبود نہیں ہو سکتا۔

دین کے اس اصل الاصول کی توضیح کے لیے قرآن نے کچھ دوسرے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ مثال کے طور پر اطاعت، استقامت صراط مستقیم کا التزام وغیرہ۔ ان سب کا تقاضا بھی وہی ہے جو اوپر "عبادت" کی تشریح میں مذکور ہوا۔ علامہ موصوف دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:-

والعبادۃ والطاعۃ والاستقامۃ ولزوم الصراط المستقیم ونحو ذالک من الاسماء مقصودھا واحد ولھا اصلان احدھما "الا یعبد الا اللہ والثانی ان یعبد بما امر وشرع لا بغیر ذالک من البدع لہ	عبادت، اطاعت، استقامت، صراط مستقیم سے چلنا وغیرہ دوسرے بہت سے نام ان سب کا مقصود ایک ہے اور اس کا مرکزی نکتہ دو چیزیں ہیں:- اول یہ کہ صرف اللہ کی عبادت (بندگی) کی جائے۔ دوم یہ کہ بندگی اس طریقہ سے ہو جس کا اس نے حکم دیا ہے اور جسے مشروع قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے من گھڑت طریقے سے نہیں۔

اس کی تائید میں وہ آیات ذیل سے استدلال کرتے ہیں۔

قال تعالیٰ فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا وَلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا وقال تعالیٰ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ	اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پس جو کوئی اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کو ساجھی نہ کرے۔ نیز فرمایا: ہاں جس نے اپنے کو اللہ کے لیے جھکا دیا اور وہ خوب کام بھی کرتا ہے

لہ حوالہ سابق   لہ فتاویٰ مذکور / ۱۷۲، ۱۷۳

أَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ وقال
تعالىٰ " وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا
مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ
مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ
حَنِيْفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا[1]

اس کا بدلہ ملے گا اور نہ ان پر کوئی ڈر ہو گا
نہ یہ غمگین ہوں گے۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور
اس سے اچھا دین کس کا ہے جو اپنے کو جھکائے اللہ
کے لیے اور وہ خوب کار ہو اور ابراہیم کے طریقہ
کی پیروی کرے جو (اللہ کے لیے) یکسو تھا۔ اور
اللہ نے ابراہیم کو (اپنا دوست) ٹھیرایا۔

اور پہلی آیت کریمہ کی یہ تفسیر پیش کرتے ہیں:۔

فالعمل الصالح هو الاحسان
وهو فعل الحسنات والحسنات
هي ما احبه الله ورسوله
وهو ما امر به امر ايجاب
او استحباب فما كان
من البدع في الدين التي
ليست مشروعة فان الله
لا يحبها ولا رسوله فلا تكون
من الحسنات ولا من العمل
الصالح كما كان من يعمل ما
لا يجوز كالفواحش والظلم
ليس من الحسنات ولا من
العمل الصالح

عمل صالح (نیک کام) کا مطلب ہے احسان
(خوب کاری) یعنی بھلائیوں (حسنات) کی انجام دہی
حسنات ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو اللہ اور
اس کے رسول کو پسند ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں
جن کا اس نے بطریق وجوب یا استحباب حکم
دیا ہے۔ پس وہ چیزیں جو دین میں گھڑ کر شامل
کر لی گئی ہوں اور جن کی مشروعیت کی کوئی
سند نہ ہو تو یہ نہ اللہ کو پسند نہ ہوں اس
کے رسول کو۔ سو تھی یہ بھلائی (حسنات)
اور عمل صالح نہیں ہو سکتیں جیسے کہ وہ شخص جو
بدی بے حیائی اور ظلم و ناانصافی کے ناجائز
کام کرتا ہے اس کا تعلق بھلائی (حسنات)
اور نیک کام (عمل صالح) سے نہیں۔

واما قوله "وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ
رَبِّهٖ اَحَدًا" وقوله "وَاَسْلَمَ وَجْهَهٗ

اللہ تعالیٰ کا قول اور چاہیے کہ وہ اپنے رب کی
عبادت میں کسی اور کو ساجھی نہ کرے نیز اس کا

[1] حوالہ مذکور

لله) فهو اخلاص الدين
لله وحده وكان عمر بن
الخطاب يقول: اللهم اجعل
عملي كله صالحا واجعله
لوجهك خالصا ولا تجعل
لاحد فيه شيئا له

ارشاد کہ "جو اپنے کو اللہ کے لیے جھکا دے"
تو اس کی حقیقت اطاعت کو تنہا اللہ کے
لیے خالص کر دینا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر
ابن الخطاب فرمایا کرتے تھے کہ خدایا
میرا ہر عمل تیری مرضی کے مطابق (صالح) ہو
اور اسے تو تنہا اپنی ذات کے لیے خالص
کر دے۔ اس طور پر کہ اس کے اندر کسی
غیر کے لیے کوئی حصہ نہ رہے

اسلام کے مطلوبہ تصور دینداری "پوری زندگی میں خدا تعالیٰ کے لیے الگ اطاعت اور اس کی ذات سے کمال درجہ محبت اور اس اطاعت و محبت کے باہمی ربط و تعلق کو دوسرے موقع پر وہ اس دل نشین انداز میں واضح کرتے ہیں۔

وانما دين الحق هو تحقيق
العبودية لله بكل وجه وهو تحقيق
محبة بكل درجة وبقدر تكميل
العبودية تكمل محبة العبد لربه
وتكمل محبة الرب لعبده وبقدر
نقص هذا يكون نقص هذا وكلما
كان في القلب حب لغير الله كانت
فيه عبودية لغير الله بحسب
ذالك وكل محبة لا تكون لله فهي
باطلة وكل عمل لا يراد به وجه الله فهو
باطل فالدنيا ملعونة ملعون ما فيها
الا ما كان لله ولا يكون لله الا ما

دین حق کی صحیح پیروی یہ ہے کہ عبودیت (بندگی)
کو بہمہ وجوہ اللہ کے لیے خالص کیا جائے
دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب ہے کہ اس
سے کمال درجہ کی محبت کی جائے۔ عبودیت
میں جس درجہ کمال ہوگا اللہ سے بندے کی
محبت بھی اسی درجہ کامل ہوگی اور اسی کے
بقدر اللہ تعالیٰ بھی بندے سے کمال درجہ محبت
کرے گا۔ اس عبودیت میں جس قدر کمی ہوگی
بندے کی اللہ تعالیٰ سے اور اللہ کی بندے سے
محبت میں بھی اسی قدر کمی ہوگی۔ دل میں جب بھی
جس قدر غیر اللہ سے محبت ہوگی اسی کے بقدر
اس کی بندگی اور عبودیت بھی ہوگی۔ حاصل یہ

لہ مجلہ مذکور

احبہ اللہ ورسولہ وھو المشروع فکل عمل ارید بہ غیر اللہ لم یکن للہ وکل عمل لا یوافق شرع اللہ لم یکن للہ بل لا یکون للہ الا ما جمع الوصفین ان یکون للہ وان یکون موافقا لمحبۃ اللہ ورسولہ وھو الواجب والمستحب کما قال: فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا [1]

کہ جو محبت اللہ کے لیے نہ ہو باطل ہے اور ہر وہ عمل جس سے خالص اللہ کی رضا مقصود نہ ہو باطل ہے پس یہ دنیا لعنت کے قابل ہے اور اس کے اندر جو کچھ ہے لعنت کے قابل ہے سوائے اس چیز یا کام کے جو اللہ کے لیے ہو اور اللہ کے لیے وہی چیز ہو سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جسے شریعت کی سند حاصل ہو پس ہر وہ عمل جس سے (صرف) اللہ مقصود نہ ہو وہ اللہ کے لیے نہ ہوگا۔

اسی طرح کوئی بھی عمل جو شریعت کے مطابق نہ ہو وہ اللہ کے لیے نہ ہوگا۔ اللہ کے لیے تو بس وہی چیز ہوگی جس کے اندر دو باتیں پائی جائیں۔ ایک یہ کہ وہ (صرف) اللہ کے لیے ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی پسند کے مطابق ہو اور یہی چیز ہے جسے شریعت کی اصطلاح میں واجب یا مستحب کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "پس جو کوئی اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کو ساجھی نہ کرے۔"

یہی مذہبیت اور دینداری کا یہی تصور ہے جس کا پیغام لیکر انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے۔ بندگی رب کا یہی پیغام ہے جسے بلا استثناء ہر پیغمبر نے پیش کیا، قرآن حکیم کا یہی مرکزی نکتہ ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس پر جمیع ائمہ امت کا اتفاق ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:۔

بل اخلاص الدین للہ ھو الدین الذی لا یقبل اللہ سواہ وھو الذی بعث بہ الاولین والآخرین من الرسل وانزل بہ جمیع الکتب واتفق علیہ ائمۃ اھل الایمان وھذا ھو خلاصۃ الدعوۃ النبویۃ وھو قطب القرآن الذی تدور علیہ رحاہ

(اپنی پوری زندگی میں) بندگی و طاعت کو اللہ کے لئے خالص کرنا یہی وہ دین یا مذہبیت و دینداری ہے جس کے سوا کوئی دوسری چیز اللہ کے لیے قابل قبول نہیں۔ یہی ایک پیغام ہے جسے دیکر اس نے اگلے اور پچھلے تمام رسولوں کو بھیجا اور اسی کے ساتھ اس نے جملہ آسمانی کتابوں کو اتارا اور وہ حقیقت ہے جس پر تمام ائمہ متفق ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پوری انبیائی دعوت کا یہی خلاصہ ہے اور یہی محور ہے

[1] فتاوی مذکور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو
دشمن قتل کیوں نہیں کر سکے؟

ڈاکٹر محمد ذکی، شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی

دنیا جانتی ہے کہ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اللہ کا پیغام سنایا۔ اور اسلام کی دعوت دی۔ تو مکہ کے لوگ آپ کے دشمن ہو گئے اور بالآخر آپ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ کیوں؟ اُن کے نزدیک اس کے اسباب یہ تھے ــــــ اسلام بت پرستی کی مذمت کر رہا تھا۔ اور اسے گمراہی سے تعبیر کر رہا تھا۔ اور مکہ کے لوگ بت پرستی میں مبتلا تھے۔ اس لئے ان کا خیال تھا کہ اسلام ان کے دیوتاؤں کی توہین کر رہا تھا۔ انہیں اور ان کے آباء و اجداد کو گمراہ بتا رہا تھا۔ اس پر وہ بے حد مشتعل تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر اسلام پھیلتا رہا اور قریش کے ہر خاندان سے لوگ اسے قبول کرتے رہے۔ تو ان کے خاندان بٹ جائیں گے۔ ان کا قومی شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کی اجارہ داری اور شان ختم ہو جائے گی۔ اور اس طرح ان کا آبائی مذہب مٹ جائے گا۔ انہی خطرات کے پیش نظر قریش کے سرداروں نے ہر ممکن کوشش کی۔ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بتوں کے خلاف کچھ نہ کہیں اور اپنے مذہب کو اپنی ذات تک محدود رکھیں، علانیہ قرآن نہ پڑھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ روز بروز لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو ان کی تشویش بڑھ گئی۔ چنانچہ ان کے سردار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے پاس گئے۔ کیونکہ وہی خاندان کے بڑے تھے۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت بھی کرتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے بھی آپ کا لایا ہوا دین قبول نہیں کیا تھا۔

قریش کے سرداروں نے ابوطالب سے کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو سمجھا دیں کہ وہ ہمارے معبودوں کی توہین نہ کریں۔ لیکن ان کی درخواست کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ وہ کئی بار ابوطالب کے پاس گئے۔ اور ایک دن انہیں دھمکی بھی دی کہ اگر آپ اپنے بھتیجے کو نہ روک سکے تو مجبوراً ہمیں قدم اٹھانا پڑے گا۔ ابوطالب کو تشویش ہوئی۔ اور انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معاملہ کی حقیقت بیان کی۔ اور کہا کہ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ اٹھا نہ سکوں

اس پر آپؐ نے فرمایا۔ اے چچا! اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج، دوسرے میں چاند بھی رکھ دیں۔ تو میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کر دے۔ یا میں ہلاک ہو جاؤں، ابوطالب کا دل بھر آیا۔ اور انہوں نے یقین دلایا کہ وہ ہرگز آپؐ کو قریش کے حوالے نہیں کریں گے۔ اور یہ کہ آپؐ جو چاہیں کہیں۔

اس کے بعد قریش کا ایک اور وفد آیا۔ تمام شکایتوں کے بعد انہوں نے یہ پیش کش کی کہ اے ابوطالب آپ عمارہ بن الولید بن المغیرہ کو جو نسب۔ جمال۔ بہادری اور شعر گوئی میں مشہور ہے۔ اپنا بیٹا بنا لیں۔ اور اپنے بھتیجے (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے حوالے کر دیں۔ کہ ہم انہیں قتل کر دیں۔ ابوطالب نے اس ظالمانہ تجویز کو ٹھکرا دیا۔ اور پھر اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے تاکید کی۔ ہر حال میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں۔ چنانچہ سب نے آمادگی ظاہر کی سلہ

یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ مکہ کے وہ تمام لوگ جو بت پرستی، مشرکانہ رسوم، اور روایتی نظام کے حامی تھے، چاہتے تھے کہ کسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں۔ چنانچہ ایک بار تو ان کے ایک سردار ابوجہل نے ارادہ کر ہی لیا تھا کہ اگر اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حرم میں نماز پڑھتے دیکھ لیا تو ایک بڑے پتھر سے آپؐ کا سر کچل دے گا۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ اسے کوئی ایسی خوفناک مخلوق نظر آئی جو اس نے نہیں دیکھی تھی۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ وہ حضرت جبرئیلؑ تھے، اگر ابوجہل آگے بڑھتا تو وہ اسے پکڑ لیتے سلہ

بہت سے لوگ بالخصوص غیر مسلم محققین اسے وہم سے تعبیر کر دیں گے لیکن کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ارادہ کے باوجود ابوجہل یا کوئی قریشی (یا کوئی بھی انسان) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کیوں نہیں کر سکا۔؟ سیرت اور تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ قریش مکہ آں حضرت صلی اللہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے۔ لیکن وہ اپنے ارادہ میں ناکام کیوں رہے؟

یہ بھی دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مضبوط قلعے میں نہیں تھے۔ کوئی فوجی دستہ آپؐ کی حفاظت کیلئے متعینات نہیں تھا۔ دن رات آپؐ مکہ کی گلیوں میں تنہا گھومتے تھے۔ پھر کسی نے بڑھ کر آپؐ کو قتل کیوں نہ کر دیا۔؟ وہ کون سی طاقت تھی جو قریش کو ایسا کرنے سے روکے ہوئی تھی؟

اس کے صرف دو جواب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس نے آپؐ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا تھا۔ وہی آپؐ کی حفاظت

سلہ یہ تمام واقعات سیرت ابن اسحاق میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

سلہ سیرت ابن اسحاق۔ نیز اسی نوعیت کی مختلف روایات۔ بخاری۔ مسلم۔ اور دوسری احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

بھی کر رہا تھا۔ یعنی خالق کائنات۔

دوسرا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ قریش اس وجہ سے آپ کو قتل کرنے میں جھجک رہے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ سارے بنی ہاشم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا تہیہ کئے ہوئے تھے اور وہ کسی بھی طرح یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ کسی بھی قبیلہ کا کوئی آدمی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کردے۔ اور یہ کہ اگر کسی قبیلے نے ایسا کیا تو بنی ہاشم خون کا انتقام ضرور لیں گے۔ اس طرح قاتل کے قبیلے اور بنی ہاشم میں جنگ چھڑ جائے گی۔ اور پھر نہ صرف قریش بلکہ دوسرے قبائل بھی اس لڑائی کی لپیٹ میں آجائیں گے۔ اور اس انتقامی جنگ میں نہ جانے کتنے لوگ مارے جائیں اور یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہے۔ اسی وجہ سے قریش کا کوئی بھی قبیلہ اپنے سر یہ خون لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اگرچہ چاہتا یہی تھا کہ آپ کو کسی طرح ختم کردیا جائے۔

ان دونوں میں سے کون سا جواب صحیح ہے، بعد کے واقعات اور تاریخی حقائق کون سے جواب کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ آپ خود ہی کرلیں۔

ان دھمکیوں، سازشوں اور قتل کی کوششوں کے جواب میں معلوم ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟ آپ نے صاف صاف اعلان فرمادیا کہ میری حفاظت کرنے والا کوئی نہیں سوائے اللہ کے، جس نے قرآن نازل کیا ہے۔ اسی کا یہ ارشاد ہوا ہے:۔

قُلِ ادْعُوا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ○ اِنَّ وَلِيِّ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ○ (الاعراف ۱۹۵ - ۱۹۶)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہو (اگر تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک تمہاری مدد کرسکتے ہیں، تو) انہیں (جس قدر پکار سکتے ہو) پکارلو۔ پھر (میرے خلاف اپنی ساری) مخفی تدبیریں کر ڈالو، اور مجھے (اپنے جانچنے) ذرا بھی مہلت نہ دو (پھر دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے) میرا کارساز تو بس اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی۔ اور وہی ہے جو نیک انسانوں کی کارسازی کرتا ہے۔

یعنی قریش مکہ اور دوسرے تمام لوگ کان کھول کر سن لیں، وہ لوگ بھی جو اللہ کے سوا کسی بھی ہستی یا خود اپنی الوہیت کے مدعی ہیں اچھی طرح سمجھ لیں کہ اللہ رب العالمین نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اسی نے یہ کتاب (قرآن) نازل کی ہے۔ وہی آپ کی حفاظت کرنیوالا ہے۔ نہ کوئی دوسری طاقت آپ کی حفاظت کررہی ہے۔ نہ آپ کو نقصان پہونچا سکتی ہے۔ نہ ابوطالب آپ کے محافظ ہیں نہ بنی ہاشم۔ کوئی فوج آپ کی حفاظت کررہی ہے نہ کوئی قوم۔

اس کا ثبوت۔ یہ چیلنج ہی خود اپنا ثبوت ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی ہستی میں (نفع یا) نقصان پہونچانے کی طاقت ہے تو وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ ڈال کر دیکھے، علانیہ ہی نہیں خفیہ بھی، قریش، تمام عرب، غیر عرب سردار اور فرمانروا۔ سب مِل کر ایک شخص پر حملہ کر دیں۔ کیا یہ ممکن نہیں؟ کیا ساری دنیا کے انسان مِل کر بھی ایک انسان کو ختم نہیں کر سکتے؟

اتنا ہی نہیں اللہ کے سوا جن جن طاقتوں کو تم پوجتے ہو۔ جنہیں معبود سمجھتے ہو۔ اُن تمام مادّی طاقتوں سے التجا ئیں کرو کہ اس آڑے وقت میں تمہارا ساتھ دیں۔ ورنہ کم از کم اپنی "الوہیت" ہی کی لاج رکھ لیں۔ اور تمہاری مدد کریں۔ کیا مادی اور تمام ماورائی طاقتیں مِل کر بھی ایک انسان کو قتل نہیں کر سکتیں۔؟

علانیہ نہیں تو چھپ کر حملہ کر دیں۔ خفیہ مشورے کریں، سازشیں کریں۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مشوروں اور سازشوں کی ہوا بھی نہ لگنے دیں۔ اور جب تیاریاں مکمل ہو جائیں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج بھی نہ دیں۔ بس اچانک ٹوٹ پڑیں۔ کیا ساری دنیا کے انسان اور اللہ کے سوا ساری طاقتیں مِل کر بھی ایسا نہیں کر سکتیں۔

کسی کو پھریری نہیں آئی کسی کو جوش نہیں آیا۔ کوئی "معبود" میدان میں نہیں آیا۔ ساری دنیا کی تلواریں کند کیوں ہو گئیں۔ ہاتھ شل کیوں ہو گئے۔ یہ چیلنج تو مکہ کی گلیوں میں گونج رہا تھا۔ پھر سناٹا کیوں تھا؟

اگر یہ اللہ کی طاقت نہیں تھی تو پھر بتائیے وہ کون تھا جو ساری کائنات کے مقابلہ میں آپ کی حفاظت کر رہا تھا اوّل تو کوئی انسان ایسا دعویٰ کر ہی نہیں کر سکتا، یہاں تک کہ کسی بھی طاقت پر بھروسہ کر کے بھی ایسا نہیں کر سکتا جب تک کہ فرمانروائے کائنات خود حفاظت کا وعدہ نہ کرے، اور یہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ وسلم کے ساتھ تھا۔ آپ نے اپنی طرف سے یہ چیلنج نہیں دیا۔ یہ اللہ کی طرف سے اعلان تھا۔

اب بھی شاید کچھ لوگوں کے ذہن میں یہی بات ہو کہ چونکہ قریش (خانہ جنگی کے خوف سے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے آپ نے یہ دعویٰ کر دیا۔ ابھی اس کی حقیقت بھی آپ کے سامنے آئی جاتی ہے غور فرمائیے!

مکہ کے قریش، یہ بات تو طے ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا تو چاہتے تھے، لیکن انتقامی لڑائی اور اس کے پھیلاؤ سے خائف تھے، اُن کی سمجھ میں کوئی ایسی صورت نہیں آ رہی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل بھی کر دیا جائے اور آپ کا قبیلہ (بنی ہاشم) انتقام بھی نہ لے سکے۔ تو شیئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے (بقول منکرین رسالت) خود ہی انہیں ایسی ترکیب بھی بتا دی۔

اسی ماحول میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہ سورہ النمل نازل ہوئی۔ اس میں دیگر قصص کے علاوہ حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ بھی ہے۔ جو اس وقت کے ماحول پر پوری طرح چسپاں ہو رہا تھا۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ صالح علیہ السلام

کی قوم کے لوگ بھی ان کے سخت دشمن ہوگئے تھے ـــــ جس طرح قریش آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے ـــــ پھر کیا ہوا ـــــ ارشاد ہے

"اس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا "خدا کی قسم کھا کر عہد کرلو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے۔ ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کرکے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ ان کے گھر خالی پڑے ہیں۔ اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے۔ اس میں ایک نشان عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔ اور بچالیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے۔ اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے (النمل $\frac{۲۷}{۴۸-۵۳}$)

یہ آیات سورۃ "النمل" کی ہیں۔ جو بالاتفاق مکی ہے۔ اور ہجرت سے تقریباً پانچ چھ سال پہلے نازل ہوئی اس کے مضمون سے قریش مکہ یقیناً آشنا ہوگئے ہوں گے، کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہی قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا، آپ کو سنا دیتے تھے اور اولیں کارِ رسالت یہی تھا۔

یہ آیات واضح طور پر اشارے کر رہی ہیں کہ اے لوگو! (بالخصوص قریش مکہ) آج جس الجھن میں تم مبتلا ہو۔ مدتوں پہلے حضرت صالحؑ کے دشمن بھی مبتلا تھے۔ وہ بھی حضرت صالحؑ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن تنہا کوئی قبیلہ ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ کیونکہ یہ ڈر تھا کہ حضرت صالحؑ کا قبیلہ انتقام کے لئے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اور اس سے ہر قبیلہ کترا رہا تھا۔

معلوم ہے انہوں نے کیا تدبیر اختیار کی؟ انہوں نے مشورہ کیا اور یہ تجویز رکھی کہ حضرت صالحؑ کے خون میں تمام (دشمن) قبائل شریک ہوجائیں، کسی ایک قبیلہ پر یہ ذمہ داری عائد نہ ہو۔ ظاہر ہے ان نو قبائل کے تمام افراد ـــــ عورت مرد۔ بچے۔ بوڑھے سب ہی ـــــ تو شریک ہوں گے نہیں۔ بلکہ یہ سردار ہی ہوں گے (تاکہ یہ راز فاش نہ ہوجائے) اور یہ طے ہوا ہوگا۔ کہ ہر قبیلہ کی طرف سے ایک مرد شریک ہو۔ اس طرح نو افراد رات کے وقت بیک وقت حضرت صالحؑ کے گھر والوں پر ٹوٹ پڑیں۔ اور سب مل کر ان کا خاتمہ کر ڈالیں۔ اس پر سب عہد و پیمان کریں اور پھر ڈھٹائی سے کہہ دیں کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تو ہم اس وقت موقع پر موجود نہ تھے۔ رہے حضرت صالحؑ کے ولی وارث تو وہ چکر میں پڑجائیں گے اور اصل قاتل کا سراغ ہی نہیں لگ سکے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا قبیلہ خاموش ہوجائے گا۔ کیونکہ نو قبیلوں سے تو تنہا لڑ نہیں سکے گا۔ اس طرح مقصد بھی حاصل ہوجائے گا۔ اور قبائل کے درمیان انتقامی لڑائی اور خونریزی بھی نہیں ہوگی۔

ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے اس تدبیر کو بہت پسند کیا ہوگا۔ اور سوچا ہوگا کہ کیوں نہ قریش کے ہر قبیلہ سے ایک جوان منتخب کریں اور پھر یہ سب مل کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹوٹ پڑیں۔

اب ذرا غور فرمائیے اور فیصلہ کیجئے کیا ایسے حالات میں کوئی انسان خود اپنے قتل کی ایسی "عمدہ" تدبیر بتا سکتا ہے؟ آپ یہی کہیں گے کہ ہرگز نہیں۔ پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں بتادی؟

جو اللہ پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے تو اس کا جواب مشکل نہیں، البتہ جو ان باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ انہیں ضرور اس معاملہ میں دشواری پیش آئے گی، وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ اگر صالح علیہ السلام کا یہ واقعہ صحیح ہے تو پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کیوں سنایا اور اپنے جانی دشمنوں کے ہاتھ میں یہ حربہ کیوں دے دیا۔ اگر آپ کو یقین تھا کہ اس طرح بھی دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے تو آپؐ کا کس پر بھروسہ تھا یا آپؐ اپنے ہی قتل کی دعوت دے رہے تھے۔؟ اگر ایسا تھا تو کیوں؟

جو لوگ حضرت صالحؑ کے واقعہ کو تاریخی حیثیت نہیں دیتے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ آپؐ نے یہ قصہ گھڑ کر کیوں سنا دیا؟

ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتا، حقیقت وہی ہے جو بعد کی آیات میں بیان کردی گئی ہے کہ دشمنانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے اس تدبیر میں کوئی خوش خبری نہیں کیونکہ جن لوگوں نے حضرت صالحؑ کے خلاف یہ تدبیر اختیار کی تھی وہ کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ بلکہ تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ اس میں یہ لطیف تنبیہ بھی ہے کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے ایسی کوئی اسکیم بنائی بھی تو ہرگز کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ یہ ایک چیلنج تھا سردارانِ قریش کے لئے۔

بہرحال وہ وقت بھی آگیا جب مکہ کے مسلمانوں کو اجازت مل گئی۔ کہ یثرب یعنی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرجائیں قریش کو جب علم ہوا۔ تو انہوں نے اس میں مزاحمت کی چنانچہ اکثر لوگ چھپ کر مدینہ منورہ کی طرف نکل گئے۔ اور کچھ لوگ (جیسے حضرت عمرؓ) علانیہ چلے گئے۔ اب مکہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ باقی رہ گئے۔

قریش مکہ سمجھ گئے کہ اب خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عنقریب مدینہ منورہ چلے جائیں گے۔ جہاں سب مسلمان مجتمع ہوکر قریش کے لئے ایک زبردست خطرہ بن جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے دارالندوہ میں ایک خفیہ میٹنگ کی تاکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آخری فیصلہ کیا جاسکے۔

اس میٹنگ میں قریش کے تمام سردار شریک تھے۔ معاملہ پر غور کیا گیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ کسی شخص نے یہ تجویز رکھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زنجیروں میں جکڑ کر نظر بند کردیا جائے یہاں تک کہ آپؐ ختم ہوجائیں، میٹنگ میں ایک بوڑھے شخص نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ وسلم کے ساتھیوں کو بہرحال اس کا علم ہوجائے گا اور

دو یعنی آپ کو چھڑا لیں گے، اس طرح خونریزی بھی ہوگی۔ اور مقصد بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

دوسری تجویز یہ سامنے آئی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جلاوطن کر دیا جائے، پھر آپ کہیں جائیں اور کہیں رہیں کم از کم اہل مکہ کو تو اطمینان ہو جائے گا، لیکن اس بوڑھے نے اس تجویز کو بھی رد کر دیا۔ اور خبردار کیا کہ اس طرح تو خطرہ اور بھی بڑھ جائے گا کیونکہ آپ جہاں جائیں گے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو متاثر کر کے ایک بڑی جماعت اپنے حمایتیوں کی جمع کر لیں گے۔ اور حملہ کر کے قریش پر غالب آ جائیں گے۔

بالآخر ابوجہل نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر ہر قبیلے کا ایک ایک شخص لے لیا جائے جو بہادر اور دلیر ہو اور سب کو ایک ایک تیز تلوار دے دی جائے، یہ منتخب نوجوان مل کر ایک ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹوٹ پڑیں اور ایک ساتھ وار کر کے آپ کو ختم کر دیں اس طرح آپ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے گا اور عبد مناف (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلے کے لوگوں) کی سمجھ میں نہ آسکے گا کہ کیا کریں۔ (یعنی تنہا تمام قبائل کے خلاف لڑ نہیں سکیں گے۔ یا تو خاموش ہو جائیں گے یا پھر خوں بہا لینے پر راضی ہو جائیں گے جو تمام قبائل مل کر ادا کر دیں گے۔ اس طرح آسانی سے معاملہ ختم ہو جائے گا) اس تجویز کی اس بوڑھے شخص نے تائید کی اور سب نے اس پر اتفاق کر لیا کہ آنے والی رات کو آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا جائے اور رات میں حملہ کر کے قصہ تمام کر دیا جائے۔ اس کے بعد لوگ منتشر ہو گئے۔

دیکھ لیا آپ نے، کافی بحث و مباحثہ کے بعد بالآخر سب کو وہی تدبیر پسند آئی۔ اور سب نے اسی کو اختیار کیا۔ جو کئی سال پہلے بقول منکرین رسالت "خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم" نے بتائی تھی۔ [1]

کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ قریش اپنے منصوبہ میں ناکام نہ ہو جائیں۔ اسی لئے انتہائی کوشش یہی رہی ہوگی کہ یہ راز کھلنے نہ پائے۔ اور سب ہی شرکا نے اسے راز ہی رہنے دیا ہوگا۔ کیونکہ سب کا مقصد ایک ہی تھا اور سب کا "مفاد" اسی میں تھا

لیکن ہوا کیا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش کا علم ہو گیا۔ ادھر یہ لوگ یہ طے کر کے منتشر ہوئے اور ادھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آپؐ اکثر صبح یا شام کو حضرت صدیق رضؓ کے مکان پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ خلافِ وقت دوپہر کے وقت تشریف لانے پر حضرت ابوبکر رضؓ سمجھ گئے کہ کوئی خاص بات ہے۔ آپؐ نے سارا واقعہ بتا دیا۔ حضرت صدیق رضؓ کو انتہائی مسرت ہوئی کہ آپؐ کے ساتھ ہجرت کا شرف انہیں حاصل ہوگا۔ اس امید پر ہی انہوں نے پہلے سے دو اونٹنیاں تیار کر لی تھیں۔ چنانچہ تمام انتظامات مکمل

---

[1] مولانا عثمانی رح فوائد میں لکھتے ہیں:۔ مکہ میں بھی کافروں کے نو سردار تھے۔ جو ہمہ وقت اسلام کی بیخ کنی اور پیغمبرؐ کی دشمنی میں ساعی رہتے تھے۔ بعض مفسرین نے ان کے نام لکھے ہیں۔ (حواشی المحلی)

کر لئے گئے۔ اور یہ طے ہوا کہ اگلے دن تڑکے میں مکہ سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان واپس تشریف لے آئے۔

ادھر رات کا اندھیرا ہونے ہی فتنی پر اسو نوجوانانِ قریش نے آپؐ کے مکان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو ہدایت فرمائی کہ اس رات وہ آپؐ کے بستر پر سو جائیں، صبح کو قریش کو وہ تمام امانتیں واپس کر دیں۔ جو انہوں نے آپ کے پاس رکھی تھیں اس کے بعد نہایت اطمینان سے مدینہ چلے آئیں۔

اس کے بعد سحر ہونے سے پہلے آپؐ باہر تشریف لائے، اپنی مٹھی میں کچھ خاک لی۔ اور ان نوجوانوں کے سروں پر ڈالتے تھے۔ اور سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات پڑھتے ہوئے جن میں یہ آیات بھی ہیں۔

ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے: اور ایک دیوار ان کے پیچھے، ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے، انہیں اب کچھ نہیں سوجھتا (۳۶/۹)

ان ہی کے درمیان سے گزرتے ہوئے حسب قرار داد مکہ سے جنوب کی جانب تشریف لے گئے، حضرت ابو بکر صدیق رضؓ آپ کے ساتھ تھے، تین دن غار ثور میں آپؐ مقیم رہے۔ وہاں آپؐ کو مکہ کی خبریں اور کھانا وغیرہ حضرت ابو بکر رضؓ کے گھر والے پہنچاتے رہے۔

وہ نوجوان جو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں نہیں۔ اور حضرت علی رضؓ موجود ہیں۔ انہوں نے ظاہر ہے مکہ اور ارد گرد کا سارا علاقہ چھان مارا۔ لیکن کہیں سراغ نہ ملا۔ نشاناتِ قدم کے ماہرین نے انہیں غار ثور تک پہنچا دیا۔ لیکن جب انہوں نے غار کے منہ پر جالا تنا ہوا دیکھا تو یہ کہہ کر لوٹ گئے، کہ اگر اس میں آپؐ داخل ہوئے ہوتے تو یہ جالا نہ ہوتا۔ بالآخر مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ تین دن کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار ثور سے نکل آئے اور نہایت اطمینان کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

یہ تمام واقعات تفصیل کے ساتھ تمام سیرت اور حدیث کی کتابوں میں صحیح اسناد کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، خود قرآن میں بھی اہم اجزاء بیان کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً اسی قتل اور جلا وطن والی سازش کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد ہے۔

اور (اے پیغمبر!) وہ وقت یاد کر جب (مکہ) میں کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے، تاکہ تجھے گرفتار کر رکھیں، یا قتل کر ڈالیں، یا جلا وطن کر دیں۔ اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے۔ اور اللہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے (الانفال، ۸/۳۰)

اور غار ثور کے واقعہ کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کروگے تو (نہ کرو) اللہ نے اس کی مدد کی ہے اور اس وقت کی ہے جب کافروں نے اسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا۔ کہ صرف دو آدمی تھے) دو میں دوسرا (اللہ کا رسول) تھا۔ اور دونوں غار (ثور) میں چھپے بیٹھے تھے، اس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی سے کہا تھا "غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے" (وہ دشمنوں کو ہم پر قابو پانے نہ دے گا) پس اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا اور پھر ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنہیں تم نہیں دیکھتے، اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور (تم دیکھ رہے ہو کہ) اللہ ہی کی بات ہے۔ جس کے لئے بلندی ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے (التوبہ، ۹/۴۰)

آپ نے دیکھ لیا۔ بالآخر وہی ہوا جس کی پہلے ہی سے اطلاع دے دی گئی تھی۔ یعنی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد فرمائی۔ آپؐ کو بچا لیا اور آپؐ کے دشمن ناکام ہوئے!

اس پر بھی جو لوگ آپؐ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ ان باتوں کا کیا جواب دے سکیں گے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے سردار قتل کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے نہایت آسان تدبیر بتا دی اسے قبول اور پسند کر لیا گیا۔ انتظامات مکمل ہو گئے، آپؐ کے مکان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پھر کیا ہوا؟ کیا نوجوانوں کی جماعت وہاں سونے کے لئے جمع ہوئی تھی؟ پھر آپؐ ان کے درمیان سے کس طرح صحیح سلامت نکل گئے۔؟

نشان قدم کے ماہر غار ثور تک انہیں لے گئے، پھر اندر کیوں نہیں دیکھا؟ کیا اس لئے کہ مکڑی نے جالا تن دیا تھا؟ کیا اس مکڑی نے غار کے منہ پر جالا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تان دیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر کس نے انہیں اندر جانے سے روک دیا؟

کیوں سارے مکہ کے لوگ آپؐ کا سراغ لگانے میں ناکام ہو گئے اور تھک کر بیٹھ گئے جب کہ ان کے مستقبل کا دارومدار اسی معاملہ پر تھا؟ یہ بات نہیں، اگر وہ سراغ لگا بھی لیتے تو وہی ہوتا جو ہوا۔ اس کا ثبوت، اس کا اپنا بیان سنیئے۔ جس نے سراغ لگایا۔ آپؐ تک پہنچ بھی گیا، اسی کا بیان ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح مکہ سے نکل گئے۔ اور قریش آپ کو پا نہ سکے تو:۔

ہمارے پاس کفار قریش کے قاصد یہ پیام لے کر آئے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کو قتل کرے یا قید کرے تو اس کو ان میں سے ہر ایک کے عوض میں ایک دیت کی برابر مال ملے گا[1] یہ (یعنی سراقہ بن مالک) کہتے ہیں کہ

[1] یعنی سو اونٹ

ابھی کچھ دیر گذرنے نہ پائی تھی کہ میں اپنی قوم بنی مدلج میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص سامنے سے آیا اور کہنے لگا اے سراقہ دریا کے کنارے میں نے ابھی ابھی کچھ لوگ دیکھے ہیں۔ جن کے متعلق میرا غالب گمان یہی ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفیق ہوں گے۔ اس کے پتہ دینے پر میں سمجھ تو گیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی ہوں گے۔ مگر بات ٹالنے کے لئے میں نے اس سے کہہ دیا وہ بھلا کہاں ہوتے، شاید تو نے فلاں فلاں کو دیکھا ہوگا۔ پھر ذرا سا وقفہ دے کر میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے گھر جا کر اپنی باندی سے کہا کہ میرا گھوڑا باہر نکالے، وہ ایک ٹیلے کے پیچھے تھا۔ اور اس کو لے کر کھڑی رہے۔ ادھر میں اپنا نیزہ لے کر گھر کی پشت کی طرف سے نکلا۔ اور اس کی پھال زمین کی طرف کر دی اور اس کے اوپر کے حصہ کو نیچا کر دیا (تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے) یہاں تک کہ اپنے گھوڑے پر آکر سوار ہوگیا۔ اور اس کو تیز کر دیا۔ تاکہ وہ جلد ان کو جا پکڑے جب میں ان کے نزدیک جا پہنچا تو میرا گھوڑا دفعتہً پھسلا۔ اور میں اس کے اوپر سے جا پڑا۔ کھڑے ہو کر میں نے اپنی فال کے تیر نکالے اور ان کا پانسہ پھینکا۔ تاکہ یہ دیکھوں کہ میں ان کو نقصان پہنچا سکوں گا یا نہیں۔ دیکھا تو اس میں ایسی بات نکلی جس کو میں ناپسند کرتا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے نزدیک جا پہنچا جہاں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن پڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ آپ کسی طرف توجہ نہ فرماتے تھے، اور ابوبکرؓ بار بار مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ جب میں اتنا قریب جا پہنچا تو اس مرتبہ میرے گھوڑے کے دونوں ہاتھ زمین میں دھنس گئے۔ یہاں تک گھٹنوں تک جا پہنچے۔ اور پھر میں اس کی پشت کی طرف جا پڑا۔ میں پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کو اس زور سے ڈانٹا۔ مگر وہ اپنے ہاتھ زمین سے نہ نکال سکا پھر جب بمشکل وہ سیدھا کھڑا ہوا تو زمین سے دھوئیں کی طرح ایک غبار نکلا۔ میں نے پھر اپنے تیر گھمائے۔ مگر وہی بات نکلی جو مجھ کو پسند نہ تھی ـــــ

دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ اس نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سمجھ گیا۔ یہ آپ ہی کا کام ہے (یعنی گھوڑے کا دھنسانا) اب اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے اس مصیبت سے جس میں میں ہوں چھڑا دے۔ اور میں آپ کے لئے یہ کروں گا کہ جو شخص بھی میرے پیچھے آئے گا اس کو دھوکے میں ڈال کر راستہ نہ بتاؤں گا۔

پھر سراقہ وہاں سے لوٹا اور راستے میں جس سے بھی ملتا۔ سب کو وہیں سے واپس کر دیتا کہ جاؤ کچھ فکر کی ضرورت نہیں، وہ ادھر تو نہیں گئے۔ (بخاری و مسلم)

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سراقہ اس وقت ایمان نہیں لائے بلکہ دیکھتے رہے کہ بالآخر کون کامیاب ہوتا ہے، چنانچہ فتح مکہ کے بعد بخدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ [1]

---

[1] دیکھئے اسد الغابہ

اسی ایک واقعہ پر کیا منحصر ایسے بہت سے واقعات ہیں جب کہ آپؐ کے دشمن قتل کے ارادے سے متعدد بار آپ کے سامنے آگئے ہیں۔ لیکن ناکام ہی رہے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور دلچسپ واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

عُمیر بن وہب الجمحی قرشی کا ایک مشہور لیڈر تھا۔ جنگ بدر میں مشرکین مکہ کو شکست ہوئی تھی۔ جس میں ستر کے قریب قریش کے لوگ ہلاک ہوئے تھے، اور اتنے ہی قید ہو گئے تھے۔ ان قید ہونے والوں میں عمیر کا بیٹا تھا۔ اس واقعے کے بعد عمیر صفوان بن امیہ کے پاس حجر میں آکر بیٹھا۔ صفوان نے کہا: جنگ (بدر) کے مقتولین کے بعد ہماری زندگی پر تف ہے اس نے کہا بے شک اس کے بعد جینے کا کوئی مزا نہیں، اگر میرے ذمہ قرض نہ ہوتا جس کی ادائیگی کا میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے، تو میں جاکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دیتا۔ اگر تم میرے بچوں اور قرض کی طرف سے مجھ کو مطمئن کر دیتے تو میرے لئے ان سے اس وقت بہانہ کرنے کا ایک موقعہ بھی ہے۔ میں ان سے یہ کہوں گا کہ میں اپنے قیدی کا فدیہ دینے کے لئے آیا ہوں۔ اس کی اس بات سے صفوان بڑا خوش ہوا اور بولا کہ اچھا تیرا قرض میرے ذمہ ہے اور تیرے بچوں کے سب اخراجات میرے بچوں کے برابر رہیں گے۔ صفوان نے اس کو سواری دی اور سب ساز و سامان کے ساتھ لیس کر دیا۔ اور حکم دیا کہ صفوان کی تلوار صیقل کر کے زہر میں بجھا دی جائے اب عمیر روانہ ہو گیا۔ مدینہ پہونچا اور مسجد شریف کے دروازے پر آکر اترا اور اپنی سواری باندھی اور تلوار لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھ لیا۔ جب کہ وہ انصار کی جماعت کے درمیان بیٹھے ہوئے کچھ گفتگو کر رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے فرمایا کہ یہ وہی کتا خدا کا دشمن اب تمہارے سامنے ہے جس نے جنگ بدر میں ہمارے درمیان جنگ کی سازش کی تھی اور لوگوں کو ہمارے خلاف ابھارا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس کے بعد پورا واقعہ بیان کیا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ آپؐ نے عمیر سے پوچھا تم کیوں آئے ہو؟ وہ بولا میرا ایک قیدی آپ کے پاس ہے۔ لہٰذا مجھ سے اس کا فدیہ قبول کریجئے۔ آخر آپ ہمارے قبیلہ و کنبہ ہی کے تو ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا تو تمہاری گردن میں یہ تلوار کیسی لٹک رہی ہے؟ عمیر نے کہا خدا تعالیٰ اس کا ستیاناس کرے۔ جنگ بدر ہی میں اس نے ہم کو کیا نفع دیا۔ جب میں اترا تو اس کو لٹکا ہوا بھول گیا۔ اور میری گردن میں لٹکی رہ گئی۔ آپؐ نے پھر پوچھا، اچھا سچ سچ بتاؤ کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا میں تو صرف اسی مقصد کے لئے آیا ہوں۔ کہ اپنے قیدی کا فدیہ دے دوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ بھلا تم نے حجر میں بیٹھ کر صفوان کے ساتھ کس معاملہ پر شرط باندھی تھی؟ اب وہ گھبرا اٹھا اور بولا میں نے تو کسی بات پر شرط نہیں باندھی تھی۔ آپؐ نے فرمایا اس بات پر کہ تم مجھے قتل کرو گے اور وہ تمہارے بچوں کے مصارف کا کفیل رہے گا اور تمہارا قرض ادا کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے اس ارادہ کے درمیان حائل ہے (تو مجھے قتل نہیں کر سکتا) یہ سن کر عمیر نے فوراً کلمۂ شہادت پڑھا۔ اور کہا بیشک آپ اللہ تعالیٰ

کے درمیان ہیں۔ ہم وحی اور تمام باتوں کی جو آسمان سے آپ کو بتائی جاتی ہیں۔ جھٹلایا کرتے تھے، لیکن یہ بات جو مجھ میں ملیجہ کر میرے اور شوال کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی خبر میرے اور اس کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ لہٰذا ضرور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو اس کی خبر دی ہے۔ [1]

ایک عمیر کیا چند سال کے اندر ہی سوئیتا عرب کے بچے بچے کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ ہی نے اپنا رسول بنایا ہے اور وہی آپ کی حفاظت فرما رہا ہے۔ لیکن آج تک ان "دانشوروں" کی سمجھ میں اتنی واضح بات نہیں آسکی۔۔۔ وہ "دانشور" جن کے ناموں کے ساتھ بہت سے خطابات اور ڈگریاں جڑی رہتی ہیں یعنی مستشرقین۔

ان کی منطق اور "تحقیق" یہ ہے کہ عربوں کا ایک معبود اللہ تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی عقائد سے متاثر ہوکر اور مشرکین مکہ کے عقائد کو ملا جلا کر ایک اللہ کا تصور پیش کیا۔ یعنی بقول ان مستشرقین کے اللہ واقعی کوئی ہستی نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن کا تراشیدہ معبود ہے۔

اسی قسم کی رائے ان تمام لوگوں کی ہے جو اللہ کے منکر ہیں۔ یہاں اس پر تفصیلی بحث مقصود نہیں۔ بلکہ صرف اتنا بتانا ہے کہ ان لوگوں کے خیال کے مطابق اگر واقعی اللہ کی ہستی ان تمام صفات کے ساتھ موجود نہیں تو کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر ایک موہوم ہستی پر بھروسہ کر کے ساری کائنات کو چیلنج دے دیا تھا کہ سب مل کر ہر ممکن کوشش کرلو۔ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے؟ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے؟

اور کیا یہی موہوم تراشیدہ ہستی ساری کائنات کے مقابلہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہی تھی؟ کیا یہ بات عقل میں آتی ہے؟ کیا کوئی غیر موجود ہستی اتنا بڑا چیلنج دے سکتی ہے۔۔۔؟ اگر نہیں تو پھر اس کے سوا کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کے خالق و فرماں روا ہی نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ چیلنج دیا تھا کہ ساری کائنات کی طاقتیں مل کر بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کچھ نہیں کر سکیں گی۔ کیونکہ پروردگار عالم آپ کی حفاظت فرمائے گا اور کامیاب کرے گا۔۔۔ اور یہی ہوا بھی۔۔۔

یہی وجہ ہے کہ لاکھ کوششوں کے باوجود نہ کفار قریش آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے میں کامیاب ہو سکے نہ یہودی جن کے سرداروں کو قتل کیا جا رہا تھا۔ جنہیں مدینہ سے نکالا جا رہا تھا۔ جو خود کو بہت جنگجو سمجھتے تھے اور جو اپنے انبیاء کو قتل کرنے میں بڑے بے باک تھے، یہاں کچھ نہ کر سکے۔

---

[1] دیکھئے، سیرت ابن اسحاق۔ نیز طبرانی (ترجمان السنہ ج ۴، ۲۲۵)

رسائل و مسائل

سورۂ مریم و انبیاء کی بعض آیتیں

(سید احمد قادری)

خط

ماہنامہ زندگی بابت ماہ شعبان ۱۴۰۱ھ مطابق جون ۱۹۸۱ء نظر سے گذرا۔ مولانا عنایت اللہ سبحانی اصلاحی کی کتاب علامہ حمید الدین فراہیؒ پر تبصرہ و تنقید کو پڑھا۔

مؤلفِ کتاب نے سورۂ مریم کی آیت "وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا" کی جو تاویل پیش کی ہے آپ نے اس سے اختلاف کر کے دوسرے قدیم مفسرین ہی کی رائے کو صحیح قرار دے کر اس کے حق میں دلائل فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ آپ کو اس بات کا حق ہے کہ جس تاویل پر آپ کو شرح صدر حاصل ہو جائے اسی کو لیں۔

آیت مذکورہ کی جو تاویل مولف کتاب نے پیش کی ہے وہ علامہ فراہیؒ اور صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تاویل ہے۔ ان کے علاوہ قدیم و جدید مفسرین کی رائے وہی ہے جو آپ نے بیان کی ہے۔ لیکن مولانا عنایت اللہ صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے دیگر مفسرین کی رائے کو ضعیف قرار دینے میں جو انداز اختیار کیا ہے اس کو انہی دو بزرگوں کی طرف منسوب کیا جانا چاہئے۔ علامہ فراہیؒ سے اس کا کوئی تعلق نہیں جوڑا جانا چاہئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا امین احسن صاحب نے مفسرین پر جو نقد یا بقول آپ کے طنز کیا ہے، قابل افسوس ہے کیونکہ آپ نے جو احادیث صحیحہ و ثابتہ پل صراط کے وجود اور بلا استثناء تمام لوگوں کے اس پر سے گذرنے کے ثبوت میں نقل کی ہیں ان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ان احادیث کی رو سے پل صراط کا وجود ثابت ہوتا ہے اور اس پر سے قیامت کے دن تمام انسانوں کا گزرنا بھی مسلم ہے۔

لیکن ایک بات قابل غور ہے، وہ یہ کہ ان تمام احادیث سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ قیامت کے دن جہنم پر پل صراط ہوگا اور سبھی انسانوں کو خواہ وہ نیک ہوں یا برے اس پر سے گذرنے کا حکم دیا جائے گا جو لوگ ہلکے پھلکے

صفات کے لحاظ سے تیز یا سست رفتار اس پر سے گذر جائیں گے۔ جو بدکار ہوں گے وہ جہنم میں گریں گے اس سے زیادہ کوئی بات
ان احادیث سے ثابت نہیں ہوتی۔

سورۂ مریم کی آیت مذکورہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ احادیث کے مفہوم سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی "واردہا" میں وارد لفظ
ورود سے اسم فاعل ہے۔ ورود کے معنی گھاٹ پر اترنے کے ہیں جہنم پر ورود کا مطلب جہنم میں داخل ہونا ہے۔ احادیث میں پل
کے اوپر سے گذرنے کے لئے لفظ "مرور" استعمال ہوا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے درمیان ظاہری مناسبت ہے اور معنوی
دونوں دو الگ الگ حقیقتوں پر دلالت کر رہے ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے مفہوم میں افراط و تفریط سے کم از کم ایک حقیقت کا انکار
لازم آتا ہے اور اگر ہم ورود کو اپنے حقیقی معنی سے ہٹا کر "مرور" کے معنی پہنا دیں تو آیات قرآنی کے محل اور نظم میں خلل واقع ہو جاتا ہے
اس لئے اعتدال کی راہ یہ ہے کہ ان دونوں کو دو الگ حقیقتیں تسلیم کر لیا جائے یعنی احادیث کی رو سے پل صراط کا وجود
اور اس پر سے تمام انسانوں کا گذرنا برحق مانا جائے اور آیت زیر بحث میں ضمیر خطاب کا مرجع انہی مجرمین کو مانا جائے جن
کا ذکر آیت ۶۶ سے شروع ہوا ہے اور آیت زیر بحث کے کئی آیات کے بعد ختم ہوتا ہے۔ اس تاویل کو ماننے سے اختلاف
بھی رفع ہو جائے گا اور احادیث کا انکار بھی لازم نہیں آئے گا۔ نیز آیات قرآنی کے نظم و محل میں بھی خلل واقع نہیں ہوتا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ کا ماقبل و مابعد سے ربط اور اس کا محل اختصار کے ساتھ بیان کیا
جائے تاکہ مذکورہ بالا تاویل کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:-

ویقول الانسان ءاذا ما مت	اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مر جاؤں گا
لسوف اخرج حیا ۰ اولا یذکر	تو پھر دوبارہ زندہ کر کے نکالا جاؤں گا؟ کیا
الانسان انا خلقناہ من قبل و	انسان کو یہ بات یاد نہیں ہے کہ ہم نے اسے اس
لم یک شیئا ۰ فوربک لنحشرنھم	سے قبل پیدا کیا حالانکہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں
والشیاطین ثم لنحضرنھم حول	تھا۔ پس تیرے رب کی قسم ہم ان کو اور شیاطین
جھنم جثیا ۰ ثم لننزعن من کل	کو جمع کریں گے پھر ہم ان کو دو زانو بیٹھے ہوئے
شیعۃ ایھم اشد علی الرحمٰن	جہنم کے گرد حاضر کریں گے۔ پھر ہم ہر گروہ میں
عتیا ۰ ثم لنحن اعلم بالذین	سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کریں گے جو
ھم اولی بھا صلیا ۰ وان منکم	رحمان کے ساتھ سب سے زیادہ سرکشی کرنے
الا واردھا کان علی ربک	والے ہیں۔ پھر ان کے جہنم میں پڑنے کے زیادہ حق دار

حتمًا مّقضيًّا ۝ ثمّ ننجّي الّذين اتّقوا ونذر الظّالمين فيها جثيًّا ۝

کون ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے تم میں سے ہر کسی کو اس (جہنم کے گھاٹ) پر اترنا ہے یہ تیرے رب کا حتمی فیصلہ ہے۔ پھر ہم متقین کو دور ہی رکھیں گے اور ظالموں کو اسی میں زانو بیٹھا چھوڑ دیں گے۔

(مریم: ۶۶-۷۲)

ان مذکورہ بالا آیات کے مخاطب کفار و مشرکین ہیں۔ آیت ۷۰ تک جو باتیں ان سے کہی گئی ہیں، غائب کے صیغے میں کہی گئی ہیں۔ غائب کا اسلوب عدم التفات پر دلالت کرتا ہے۔ گویا مخاطب اس قابل ہے ہی نہیں کہ ان سے بالمشافہ گفتگو کی جائے۔ آیت ۷۱ میں اچانک حاضر کا صیغہ استعمال کر کے مخاطب کیا گیا۔ انذار کی آیات میں خطاب کا اسلوب زجر و توبیخ، ملامت، دھمکی اور شدتِ عتاب پر دلالت کرتا ہے۔ گویا اب ان کو صاف اور دو ٹوک فیصلہ سنا دیا گیا کہ تم کو یقیناً جہنم میں جانا ہے۔ تم اس سے ہرگز بچ نہیں سکتے۔ یہ تمہارے رب کا قطعی اور اٹل فیصلہ ہے۔ اس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ یہ فیصلہ انہی لوگوں کو سنایا گیا ہے جن کا ذکر آیت ۶۸ میں کیا گیا ہے کہ "ہم ان کو اور شیاطین کو جمع کریں گے اور دو زانو بیٹھے جہنم کے گرد حاضر کریں گے"۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو جہنم کے گرد جمع کیا جائے گا وہی جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

یہاں ایک شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ آیت ۷۲ "ثمّ ننجّي الذين اتقوا" میں "ثمّ" ترتیب کے لیے آیا ہے اس لحاظ سے آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس ورود کے بعد متقین کو نجات ملے گی۔ لیکن یہ شبہہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہاں "ثمّ" ترتیب کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ اس کا محل وہی ہے جو "ثمّ لنحن اعلم بالذين هم اولی بها صليًّا" میں "ثمّ" کا ہے۔ یہ "ثمّ" وہاں کے حالات کا تنوع اور بیک وقت دو قسم کے لوگوں کے ساتھ جزا و سزا دینے کو ظاہر کر رہا ہے یعنی ایک طرف یہ مجرمین و معاندین کیفرِ کردار کو پہنچیں گے اور دوسری طرف متقین کو قیامت کے ہولناک مناظر اور تردد و پریشانی سے نجات ملے گی۔

دوسرے یہ کہ تنجیہ صرف نجات دینے کے معنے ہی میں نہیں آتا بلکہ دور رکھنے کے معنے میں بھی آتا ہے۔ اور اگر تنجیہ کو نجات دینے کے مفہوم میں لیا بھی جائے تو دور رکھنے کا مفہوم بھی اس میں شامل رہے گا اور نجات اس پریشانی اور تردد سے جس کی بنا پر وہاں نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔

نیز اگر آیت زیر بحث میں مخاطب تمام ہی انسانوں کو مانا جائے تو كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا کا

گویا بیجا اور بے محل معلوم ہوتا ہے۔ یہ اور اس قسم کا اسلوب ہمیشہ شدت عتاب ہی کے لیے آتا ہے۔ غور فرمائیں کہ تمام انسانوں بشمول انبیاء و رسل علیہم السلام کے بارے میں خداوند رحیم و کریم کی طرف سے اس قسم کی وعید اور عتاب یا قطعی اور اٹل فیصلہ سنانے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ یہ کون سا موقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قطعی اور طے شدہ فیصلے کا اعلان کرے۔ اس لحاظ سے بھی یہی بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آیت مذکورہ میں مخاطب انھیں مجرمین کو مانا جائے جن کا ذکر اس پورے سلسلۂ کلام میں چل رہا ہے تاکہ اس ٹکڑے کا محل بھی سمجھ میں آئے۔

اولئك عنها مبعدون لا يسمعون حسيسها الآیۃ پر بحث کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ "انھوں نے (مولانا اصلاحی صاحب) اس طرح کا تصور دیا ہے کہ اہل تقویٰ جہنم سے ایسے دور رکھے جائیں گے جیسے دوزخ پر کبھی ان کی نظر بھی نہ پڑے گی۔" انھوں نے نہ یہ بات کہی ہے اور نہ اس کا تصور دیا ہے کہ اہل تقویٰ کی جہنم پر نظر بھی نہ پڑے گی اور ایسا وہ کہہ بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ سورۂ اعراف آیت ۴۶ اور ۴۷ میں صراحت موجود ہے کہ اصحاب اعراف جنت و جہنم دونوں کا مشاہدہ کریں گے اور جنتیوں کو سلامتی و مبارکباد پیش کریں گے اور جہنمیوں کو زجر و ملامت کریں گے۔ رہا لا یسمعون حسیسها کے مفہوم کا سوال تو میں سمجھتا ہوں کہ مولانا امین احسن صاحب نے ٹھیک ہی سمجھا ہے۔ یقیناً جہنم کی ہوا مجرمین ہی کے لیے ہے۔ اہل تقویٰ سے اس کا نہ کوئی تعلق ہے اور نہ قرآنی آیات میں اس کی کوئی گنجائش ہی ہے۔

آپ نے اپنی بات کو مؤکد کرنے کے لیے "وبرزت الجحيم لمن يرى" اور "وجاى يومئذ بجهنم" سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے لیکن "وأُزلفتِ الجنّةُ للمُتّقين" کی طرف آپ کی نگاہ نہیں گئی۔ اگر "وبُرّزتِ الجحيم لِمَن يّرىٰ" میں "مَن" نیک و بد دونوں پر حاوی ہے تو "وأزلفت الجنة" سے کس بات کی طرف اشارہ ہے؟ اتنی واضح بات سے آپ کی نظر کیسے چوک گئی۔ ان دونوں آیتوں کو اپنے قول کے حق میں دلیل بنانے کا کیا تک ہے۔ ان دونوں آیتوں پر دوبارہ ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں کہ ان کا کیا محل ہے اور جہنم کن لوگوں کے لیے قریب لائی جائے گی؟ اگر دونوں موقعوں پر آپ مخاطب تمام انسانوں کو مانتے ہیں تو سورۂ شعراء آیت ۹۰-۹۱ ملاحظہ فرمائیں۔ "وأُزلفتِ الجنّةُ للمتقين ۝ وبُرّزتِ الجحيمُ لِلغاوين" ان صریح اور واضح آیات کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہنم نیکوکاروں اور بدکاروں کے لیے مشترکہ طور پر قریب لائی جائے گی۔

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے مفسرین کرام پر جو نقد کیا ہے اس سلسلے میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:-

"پل صراط کی بات مفسرین نے نہیں کہی ہے بلکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے "

بات اپنی جگہ درست ہے لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پل صراط پر سے تمام انسانوں کے گزرنے کی خبر بیان فرمائی ہے۔ یہ تو نہیں فرمایا ہے کہ پل صراط پر سے گذرنا اور جہنم پر ورود ایک بات ہے۔ ان دونوں کو گڈمڈ کرنے میں مفسرین نے یا تو قیاس سے کام لیا ہے، یا ضعیف تفسیری روایات پر اعتماد کیا ہے

آپ نے قسموں کے باب میں بھی مؤلف کتاب سے اختلاف کر کے تحریر فرمایا ہے کہ "تبصرہ نگار کو اس سے اتفاق نہیں کیونکہ مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ایک الجھن یا سوال کے متعدد جوابات دیے جا سکتے ہیں۔" یہاں تک تو بات ٹھیک ہے البتہ آپ کا یہ فرمانا کہ "اذہان مختلف ہوتے ہیں اس لیے کسی کو کسی جواب سے تشفی ہوتی ہے اور کسی کو کسی دوسرے سے۔ متعدد جوابات کو اضطراب قرار دینا صحیح نہیں ہے۔" محل نظر ہے۔ کیونکہ متعدد جوابات اگر بیک وقت کسی الجھن کو حل کرنے میں معاون ہوں تو بات درست ہے لیکن یہ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا کہ کسی کو کسی جواب سے تشفی ہوتی ہے اور کسی کو کسی دوسرے سے۔ کسی الجھن یا سوال کا جواب دینے میں اس بات کا ہرگز لحاظ نہیں کیا جاتا کہ ہر شخص لازما تشفی ہی حاصل کرے۔ تشفی اور عدم تشفی کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ مطلوب و مقصود جواب کا صحیح اور مدلل ہونا ہے دلائل و براہین کے باوجود اگر کسی کو تشفی نہیں ہوتی تو یہ جواب کے ضعف کی علامت نہیں بلکہ فہم کا قصور ہے۔

امام رازیؒ نے جو جوابات دیے ہیں ان میں سے کسی ایک پر بھی انہیں جزم حاصل نہیں تھا اسی لئے انھوں نے مختلف صورتیں پیش کر دیں لیکن ان میں سے صحیح اور راجح کون ہے اس پر کلام ہی نہیں کیا۔ عام لوگوں کو ایسے مواقع پر شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ پہلی تاویل صحیح مانی جائے کہ دوسری اس چیز کی تعبیر کے لئے مؤلف کتاب نے اضطراب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ چیز بہرحال مفسرین کے عجز کی علامت ہے۔ جہاں تک علامہ حمید الدین فراہیؒ کو جس بات پر شرح صدر حاصل ہوا اس کو پیش کرتے اور اسے دلائل و براہین سے ثابت بھی کرتے ہیں یہی بات دراصل مؤلف کتاب نے کہنی چاہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

"زندگی نو" کے ایڈیٹر کا پتہ

سید احمد قادری محلہ گھیر سیف الدین خاں۔ رام پور۔ یوپی۔

زندگی نو کے منیجر کا پتہ

۲۵ ۵ ۱۵ سوئی والان۔ نئی دہلی ۲

معروضات

ضمنی باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے میں ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ مجھے قدیم و جدید مفسرین کی تفسیر پر شرح صدر کیوں ہے۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ پل صراط کے وجود اور اس پر سے تمام انسانوں کے گزرنے کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، البتہ اس کا تعلق آپ کے نزدیک سورۂ مریم کی آیت وان منکم الا واردھا سے نہیں ہے۔ اس کی دلیل آپ نے یہ دی ہے کہ آیت میں "ورود" کا لفظ ہے اور احادیث میں لفظ "مرور"۔ آپ نے لکھا ہے:-

> "ورود" کے معنے 'گھاٹ پر اترنے' کے ہیں۔ جہنم پر ورود کا مطلب جہنم میں داخل ہونا ہے۔ احادیث میں پل کے اوپر سے گزرنے کے لیے لفظ "مرور" استعمال ہوا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے درمیان نہ ظاہری مناسبت ہے اور نہ معنوی۔ دونوں الگ الگ حقیقتوں پر دلالت کرتے ہیں۔"

یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ 'ورود' کے معنے گھاٹ پر اترنے کے ہیں لیکن اس آیت میں ورود کا مطلب جہنم میں داخل ہونا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ورود کے معنے صرف داخل ہونے کے نہیں ہیں، بلکہ پانی کے پاس صرف پہنچنے کے بھی ہیں، داخل ہونا اس لفظ کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ میں عربی لغات اور لغۃ القرآن کی لمبی بحث سے بچنے کے لیے قرآن کریم کی دو آیتیں پیش کرتا ہوں۔ سورۂ القصص میں ہے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ	اور جب وہ مدین کے کنوئیں پر پہنچا تو اس نے اس
عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ	پر لوگوں کی ایک بھیڑ دیکھی جو اپنے جانوروں کو پانی
يَسْقُونَ (۲۲)	پلا رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام مدین کے کنوئیں میں داخل ہوئے تھے اور نہ وہ لوگ پانی میں داخل تھے جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ اس لیے آیت زیر بحث میں قطعیت کے ساتھ یہ مطلب بتانا کہ "جہنم پر ورود کا مطلب جہنم میں داخل ہوتا ہے" صحیح نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ کسی جگہ سے مرور (گزرنے) کے لئے "ورود" لازم ہے جب تک کوئی شخص کسی جگہ وارد نہ ہو وہ وہاں سے گذر نہیں سکتا۔ وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو جہنم کے پاس پہنچنا اور پھر پل صراط سے گزرنا ہوگا" اب غور فرمایئے کہ پل صراط سے متعلق احادیث کا سورہ مریم کی اس آیت سے تعلق ہے یا نہیں؟ دوسری آیت سورہ یوسف میں ہے!

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا	اور ایک قافلہ آیا پھر اس نے اپنے وارد کو

وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰی دَلْوَهٗ — بھیجا اور اس نے کنوئیں میں اپنا ڈول ڈالا

اس آیت میں صراحت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جس کنوئیں میں ڈالے گئے تھے وہاں پہنچ کر "وارد" کنوئیں میں داخل نہیں ہوا بلکہ اس نے اس میں ڈول ڈالا۔ اس آیت میں "وارد" اس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جس کو قافلہ والے کسی چشمہ یا کنوئیں پر بھیج دیتے تھے تاکہ وہ پہلے سے پانی کا انتظام کرکے رکھے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آپ نے سورۂ مریم کی اس آیت اور احادیث صراط میں تطبیق دینے کی جو کوشش کی ہے وہ اس وقت صحیح ہوتی جب "وارد" کے معنے صرف داخل ہونے والے کے ہوتے۔

شاہ عبدالقادر دہلوی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہما اللہ نے سورۂ مریم کے اس فقرے کا یہ بالکل صحیح ترجمہ کیا ہے:— "اور کوئی نہیں تم میں جو نہ پہنچے گا اس پر"۔

سورۂ مریم کی آیات کے سیاق و سباق اور نظم آیات کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں عرض ہے کہ اس حقیر نے ان کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ سلسلہ کلام روک کر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو اس حقیقت پر متنبہ اور متوجہ کیا ہے کہ ہر شخص کو جہنم پر وارد ہونا ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلم۔ اس کی تائید پل صراط کی احادیث نبوی سے بھی ہوتی ہے اور صحابہ و تابعین کے اقوال سے بھی۔ آیت زیر بحث ان آیتوں میں ہے جن کے بارے میں صحیح احادیث بھی مروی ہیں ضعیف روایات بھی اور اقوال صحابہ بھی۔

اس حقیر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کیا صحابہ و تابعین بھی آیات کے محل، سیاق و سباق اور نظم و ربط سے ناواقف تھے؟ کیونکہ اس حقیر کے علم کی حد تک کسی صحابی و تابعی نے "اِنْ مِّنْكُمْ" کے ضمیر خطاب کو ان مجرمین کے ساتھ خاص نہیں کیا ہے جن کا ذکر اس آیت سے اوپر ہے، بلکہ سب نے اس خطاب کو تمام انسانوں کے لیے تسلیم کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پل صراط کی احادیث اور اقوال صحابہ کو نظر انداز کیے بغیر اس ضمیر خطاب کو صرف مجرمین کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اس حقیر نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ مجھے بھی علامہ حمید الدین فراہیؒ سے عقیدت ہے لیکن اتنی نہیں کہ صحیح احادیث اور اقوال صحابہ کو نظر انداز کر دوں۔

یہ عجیب بات ہے کہ آپ ایک طرف ضمیر خطاب کا مخاطب صرف مجرمین کو قرار دے رہے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تمام انسانوں کو پل صراط پر سے گزرنا ہوگا۔ آپ نے "ثُمَّ" اور "حَتْمًا مَّقْضِيًّا" کے بارے میں کسی دلیل کے بغیر جو باتیں لکھی ہیں ان پر کچھ لکھنا خواہ مخواہ کلام کو طویل کرنا ہے۔ جب "ورود" کے معنے صرف "دخول" کے نہیں تو تمام تاویلات لاحاصل ہیں۔

سورۃ الانبیاء کی آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳ کے بارے میں اس حقیر نے جو اصل بات لکھی ہے اس پر آپ نے بالکل توجہ نہیں کی۔ اس پوری بحث کو یہاں دہرانے کا رہے۔ آپ اس کو دوبارہ پڑھیں میں اس کا حاصل یہاں عرض کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ "اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ" اور لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا" کا تعلق جنت میں پہنچ جانے کے بعد ہے اس سے پہلے نہیں۔ کیونکہ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ (اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من بھائی نعمتوں میں رہیں گے) کا فقرہ اس کی واضح دلیل ہے من بھائی نعمتوں میں خلود، میدان قیامت میں نہیں بلکہ جنت میں ہوگا اور سورہ مریم میں جو بات کہی گئی ہے وہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے کی ہے، اس لئے سورہ الانبیاء کی آیتوں کو سورہ مریم کی زیر بحث آیت کے لئے دلیل بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے تو پل صراط کو مفسرین کا قول قرار دیدیا ہے اور تمام اہل ایمان کے جہنم سے گزرنے پر العیاذ باللہ پڑھ لیا ہے لیکن آپ کا معاملہ عجیب ہے آپ ایک طرف پل صراط سے تمام اہل ایمان کے گزرنے کے بھی قائل ہیں اور دوسری طرف سورۂ انبیاء میں اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ کی اس تفسیر کو بھی صحیح قرار دیتے ہیں جو مولانا امین احسن صاحب نے کی ہے۔ آپ نے غور نہیں کیا ہے کہ پل صراط پر سے گزرنے والے اہل ایمان کے لئے نہ جہنم کی ہوا روک دی جائے گی، نہ اس کی آہٹ بند ہوگی اور نہ اس پر کوئی پردہ ڈالا جائے گا۔ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنا ہولناک وقت ہوگا کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی اللھم سلم، سلم (اے اللہ جہنم سے بچالے، جہنم سے بچالے) کی دعاء مانگتے ہوئے پل صراط سے گزریں گے غالباً احادیث صراط اور سورہ مریم کی آیت میں تطبیق دینے کے جذبے نے آپ کو اس پر غور کرنے سے روک دیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے سورہ انبیاء کی آیت ۱۰۱ اور ۱۰۲ کی جو تفسیر کی ہے وہ اس لئے بھی صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے اس کو جنت میں داخل ہونے سے پہلے کا واقعہ سمجھ لیا ہے حالانکہ دونوں آیتیں جنت میں داخل ہونے کے بعد کی صورت حال واضح کر رہی ہیں ——— وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ٥ (اور بھڑکتی ہوئی دوزخ ہر دیکھنے والے پر ظاہر کر دی جائے گی) اور وَجِآْيْءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ (اور جہنم اس روز سامنے لے آئی جائے گی) کی آیتیں پیش کرتے وقت وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (اور جنت متقیوں کے قریب لے آئی جائے گی) میری نگاہ سے اوجھل نہ تھی لیکن مجھے تو صرف یہ دکھانا تھا کہ میدان حشر میں جہنم کا مشاہدہ اہل ایمان بھی کریں گے اس لئے وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ کو بیان کرنے کا موقع نہ تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے سورہ مریم کی زیر بحث آیتوں کی تفسیر میں ایک جگہ لکھا ہے:

"جہنم کی تو اہل تقویٰ کو ہوا تک نہ لگے گی اور بھڑکتا ہوا شعلہ بھی نہیں دیکھنے پائے گی۔"

(تدبر قرآن ج ۴ ص ۱۳۵)

کسی کو کسی چیز کی ہوا نہ لگنا اردو کا ایک محاورہ ہے جو کسی چیز کو کسی سے قطعی بچانے اور چھپائے رکھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے یہاں اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جہنم اہل تقویٰ سے اس طرح چھپا کر رکھی جائے گی کہ ان کی نظر بھی اس پر نہ پڑ سکے گی۔ ہم نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ مولانا اصلاحی صاحب اصحاب الاعراف کے بارے میں جو کچھ لکھ آئے ہیں وہ سورۂ جاثیہ کی زیر بحث دو آیتوں کی تفسیر میں ان کو یاد نہیں رہا۔ افسوس ہے کہ آپ اس تضاد کو محسوس نہیں کر سکے ہیں بلکہ خود اسی تضاد میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ کی آیت بھی ہم نے یہ دکھانے کے لئے پیش کی تھی کہ میدان حشر میں جہنم اہل تقویٰ سے چھپا کر نہیں رکھی جائے گی وہ بھی اسے دیکھیں گے "لمن یریٰ" میں "من" کو عام میں نے اپنی جی سے نہیں مانا ہے بلکہ مستند مفسرین قرآن نے اس کو عام تسلیم کیا ہے — ابن کثیرؒ نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے

ای اظہرت للناظرین فراٰھا الناس عیانا (ابن کثیر ج ۴)	یعنی وہ دیکھنے والوں کے لئے ظاہر کر دی جائے گی جس کو لوگ بچشم سر دیکھیں گے۔

تفسیر جلالین میں یہ ترجمہ ہے:۔

اظہرت النار المحرقة لکل راءٍ۔	جلانے والی آگ ہر دیکھنے والے کے لئے ظاہر کر دی جائے گی۔

شاہ عبدالقادر دہلوی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے:۔

"اور نکال ظاہر کر دیں دوزخ کو جو چاہے دیکھے۔"

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے حاشیۂ قرآن میں لکھا ہے:۔

یعنی دوزخ کو اس طرح منظر عام پر لائیں گے کہ ہر دیکھنے والا دیکھ سکے گا، کوئی آڑ، پہاڑ درمیان میں حائل نہیں رہے گا۔

اب اگر اس حقیر نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ قیامت کے میدان میں جہنم کو اہل تقویٰ بھی دیکھیں گے تو کون سی انوکھی بات لکھ دی ہے یہ قابل غور بات یہی ہے کہ اگر جہنم صرف اہل شرک و کفر کے لئے ظاہر کی جائے گی تو عموم کا صیغہ کیوں اختیار کیا گیا، یہاں بھی تو وبرزت الجحیم للطاغین یا للغاوین یا للمجرمین کہا جا سکتا تھا — سورہ شعراء میں وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ کی آیت کریمہ کا مطلب فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ

[illegible]کافرین ٥ کی آیت سے سمجھنا چاہیے۔ یہ مسلمانوں کو خطاب کرکے کہا گیا ہے —
اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کافروں کے علاوہ کوئی دوسرا اس میں داخل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے
کہ اصلاً وہ کافروں اور مشرکوں ہی کے لیے تیار کی گئی ہے اور وہ انہیں کا ابدی ٹھکانا ہے۔ اسی طرح وَبُرِّزَتِ
الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے سوا اسے اور کوئی نہ دیکھے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصلاً وہ
گمراہوں کے لئے ظاہر کی جائے گی تاکہ وہ اس میں داخل ہونے سے پہلے لرزہ براندام اور نیم جان ہو جائیں اور انہیں
ذلیل کرنے کے لئے ان سے سوالات کئے جائیں۔ اہل تقویٰ جو جہنم کا مشاہدہ کریں گے وہ ان کے جذبۂ شکر و سپاس
میں اضافہ کرے گا کہ اللہ نے کس خوفناک چیز سے انہیں بچا لیا اور جنت میں داخل ہونے سے پہلے ان کی مسرت میں اضافہ
کرے گا۔ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل تقویٰ کو جنت اور جہنم کا مشاہدہ ان کی قبروں میں بھی کرایا جائے گا
اور صحاح کی بعض روایتوں میں اہل شرک و کفر کے لئے بھی یہ کہا گیا ہے کہ ان کو بھی ان کی قبروں میں جہنم اور جنت کا مشاہدہ
کرایا جائے گا۔"

۲۔ قسم کے بارے میں امام رازی کے جوابات کی جو توجیہ اس حقیر نے کی ہے اسے آپ صحیح نہیں سمجھتے تو کیا حرج ہے اس
پر کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر میں عرض ہے کہ جس مدرسہ سے آپ نے میرے تبصرے پر طویل تبصرہ بھیجا ہے اس میں
آپ متعلم ہیں تو ان معروضات پر ضرور غور کریں اور اگر معلم ہیں جب بھی اپنے فہم قرآن کو اتنا بڑا درجہ دیجئے کہ دوسروں کا
فہم قرآن قابل غور بھی باقی نہ رہے۔

ریفرنڈم

پاکستان میں حالیہ ریفرنڈم کے سلسلے میں محترم نعیم صدیقی صاحب نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے:—
"جو حضرات پولنگ اسٹیشن پر الو بولنے کی پیشین گوئی کر رہے تھے انھوں نے جب سیکڑوں پاکستانی شاہبازوں
کی صفیریں سنیں تو ان کے اپنے دل و دماغ میں الو بولنے لگا۔ آج کوئی کہتا ہے کہ پولنگ ۱۵-۲۰٪ ہوئی
اور کسی کا زائچہ بتاتا ہے کہ ۵ پر ہوئی۔ دوسرا بتاتا ہے کہ جعلی ووٹ بھگتائے گئے۔ سوال
یہ ہے کہ اگر آپ ریفرنڈم کو ناکام بنانا چاہتے تھے تو شہری ذمہ داریوں کے تحت جرأت کر کے آپ نے
اپنے لوگوں سمیت جا کر "نہیں" کا ووٹ کیوں نہ ڈالا؟ اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا۔

MONTHLY Regd No. D.NO.-(DN)-348
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN R. NO.- 42893/84
NEW DELHI-110002 Feb 85

صرف ٹائٹل دہلی آرٹ پریس میں چھپا۔

ماہنامہ
زندگی نو
نئی دہلی ۲

زندگی نو

ماہنامہ — نئی دہلی

مُدیر: سید احمد قادری

زرِ تعاون

ہندوستان سے

سالانہ	۳۰/-
ششماہی	۱۵/-
فی پرچہ	۳/-

غیر ممالک سے بذریعہ ہوائی جہاز

عرب ممالک	سالانہ	۱۰۰/-
یورپین ممالک	"	۱۲۵/-
آسٹریلیا و امریکہ	"	۱۵۰/-

جلد ۴ | رجب ۱۴۰۵ھ مطابق اپریل ۱۹۸۵ء | شمارہ ۴

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے

جناب سید احمد عروج قادری، مدیر "زندگی نو" گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت پرنٹرز اینڈ پبلشرز کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵ سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۶۲۳۱۳ ، ۲۷۳۲۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سیّد احمد قادری)

اعظم گڑھ کے ایک مشہور و معروف ماہنامہ فروری ۵۸ء کے شذرات میں ہندستان کے حالات کا ایک مختصر تجزیہ شائع ہوا ہے اور اس کا یہ پیراگراف قیمتی اور اسلام کی صحیح ترجمانی ہے۔

"خاموشی، سکون، خلوت نشینی اور منفردانہ زندگی کا نام اسلام نہیں ہے۔ اسلام جد و جہد و سعی و عمل اور حرکت و سرگرمی کا نام ہے۔ وہ موت نہیں حیات ہے۔ وہ سرتاپا جہاد ہے لیکن خلوت میں بیٹھ کر نہیں بلکہ میدان میں نکل کر۔ یہ عمل ہے، ترک عمل نہیں ہے۔ ادائے واجبات ہے عدم واجبات نہیں، ادائے فرض ہے، احتراز فرض نہیں۔"

اگرچہ اس پیراگراف میں گوشہ نشینی اور منفردانہ زندگی اور اسی طرح ترک عمل کی تردید کی گئی ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اجتماعی زندگی کے معنی کیا ہیں، وہ کیسی ہونی چاہئے اور اس کا مقصد کیا ہونا چاہئے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمانوں کی ایک ملک گیر تنظیم موجود ہے، مسلم مجلس مشاورات بھی ایک وفاق کی حیثیت رکھتا ہے کچھ خانقاہوں کو چھوڑ کر ہمارے مسلمان میدان عمل میں ہیں۔ آخر کس بات کی ہے۔ یہ بھی واضح نہیں کیا گیا کہ عمل کیا ہو اور ادائے فرض کیا ہے؟ مقامی اور شہری پیمانہ پر کسی تنظیم و تشکیل کیلئے بھی سب کا ایک مقصد پر متحد ہونا ضروری ہے۔ کیا مسلمان شہری پیمانہ کی تشکیل کے کسی ایک مقصد پر متحد ہیں؟

راستے سب کے جدا، منزل الگ — پھر کوئی کارواں کہنا غلط

مدیر محترم نے جس پیراگراف میں اسلام کی ترجمانی کی ہے۔ اگر آئندہ وہ اس کی تشریح کردیں تو بہتر ہوگا۔

لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات ہو گئے، وزارتیں بن گئیں لیکن اس سے ملک کے حالات میں تبدیلی کی کوئی توقع ہے؟ کیا کرپشن ختم یا کم ہو جائے گا؟ کیا لوٹ مار اور قتل و غارت میں کمی آجائے گی؟ کیا ارتداد کا طوفان جو ملک کو گھیرے میں لے رہا ہے، ختم ہو جائے گا؟ کیا مسلمانوں کے تشخص کو تسلیم کر لیا جائے گا؟ کیا ہوش ربا مہنگائی ختم ہو جائے گی؟ کیا رشوت کا بازار سرد پڑ جائے گا؟ کیا دولت، عزت، اور جاہ و منصب کے پیچھے لوگ دوڑنا چھوڑ دیں گے؟ ان انتخابات سے آخر عوام کو کیا ملے گا؟ لوک سبھا میں کانگریس آئی کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی ہے۔ ابھی وزیر اعظم کے بیانات بھی کچھ اچھے آرہے ہیں لیکن کیا یہ صورت حال قائم رہے گی؟ اپنے کو مقبول بنانے کے لیے اچھے بیانات ایک وسیلہ کا کام دیتے ہیں اور جب قدم جم جاتے ہیں تو اصل صورت سامنے آجاتی ہے۔ یہ حالات ہمارے لیے مایوس کن نہیں ہیں۔

یا گ ہے حالات کی قدرت کے ہاتھوں میں ترنج   اٹھو، کمر کس کیوں جہاں کے حال سے نوامید ہے

اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کا ہمیں مکلف بنایا ہے وہ آخری دم تک ہمیں انجام دینا ہے۔ اگر ہم نے یہ کر لیا تو کامیاب ہو گئے۔ اسلام کے لیے کام کرنے والوں کے لیے اب وقت پہلے سے زیادہ مشکل آگیا ہے۔

۳

پاکستان میں انتخابات آخر ہو ہی گئے۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ ایک بات یقینی ہے کہ انتخابات کی تاریخ میں یہ اپنے رنگ کا ایک نیا طریقہ انتخابات تھا۔ انگریزوں نے ہمیں جمہوریت کے جو معنے سمجھائے ہیں اور الکشن کا جو طریقہ بتایا اور عمل کر کے دکھایا ہے۔ اس پر عام طور سے مسلمانوں کو بھی اتنا یقین ہے کہ جمہوریت کا کوئی دوسرا معنے اور الکشن کا کوئی دوسرا طریقہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جناب ضیاء الحق کو یہ کریڈٹ ملنا چاہیے کہ وہ مغربی طریقۂ انتخاب پر یقین رکھنے والوں کی مخالفت و مزاحمت، نئے قسم کے انتخابات کرانے میں کامیاب ہو گئے اور عوام نے مخالفین کی رائے کو مسترد کر دیا۔ ان انتخابات کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ابھی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اگر یہ اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی کامیاب رہے تو شاید دوسرے ملکوں کے لیے بھی یہ ایک نمونہ بن جائیں۔ مغرب کے جن ذرائع ابلاغ نے ان انتخابات کی مخالفت کی تھی وہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ انتخابات غیر جانبدارانہ تھے۔ ان میں حکومت کی طرف سے نہ زور استعمال کیا گیا، نہ دھونس اور دھاندلی۔ اسی لیے اس کے متعدد وزرا انتخاب ہار گئے۔ ۲۳ مارچ کے بعد شاید یہ اندازہ لگ سکے کہ اپنے نتائج کے لحاظ سے انتخابات کامیاب رہے یا ناکام۔ ضیاء الحق صاحب نے صدر کی حیثیت سے اپنے اختیارات بڑھا لیے

اور [illegible] کے دستور کی چند دفعات ابھی معطل بھی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کا نتیجہ برا ہی نکلے، اچھا بھی نکل سکتا ہے۔ پیپلز پارٹی اور بالخصوص بھٹو خاندان جو کینسر کی طرح پورے پاکستان میں پھیل گیا تھا اس کی جڑیں اکھاڑ دی گئی ہیں اگرچہ وہ اپنی شرارت سے اب بھی باز نہیں آئیں گے لیکن توقع کرنی چاہیے کہ وہ ناکام ہی رہیں گے۔ پاکستانی جماعت کے دو نمایاں افراد کی ناکامی کی اصل وجہ دور سے بیٹھ کر ہم صحیح طور پر جان نہیں سکتے۔ اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عوام کو خوش نہیں رکھ سکے، یا انتخابات جیتنے کے لیے ان کے مخالفین نے جو تدبیریں اختیار کی ہونگی وہ انہیں اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اتنی بات اور ظاہر ہے کہ صرف ڈنڈے کے زور سے اسلامی شریعت صحیح طور پر نافذ نہیں ہو سکتی۔ صدر ضیاء کا فوجی ڈنڈا ہٹنے کے بعد کیا ہوگا؟ اسلامی شریعت سے دلچسپی اور محبت پیدا کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ ضیاء الحق صاحب کو اس میں کامیابی ہو اور وہاں اسلامی شریعت نافذ ہو جائے۔

انبیاء کرامؑ کی دعوت اسلامی کی تاریخ بتاتی ہے کہ اب شاید فوجی اقتدار ہی سے اسلام غالب ہو سکتا ہو انتخابات کے ذریعہ نہ کبھی اسلام غالب آیا ہے اور نہ اس زمانے میں اس کی کوئی توقع ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت قاہرہ سے باغیوں کو تباہ کر دیتا تھا، یا مومنین و مجرمین کے درمیان جنگ او رقتال سے اسلام غالب آتا تھا۔ اب مشیت ایزدی یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان فوجوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا کر دے اور ان کے ذریعہ اسلام غالب ہو۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا وہ ان ملکوں کے لیے ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور اقتدار انہیں کے ہاتھوں میں ہے۔

(۴)

ان دنوں ہمارے جدید تعلیم یافتہ خصوصیت کے ساتھ، تصوف کی طرف بہت متوجہ ہیں۔ ابھی پٹنہ اور علیگڈھ میں اس پر سیمینار منعقد ہو چکے ہیں۔ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر بیدار صاحب رامپوری بھی اس معاملہ میں بیدار ہیں۔ اگرچہ اس حقیر کو بھی موجودہ فلسفیانہ تصوف سے دلچسپی ہے مگر ناقد کی حیثیت سے۔ بحمد اللہ یہ دلچسپی نہ بے عملی کے جواز کے لیے ہے اور نہ اندھے پن کے ساتھ۔ بلکہ ایک ایسے ناقد کی حیثیت سے جو اس کی خوبیوں کا معترف بھی ہے اور اس کی ناخوبیوں پر معترض بھی۔ انسان کی عمر قلیل ہے اور موضوعات علمی کثیر ہیں۔ میں نے ان موضوعات کو جن کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ دین اسلام سے بلکہ اس کی اقامت سے ہے، سوچ سمجھ کر اپنے لیے منتخب کر لیا ہے۔ اس میں میرا کوئی قابل ذکر کارنامہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے

نے جو کچھ بھی صلاحیت عطا فرمائی ہے، میں اس کو اسی میں کھپا رہا ہوں اور دعا کرتا رہتا ہوں کہ آخر دم تک اسی میں لگا رہوں۔ تصوف پر جو سمینار پٹنہ اور علی گڑھ میں ہوا اور جس میں بڑے اور چھوٹے اعیان علم نے حصہ لیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ تصوف کے مخطوطات کی تلاش کر کے اس کی ایک مکمل اور مفصل فہرست تیار کی جائے۔ یہ ایک بڑا کام اور ایک اچھا علمی کام ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے اس کا بڑا فائدہ ہوگا کہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ ان میں امرت کتنا ہے اور زہر کتنا؟ دیکھا یہ جا رہا ہے کہ وہ لوگ جو تصوف کی کتابوں کی طرف متوجہ ہیں یا اس کی تحقیق کر رہے ہیں ان میں اکثر حضرات کا عملی تعلق تصوف سے کچھ بھی نہیں یا محض حقیر ہے، بس زیادہ سے زیادہ نماز روزے تک ۔۔۔ اس لیے یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اس کا محرک کیا ہے؟ علمی ورثہ کی محافظت یا کچھ اور؟ میں نیتوں پر حملہ نہیں کرتا لیکن قرائن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیکولرزم اور وحدت ادیان کو اگر تقویت مل سکتی ہے تو اسی فلسفیانہ تصوف سے۔ چنانچہ بعض اہل علم اس سے یہ کام لے بھی رہے ہیں۔ یونانی فلسفہ سے متاثر تصوف اور ہندوستانی ویدانت میں محض معمولی فرق ہے۔ مجرد عشق الٰہی اور اللہ کی ذات بحت (بے صفات ذات) تک رسائی دونوں ہی کی منزل مقصود ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس پر جو سمینار ہوا تھا اس میں پروفیسر مقبول احمد صاحب نے اپنے کلیدی خطبے میں یہ بجا فرمایا :۔

"اور تصوف زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک فلسفہ بھی ہے۔" (قومی آواز لکھنؤ ۲۶ فروری ۸۵ء)

یہ حقیر اتنا اضافہ کرتا ہے کہ مروجہ تصوف اصلاً فلسفہ ہی ہے۔ آیات قرآن کی معنوی تحریفات اور موضوع احادیث کا اس میں پیوند لگا دیا گیا ہے۔ شہاب الدین مقتول نے انصاف کے ساتھ یونانی فلاسفہ کو اپنا استاذ اور گرو تسلیم کیا ہے۔ ہندو دین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسین رضوی نے بھی صحیح کہا کہ :۔

"علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کا ادراک ہمیں تصوف کے مطالعہ سے ملتا ہے اس سلسلے میں جملہ رموز کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔"

قرآن کریم کی ان اصطلاحات کو تصوف میں کیا بنا دیا گیا ہے اس پر گفتگو کا یہ موقع نہیں۔

۵

"زندگی نو" اقامت دین کا نقیب ہے۔ یہ ایک دینی اور علمی ماہنامہ ہے۔ اس کا حقیر مدیر اپنی معمولی صلاحیت کے مطابق کوشش کرتا ہے کہ اس کا علمی ولسانی معیار حتی الوسع گرنے نہ پائے۔ عام سطحی رجحان کی رعایت

سے اس میں بہت سی عام فہم چیزیں بھی شائع کر دی جاتی ہیں مگر ان کی بھی ایک حد ہے۔

زندگی اور اب زندگی نو کے قارئین میں وہ اہل علم جو جماعت اسلامی ہند کے نصب العین اور اس کے طریقہ کار سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ایسے مضامین بھی بھیجتے رہتے ہیں جن پر پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان پر کتابیں بھی موجود ہیں۔ ہم ایسے مضامین شائع نہیں کرتے۔ لیکن میری اس معذوری کو وہ تسلیم نہیں کرتے اور خفا ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنا کوئی ایسا مضمون بھی نہیں بھیجتے جو اس میں شائع ہو سکتا تھا۔ ملک میں جرائد بہت ہیں کہیں نہ کہیں ان کا مضمون شائع ہو ہی جاتا ہے اسی طرح بعض مضامین ایسے آتے ہیں جن کا مواد تو اچھا ہوتا ہے لیکن ترتیب اور زبان اچھی نہیں ہوتی اور مدیر کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ انہیں از سر نو مرتب کرے اور اس کی زبان ٹھیک کرے ایسے لوگ بھی خفا ہو جاتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہوتی ہے کہ اہل علم اپنی کتابیں بالاقساط زندگی میں شائع کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں اور قارئین عام طور سے ایسے مضامین سے گھبرا جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی خفا ہو جاتے ہیں۔ مدیر سوچتا ہے کہ وہ کیا کرے؟ مجبوراً اس کو خفگی ہی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ہر مدیر کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ جس مضمون کو مناسب سمجھے اسے شائع کرے اور نامناسب سمجھے تو شائع نہ کرے الا یہ کہ کسی وجہ سے اس کی اشاعت ضروری قرار پائے۔ جماعت اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم سے میری درخواست ہے کہ:۔

(۱) وہ اتنے طویل مقالے نہ بھیجیں جو تین قسطوں سے بھی آگے بڑھ جائیں۔ ہم بالاقساط والے مضامین کو آٹھ صفحات سے زیادہ نہیں دیتے۔ (۲) جن موضوعات پر مضامین بہت نکل چکے ہیں اور ان پر کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، ان پر مضامین نہ بھیجیں مثلاً اقامت دین۔ طاغوت۔ عبادت، الا یہ کہ ان موضوعات پر کوئی خاص تحقیق پیش کی گئی ہو۔

(۳) وہ کوشش کریں کہ ان کا مضمون ایک ہی اشاعت میں شائع ہو جائے۔ ایسے مضامین کو ہم دس پندرہ صفحات تک دینے کے لیے تیار ہیں۔ (۴) ماہنامہ زندگی نو کے علمی و دینی معیار اور اس کی زبان و ترتیب کا خیال رکھیں

(بقیہ صفحہ ۳۲) پروگرام ترتیب دیا جائے اور انھیں اس نصاب کے تحت تعلیم دی جائے جو اساتذہ اور اماموں کے لیے تیار کیا گیا ہو۔

۶۔ مندرجہ بالا خطوط پر کام کا جائزہ لینے کے لیے ایک نگراں کار کمیٹی مقرر کی جائے ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر کی تنظیموں کا بھرپور تعاون حاصل کیا جائے اور ہر مدرسہ کی انتظامیہ کو آمادہ کیا جائے کہ وہ خاص طور پر اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

ارشادِ رسول

ایک کفن جسم کا ایک کفن روح کا

(سید احمد قادری)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری کے جنازے میں شرکت کے لیے نکلے جب ہم لوگ قبر کے پاس پہنچے تو اس وقت تک لحد تیار نہیں ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے اور ہم لوگ بھی آپ کے ارد گرد اس طرح بیٹھ گئے جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ آپؐ کے دست مبارک میں ایک لکڑی تھی جس سے آپ زمین کرید رہے تھے (گویا آپ فکر مند تھے اور بحالت فکر لکڑی سے زمین کرید رہے تھے) پھر آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا "عذاب قبر سے اللہ کی پناہ مانگو" یہ آپ نے دو بار یا تین بار فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جب بندۂ مومن دنیا سے جدا اور عالم آخرت میں داخل ہو رہا ہوتا ہے (یعنی جب اس کی موت کا وقت بالکل قریب آجاتا ہے) تو اس پر آسمان سے فرشتے نازل ہوتے ہیں گورے چہرے والے جیسے ان کے چہرے آفتاب ہوں۔ ان کے ساتھ جنت کے کفنوں میں سے ایک کفن اور جنت کی خوشبوؤں[1] میں سے ایک خوشبو ہوتی ہے۔ وہ مرنے والے کے پاس تا حد نظر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آتے اور مرنے والے کے سر کے پاس بیٹھ کر کہتے ہیں اے اچھی روح جسم سے نکل کر اللہ کی مغفرت و رضوان کی طرف چل! آپ نے فرمایا، مومن کی روح جسم سے اس طرح نکل آتی ہے جس طرح مشکیزے سے پانی کا قطرہ نکل آتا ہے۔ ملک الموت اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں لیکن آسمان سے اترے ہوئے فرشتے پلک جھپکتے ان کے ہاتھ سے لے کر اس روح کو اس کفن اور خوشبو میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس روح سے مشک کی ایسی خوشبو پھیلتی ہے جس کی کوئی نظیر سطح زمین پر موجود نہیں ہے۔ پھر فرشتے اس روح کو لیکر آسمان کی طرف پرواز کرتے ہیں، وہ دوسرے فرشتوں کی جس جماعت کے پاس

---

[1] حدیث میں حنوط کا لفظ آیا ہے۔ حنوط ایک مرکب خوشبو کا نام ہے جو مردے کے جسم اور کفن میں لگائی جاتی تھی۔

سے بھی گزرتے ہیں وہ پوچھتے ہیں یہ اتنی اچھی روح کس کی ہے؟ وہ کہتے ہیں، یہ فلاں بن فلاں کی روح ہے۔ فرشتے اس کا سب سے اچھا نام جو دنیا میں لیا جاتا تھا وہی نام کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ فرشتے اس روح کو لے کر آسمانِ دنیا تک پہنچتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں، دروازہ اس روح کے لیے کھول دیا جاتا ہے پھر ساتویں آسمان تک آسمانِ دنیا کے مقرب فرشتے اس روح کی مشایعت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ فرشتے اس روح کو لیکر ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے کا اعمال نامہ علیین میں درج کرو اور اس کو زمین کی طرف واپس کرو۔ اس لیے کہ میں نے انسانوں کو زمین ہی سے پیدا کیا اور اسی میں ان کو داخل کروں گا اور اسی سے ان کو دوبارہ نکالوں گا۔ آپ نے فرمایا تو میت کی روح اس کے جسم میں داخل کر دی جاتی ہے اس کے بعد دو فرشتے آتے ہیں، اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں۔ مَن ربک؟ (تمہارا رب کون ہے؟) بندۂ مومن کہتا ہے رَبِّیَ اللہ (میرا رب اللہ ہے) وہ پھر پوچھتے ہیں۔ ما دینک (تمہارا دین کیا ہے؟) وہ کہتا ہے دینی الاسلام (میرا دین اسلام ہے) دونوں فرشتے تیسرا سوال کرتے ہیں۔ ما ہٰذا الرجل الذی بعث فیکم (اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو تم میں مبعوث کیا گیا) وہ کہتا ہے ہو رسول اللہ (وہ اللہ کے رسول ہیں) فرشتے پوچھتے ہیں۔ وما علمک (یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی) وہ کہتا ہے قرأت کتاب اللہ فآمنت بہ وصدقت (میں نے اللہ کی کتاب پڑھی تو ان پر ایمان لے آیا اور ان کی تصدیق کی) اس سوال و جواب کے بعد آسمان سے ایک منادی پکارتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا تو اس کی قبر میں جنت کا فرش بچھا دو، اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو۔ آپ نے فرمایا اس سے قبر میں جنت کی خوشبو آتی ہے پھر اس کی قبر تا حدِ نگاہ وسیع کر دی جاتی ہے۔ پھر ایک شخص آتا ہے حسین چہرے، عمدہ لباس اور اچھی مہک والا اور کہتا ہے تمہیں بشارت ہو اس چیز کی جس سے تمہیں مسرت ہوتی تھی۔ یہ تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا مومن کہتا ہے تم کون ہو، تمہارا چہرہ تو ایسے شخص کا چہرہ ہے جو خیر لاتا ہے وہ کہتا ہے۔ میں تمہارا عمل صالح ہوں یہ سنکر مومن کہتا ہے۔ اے میرے رب قیامت قائم کر دے۔ اے میرے رب قیامت قائم کر دے۔ اور آپ نے فرمایا اور بندہ کافر جب مرنے لگتا ہے تو آسمان سے کالے کلوٹے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ٹاٹ کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ یہ فرشتے بھی کثیر تعداد میں ہوتے ہیں وہ بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آتے ہیں اور کافر کے پاس بیٹھ کر کہتے ہیں۔ اے خبیث روح اللہ کے غضب کی طرف چل۔ روح کافر کے جسم میں پھیل جاتی ہے تو ملک الموت اس کو اس کے جسم سے اس طرح کھینچتے ہیں جس طرح بھیگے ہوئے اون سے سیخ کھینچی جاتی ہے (باقی ص۵۶ پر)

ہیں۔ اور فتنہ پیدا کرنے والوں کی علمی و ذہنی سطح بلند رہنے کے باوجود بھی ان کی سطح بلند ہیں
واصل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے دامن کا سرا ہاتھ سے چھوڑ دینے والے سبھی
ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ خواہ وہ عرب کے بادیہ نشین ہوں یا اسماء و صفات اور افعال الٰہی کے
معنوں کا درس دینے والے میوں صدی کے عارضہ دین الٰہی کے خالق ہوں یا بیسویں صدی کے "اسلام"
کے مصنف مشکوٰۃ نبوت سے جس قدر بُعد ہوتا چلا جاتا ہے تاریکیوں میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے

ومن لم یجعل اللہ لہٗ نورا فمالہٗ من نور

علامہ اقبال اس حقیقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اب مولانا علی میاں صاحب ایک طرف تو تفریق بین احکام اللہ کے فتنہ کو ہوا دیتے ہیں اور دوسری طرف "اعتقادی اور تہذیبی ارتداد" فکری اور اخلاقی انتشار" کا رونا روتے ہیں۔ "ردۃ ولا ابا بکر لھا" (فتنہ ارتداد ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ابوبکر نہیں) تصنیف فرماتے ہیں "ردۃ ولا ابا بکر لھا" کے متعلق مولانا یہ تفصیلات بتاتے اور اس کو اس طرح سراہتے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں ہمارے دوست سعید رمضان جو "المسلمون" رسالہ کو دمشق سے نکال رہے تھے ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے جرمنی چلے گئے۔ انھوں نے مجھ سے خواہش کی کہ ان کی غیر موجودگی میں "المسلمون" کا اداریہ میں لکھ دیا کروں۔ میں نے کئی مہینے اس کی تعمیل کی۔ اس سلسلے میں میرا پہلا مضمون "ردۃ جدیدۃ" کے عنوان سے تھا جس میں میں نے عالم اسلام میں ایک نئے قسم کے ارتداد کی نشان دہی کی یہ وہ ارتداد ہے جو مشرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی و تہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے اور سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہد رسالت سے لیکر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے۔ یہ دین لادینیت ہے، جو مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے بیشتر افراد کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے لیکن پچھلی ارتدادی تحریکوں اور رہبروں کے برخلاف اس ارتداد کی زد میں آنے والا اور ضروریات دین اور حقائق دین کا انکار کرنے والا کسی کلیسا یا مندر میں نہیں جاتا اور نہ تبدیلی مذہب کا خود اعلان کرتا ہے اور نہ اسلامی معاشرہ اس پر چونکتا ہے۔ اور اس سے فصل و انقطاع کا وہ معاملہ کرتا ہے جو مرتدین سابقین کے ساتھ کیا جاتا تھا

درحقیقت اس خیال کی بنیاد اور اس مسئلہ کی طرف توجہ فاضل گرامی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کے ایک مضمون سے ہوئی تھی میں نے یہ بنیادی تصور لیکر اس کو اس مضمون میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا، لادینیت کی عالمگیری اشاعت کا راز بھی بتایا۔ عالم اسلام میں اس کے اہم مظاہر کی بھی نقاب کشائی کی۔ پھر اس کے علاج کے طریقے، نئی طاقتور دعوت ایمان اور اس کے لیے نئے علمی اداروں کی ضرورت، نئے ذہنوں کو سامنے رکھ کر طاقتور لٹریچر کی تیاری پر زور دیا اور اس سنگین صورت حال کی تصویر کشی کی جس سے عالم اسلام دوچار ہے۔

یہ مضمون دو قسطوں میں ردۃ جدیدۃ اور دعوۃ جدیدۃ کے عنوان سے المسلمون میں شائع ہوا۔ بعد میں بھی ایک مستقل رسالہ کی شکل میں "ردۃ ولا ابابکر لھا" (فتنہ ارتداد ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ابوبکر نہیں) کے عنوان سے شائع ہوا جو مختلف وقتوں میں اور مختلف اداروں کی طرف سے ہزاروں ہزار کی تعداد میں طبع ہوا اور منی و عرفات تک میں اس کی تقسیم ہوئی، غالباً راقم کا کوئی مضمون، رسالہ، یا کتاب اتنی بڑی تعداد میں نہ شائع ہوئی نہ اثر انداز۔ اردو میں اس کا ترجمہ مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب مدیر "الفرقان" کے قلم سے "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" کے عنوان سے پہلے "الفرقان" پھر رسالہ کی شکل میں کئی بار شائع ہوا۔[1]

[1] اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ قابل ذکر ہے۔ غالباً ۱۹۶۴ء تھا۔ رابطہ کے اجلاس ہو رہے تھے۔ ہم لوگ رابطے کے مرکز (مکہ معظمہ) میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دروازے سے ایک شیعہ عالم داخل ہوئے۔ میں چونکہ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں اس لیے فوراً پہچان لیا کہ کوئی شیعہ مجتہد ہیں۔ مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم (جو کچھ دن ایران میں رہے تھے) بڑھے اور ان کا استقبال کر کے لائے اور ایک ایک سے تعارف کرانا شروع کیا۔ یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ یہ فلاں ہیں، فلاں ہیں۔ میری باری جب آئی تو انھوں نے کہا۔ ھذا الشیخ ابوالحسن ندوی، یہ نووارد زائر (آیت اللہ) روح اللہ خمینی صاحب تھے۔ میرا نام سنکر بولے۔ ہاں ہاں میں نے آپ کا رسالہ ردۃ ولا ابابکر لھا پڑھا ہے۔ میرے خیال میں تو اس کا نام ردۃ ولا اباحسن لھا ہونا چاہیے تھا (مراد حضرت علی ہیں) میں نے کہا جی نہیں۔ عربی کا یہ محاورہ نہیں ہے۔ عربی کا محاورہ ہے قضیۃ ولا اباحسن لھا (مشکل مسئلہ ہے

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

پھر ان کے ساتھ ساتھ حضرت صدیق اکبرؓ کا عظیم کارنامہ مولانا کی تقاریر کا محبوب موضوع بنا ہوا ہے جس پر مولانا انتہائی وجد کی حالت میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ تقریر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحریروں میں بھی جگہ جگہ حضرت صدیق رضؓ کے تاریخی جملہ "اینقص الدین وانا حی" کیا میرے جیتے جی دین میں قطع برید ہو سکتی ہے" کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ مگر حضرت صدیق رضؓ کو یہ سارا خراج عقیدت پیش کرتے رہنے کے باوجود مولانا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ اللہ کے دین سے فریضہ نہی عن المنکر کو دین سے خارج کر ڈالنا' اللہ کے دین میں "قطع و برید" ہے اور یہ کہ فریضہ نہی عن المنکر جسے مولانا دین سے خارج کر ڈالتے ہیں۔ اس کی اللہ کے دین میں زکوٰۃ کی اس بکری کے بچے سے کم اہمیت نہیں جس کے متعلق حضرت صدیق اکبرؓ کا یہ ارشاد قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے مینارۂ نور بنا رہے گا۔

واللہ لو منعونی عناقا کانوا	خدا کی قسم اگر انھوں نے مجھے ایک بکری کا بچہ
یودونہا الی رسول اللہ صلے	نہ دیا جو وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا
اللہ علیہ وسلم لقاتلتہم علی	کرتے تھے تو میں ان سے اسے روکنے پر ضرور
منعہا (مشکوٰۃ)	جنگ کروں گا۔

کیونکہ نہی عن المنکر ایسا اہم فریضہ ہے جس کی عدم ادائیگی کی سزا سخت عذاب مقرر کی گئی ہے اس کے حوالے اوپر گزر چکے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کا پورا فوجداری نظام ازالۂ منکر ہی کے ذیل میں آتا ہے اس لیے اس فریضہ کو دین سے خارج کر دینے کے نتیجہ میں اللہ و رسول کے وہ سارے احکام جو اجراء حدود اور تعزیرات کے سلسلے میں وارد ہوئے ہیں' دین سے خارج ہو جائیں گے۔ پھر نہ تو کسی اسلامی حکومت کو چور کا ہاتھ کاٹنے' زانی کو سنگسار کرنے یا کوڑے لگوانے کا اختیار باقی رہ جائے گا' نہ اسلامی تعزیرات کو عملاً نافذ کرنے کا۔ لیکن اپنی تصنیف "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" کے ایک دوسرے مقام پر مولانا علی میاں صاحب نے مولانا الیاس صاحب کے ذہن میں اسلامی تاریخ کے خلاصہ کی بنیاد پر اسلام کے غلبہ و اقتدار کو دین سے خارج کر ڈالا ہے۔ اس لیے حدود کے اجرا اور تعزیرات کے نفاذ کا اب سرے سے

(بقیہ حاشیہ) اور اس کے حل کے لیے حضرت ثانی نہیں ہیں) اس رسالہ کے لیے ردۃ ولا ابابکر لہا ہی کا عنوان موزوں تھا۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔

کاروان زندگی ص ۴۵۱ تا ۴۵۳

کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا ۔ [illegible] کہ مولانا علی میاں صاحب کے رفیق محترم مولانا منظور صاحب نعمانی کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے "سفر غزوات" اور "تبلیغی جماعت کے نکلنے کا موازنہ اور تبلیغی جماعت کے نکلنے کی سفر غزوات پر برتری ثابت کرتے ہوئے بیان فرمائی ہے ۔ یہ پورا اقتباس گذشتہ اوراق میں دیا جا چکا ہے ۔ یہاں اس کا صرف آخری جملہ دیا جا رہا ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

> مثلاً قتال میں شفاء غیظ اور اطفاء شعلۂ غضب کی صورت بھی ہے اور یہاں اللہ کے لیے کظم غیظ ہے اور اس کے دین کے لیے لوگوں کے قدموں میں پڑکے اور ان کی منتیں خوشامدیں کرکے بس ذلیل ہونا ہے [1]

اس مقام پر عقل یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہے کہ یہ جو مولانا علی میاں صاحب کی کتاب میں جگہ جگہ اعلاء کلمۃ اللہ کا تذکرہ آیا ہے تو لوگوں کے قدموں میں پڑکے اور ان کی منتیں خوشامدیں کرکے ذلیل ہونے والے حضرات آخر اللہ کے کلمہ کا اعلاء کس طرح کریں گے ؟

ذالک مبلغھم من العلم　　یہ ہے ان کا مبلغ علم

مانعین زکوٰۃ کے خلاف حضرت صدیق اکبرؓ کے اس سخت موقف اور اس پر پوری جماعت صحابہ کے اجماع نے اگرچہ قیامت کے لیے تفریق بین احکام اللہ کے فتنہ کا سد باب کر دیا تھا اور کسی شخص کے لیے بھی اس کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی کہ اس فتنہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کرے مگر مولانا علی میاں صاحب ایک طرف تو اس فتنہ کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسری طرف حضرت صدیق اکبرؓ کے کارنامے کو خوب خوب سراہتے ہیں لیکن انھیں اس کا ذرا بھی احساس بھی نہیں ہوتا کہ جس فتنہ کی حضرت صدیقؓ نے بالکلیہ بیخ کنی کر دی تھی ۔ اسی فتنہ کو ہوا دینے کا وہ خود باعث بنے ہوئے ہیں ۔

اسی طرح قرآن کے مطالعہ کا حاصل کبھی بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درمیان تفریق اور امتیاز نہیں رہا ۔ اس بات کے ثبوت میں متقدمین سے لیکر متاخرین تک کی کسی بھی تفسیر کو دیکھا جا سکتا ہے اور فی الواقع کسی صاحب ایمان کے لیے ایسا کرنے کی قطعاً کوئی گنجائش بھی نہ تھی ۔ کیونکہ اللہ کے سارے احکام کو بے چون و چرا برحق تسلیم کرنا ایمان باللہ کا ابتدائی تقاضا ہے

بہرحال یہ تو قرآن اور تفریق بین احکام اللہ کا معاملہ تھا ۔ اب قرآن اور مولانا علی میاں صاحب کے معاملہ کو لیجیے ۔ مولانا ایک طرف تو علی الاعلان قرآن کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور دوسری طرف حریف پر اپنے مطالعہ کتاب و سنت کی برتری ثابت کرنے اور حریف کا استخفاف کرنے کے لیے اس قسم کی تعلّی کرتے رہتے ہیں ۔

---

[1] ملفوظات مولانا محمد الیاس ؒ ص ۷۶

اس ردِ عمل کے اثرات (جو بعض اوقات خوردبین کے بغیر نہیں دیکھے جا سکتے) بہت سے ان اسلام پسند مصنفین اور داعیوں کی تحریروں میں نظر آتے ہیں، جن کو موجودہ مادی فلسفوں، مغربی سیاست و اقتدار کی کامیابی اور اپنے ملک کے مسلمانوں کی غیر منظم زندگی یا غلامی نے اسلام کے مطالعہ، صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور ان فلسفوں اور نظامہائے حیات کے متوازی اسلامی فلسفہ اور نظامِ حیات کے پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ ان کی تحریروں اور تعبیروں اور ان کے طریقِ فکر میں اس "ردِ عمل" کے عکس اور سائے اس شخص کو آسانی کے ساتھ نظر آ سکتے ہیں جس کو ماحول کے اور عمل و ردِ عمل کے سلسلہ سے آزاد ہو کر کتاب و سنت کے مطالعہ کا موقع ملا ہے پھر وہ ان جدید فلسفوں اور نظامہائے حیات کی آہنی گرفت اور جسم و جان میں پیوست ہو جانے والے اثرات سے بھی واقف ہے۔

ان جدید تحریروں اور اسلام و مسلمانوں کی جدید نشاۃِ ثانیہ کی کوششوں میں اور نائبینِ انبیا اور مجددین و مصلحین کی دعوت و فکر میں جن کو علمی و دینی رسوخ کی دولت یا ایمانی صحبت و تربیت کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ ایک واضح فرق محرکاتِ عمل اور مقاصد کا ہے۔ پہلے گروہ کی کوشش و فکر کا بڑا محرک حصولِ قوت و اقتدار یا غلبہ و عزت، اسلامی ریاست کا قیام اور حیاتِ انسانی کا نظم و سکون اور ثانی الذکر کا اصل محرک رضائے الٰہی کا حصول، آخرت کی کامیابی، ایمان و احتساب کا جذبہ اور اتباعِ نبوی و اعلائے کلمۃ اللہ کا شوق ہے اور انہیں جیسے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ○ (القصص - ۸۳)

وہ (جو) آخرت کا گھر (ہے) ہم نے اسے ان لوگوں کے لیے (تیار) کر رکھا ہے جو ملک میں فساد کا ارادہ نہیں کرتے اور انجام (نیک) تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔ [1]

مگر اس قسم کی تعلیل کرتے ہوئے مولانا کو اس بات کا شمہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا کہ منکشف نکتہ کی

[1] منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین ص

بنیاد پر اسلام ہی میں کتر بیونت کرنے کا جو کام ان کی تصنیف حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت بر سہا برس سے انجام دے رہی ہے۔ وہ کتاب و سنت کے سراسر خلاف ہے۔ مگر حریف کے سایہ نے مولانا کے دل و دماغ کو اتنا متاثر کر دیا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ نہ تو کسی بات پر غور کر پاتے ہیں، نہ کسی بات پر ٹک پاتے ہیں، نہ کسی موقف پر قائم رہ سکتے ہیں حتیٰ کہ جن چیزوں کے متعلق مولانا بیت ہزار بار اور پر اعتماد انداز میں بتاتے ہیں کہ وہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہیں کہ ایسا اہم فریضہ ہے کہ امت کی بعثت کا مقصد قرار دیا گیا ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ اس پر بھی قائم نہیں رہ سکتے اور یہ بلاشبہ ایک غیر متوازن کیفیت ہے جس میں ان کا قلم حدود و قیود سے آزاد ہو گیا ہے۔ اسی لیے وہ کشف و الہام اور وحی الٰہی، نبی اور مجدد کے حدود و اختیار میں امتیاز نہیں کر پاتے۔ ایک طرف تو کشف و الہام کی نامعلوم آوازوں کو "وسوسۂ شیطانی" بتاتے ہیں اور دوسری طرف کشف و الہام کی بنیاد پر "اصل دین" تصنیف کر ڈالتے ہیں۔ گزشتہ اوراق میں مولانا کی کتاب سے اقتباس آچکا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب بیسویں صدی میں اصل دین وہ نہیں رہ گیا جسے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ پیش کرتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ محض پلیٹ فارم بدل جانے سے تعبیر بدل جاتی ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کے منبر سے مولانا خطبہ دیتے ہیں تو کشف و الہام کی نامعلوم آوازوں کو وسوسۂ شیطانی قرار دیتے ہیں اور تبلیغی جماعت کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے کشف و الہام کی بنیاد پر ایک "اصل دین" تصنیف کر ڈالتے ہیں۔ پھر ایک طرف فرماتے ہیں:۔

> "یہاں ایک باریک بات سمجھ لینا چاہیے، وہ یہ کہ ایک نبی ہوتا ہے اور ایک مجدد اور مصلح ہوتا ہے نبی کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے اتباع کے بغیر نجات ہی نہیں ہو سکتی اور اس کی ہدایت حاصل کیے بغیر اللہ کی رضا اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس میں کسی قسم کی مداہنت یا تساہل کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن مجددین و مصلحین کا معاملہ یہ نہیں ہے۔

نوٹ:۔ اور دوسرا رخ آئندہ اشاعت میں ملاحظہ کیجیے۔

نہیں دیتا کیونکہ اسے یقینی طور پر علم ہے کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کا یہ جنون اسے تباہ کر دے گا۔ اسلام کسی ایک فرد کے تابع نہیں ہوتا کیونکہ اس کی نظر دیگر تمام افراد پر بھی ہے جو اس فرد کے عمل سے نقصان اٹھا سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ تمام افراد کا حق ہے کہ وہ نقصان سے محفوظ رہیں اور زندگی اطمینان سے بسر کریں۔ اسلام کسی ایک نسل کے خدمات کی پذیرائی بھی نہیں کرتا کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ اس نسل کے اعمال سے آئندہ نسلیں نقصان اٹھائیں گی۔

اسلام انسانیت کی گراوٹ میں انسان کا ساتھ نہیں دیتا کیونکہ اس کے نقطہ نظر کے مطابق مقصد انسانیت رفعت و ارتقاء ہے۔ گراوٹ اور پستی نہیں ہے۔ یہ بھی ایک انسانی حقیقت ہے جو عقیدے سے جدا رہ کر بھی ثابت ہو چکی ہے۔ اسلام صرف حیاتیاتی عمل کی انجام دہی کو کافی نہیں گردانتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ صرف حیاتیاتی کردار سے جدا گانہ شے ہے اور زندگی کو حیاتیاتی لحاظ سے۔ بہر حال حسن کی ضرورت نہیں ہے مگر پھر بھی حسن زندگی میں ایک پسندیدہ شے ہے۔

اسلام پسند نہیں کرتا کہ انسانیت پستی و انحطاط کے ایسے مقام پر آجائے جہاں تمام انسانوں کے عمل باہم مشابہ ہو جائیں اور سب کے سب خالص جبلی وظائف کی انجام دہی میں مصروف ہو جائیں کیونکہ اسلام اس حقیقت سے باخبر ہے کہ لوگوں میں جذبات و میلانات کا بھی تفاوت اسی طرح ہوتا ہے۔ قوت، قدرت، عقلمندی اور دولت مندی میں تفاوت و فرق ہے اور انسانیت کا یہ تنوع اور اس کی بوقلمونی قانون زندگی اور مقصد حیات ہے اور اگر انسانیت پستی و انحطاط کا شکار ہو جاتا تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

غرض اسلام بآن واحد تمام مقاصد زندگی کی تکمیل پر انسانیت کو بغیر کسی جبر کے آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ جب وہ جنسی میلان کو استمرار نسل کے لیے ضروری خیال کرتا ہے تو لوگوں کو اس میلان کی تکمیل کی اجازت بھی دیتا ہے اور جب وہ اس میلان کی تکمیل کی اجازت بھی دیتا ہے اور جب وہ اس میلان کی تکمیل کے طریقوں کو پاکیزہ اور شائستہ بناتا ہے تو وہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتا ہے کہ مقصد زندگی ارتفاع ہے اور انسان کو اس ارتفاع پر قدرت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اسلام انسان پر نہ تو نا روا بوجھ مسلط کرتا ہے اور نہ اسے رہبانیت کی دعوت دیتا ہے بلکہ رہبانیت اور ترک دنیا کو مذہبی فرائض کی ادائیگی سے کوتاہی خیال کرتا ہے۔

(اسلام اور جدید افکار ص ۳۸۷ تا ۳۹۰)

ان اجتماعی اصولوں کو مد نظر رکھ کر اسلام اپنے معاشرتی نظام کو اس طرح توازن کے ساتھ مرتب

کرتا ہے کہ اس میں مرد اور عورت دونوں کی آزادی اور مساوی درجہ کا پورا پورا تحفظ ہو جاتا ہے اور اس ماحول میں دونوں کی شخصی اور صنفی صلاحیتوں کا بھرپور ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ انسان کی معاشرتی تاریخ کا غائر مطالعہ بتاتا ہے کہ ابھی تک انسان نے جتنے معاشرتی نظام بھی مرتب کیے ہیں۔ ان میں ہمیشہ نقصان عورت ہی کو اٹھانا پڑا ہے اس کی انفرادی حیثیت کا انکار کیا گیا۔ اسے غلام اور شودر کے مقام پر پہنچا دیا گیا۔ اس کی زندگی کو بے قیمت بنا کے رکھ دیا گیا۔ اسے شوہر کے ساتھ زندہ جلا ڈالا گیا۔ شوہر کی پوجا کرنا اس کا فرض قرار پایا۔ مرد کی جنسی بھوک کی بارگاہ پر بھینٹ چڑھایا گیا۔ دوکان اور مکان کی طرح کرائے پر چلایا گیا۔ اس پر خوف و ہراس مسلط کر کے اس کی شخصیت کو کچلا گیا۔ پیدا ہوتے ہی اسے قتل کیا گیا۔ ہر طرح اس کا جنسی استحصال ہوتا رہا اور اسے کبھی آزادی اور سکون کا ایک سانس بھی نصیب نہیں ہونے دیا گیا۔ اور حالات سے مجبور ہو کر اسے اپنی قسمت پر شاکر ہونا پڑا۔ اس غرض کے لیے سب سے زیادہ مذہب کو استعمال کیا گیا کبھی سیاسی مصالح اس کا سبب بنے اور کبھی سماجی ضرورتوں کا سہارا لیا گیا۔ تاریخ انسانی میں ہمیشہ مردوں کے ہاتھوں عورت کا یہ استحصال اس بات کی علامت ہے کہ مرد ہمیشہ طاقتور اور جارح رہا ہے اور اس لیے اس نے ہمیشہ استحصال کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ رہی ہے کہ ابھی تک سارے نظام مردوں ہی نے مرتب کیے ہیں اور اس لیے انھوں نے ہمیشہ معاشرے کی تشکیل کرتے وقت اپنے مفادات اور صنفی تقاضوں کو اس طور پر اولیت کا مقام دیا ہے کہ ان کے پیش نظر عورت صرف ان کی ضرورت کا محض وسیلہ بنکر رہ گئی۔ بیسویں صدی میں ضرور یورپ کے زیر اثر اور اس کے پروپیگنڈے کی وجہ سے عورت کی آزادی اور مساوات کا شور سنائی دینے لگا ہے۔ لیکن اس شور میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی مرد کی اپنی چالاکی اور مکاری اپنا کام پوری طرح کر گئی ہے اور عورت کا انجام ماضی سے بھی بدتر ہو کر رہ گیا ہے۔

یورپ کی جدید معاشرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آزادی اور مساوات کے پاکیزہ شیشوں میں تریاق کے بجائے زہر ہلاہل انڈیل دیا ہے اور نادان عورت اس زہر کو تریاق سمجھ کر جام کے جام لنڈھا رہی ہے اور آزادی و مساوات کے نشہ سے بدمست ہو کر سب کچھ بھول چکی ہے اور اس زہر نے اس کی نسوانیت کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یورپ نے عورت کو جو کچھ دینے کا شور مچایا تھا وہ تو اس نے عورت کو آج تک نہیں دیا مگر اسے نسوانیت سے محروم کر کے عورت اور مرد کے درمیان کی ایک ایسی مخلوق بنا دیا ہے جو اعضاء کے اعتبار سے تو عورت معلوم ہوتی ہے مگر کردار میں اپنے آپ کو مرد ثابت کرتی رہتی ہے وہ اس کشمکش میں بے دم ہو چکی ہے مگر آزادی اور مساوات

کی خراب پھر بھی اپنا اثر دکھا رہی ہے اور ابھی تک اسے اپنی ذات کا ہوش نہیں آسکا ہے۔ کیونکہ
خواب سے بیدار ہوتا ہے کبھی محکوم اگر　　　پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
حالانکہ ان حالات کے نتیجہ میں مغرب جنسی انارکی کی لعنت میں تو مبتلا ہو کر رہ گیا ہے۔ ساتھ ہی "مرد بیکار و زن تہی آغوش" کی لعنت بھی اس پر مسلط ہو چکی ہے۔ حیرت ناک بات تو یہ ہے کہ مغربی پروپیگنڈے نے عورت کو اس حد تک مسحور کر دیا ہے کہ وہ اس قابل بھی نہیں رہی کہ اپنی فطرت کو سمجھ سکے اور اس فریب میں مبتلا نہ ہو جو مغربی فلاسفر اسے دے رہے ہیں۔ کیا اس ظلم کی بھی کوئی انتہا ہے کہ ایک طرف قدرت بقاء نسل انسانی کا فریضہ ادا کرتی رہے۔ مرد کے لیے اولاد پیدا کرے اور کامل نو ماہ اس بوجھ کو سہارتی رہے۔ پھر وضع حمل کے بعد اپنی قوتوں کو مجتمع بھی کرے اور بچہ کو دو سال تک دودھ بھی پلاتی رہے اور اس کے بعد پھر اپنے اس فطری وظیفہ میں منہمک ہو جائے ساتھ ہی پہلے بچے کی تعلیم و تربیت کی فکر بھی رکھے۔ اس ہمہ گیر فرض کی ادائیگی کے بعد بھی مرد اس کی معاش کی ذمہ داری بھی نہ لے اور اس میدان میں بھی اسے مرد کے ساتھ دوڑنا پڑے۔ وہ سیاسی و سماجی معاملات میں مصروف رہے۔ دوکان یا تماشا و پارکوں میں اس کی نظر بازیوں کے موجود رہے۔ اس کو شراب نوشی کرا کے بدمست کرے اس کا دل بہلانے کے لیے نمائش میں مصروف ہو اور اس کی شہوانی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہمہ تن آمادہ تیار رہے پھر مرد اپنے کارناموں کے نتائج کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے بھی تیار نہ ہو اور اس کو قتل اولاد پر آمادہ کرنے کے لیے نت نئے طریقوں کی تعلیم دیتا رہے[1]

اس طرح ماضی ہی میں نہیں بلکہ دور جدید میں بھی ترقی پسندی کے نام پر عورت کا بدترین حد تک جنسی استحصال کیا جا رہا ہے۔ اس غریب کا استحصال ماضی میں ہوتا ہی رہا تھا۔ دور جدید کی علمی و فکری اور سائنسی ترقی بھی اس کو استحصال سے محفوظ رکھنے میں ناکام ہو چکی ہے۔

اس معاملے میں اسلامی معاشرت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کو وضع کرنے والا نہ مرد ہے اور نہ عورت اس لیے ان دونوں میں سے کسی نے سارے تحفظات صرف اپنے لیے مخصوص نہیں کیے ہیں بلکہ اس کے برخلاف اس کا واضع وہ خداوند قدوس ہے جو نہ صرف کائنات بلکہ خود انسان کا بھی خالق ہے اور ان دونوں صنفوں کی تخلیق بھی جس کے منصوبے کے تحت ہوتی ہے۔ اس لیے اس معاشرے میں نہ مرد کا استحصال ممکن ہے اور نہ عورت کا۔ پھر جس خدا نے عورت اور مرد کے جسمانی اعضاء اور ان کی ذہنی و نفسیاتی صلاحیتوں کو پیدا کیا ہے وہ ان کے نازک ترین معاملات اور مسائل سے اچھی طرح واقف ہے اس لیے اس نظام میں ان سب کی رعایت بھی ملحوظ رکھی

---

[1] اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ۔ ص ۱۰۲

گئی ہے

اسلامی معاشرت کا بنیادی مقصد عورت اور مرد کی شخصیت کا کامل ارتقاء ہے۔ شخصیت کے اس ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں ان دونوں صنفوں کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے جہاں کامل یکسوئی کے ساتھ اپنی تعمیر میں مصروف رہیں۔ ایسے ماحول کے لیے ضروری ہے کہ نظام معاشرت کی تشکیل اس طور پر کی جائے کہ دونوں خوف و وحشت کے ماحول سے محفوظ رہیں، خود اعتمادی پیدا ہو سکے، ذہنی انتشار سے محفوظ رہیں، کسی قسم کے خطرات کا امکان نہ ہو۔ نفسیاتی الجھنیں پیدا نہ ہو سکیں۔ ذہنی صلاحیت، جسمانی ساخت، صنفی عوارض، جذباتی کیفیت، فطری رجحان اور صنفی میلانات کی رعایت کی گئی ہو اور استحصال کا امکان دور دور تک باقی نہ رہے۔ ایک ایسے ماحول ہی میں اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی شخصیت ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہوئی بلندیوں کو چھو سکے لیکن یہ یاد رہے کہ اسلام شخصیت کے ارتقاء کا مفہوم بھی خود ہی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک شخصیت کے ارتقاء سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص پوری توانائی کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل میں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کرے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اسلام کے نزدیک کسی بھی قیمت پر یہ ارتقاء ہے ہی نہیں کہ مرد عورت میدان میں داخل ہو کر اسے چیلنج کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے یا عورت مرد بنکر اس سے مقابلہ کرنے لگے۔ اس طرح سے تو اسلام کے نزدیک شخصیت کا ارتقاء نہیں بلکہ اس کا زوال ہو جاتا ہے۔ اسلام اس بات کو ارتقاء کہتا ہی نہیں کہ آفتاب اپنی شعاعوں کے ذریعے ضیاء پاشی ترک کر کے کسی اور ستارے سے کسب نور کرنے لگے اور اس طرح چاند سے مقابلہ کرنے کی حماقت کرے یا چاند آفتاب سے کسب نور کرنا چھوڑ کر آفتاب کے مدار میں داخل ہو جانے کی جسارت کر بیٹھے۔ ظاہر ہے ایسی کوئی بھی حماقت آفتاب کا تو زوال کہلائے گی ہی مگر چاند کی تباہی تو یقینی ہو جائے گی اور نظام کائنات میں رخنے پڑ کر پورے نظام کی تباہی پر منتج ہوگی۔

مرد اور عورت کے سلسلے میں بھی اسلام کا نظریہ کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے نزدیک عورت کا ارتقاء ہی یہ ہے کہ اس کی مجموعی صلاحیتوں کا ارتقاء اپنی نسوانیت کے تحفظ کے ساتھ اس طرح ہو کہ وہ عورت ہونے کی حیثیت سے اپنے سارے فرائض کو بحسن و خوبی اور بڑی کامیابی و کامرانی سے انجام دے سکے۔ اسی طرح مرد کی شخصیت کے ارتقاء کا مفہوم بھی اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا ارتقاء اس طور پر ہوتا رہے کہ اس میں مردانہ خصائل زیادہ سے زیادہ بہتر اور اکمل انداز سے بروئے کار آتے رہیں اسی لیے اسلام مردوں پر عورتوں کی نقل کرنے کو

حرام قرار دیتا ہے اور عورتوں سے بھی منع کرتا ہے کہ وہ مردوں کی نقل کرنے کی حماقت کا ارتکاب نہ کریں۔ مرد میں عورت کی خصوصیات کی پیدائش کو وہ مرد کا زوال کہتا ہے اور عورت میں مرد کی نقل کرنے کے رجحان کو اس کی تباہی اور معاشرتی زندگی کی موت قرار دیتا ہے۔ اس لیے اسلام اپنے معاشرتی نظام کے ذریعہ ایسا ماحول پیدا کرتا ہے جس میں مرد کا ارتقاء مرد ہونے کی حیثیت سے ہوتا ہے اور عورت کا عورت ہونے کی حیثیت سے۔ یہی ارتقاء اسلام کی زبان میں ان دونوں کا شخصی ارتقاء ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ معاشرے میں مساوات و آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور اسی کے پیش نظر وہ کام اور دائرۂ عمل کی تعیین کرتا ہے۔

جیسا کہ گذر چکا ہے اسلام مرد اور عورت کی کامل مساوات کا قائل ہے لیکن اسلام مساوات کے اس لفظ کو مکر و فریب دینے کے لیے استعمال کرتا ہے اور نہ نشہ اور مشروب کے طور پر استعمال کرا کے بدمست کرانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بلکہ اس لفظ کو بھی وہ خود ہی اپنا مفہوم دیتا ہے۔ وہ مغربی فلسفیوں کی مانند مرد اور عورت کو ہر اعتبار سے مساوی قرار نہیں دیتا اور درواقعتاً اس اعتبار سے وہ مساوی ہیں ہی نہیں، عورت اور مرد کے جسم کا ایک ایک عضو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ عورت کی ہڈیاں مرد سے مختلف، اس کی شکل مرد سے الگ، اس کی آواز مرد سے ممتاز، یہاں تک کہ اس کی چال، اس کی پسند، اس کا رجحانِ طبع، اس کے جذبات کی حالت، اس کا فکری ترفع اس کی ذہنی کیفیت، الغرض اس کی کوئی ایک چیز بھی مرد کے مماثل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ خود اپنے جسم کی ظاہری اور باطنی ساخت میں بھی وہ مرد سے علیحدہ ہوتی ہے۔ یہ اختلاف یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ عورت کے گوشت کے ریشوں کی بناوٹ تک مرد کے گوشت کے ریشوں سے مختلف ہوتی ہے۔

عورت اور مرد کے جسم، صلاحیتوں اور اس کے اعضاء کے اس اختلاف کا آغاز اس وقت سے ہو جاتا ہے جب شکم مادر میں استقرارِ حمل کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تحقیق بھی اسی یورپ کی ہے جو سماجی معاملات میں عورت کو بالکلیہ مرد کے مماثل قرار دیتا ہے مگر خود تحقیق کرکے سائنس کے ذریعے بتاتا ہے کہ استقرارِ حمل کے ساتھ ہی لڑکی اور لڑکے کے تخلیقی عمل کا تعین ہو جاتا ہے اور وہیں سے دونوں کی تخلیق میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ لڑکی یا لڑکے کی شکل میں اس کی پیدائش ہو جاتی ہے۔ گویا کہ عورت اور مرد کا تخلیقی اختلاف استقرارِ حمل سے شروع ہوتا ہے اور میت تک بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ مگر یہی یورپ خدا ہی جانے اپنے پروپیگنڈے کی پُرفریب فن کاری کے ساتھ ساری دنیا کو دھوکا دینے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے اور خدا جانے دنیا نے بھی یہ دھوکا کیسے کھا لیا۔ غالباً اس سے بڑا دھوکا انسانیت نے اپنی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں کھایا ہوگا جو اسے بیسویں صدی کے علمی اور سائنسی

دو دوروں میں کھاتا پڑ گیا۔ لیکن اسلام کا معاملہ اس سلسلے میں بالکل دوسرا ہے۔ وہ پہلے ہی قدم پر دونوں کو علیحدہ علیحدہ قرار دیتا ہے اور ان کی فطری ساخت طبعی رجحان، صنفی عوارض اور عملی فرائض کو ساتھ رکھ کر عورت اور مرد کو انسانی حقوق کے اعتبار سے مساوی قرار دیتا ہے۔ مگر وہ یورپ کی طرح کام کی مساوات کا قائل نہیں ہے بلکہ آسائش حیات میں مساوات کا قائل ہے۔ کام کے تعین میں اور فرائض کی تعیین میں تو اسلام دونوں صنفوں کی صلاحیتوں ضرورتوں اور کمزوریوں یا برائیوں کو سامنے رکھ کر تعین کرتا ہے اور ان کے لیے اپنے میدان منتخب کرتا ہے جن میں ان کی شخصیت کا پوری طرح ارتقاء ہو سکے۔ البتہ کام کی نوعیت اور میدان عمل کے باوجود اسلام آسائش حیات میں کامل مساوات فراہم کرتا ہے۔

فعل تخلیق چونکہ قدرت کا منشاء و مقصد ہے جس کے لیے اس نے انسان کو مرد اور عورت کی دو مختلف صنفوں میں تقسیم کر کے ان کے ذمہ کام کو تقسیم کر دیا ہے۔ اس تقسیم میں مرد کے حصہ میں حیثیت فاعل آتی ہے تو عورت کے حصہ میں حیثیت مفعول۔ عملی دنیا میں فاعل ہمیشہ اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے جب کہ مفعول میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے مگر چونکہ یہ تقسیم خالق کائنات کی جانب سے اس کے منصوبے کے تحت عمل میں آتی ہے جس میں نہ مرد کی پسند کو کوئی دخل ہے اور نہ عورت کا انتخاب اس کا سبب۔ اس لیے نہ حیثیت فاعلی کو مرد کے لیے سرمایہ افتخار کہا جا سکتا ہے اور نہ حیثیت مفعولی عورت کے لیے تذلیل و تحقیر کا سبب بن سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اسلام دونوں صنفوں کو اپنے اپنے حصہ کی ذمہ داری کی حسن و خوبی ادائیگی کو قابل فخر قرار دیتا ہے اور صرف حیثیت کے اس فرق کی وجہ سے نہ تو کسی کو ذلیل و حقیر قرار دیتا ہے اور نہ کسی کو مغرور و متکبر بننے کی اجازت دیتا ہے لیکن اسلام جب معاشرے کی ذمہ داریاں تقسیم کرتا ہے اور دائرہ کار متعین کرتا ہے تو ان حیثیتوں کو ملحوظ ضرور رکھتا ہے اس لیے کہ دونوں صلاحیتیں ان کی اس حیثیت کے فرق کو ملحوظ رکھ ہی دی گئی ہیں۔ اس لیے ان کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ممکن تھا کہ ان میں سے کسی کے ذمہ وہ فرض عائد ہو جاتا، جس کے کرنے کی صلاحیت اس میں سرے سے ہی نہیں، یا ہو سکتا ہے کہ اس فرض کی ادائیگی اس کے فطری فرائض میں رخنہ پیدا کرنے کا سبب بن جاتی یا ان صلاحیتوں کو ضائع کر دیتی۔

اسلام نے ان ساری مصلحتوں کو نظر میں رکھ کر عورت کے لیے میدان عمل اس کے گھر اور خاندان کو متعین کیا ہے۔ کیونکہ بالعموم عورت نے ذمہ سب سے پہلے گھر اور گرہستی کی مصروفیات آتی ہے۔ پھر دوران حمل وہ دوڑ دھوپ کرنے کے قابل بھی نہیں رہتی بلکہ الٹی نگرانی اور تحفظ کی محتاج ہو جاتی ہے پھر کامل (باقی بر صفحہ

برطانیہ میں

مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ

(جناب ممتاز علی صاحب علی گڑھ)

اس وقت برطانیہ میں کم و بیش ۱۵ لاکھ مسلمان آباد ہیں جن کا ۵۰ فی صد حصہ ان مہاجرین پر مشتمل ہے جن کی آمد دوسری جنگ عظیم کے بعد بہتر معاشی مواقع کی تلاش میں یہاں شروع ہوئی تھی اور ۵۰ فی صد حصہ اس نسل پر مشتمل ہے جو یا تو برطانیہ ہی میں پیدا ہوئی ہے یا پھر برطانیہ ہی میں پرورش پا کر جوان ہوئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جن مسلمانوں نے یورپ اور امریکہ کا رخ کیا ان کا تعلق غیر ترقی یافتہ ممالک سے تھا جن میں برصغیر ہند و پاک اور ترکی قابل ذکر ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے امریکہ اور برطانیہ کو اپنا وطن بنایا جبکہ ترکی کے مسلمانوں نے جرمنی اور فرانس کو۔

مسلمان یورپ میں کوئی پہلی بار نہیں آئے تھے بلکہ وہ اس سے قبل بھی دو بار یورپ کا رخ کر چکے ہیں۔ پہلی بار آٹھویں صدی عیسوی میں اور دوسری بار چودھویں صدی عیسوی میں۔ فرق یہ ہے کہ اس سے قبل مسلمان حکومت و تہذیب کے اعتبار سے غالب جماعت کی حیثیت سے یورپ میں داخل ہوئے تھے اور اب یہ نہ صرف سیاسی اور معاشی سطح پر کمزور ہیں بلکہ نظریاتی اور فکری و تمدنی سطح پر بھی مغلوب نظر آتے ہیں

برطانیہ میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال

جو پندرہ لاکھ مسلمان برطانیہ میں آباد ہیں ان میں سے زیادہ تر لندن، بریڈ فورڈ، مانچسٹر، برمنگھم، گلاسگو، نیو کاسل، لیوٹن، ہڈرس فیلڈ، ناٹنگھم، والسال، راچڈیل، نیلسن، ڈیوزبری، ریلی، ٹمکین اور بلیک برن وغیرہ میں مقیم ہیں۔ ان میں سے اکثریت پاکستانی مسلمانوں کی ہے جو ایک اندازے کے مطابق پانچ لاکھ سے زائد ہیں ان کے علاوہ تقریباً ہر مسلم ملک کے مسلمان یہاں موجود ہیں اور ان ممالک کے مسلمان بھی ہیں جو غیر مسلموں کی حکومت میں ہیں یا وہاں اقلیت میں رہتے بستے ہیں۔ ان کا تعلیم یافتہ طبقہ مغربی سیکولر تعلیم سے آراستہ ہونے کی

وجہ سے مغرب کی ذہنی اور معاشی غلامی میں مبتلا ہے یا بالکل ان پڑھ ہونے کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار اور نتیجۃً مغرب ہی کے ذہن سے سوچنے پر مجبور ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے دل و دماغ کے کسی نہ کسی گوشے میں ایسے اسلامی تشخص کا احساس ضرور موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلمان اپنے تہذیبی تشخص کے لیے تھوڑی بہت جد و جہد کر رہے ہیں۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی کا ارتقاء

گذشتہ دو دہوں میں برطانیہ کی مسلم آبادی کا تناسب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے لیکن یہ امر قابل افسوس بھی ہے اور قابل تشویش بھی کہ مختلف مذہبی قومیتوں کی آبادی کے حقیقی اعداد و شمار۔ قابل اعتماد اعداد و شمار کہیں دستیاب نہیں ہے اور اندازے بہت بڑی حد تک بہت مختلف ہیں بلکہ ان میں نمایاں فرق ہے (Christian World Encyclopedia 1938) کے مطابق برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔ جبکہ دیگر غیر سرکاری ذرائع مسلمانوں کی تعداد ۸ لاکھ بتلاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمان رہنماؤں کا اندازہ یہ ہے کہ ان کی قوم کی تعداد ۱۵ لاکھ کے قریب ہے۔ بہرحال حقیقی تعداد جو بھی ہو برطانوی مسلمان برطانیہ کی آبادی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور اس ملک کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہے

زیر نظر مضمون میں مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے موضوع پر روشنی ڈالی جا رہی ہے لیکن یہاں صرف ان عملی پہلوؤں ہی کو زیر بحث لایا گیا ہے جو مسلمان برت رہے ہیں اور ان فکری اور نظریاتی پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا گیا جن کا تعلق اسلامی نظریہ تعلیم سے ہے بلکہ یہاں ان تعلیمی سرگرمیوں کا احاطہ مقصود ہے جن کے ذریعہ مسلمان اپنے بچوں کو زیور علم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکیں۔

مسلمان بچوں کے تعلیمی مسئلہ کی اہمیت

برطانیہ کی مسلمان کمیونٹی جن اہم ترین مسائل سے دوچار ہے ان میں مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ سرفہرست ہے محتاط ترین اندازوں کی رو سے تین لاکھ کے قریب مسلمان بچے یہاں زیر تعلیم ہیں۔ برطانوی مسلمانوں کی یہ نئی نسل جو یہاں زیر تعلیم ہے شدید خطرات کا شکار ہیں یہ وہ بچے ہیں جن کے کان آذان کی آواز سے نا آشنا جن کی نگاہیں مسجد و محراب کے منظر سے محروم اور جن کا شعور و احساس مسلم ثقافت و تمدن سے نابلد ہے وہ یہاں ایک اجنبی ماحول میں زندگی گذار رہے ہیں اور اپنی تمدنی و تہذیبی روایات سے یکسر کٹ گئے ہیں جس ماحول میں وہ پل رہے ہیں وہ لادینیت، عیسائیت اور مادہ پرستی کے مظاہر سے پُر ہے۔ جہاں اکثریت خدا کے نام لیواؤں

کمی ہونے کے باوجود مارکس، فرائڈ اور ڈارون کو حقیقی معنے میں اپنا خدا بنائے ہوئے ہیں لہٰذا جن اسکولوں میں یہ نئی نسل تعلیم حاصل کر رہی ہے اس کا پورا نظام نہ صرف مسلم تہذیب و ثقافت اور مذہب اسلام کی ضد پر مبنی ہے بلکہ ایسے جدید خداؤں کا مرہونِ منت ہے ان حالات میں نظریاتی نقطہ نظر سے یہ تعلیمی ادارے مولانا مودودی کے الفاظ میں دراصل مسلمان بچوں کے لیے قتل گاہوں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن یہاں کے لازمی تعلیمی نظام کی بنا پر وہ یہاں کے تعلیمی اداروں میں داخل ہونے کے لیے مجبور ہیں۔ لازمی تعلیم کے قانون کی رو سے مسلمان لڑکیاں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں اور نوعمر لڑکیاں بھی یہاں کے تعلیمی اداروں میں جانے کے لیے مجبور ہیں جن کے والدین مذہبی و دینی شعور رکھنے کی وجہ سے ان اداروں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ غرض برطانوی نظام تعلیم اپنے مزاج، منہاج، مقاصد، نصاب اور روایات کی رو سے مسلمانوں کے نظام تعلیم کی بالکل ضد ہے۔

مذہبی تشخص کا احساس

برطانوی مسلمان دنیا کے دیگر مسلمانوں کی طرح اپنی طویل مذہبی اور تمدنی روایات کی بنا پر ایک واضح اور ممیز گروہ ہونے کا احساس رکھتے ہیں جن کے تمدنی اصول اور اخلاقی اقدار کی جڑیں ان کے دین و مذہب میں پیوست ہیں۔ بحیثیت مجموعی مسلمان اپنے نظریاتی اور تمدنی وجود کی نہ صرف حفاظت کرنا چاہتے ہیں بلکہ اسے قائم اور باقی رکھ کر مزید امتیازی حیثیت سے اسے ترقی دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مسلمان اپنے دینی اور تمدنی وجود کو برطانوی معاشرے میں تحلیل کر دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنی تمام مذہبی تعلیمات و روایات کو اپنی نئی نسل تک منتقل بھی کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی نئی نسل اپنے دین و مذہب کی خاطر خواہ طریقہ پر حفاظت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نئی نسل کو برطانوی نظام تعلیم کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی کوشش

۱ برطانوی نظام تعلیم کی یہ صورت حال مسلمانان برطانیہ کے لیے ایک چیلنج بن کر ابھری ہے۔ اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے کچھ صاحب دل اور باحمیت مسلمانوں نے اپنی اپنی جگہ سوچ بچار شروع کی، مسئلہ کی حقیقی نوعیت سے واقفیت اور اس کے حل کے لیے آئے دن سیمینار، سمپوزیم اور کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں اور ابتدائی مراحل کے طور پر جز وقتی مذہبی تعلیم کے ادارے، صباحی اور شبینہ مدارس قائم کیے گئے جہاں سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو اسلام کی مبادیات کی تعلیم دی جانے لگی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مساجد، اسلامک سنٹرز اور صباحی اور شبینہ مدارس کا پورے ملک میں ایک جال پھیلا دیا گیا۔ برصغیر ہند و پاک کے علاوہ بعض عرب ممالک سے دینی

مدارس کے فارغ التحصیل فضلاء کو مدعو کیا گیا تاکہ وہ نسل کو اسلام کی مبادیات کی تعلیم دے سکیں۔

مسلمانوں کی ان کوششوں کے اثرات و نتائج کا جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی نظام تعلیم کے خدوخال پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

برطانوی تعلیمی ادارے اور ان کا نظام

برطانوی تعلیمی نظام دراصل ۱۹۴۴ء کے ایجوکیشن ایکٹ پر مبنی ہے جس کی رو سے والدین خود اپنے بچوں کی تعلیم کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ ۵ سال کی عمر سے ۱۶ سال کی عمر تک بچوں کو مناسب تعلیم فراہم کی جانی چاہیے اور اگر مناسب تعلیم کی فراہمی میں والدین غفلت سے کام لیتے ہیں تو ایسی صورت میں حکومت کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ قانون کی رو سے والدین کے خلاف قانونی کارروائی کرے اور بچوں کو والدین کی سرپرستی سے نکال کر مقامی حکومت کے حوالے کر دے۔ برطانیہ میں ۵ سال سے ۱۶ سال کی عمر کے طلباء کے لیے جو تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں ان کی ترتیب یوں ہے۔

۱۔ پانچ سال سے کم مدت کے بچوں کے لیے کنڈرگارٹن کی طرز کے ادارے۔
۲۔ چھ سال سے ۱۱ سال تک کی عمر کے لیے پرائمری اسکول
۳۔ گیارہ (۱۱) سال سے ۱۶ سال تک کی عمر کے لیے ثانوی اسکول

سولہ سال سے زیادہ عمر کے طلباء کے لیے جو تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں ان کی ترتیب یوں ہے۔

۱۔ اعلیٰ ثانوی یا فنی تعلیمی ادارے۔
۲۔ کسی نامی فن یا پیشے کے خصوصی کالج
۳۔ جامعات۔

ان تمام تعلیمی اداروں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا پورا نظام سیکولر اور مغرب کی فکری بنیادوں پر استوار ہوا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی چند خصوصیات ایسی ہیں جو مسلمانوں کے لیے انتہائی مضرت رساں ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

۱۔ ان تمام اداروں کی اکثریت کا نظام تعلیم مخلوط ہے۔
۲۔ غیر اسلامی نصاب تعلیم رائج ہے۔
۳۔ اسکول یونیفارم غیر ساتر لباس پر مشتمل ہوتا ہے جس کی پابندی ہر طالب علم کو کرنی پڑتی ہے چنانچہ

مسلم طالبات کو بھی اسکرٹ پہننا ضروری ہوتا ہے۔

۴۔ نصاب تعلیم کے ضروری اجزاء میں رقص و موسیقی کی تعلیم فزیکل ایجوکیشن، مکس گیمز اور تیراکی شامل ہیں۔ فزیکل ایجوکیشن کے موقع پر جو مخصوص لباس پہنا جاتا ہے وہ اس قدر چست اور تنگ ہوتا ہے کہ جسم عریاں نظر آتا ہے۔ خاص کر طالبات کا لباس۔ اس کے علاوہ تیراکی مخلوط ہوتی ہے اور تیراکی سے پہلے اور بعد میں شاور لیا جاتا ہے جس کے لیے مخلوط انتظام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض بالکل برہنہ ہو کر شاور لیتے ہیں۔ سیکس ایجوکیشن کے نام پر اسکول ہی میں سیکس پر مبنی فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔

۵۔ اسکولوں کی جانب سے تفریحی پروگرام مرتب کیے جاتے ہیں جس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شرکت ہوتی ہے۔ یہ پروگرام بعض اوقات ایک سے زائد دن کے لیے بھی ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اسکولوں میں مذہبی تعلیم لازمی تعلیم کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ ۱۹۴۴ء کے ایجوکیشنل ایکٹ کی رو سے تمام اسکولوں میں نہ صرف مذہبی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ اسکول کی تعلیم کا آغاز ہی مذہبی دعاء یا عبادت سے ہو۔ چنانچہ اسکولوں میں ہر روز اسمبلی ہوتی ہے جس میں تمام مذاہب کے طلبا شامل ہوتے ہیں جس میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے جس کی وجہ سے مسلم طلبہ پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں حالانکہ اس ایکٹ میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ تمام طلبہ کے لیے ایک ہی مذہب کی تعلیم نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم ایک متفق علیہ نصاب پر مشتمل ہو اور غیر فرقہ وارانہ ہو۔ مگر یہ بالکل واضح ہے کہ اس قانون کے بنانے والوں کے پیش نظر مذہبی تعلیم سے مراد مروجہ عیسائیت ہی کی تعلیم تھی چنانچہ آج مذہبی تعلیم کے عنوان سے عیسائیت ہی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کی غرض سے یہودیوں نے اپنے علیحدہ اسکول قائم کر رکھے ہیں۔ جہاں وہ اپنے مذاہب کی تعلیم دیتے ہیں لیکن مسلمانوں کے اپنے علیحدہ اسکول نہیں ہیں

مسلم طلباء کی ذہنی کشمکش

برطانوی نظام تعلیم کی ان خصوصیات کی وجہ سے مسلمان طلبہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں دوران تعلیم ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں کیونکہ ان کے اپنے دین کی خصوصیت کے مد نظر ان کے گھروں میں والدین کی جانب سے جو خیالات ملتے ہیں اور ان کے والدین جن خیالات و نظریات کو ان کے دل و دماغ میں مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں وہ اسکولوں

کے اندر پائے جانے والے خیالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

ان حالات کے علاوہ برطانیہ میں اباحیت پسندی اور بے جا آزادی فکر و عمل کی وجہ سے جو اثرات مسلم نوجوانوں اور طلباء و طالبات کے ذہن و فکر پر پڑتے ہیں وہ بھی انتہائی مضر اور نقصان دہ ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل ایک چوراہے پر کھڑی ہوتی ہے جس کے چاروں طرف خطرات ہی خطرات ہیں اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ آخر انھیں جانا ہے تو کس طرف۔ والدین کی جانب سے دباؤ اور سوسائٹی کی جانب سے کشش۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ذہنی کشمکش ہی برپا ہو سکتی ہے۔

مسلم والدین کا رول

جب یہ نوجوان نسل اس ذہنی کشمکش کے ساتھ اسکولوں سے گھروں کا رخ کرتی ہے اور اپنے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات والدین کے سامنے پیش کرتی ہے تو والدین اپنی کم علمی اور اسلام سے ناواقفیت کی بنا پر ان کے سوالات کے تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ زبان بھی ان کے درمیان ایک مسئلہ بن جاتی ہے کیونکہ نئی نسل تو روانی کے ساتھ انگریزی بول سکتی ہے لیکن والدین اس روانی کے ساتھ اپنے بچوں سے بات چیت نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ نئی نسل کا اپنی مادری زبان سے تعلق بھی برائے نام ہی رہتا ہے۔ کسی حد تک روزمرہ کی گفتگو تو کر سکتے ہیں لیکن کسی علمی مسئلہ کو مادری زبان کے ذریعہ سمجھ نہیں سکتے۔

علماء کا رول

والدین کی جانب سے مایوس ہو کر جب یہ نوجوان دینی مدارس اور اسلامک سنٹرز کا رخ کرتے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ یہاں اسلام کا گہرا علم رکھنے والے اہل علم بھی موجود ہیں جو نہ صرف اسلام کی بنیادیات کی تعلیم دینے کی اہلیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہمارے سوالات کا تسلی اور تشفی بخش جواب بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن ان طلباء کو یہاں بھی مایوس ہی ہونا پڑتا ہے کیونکہ یہاں بھی زبان ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ علماء نہ صرف انگریزی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں بلکہ اگر کسی حد تک واقفیت رکھتے ہیں تو طلباء کو مطمئن کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ذہنی ساخت اور اسلام کے تعلق سے ان کا نقطہ بھی وہی محدود ہوتا ہے جو عام طور پر ان اداروں میں پایا جاتا ہے جہاں سے یہ فارغ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان علماء کی جانب سے جو غیر ضروری فقہی اور اختلافی مسائل چھیڑ دیے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے اندر جو اختلافات پیدا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ سے نئی نسل ان علماء سے مطمئن نہیں پاتی بلکہ اس کا الٹا ہی اثر ہوتا ہے اور وہ علماء کے تعلق سے یہ تصور قائم کرتی ہے کہ یہ تنگ نظر اور خود غرض لوگ ہیں جو اپنے ذاتی مفادات اور اپنی علمی برتری کی خاطر ہر طرح کے اختلافات کو [illegible]

دینی مدارس کا کردار

برطانیہ میں مساجد کے دینی مدارس کا جو نظام تعلیم ہے وہ بھی وہاں کے معاشرے کی ضروریات اور طلباء کی ذہنی ساخت سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے دینی مدارس سے فارغ فضلا کو یہاں مدعو کر لیا جاتا ہے اور ان کی یہاں کے ماحول کی مناسبت سے تربیت کیے بغیر انہیں بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے شاید اس خیال سے کہ اسلام کی تعلیم بغیر کسی تربیت کے دینا آسان ترین کام ہے اور یہ اساتذہ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ برطانیہ میں پیدا ہونے والی نسل اور برطانیہ کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والی نسل کو تعلیم دے رہے ہیں وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں جو ہند و پاک کے اکثر صباحی اور شبینہ مدارس میں اختیار کیا جاتا ہے

ان دینی مدارس اور اس نظام تعلیم پر مسلمان ہزاروں پونڈ ضرور خرچ کر رہے ہیں لیکن انھیں اس بات کا کم ہی احساس ہو پاتا ہے کہ ان مدارس کی افادیت کیا ہے جس کی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ احتساب، تنقیدی جائزہ اور تجزیہ کے رجحان کے حامل نہیں اور نہ ہی جدید طریقوں سے اپنی سرگرمیوں کے اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ اس ضمن میں سیمینار، سمپوزیم اور کانفرنس وغیرہ میں بھی جو مسائل زیر بحث لائے جاتے ہیں وہاں بھی عملی تجربات سے فائدہ اٹھانے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی جاتی ہے کہ جن اسکالرز نے برطانوی مسلمانوں کی نئی نسل کی ذہنی و فکری ساخت کی تشکیل میں حصہ لینے والے عناصر پر تحقیقی کام کیا ہے اس سے استفادہ کیا جائے۔ ان اسکالرز کی یہ رائے ہے کہ ان مدارس کی تعلیم سے طلبہ میں اسلام پر گہرا یقین نہیں پیدا ہوتا اور نہ مذہبی حق کے تعلق سے وفاداری پیدا ہوتی ہے مختصر یہ کہ ان دینی مدارس کے تعلیمی نظام کے لیے مثبت اثرات کہیں نظر نہیں آتے جس کی مدد سے یہ نوجوان نسل اپنی ذہنی کشمکش کو دور کر سکتی اور مغربی تہذیب کے شدید طوفان کے درمیان مضبوط قدم کے ساتھ کھڑی ہو سکتی۔ اسکالرز کی یہ رائے محض کوئی رائے نہیں ہے بلکہ انھوں نے سروے کے دوران ہزاروں مسلم طلباء و طالبات سے ربط پیدا کر کے سوالات کے ذریعے دوستانہ ماحول میں ان کے ذہن کو سمجھنے کے لیے بعد یہ رائے دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس رائے کا ایک مقام ہونا چاہیے اور مسلم قائدین اور مدارس کے منتظمین کو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔

دینی مدارس میں پائی جانے والی خامیوں کی وجوہات

دینی مدارس کے اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی خامی تو یہ ہے کہ یہاں کوئی ایسا نصاب نہیں پڑھایا جاتا جسے ایسے ماہرین تعلیم نے تیار کیا ہو جو برطانیہ کے نظام تعلیم سے گہری واقفیت کے ساتھ اسلامی نظام تعلیم

اور وہاں کے عصری انطباق کا بھی گہرا علم رکھتے ہوں ۔ اس کے بجائے جس طرح سے ہندو پاک کے صباحی اور شبینہ مدارس میں بچوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے بالکل اسی انداز میں یہاں بھی دینی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ ہر شہر اور ہر علاقہ بلکہ ہر ہر مسجد و اسلامک سنٹر کے مسلمان اپنے اپنے طور پر اپنا تیار کردہ نصاب پڑھاتے ہیں ۔ ملکی سطح پر کسی تنظیم کی جانب سے کسی ایسے نصاب کی تیاری کی اب تک کوشش نہیں کی گئی ہے جسے سارے ملک کے صباحی اور شبینہ مدارس میں پڑھایا جا سکے ۔ البتہ یونین آف مسلم آرگنائزیشن اور مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ لندن کی جانب سے ایک ایسا نصاب تیار کیا گیا ہے جو یا تو مسلمانوں کی جانب سے قائم کیے اور چلائے جانے والے مدارس میں پڑھایا جا سکتا ہے یا پھر سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے نصاب کے تحت ۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ ابھی تک برقرار ہے اور حل طلب ہے کہ کیا ان حالات میں مسلمانوں کو اپنے علیحدہ اسکول قائم کرنے چاہئیں ۔ اس مسئلہ پر مسلمان ابھی تک یکسو نہیں ہیں بلکہ اس ضمن میں ان کی رائیں مختلف ہیں ۔

دوسری خامی یہ ہے کہ یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی نہیں ہوتا بلکہ کوئی اور زبان ہوتی ہے جس کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان نہ تو ہم آہنگی ہو پاتی ہے اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کو سمجھ کر ایک دوسرے کو سمجھ کر ایک دوسرے کو مطمئن کر سکتے ہیں ۔

اس نظام تعلیم کی تیسری خامی یہ ہے کہ طریقہ تدریس برطانوی معاشرے اور یہاں کے طلباء کی نفسیات سے مطابقت نہیں رکھتا جو طریقہ تدریس برطانوی اسکولوں میں اختیار کیا جاتا ہے اس کے برخلاف دوسری ہی شکل یہاں ان دینی مدارس میں اختیار کی جاتی ہے ۔

ان مدارس کی چوتھی خامی یہ ہے کہ اسلام کی مبادیات کی تعلیم کے عنوان سے صرف ناظرہ قرآن کی تعلیم پر اکتفا کر لیا جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ کلمے اور نمازیں بھی سکھا دی جاتی ہیں جبکہ ناظرہ قرآن پڑھنے اور نماز زبانی یاد کر لینے سے بچوں کی تربیت نہیں ہو پاتی ۔ بغیر سمجھے ناظرہ قرآن پڑھنے اور عقیدۃً کچھ ثواب تو ضرور مل جاتا ہے لیکن اس کو سمجھ کر پڑھنے سے جو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں ان سے بچے محروم رہتے ہیں ۔

ان خامیوں کی وجہ سے اب مسلمانوں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ مساجد میں رائج دینی نظام تعلیم اور موجودہ طریقہ تدریس غیر مربوط ، غیر مفید اور نتائج کے لحاظ سے قطعی حوصلہ افزا نہیں ہے ۔ ماحول کی مناسبت سے مساجد کا نظام تعلیم انتہائی ٹھوس اور طریقہ تدریس انتہائی موثر اور حکیمانہ ہونا چاہیے جس سے بچوں کا اپنے دین پر ایمان پختہ ہو اور انہیں اسلام کے بنیادی عقائد کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوں اور وہ اس قابل ہو سکیں کہ سرکاری اسکولوں

میں عیسائیت کی تعلیم اور ماحول کی مادہ پرستی کا ان سے ذہنوں پر کوئی اثر نہ ہو۔ اس کے بعد اسلامی ادب، معاشرت اور اخلاقی قدروں کی افادیت پر بھی ان کا یقین پختہ ہو۔ دینی مدارس کے نصاب تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جانا چاہیے کہ وہ یہاں کے حالات میں مؤثر ثابت ہو سکے اور جس کا معیار نئی نسل کی ذہنی صلاحیتوں سے مطابقت رکھتا ہو اور وہ سرکاری اسکولوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نصاب کی تعلیم کے بھی متحمل ہو سکیں۔ لیکن موجودہ طریقہ تدریس اور نصاب تعلیم ان مقاصد کے حصول میں ناکام ہے جس کی وجہ سے عام مسلمانوں کے علاوہ اہل علم و دانش بھی مسلمانوں کی نئی نسل کی دینی بنیادوں پر تعلیم و تربیت کے تعلق سے فکرمند ہیں۔

سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم

مسلمان بچوں کو ان مدارس کے علاوہ ایک اور ذریعے سے بھی دینی تعلیم دینے اور اسلام کی مبادیات سے واقف کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ ہے سرکاری اسکولوں میں لازمی مذہبی تعلیم کے قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کی تعلیم دینے کی کوشش۔ اس ضمن میں بعض مقامات پر مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ لندن نے محکمۂ تعلیم سے باقاعدہ اجازت حاصل کر کے گرامر اسکولوں اور دیگر سرکاری اسکولوں میں اپنے خرچ پر اساتذہ فراہم کر کے اسلامی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس چھوٹی سی لیکن منظم کوشش سے بعض شہروں میں اچھے خاصے حوصلہ افزا نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں لیکن مسلمانوں کے بچوں کی کل آبادی کے اعتبار سے یہ کام بہت ہی کم ہے۔ مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے شائع شدہ رپورٹوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا یہ کام ابھی تک صرف چند شہروں اور چند ہی اسکولوں تک محدود ہے جبکہ ان اسکولوں کی تعداد جہاں مسلمان بچے زیر تعلیم ہیں سینکڑوں سے اوپر ہے۔ اس کے علاوہ ان اسکولوں میں یہ اسلامی تعلیم بھی عام طور پر اسکول کے اوقات کے بعد ہوتی ہے جب کہ ہر طالب علم جلد سے جلد گھر جانے کی فکر میں ہوتا ہے چنانچہ اس تعلیم سے وہ خاطر خواہ استفادہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ اس تعلیم کے اثرات معاشرے اور سرکاری اسکولوں کی سیکولر تعلیم کے مقابلہ میں صفر کے برابر ہی ہوتے ہیں۔

بچوں کی اسلامی کتب

بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے تیسرا ذریعہ بچوں کے لیے اسلامی کتب اور رسائل کی تیاری اور ان کی تقسیم بھی ہے چنانچہ کئی اداروں کی جانب سے اچھی چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کی جا رہی ہیں جن میں اسلام کی

بنیادی تعلیم کے علاوہ سیرت رسول اور صحابہ پر بھی مشق کیا جا رہا ہے اور انگریزی رسالوں کی اشاعت کی بھی کوشش ہو رہی ہے جو بچوں ہی کے لیے ہوں جیسے برمنگھم سے شائع ہونے والے رسائل ینگ مسلم ڈائجسٹ اور اسٹریٹ پاتھ وغیرہ لیکن ان کتابوں اور رسالوں کی بھی رسائی تمام طلباء تک نہیں ہو پاتی جس کی ایک وجہ والدین کی لاپرواہی ہے اور دوسری وجہ مسلم تنظیموں کی ناقص کوششیں ہیں۔

چند تجاویز

اس مسئلہ پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا تنقیدی نقطۂ نظر سے خود مسلمان بے لاگ جائزہ لیں اور یہ معلوم کریں کہ جو خامیاں پائی جاتی ہیں ان کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کام کو اسلامک کونسل آف یورپ، رابطہ عالم اسلامی لندن، اسلامک فونڈیشن لیسٹر اور مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ لندن اسلامک طور پر اپنے ہاتھ میں لیں اور حسب ذیل خطوط پر کام کو آگے بڑھایا جائے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ نہ صرف موجودہ طریقہ تعلیم کی خامیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے بلکہ اسے موثر اور اطمینان بخش بھی بنایا جا سکتا ہے۔

۱۔ موثر اور مناسب نصاب تعلیم کی تیاری

اس نصاب کو تیار کرنے کے لیے ایسے ماہرین تعلیم پر مشتمل کمیٹی مقرر کی جائے جن کی برطانوی معاشرے اور نظام تعلیم سے گہری واقفیت ہو اور اسلامی نظام تعلیم سے بھی۔ نصاب کی تیاری کے سلسلے میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ وہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے لیے یکساں قابل قبول ہوں۔

۲۔ مساجد کے مدارس کا ذریعہ تعلیم لازمی طور پر انگریزی ہو۔

۳۔ پورے ملک کی مساجد میں ایک ہی نصاب پڑھایا جائے جسے مندرجہ بالا کمیٹی نے تیار کیا ہو۔

۴۔ ان مدارس میں اساتذہ کے تقرر سے قبل ان کی تربیت اور تیاری کا نظم کیا جائے اس سلسلے میں مساجد کے اماموں اور صباحی و شبینہ مدارس کے اساتذہ کی تربیت کے لیے بھی ایک نصاب تیار کیا جائے اور ان کی باضابطہ ٹریننگ کا انتظام کیا جائے جس کا لازمی جز انگریزی زبان اور برطانوی نظام تعلیم اور طریقہ تدریس سے واقفیت ہو۔ اساتذہ اور اماموں کی مندرجہ بالا نصاب کے تحت تربیت و تیاری کے بغیر انہیں اس ذمہ داری پر ہرگز فائز نہ کیا جائے۔

۵۔ جو امام و اساتذہ اس وقت برسر خدمت ہیں ان کے لیے صحیح المعیار تربیت کا (باقی بر صفحہ)

مختصر روداد مرکزی مجلس شوریٰ

(جناب افضل حسین صاحب سکریٹری جنرل)

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کے غیر معمولی اجلاس منعقدہ ۱۵ فروری [illegible] ۲۰ فروری [illegible] ارکان جماعت کے ووٹ کے سلسلے میں جو فیصلہ کیا گیا ہے، نیز حالات حاضرہ پر ارکان کے احساسات و تاثرات زندگی میں طباعت کے لیے ارسال کیے جا رہے ہیں۔ اجلاس کی صدارت محترم امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی نے فرمائی اور درج ذیل ارکان مرکزی مجلس شوریٰ شریک اجلاس ہوئے۔

۱۔ مولانا محمد یوسف صاحب (صرف پہلی نشست میں)
۲۔ جناب محمد مسلم صاحب (صرف پہلی نشست میں)
۳۔ جناب محمد عبدالفتاح صاحب (اڑیسہ)
۴۔ جناب ڈاکٹر احمد سجاد صاحب رانچی (بہار)
۵۔ مولانا سید احمد عروج قادری صاحب (مدیر زندگی)
۶۔ سید حامد حسین صاحب (یوپی)
۷۔ جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب (مدھیہ پردیش)
۸۔ جناب رشید عثمانی صاحب (مہاراشٹر)
۹۔ جناب عبدالعزیز صاحب (آندھرا)
۱۰۔ جناب اعجاز اسلم صاحب (تامل ناڈو)
۱۱۔ جناب ٹی کے عبداللہ صاحب (کیرلا)
۱۲۔ جناب محمد سراج الحسن صاحب (سکریٹری جماعت)
۱۳۔ جناب سید یوسف صاحب (سکریٹری جماعت)
۱۴۔ جناب محمد شفیع مونس صاحب (")
۱۵۔ افضل حسین (قیم جماعت)

جناب نجابت اللہ صدیقی صاحب علیل تھے، جناب ضیاء اللہ صاحب بہار، انجینئر سلیم الدین صاحب (بہار) علالت، نیز کے سی عبداللہ صاحب کیرلا بعض ضروری مصروفیات کی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے۔

پہلے پریس ریلیز ہے، اس کے بعد احساسات و تاثرات

ارکان جماعت کے ووٹ کا استعمال

مرکزی مجلس شوریٰ کا فیصلہ

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ نے ارکان جماعت کے ووٹ کے سلسلے میں جو فیصلہ کیا ہے اس کا متن ہم ۲۵ فروری کے سہ روزہ دعوت میں شائع کر چکے ہیں اب اس کے ایک پیراگراف میں ترمیم و تبدیلی کے سبب اسے دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں۔

جماعت اسلامی ہند کی دعوت اور اس کی پالیسی پروگرام سے بخوبی واضح ہے کہ وہ منکرات اور ہر قسم کی برائیوں کا ازالہ اور ملک میں انسانی قدروں کا فروغ چاہتی ہے ظلم و ناانصافی کے خاتمہ اور عدل و قسط کے قیام کے لیے کوشاں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ بنیادی انسانی حقوق بالخصوص جان و مال اور عزت آبرو کا پورا پورا تحفظ ہو، سماجی اور معاشی انصاف ہر شخص کے لیے سہل الحصول ہو، فرقہ پرستی اور تہذیبی جارحیت کا خاتمہ اور کلیت پسندانہ و آمرانہ رجحانات کا سد باب ہو، جمہوری اقدار نشو و نما پائیں اور پروان چڑھیں، ملک میں معاشی استحصال کی راہیں مسدود اور فقر و فاقہ اور مرض و جہالت کا استیصال ہو، عدم مساوات، اونچ نیچ اور چھوت چھات جیسی سماجی برائیاں دور ہوں اور پس ماندہ طبقات اور گروہوں کو سماجی اور معاشی اعتبار سے اونچا اٹھایا جائے۔ علاقائی اور لسانی عصبیتیں اور مذہبی، لسانی اور تہذیبی اقلیتوں کے خلاف تعصبات اور نفرتیں مٹ جائیں۔

ہمارا ملک مختلف تہذیبی اور مذہبی اکائیوں کا گہوارہ ہے جس میں از روئے دستور انھیں اپنے تشخص، زبان اور خصوصی کلچر کے تحفظ و فروغ کی ضمانت حاصل ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان بنیادی حقوق کی راہوں میں تہذیبی جارحیت اور قابل نفرت فرقہ پرستی شدید رکاوٹ بنتی رہتی ہے جو فرقہ وارانہ یک جہتی کے لیے سخت مضرت رساں ہے اور جو ملک کی سالمیت کے لیے بھی نقصان کا موجب بن سکتی ہے۔ اس معاملہ میں خاص طور سے پرسنل لا، دینی تعلیم، اوقاف اور زبان وغیرہ سے متعلق اہم مسلم مسائل کو جس تنگ نظری، مخالفانہ طرز عمل اور غیر یقینی صورت حال کا سامنا رہتا ہے اسے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہ بعض عناصر جو کلیت پسندانہ اور آمرانہ طرز عمل پسند کرتے اور جن کی طرف سے اس طرح کے رجحانات کا اظہار ہوتا رہتا ہے ان کا معاملہ بھی قابل لحاظ ہے اور جمہوریت

کی بحالی و برقراری جماعت کے نزدیک یہ بھی ایک اہم ترین ضرورت ہے

جماعت اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے ترغیب و تلقین سے کام لیتی ہے وہ بلالحاظ مذہب و ملت باشندگان ملک بالخصوص امت مسلمہ کے اشتراک و تعاون کی خواہش مند اور اس کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ ہمارے نزدیک ان مقاصد کے حصول کے لیے الیکشن بھی ایک اچھا اور کارآمد ذریعہ ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء کے چند ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات کے موقع پر جب جمہوریت کے تحفظ اور اس سلسلے میں دستور ہند کی بیالیسویں ترمیم کی منسوخی کا اہم مسئلہ ملک کے سامنے تھا تو ارکان جماعت کو ووٹ کے استعمال کی اجازت دے دی گئی تھی اور اسی نقطہ نظر کی بنا پر جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے حالیہ اجلاس منعقدہ فروری ۱۹۸۵ء میں طے کیا ہے کہ ارکان جماعت پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے الیکشن میں کچھ شرائط کے ساتھ اپنا ووٹ استعمال کر سکتے ہیں۔

جماعت کے ان مذکورہ بالا اہم مقاصد سے اتفاق رکھنے والا امیدوار ہی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ہمارے ووٹ کا مستحق ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان کے لیے حتی الوسع کوشش کرنے کا وعدہ کرے اور اس سے ایفائے عہد کی توقع ہو۔ ہمارے ووٹ کے مستحق امیدوار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ملک کی اقلیتوں اور بالخصوص مسلم اقلیت کو دستور ہند نے جو ضمانتیں دی ہیں ان سے فی الجملہ واقفیت اور ہمدردی رکھتا ہو، وہ وعدہ کرے کہ منتخب ہو جانے پر ان کے موقف و مطالبات کی نہ صرف تائید کرے گا بلکہ ان کو نقصان پہنچانے والی کسی قانون سازی کی حمایت سے باز بھی رہے گا۔ ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ بھی ہے کہ یہاں بعض عناصر ایسے ہیں جو جمہوریت دشمن اور اقلیت مخالف نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایسے امیدوار ہرگز ہمارے ووٹ کے مستحق نہیں ہو سکتے جن کا تعلق کسی ایسی پارٹی سے ہو جو کلیت پسندانہ و آمرانہ نظام کی خواہشمند ہو، یا جو اقلیتوں کے معاملہ میں دستوری ضمانتوں کے خلاف رویہ رکھتی ہو۔ ملک اخلاقی بحران کی جس سنگین صورت حال سے دوچار ہے اس میں امیدوار کے اخلاق و کردار پر نگاہ ڈالنا بھی بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ووٹ کا مستحق اسی امیدوار کو قرار دیا جانا چاہیے جو اپنے حلقہ تعارف میں ایک سچے اور اچھے بھلے شخص کی حیثیت سے جانا مانا جاتا ہو۔

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ارکان کے احساسات و تاثرات

جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا ۱۵ فروری تا ۲۰ فروری ۱۹۸۵ء ایک غیر معمولی اجلاس جماعت کے مرکز دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں یہ مسئلہ زیر غور آیا کہ ارکان جماعت پر سے الیکشن میں ووٹ نہ دینے کی پابندی کن شرائط کے ساتھ اٹھائی جائے۔ ارکان شوریٰ کے تفصیلی تبادلہ خیال کے بعد جو باتیں طے پائیں وہ پریس ریلیز کے عنوان سے اخبارات کے لیے جاری کی جا چکی ہیں۔

اخلاقی بحران اور اس کے خطرناک نتائج

مادہ پرستانہ نقطہ نظر کو اختیار اور اخلاقی قدروں کو پامال اور نظر انداز کرنے کے نتائج سماج کی رسوائی اور مستقبل کے لیے سنگین خطرہ کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ امیر و غریب طبقے کی تقسیم پریشان کن ہو گئی ہے۔ جو معاشی ترقی ہوئی ہے وہ بھی عمومی فلاح کے نقطہ نظر سے غیر متوازن اور کشمکش میں اضافہ کا باعث ہو رہی ہے جا بجا امن و قانون کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور عام سماجی زندگی پر بھی اس کے برے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے ہیں۔ مختلف وزارتوں، بینکوں کے اعلیٰ عہدیداروں کے خلاف جو سنگین الزامات گزشتہ دنوں منظر عام پر آئے ہیں اس نے صورت حال کو اور بھی تشویشناک بنا دیا ہے۔ یہ افسوسناک حقیقت اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ذمہ دارانہ مناصب تک پر کام کرنے والے بعض افراد کے بارے میں بھی پوری طرح اعتماد کرنا مشکل ہو گیا ہے وہ اپنی ناعاقبت اندیشی، حقیر فائدوں اور نفسانی خواہشات کی تسکین کے لیے ملک کے اہم ترین راز دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر کے ملک کے لیے زبردست خطرات کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

یہ امر یک گونہ خوش آیند ہے کہ اس طرح کے خود غرض اور غلط کار افسروں کی جاسوسی و بد عنوانی کے الزامات

کی تحقیق اور ان کے خلاف قانونی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ اس سے کرپشن پر قابو پانے میں مدد ملے گی لیکن اس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس مقصد کے لیے سماجی اصلاح کی حقیقی تحریک اور پائدار تدبیر اختیار کرنا ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ بنیادی نقطہ نظر میں تبدیلی ہو۔ اپنے خالق و پروردگار کی اور اس کے سامنے جوابدہی کا یقین ہو اور روحانی و اخلاقی اقدار کو ان کا صحیح مقام دیا جائے۔

دل بدلی قانون

سیاست و وزارت کے عنوان سے استحصال کا بازار ملک گیر پیمانے پر جس طرح گرم ہو چکا ہے اور الیکشن میں کامیاب ہو جانے کے بعد قانون ساز اداروں کے ارکان کی جس طرح پیسے، اقتدار اور دوسرے گھٹیا مفادات کے لیے دل بدلی ہوتی رہی ہے وہ جگہ جگہ قابل افسوس شکل میں سامنے آتی رہی ہے اور ملک دوست اور سنجیدہ فکر شہری سخت تشویش اور یک گونہ مایوسی و بددلی میں مبتلا رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں دل بدلی قانون کی منظوری اسی ناگفتہ بہ صورت حال کا نتیجہ تھا۔ اگر جمہوری اقدار کا صحیح معنوں میں احترام کیا جاتا تو ملک کو اس طرح کے کسی قانون کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اب یہ کہنا تو مشکل ہے کہ یہ نیا قانون اپنے نفاذ کی صورت میں کس حد تک فی الواقع فائدہ مند ہوگا لیکن بظاہر یہی توقع کی جاتی ہے کہ حصول مقصد میں اس سے مدد ملے گی البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسئلہ کا اصل حل باشندگان ملک کے اخلاقی و سیاسی شعور کی بیداری اور جمہوری اقدار کے احترام میں ہے اس بنا پر یہ نہایت ضروری ہے کہ بدعنوانیوں کے تمام دروازے بند کرنے کی کوشش کی جائے اور تمام سیاسی پارٹیاں بھی ملک اور خود اپنے مفاد کے پیش نظر اپنے درمیان اس طرح کی حرکات نہ ہونے دیں جو گھٹیا سیاسی مقاصد کے لیے ہوتی رہی ہیں۔ شہریوں کا یہ امید کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نئے قانون کا وہ حشر نہ ہونے دیا جائے گا جس کا مظاہرہ کرپشن اور خود غرضی کی وجہ سے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔

آسام

آسام میں آسامیوں اور غیر آسامیوں کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا اور جس نے غیر ملکیوں کے نام پر ایک خطرناک اور پر تشدد تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی بدقسمتی سے کچھ فرقہ پرست عناصر اسے آخر کار فرقہ وارانہ رخ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو ڈرانے دھمکانے اور تشدد آمیز حرکات کے لیے مزید زور پیدا ہو گیا تھا اور نہایت تباہ کن فسادات کے نتیجے میں ملک کو شدید نقصان اور بدنامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

فسادات کے بعد شہریت کے تحقیق کے لیے ٹریبونل قائم کرنے کا اعلان ہوا تو اس سے اس اندیشے کو تقویت ملی تھی اس تحقیق سے آسام کے شہریوں خاص طور سے مسلمان شہریوں کو پریشان کیا جا سکتا ہے چنانچہ مختلف حلقوں نے خاص طور پر مسلم مجلس مشاورت اور جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ نے حکومت کو اس جانب توجہ دلائی تھی کہ کوئی ایسی صورت اختیار نہ کی جائے جس سے لوگوں کو خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑے اور اصولوں کو طے کرتے اور ان کے عمل درآمد میں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ ملک کے شہریوں کو اپنے قانونی دفاع کا صحیح اور پورا موقع مل سکے۔

اس مسئلے سے متعلق ملک کے دانشوروں، رہنماؤں اور سیاسی سماجی جماعتوں کی بھی ایک اہم ذمہ داری ہے کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہیں اور کسی ایسے کام کی تائید وحمایت نہ کریں جو ریاست کی فضا کو خراب کرنے اور بے گناہ شہریوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کا باعث ہو سکتا ہے اگر مختلف اطراف اور خود حکومت کی طرف سے فضا کو پرامن اور مسئلے کو عدل وانصاف کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ طرفین کے درمیان مذاکرات صحیح رخ اختیار کریں گے اور کامیاب ہو جائیں گے۔

فرقہ پرستانہ و پرتشدد فضا

ملک اور سماج کی ہمہ جہتی اصلاح اور تعمیر وترقی کا اس امر پر دارومدار ہوتا ہے کہ وہاں امن وامان کا دور دورہ ہو۔ اور فضا تشدد، منافرت وعداوت سے پاک ہو۔ پرامن طریقے اور آئینی وجمہوری ذرائع سے کام لیکر ہر شخص اور گروہ کو تعمیری مقاصد کے لیے جدوجہد کے کھلے مواقع حاصل ہوں لیکن یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ آزادی کے ۴۷ سال گزر جانے کے بعد ملک کی بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ فضا میں تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ طرح طرح کے مسائل اور نعروں سے عوام کے جذبات مشتعل اور ان کے درمیان عداوت ومنافرت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہتی ہے جس کا نتیجہ تشدد اور فسادات کی شکل میں سامنے آتا رہتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے رام جنم بھومی مکتی سمتی نے اپنی اسکیم "مکتی مارچ" کا اعلان کیا تھا جس کے سلسلے میں بجا طور پر چاہیے تھا کہ اس کے تعلقات سنجیدہ نوٹس لیا جانا چاہیے لیکن یہ دیکھ کر نہایت افسوس اور سخت تشویش پیدا ہوئی ہے کہ بعض فرقہ پرست عناصر اور سیاسی جماعتوں نے اس صریح ناعاقبت اندیشانہ اسکیم کی زور شور سے حمایت کی ہے جس سے ان خطرناک عزائم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو فضا کو خراب اور اسے فرقہ وارانہ فسادات کے لیے تیار کرتے ہیں۔

بہر حال ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کے بہی خواہ اور امن دوست عناصر حالات کی خطرناکی کا صحیح صحیح احساس کریں۔ تاکہ ملک کی فضا منافرت و تشدد اور ناروا کشمکش سے محفوظ رہ سکے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس کی اہم اور اولین ذمہ داری ہے کہ وہ فوری طور پر ان خطرناک عزائم کی پوری قوت سے روک تھام کرے۔ اور کسی بھی گروہ کو تشدد اور فساد کے بھڑکانے کا موقع نہ دے۔

پنجاب

پنجاب میں بہت دنوں سے بے اعتمادی اور بدامنی کی جو فضا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس ریاست میں اور ملک کے دوسرے مقامات پر جو نقصانات اور قیمتی جانیں ضائع ہوئی ہیں اس سے پورا ملک واقف ہے۔ حالات پر قابو پانے اور ان مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں جو اقدامات کیے جاتے رہے ہیں ان سے اب تک کوئی خوشگوار اور خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ جنرل الیکشن کے دوران اور اس کے معاً بعد حکومت کی جانب سے جو کچھ کہا گیا تھا اس کے پیش نظر توقع تھی کہ مسئلہ کو صحیح رخ سے حل کرنے کی فوری اور مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں گی اور ٹھوس اور مضبوط قدم اٹھائے جائیں گے۔ لیکن ابھی تک کوئی واضح اور قابل اطمینان صورت سامنے نہیں آسکی ہے۔ بلکہ کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وقت گومگو کی حالت میں گذر رہا ہے۔ بہر حال حالات کا تقاضا ہے کہ حکومت سکھ برادری اور ملک کے دوسرے عناصر گذشتہ المناک واقعات سے صرف نظر کرتے ہوئے حالات کو خوشگوار بنانے میں سنجیدگی سے توجہ کریں تاکہ مذاکرات کے لیے راہ بخوبی ہموار ہو جائے اور مسئلہ کا صحیح اور ایسا قابل اطمینان حل نکل آئے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ اس سلسلے میں مختلف اطراف سے اکالی لیڈروں کی رہائی کا جو مشورہ دیا گیا ہے وہ فی الواقع سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے اور باہمی مذاکرات کے لیے بہترین آغاز کا کام دے سکتا ہے۔

سری لنکا

سری لنکا کا سنہالی تامل نسلی مسئلہ روز بروز پیچیدگی اختیار کرتا جا رہا ہے اور حکومت اور تاملوں کے درمیان کشمکش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے برابر جانی و مالی نقصان ہو رہے ہیں۔ پچھلے دنوں مذاکرات کے لیے حکومت کی طرف سے جو کانفرنس بلائی گئی تھی اس سے توقع کی جانے لگی تھی کہ کسر و انکسار سے کام لیکر کوئی ایسا فارمولہ معلوم کر لیا جائے گا جس سے طرفین کو اتفاق ہو اور معاملہ سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کے لیے قابل قبول ہوگا۔ لیکن کانفرنس میں حکومت کی جانب سے جو اسکیم پیش کی گئی اسے نہ تو تمل

شدت پیدا ہوتی تھی اور اس کے بجائے کہ وہ ایک دوسرے کے خیالات [illegible]
ٹھنڈے دل و دماغ سے سمجھنے کی کوشش کرتے اپنے اپنے موقف میں کچھ اور سخت ہو گئے۔
اطلاعات و اقدامات سے یہ تاثر ملا کہ ان سب باتوں کو اختیار و قبول کر لینے کی جس حد تک توقع کی
تھی وہ اس کے لیے بھی آمادہ نہیں ہیں۔ جذبات کی شدت اور باہمی کشمکش و تصادم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ چکما
فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ بڑی تعداد میں ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے جس کی وجہ سے خود ہندوستان کے لیے بھی مسائل پیدا
ہو گئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ طرفین ٹھنڈے دل سے مسئلے کو سمجھیں اور منصفانہ سیاسی حل کے لیے آمادہ ہوں اور
اپنے اپنے یہاں باہمی مشورے سے معقول نکات کی بنیاد پر کوئی قابل عمل اسکیم تیار کریں تاکہ خوشگوار فضا میں سنجیدہ
مذاکرات ہو سکیں اور ایسا متوازن و مناسب حل تلاش کیا جائے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

بھوپال کا المیہ

گذشتہ دنوں بھوپال میں جو گیس کا زبردست حادثہ پیش آیا وہ صنعتی تاریخ کا سب سے بڑا المناک حادثہ
تھا۔ اس سے شہری آبادی کا ایک بڑا حصہ متاثر ہوا اور بڑی تعداد میں لوگ معذور اور ہلاک ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں
کے پس ماندگان اور دوسرے تمام متاثر اور معذور ہونے والے لوگ ہم سب کی ہمدردی اور تعاون کے پورے
پورے مستحق ہیں اور بھوپال اور بیرون بھوپال سے تعلق رکھنے والے ان تمام افراد اور سماجی، فلاحی اداروں کا کام
لائق ستائش ہے جنہیں دامے، درمے، قدمے، سخنے اپنے آفت زدہ بھائیوں کی خدمت کی توفیق ملی اور جن کی خدمت کا سلسلہ
اب تک جاری ہے۔

باشندگان شہر کو حادثے کے اندیشے سے بروقت آگاہ اور حفاظت کے امکانی انتظام کے معاملے میں انتظامیہ
سے غفلت و کوتاہی ولاپرواہی صادر ہوئی۔ اس کے متعلق عوام اور دانشوروں کے تاثرات و احساسات پہلے ہی اخبارات
میں آ چکے ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ اسے ضرور ملحوظ رکھا جائے گا اور بجا طور پر شکایات کا موقع پیدا نہ ہونے دیا جائے گا
اب حکومت کا اس جانب متوجہ ہونا نہایت ضروری ہے کہ متاثر ہونے والوں کے نقصانات کی تلافی اور مسائل کے حل
کے سلسلے میں مزید تاخیر نہ ہو۔ امید ہے کہ اس معاملہ میں فوری اور مؤثر اقدامات کیے جائیں گے اور یہ حقیقت سامنے
رہے گی کہ وقت جیسے جیسے گزرتا ہے مسائل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کے حل کے سلسلے میں طرح طرح کی دشواریاں
پیش آنے لگتی ہیں۔

مسلم مجلس مشاورت

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل سے ملک گیر پیمانہ پر اتحاد اور بھائی چارہ کی خوشگوار فضا قائم کرنے کا جو اہم کام ہوا اور مسلمانوں میں ان کے خیر امت ہونے کا احساس ابھارنے کی جو کوشش کی گئی اسے آزاد ہند کی تاریخ میں فراموش کرنا بہت مشکل ہے اور اس کی ضرورت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس اہم ملی ادارے سے متعلقہ امور و مسائل کے حل کی بجا طور پر جو توقع کی جاتی ہے وہ پوری نہیں ہو رہی ہے۔ اور اس تاخیر پر مختلف انداز سے لوگوں کے جو تاثرات وجذبات سامنے آتے رہتے ہیں انھیں بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی تشویش بالکل فطری ہے۔ بہر حال یہ نہایت ضروری ہے کہ تمام مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کی جائے اور اس ادارے کو صحیح معنے میں فعال اور مؤثر بنانے پر فوری توجہ دی جائے تاکہ وہ طے شدہ خطوط پر گامزن ہو جائے۔ اور اس سے تعلق خاطر رکھنے والوں میں مایوسی و بددلی کی بجائے عزم وحوصلہ پیدا ہو۔

افریقی ممالک کا بھیانک قحط

ایتھوپیا اور افریقہ کے وہ دوسرے ممالک جو ان دنوں زبردست قحط کی لپیٹ میں ہیں وہاں لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد موت کی آغوش میں سو چکی ہے جن میں بچے اور ضعیف عورتوں اور مردوں کی اکثریت ہے اور جو لوگ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حالت پر رحم فرمائے۔ ان پر رزق کی راہیں کھولے اور ان کی مصیبت وپریشانی رفع فرمائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قحط کی مصیبت خشک سالی کے باعث پیدا ہوئی ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان ملکوں کی حکومتوں اور مخالف حکومت گروہوں کے درمیان جو تصادم اور کشمکش برپا ہے اس نے خانہ جنگی کی صورت پیدا کر دی ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ ان ملکوں کے اپنے وسائل حالات کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہیں بلکہ باہر سے جو امداد مل رہی ہے وہ بھی کچھ اس طرح کی ناعاقبت اندیشانہ حرکات کی نذر ہو رہی ہیں۔ پریس میں جو خبریں آتی رہتی ہیں ان سے تو یہاں تک تاثر ملتا ہے کہ حکومتیں ان لوگوں تک صحیح طور پر امداد نہیں پہنچنے دیتیں جو اصلاً اس کے مستحق ہیں۔ بلکہ اس اختلاف خیال نے مشکل کو اور سخت بنا دیا ہے کہ امداد حکومتوں کے ذریعے پہنچے یا ان دوسرے ذرائع سے جو امداد پہنچانے والی ایجنسیوں کے نزدیک قابل اعتماد ہوں۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں افریقی مصیبت زدہ بھائیوں کی امداد کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ مگر بہت بڑے پیمانہ پر توجہ کرنے کی ضرورت ایسا ہی خود اقوام متحدہ کے بعض ذمہ داروں کی جانب سے

ہوتا ہے۔ ان ملکوں کی خاصی بڑی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور دولت مند مسلمانوں کی جانب سے ابھی تک وہ توجہ نہیں کی گئی ہے جو ان کی ذمہ داری کا تقاضا ہے۔ یوں تو انھیں ان تمام ہی لوگوں کی خدمت کے لیے اپنے مالی وسائل سے کام لینا چاہیے جو روٹی، روزی اور دیگر اشیائے ضروری کے محتاج ہیں لیکن انھیں اس خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ باہر سے جو امداد وہاں پہنچ رہی ہے اس سے خود مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی راہیں کشادہ ہو رہی ہیں جو خدانخواستہ ناپسندیدہ نتائج بھی پیدا کر سکتی ہیں۔

ایران عراق جنگ

عراق اور ایران کے درمیان جو جنگ تقریباً ساڑھے چار سال سے جاری ہے اس کا کوئی بہتر مثبت نتیجہ سامنے نہ آیا ہے اور نہ بظاہر اس کی کوئی توقع ہی دکھائی دیتی ہے اس سے طرفین کا جو جانی ومالی نقصان ہوا ہے اور خاصے وسیع علاقے کی جس طرح بربادی ہوئی ہے اس پر مسلمانان عالم کا گہرا دکھ اور روحانی اضطراب بالکل قدرتی ہے مسلم سربراہان مملکت غیر جانبدار تحریک اور اقوام متحدہ کی جانب سے اس سلسلے میں جو کوششیں ہوئی ہیں وہ ابھی تک وہ بھی ناکام تا ہی ثابت ہوئی ہیں بلکہ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ فی الواقع ان اداروں کی جانب سے طرفین کے سامنے باہمی سمجھوتے اور جنگ بندی کے سلسلے میں کیا تجویزیں پیش کی گئی ہیں اور وہ خود اس مقصد کے لیے کن نکات کو جنگ بندی اور صلح وصفائی کے لیے منصفانہ اور قابل قبول عمل سمجھتے ہیں۔ بہرحال دونوں متصادم طاقتوں کو ذرا ٹھنڈے دل اور پوری سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ اس بے مقصد جنگ سے امت مسلمہ کا کتنا زبردست نقصان اور اس کی رسوائی ہو رہی ہے اور صلح وصفائی کرانے والوں کو بھی مدبرانہ اور حکیمانہ انداز میں اپنی کوششیں تیز تر کر دینی چاہییں تاکہ وہ کامیاب ہوں اور جنگ جلد سے جلد بند ہو جائے۔
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صحت مندانہ خطوط پر کوششیں جاری رکھنے کا موقع فراہم اور انہیں کامیابی سے ہمکنار کرے

افغانستان

گذشتہ پانچ برسوں سے افغانستان کا مسئلہ عالمی ضمیر کے لیے ایک زبردست چیلنج بنا ہوا ہے اور اسے حل کرنے کی جو کوششیں اب تک ہوئی ہیں صحیح معنوں میں ان کا کوئی حل اب تک سامنے نہیں آیا ہے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوویت یونین جو اس قضیہ کا اصل ذمہ دار اور فریق ہے اپنی جارحیت کا سلسلہ برابر جاری رکھنا چاہتا ہے اور سیاسی حل کے لیے جو مذاکرات اقوام متحدہ کے نمائندے کے ذریعے ہوتے رہے ہیں ان سے بھی اس کا مقصد افغانستان میں اپنی جڑیں مضبوط کر لینا ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اقوام متحدہ کے نمائندے کی جانب سے آئندہ مہینے کے لیے

مذاکرات کے سلسلے میں جو بیان شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ آخر کار مذاکرات کامیاب ہوں گے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ متعلق طاقتیں اور دنیا کے آزادی پسند ممالک اس مسئلہ کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کریں تاکہ اس علاقے اور پوری دنیا کے امن و امان کو برباد ہونے سے بچایا جا سکے اس سلسلے میں اسلامی کانفرنس اور مسلمان اقوام کی جو ذمہ داری ہے اسے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے انھیں اس پر ضرور نگاہ رکھنی چاہیے کہ افغانستان کا مسئلہ ہو یا ان کا کوئی دوسرا مسئلہ، اس کا حل اسی صورت میں بر آمد ہو سکتا ہے جبکہ خود انہیں اس کا صحیح شعور و احساس ہو اور اپنی صلاحیتیں اور وسائل ان پر لگانے کے لیے آمادہ و تیار ہو جائیں۔

اسلحہ کی دوڑ اور بڑی طاقتیں

ایک طویل عرصہ سے بڑی طاقتوں کے درمیان جدید اسلحہ خاص طور پر ایٹمی ہتھیاروں کی جو قابل نفرت دوڑ جاری ہے اس نے پوری دنیا کو شدید اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ امریکی روسی مذاکرات سے جب گزشتہ سال روس نے علیحدگی اختیار کر لی تھی تو دنیا کی پریشانی و بےچینی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی یہ کہنا تو مشکل ہے کہ بڑی طاقتوں کو عام انسانی برادری کے مستقبل کا کس حد تک خیال ہے لیکن خود اسے ان کے اپنے تحفظات و مفادات کے شدید طور پر متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہی کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ مذاکرات کا آغاز کرنے پر پھر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اگرچہ امریکہ کے خلائی دفاعی تجربات کا اختلافی مسئلہ کبھی کبھی یہ اندیشہ بھی پیدا کر دیتا ہے کہ یہ مذاکرات کسی مرحلہ پر پھر ناکام نہ ہو جائیں پھر بھی بڑی حد تک یہی توقع کی جا رہی ہے کہ ان کا کچھ نہ کچھ مثبت نتیجہ ضرور نکلے گا۔ ان دونوں بڑی طاقتوں اور ان کے علاوہ دیگر یورپی بڑی طاقتوں کو اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی سے غور کر کے وہ اہمیت دینی چاہیے جس کا یہ مسئلہ فی الواقع مستحق ہے۔ ساتھ ہی دنیا کی دوسری قوموں کو بھی اپنی زوردار آواز بلند کرنی چاہیے۔ تاکہ وہ کسر و انکسار سے کام لیکر جوہری اسلحہ پر مکمل پابندی یا بدرجہ آخر معقول حد تک ان میں تخفیف کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

پچھلے دنوں دہلی کی سربراہ کانفرنس میں ۶ ملکوں کے درمیان مذاکرات میں جو نکات متعین کیے گئے توقع ہے کہ ان سے بھی اس معاملہ میں مدد ملے گی

اس دوڑ کے خاتمے سے متعلق فیصلے کے ساتھ اس طرح کی نگرانی کے انتظام پر بھی اتفاق ضروری ہے جو مؤثر طور پر اس امر کی دیکھ بھال کرتا رہے کہ معاہدات کی کسی جانب سے بھی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔

عرب ممالک میں

نیشنلزم، سوشلزم اور بعث ازم شکست کھا چکے ہیں

(مولانا خلیل حامدی)

گوجرانوالہ۔ (نمائندہ ریاض) ڈائریکٹر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ انٹرنیشنل ایجوکیشن اکیڈمی اور ناظم دارالعروبہ منصورہ مولانا خلیل حامدی نے بیان کہا کہ عرب ملکوں میں نیشنلزم اور سوشلزم اور بعث ازم شکست کھا چکے ہیں اور نوجوان نسل میں نہایت تیزی کے ساتھ تحریک اسلامی سے وابستگی بڑھ رہی ہے۔

ایک خصوصی انٹرویو میں مولانا خلیل حامدی نے خلیجی ملکوں کے تازہ دورے کے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ عرب ملکوں میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم تحریک اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر نے گہرا اثر ڈالا ہے اور عرب قومیت اور لادینی نظریات شکست و ریخت کے بعد معدوم ہو جانے کے مرحلے سے گذر رہے ہیں جبکہ بیشتر تعلیمی اداروں میں منظم طور پر تحریک اسلامی کے لیے کام ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ البتہ دولت کی فراوانی اخلاقی فساد پھیلانے کے شیطانی کام کر رہی ہے تاہم نئی نسل بڑے تناسب کے ساتھ رجوع الی الاسلام کی طرف مائل ہے مکاتیب میں اسلامی لٹریچر شدت سے نظر آتا ہے۔ قطب شہیدؒ اور مولانا مودودیؒ کے علاوہ وہاں اسکالرز کا خاصا طبقہ پیدا ہو چکا ہے جن کی تصنیفات تحریک اسلامی کو آگے بڑھانے میں اہم عنصر کی اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ ان اسکالرز میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی، محمد الغزالی، انور الجندی، ڈاکٹر عبدالعزیز زیدان، ڈاکٹر حسن ترابی اور قطبی جیسے مفکر شامل ہیں۔ جناب خلیل حامدی نے عرب عوام میں ایران و عراق جنگ کے تاثرات اور اثرات کا ذکر کیا اور کہا کہ عرب ملکوں کے عوام اس جنگ سے سخت نالاں ہیں اور پورے علاقہ کا معاشی طور پر ستیاناس کر دیا گیا ہے۔ دونوں حریف (ایران و عراق) تو تباہ ہو ہی گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقہ کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے فراوانی سے دولت عطا کی تھی۔ قدرتی وسائل ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود، اسلام کی سربلندی پر خرچ کیے جانے چاہیے تھے لیکن یہ وسائل مسلمانوں کی تفرقہ اور تباہی کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں اور اس کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ اس جنگ میں اسلحہ تیار کرنے والے بڑے بڑے ملکوں اور اسلحہ کے تاجروں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ مشرق و مغرب دونوں بلاک اس جنگ سے اسلام کے مرکزی علاقوں کو

تباہ و برباد کرنے کی سازش کر رہے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایران و عراق جنگ سے اسرائیل کو فائدہ پہنچ رہا ہے انھوں نے کہا کہ ایران و عراق کی طویل جنگ نے مسلمانوں کی تاریخ میں سیاہ باب کا اضافہ کیا ہے جسے جس قدر جلد بند کیا جائے بہتر ہے۔ اس جنگ کی ابتدا کس نے کی اور جارح کون ہے؟ یہ بحث تو سیاست دانوں کا حصہ ہے لیکن نتائج و اثرات یہ ہیں کہ اس علاقہ کے عوام دنیا بھر کے دانشمندوں کی قیادت کی طرف نظر کیے ہوئے ہیں کہ ایران و عراق کو جنگ سے باز رکھا جائے تاہم یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ ان حالات میں تحریک اسلامی اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ مولانا خلیل حامدی نے بتایا کہ خلیجی ملکوں میں یونیورسٹیوں میں مولانا مودودیؒ پر ریسرچ ہو رہی ہے اور طلباء ان کے فکر پر پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایم اے ریسرچ کر رہے ہیں حال ہی میں ریسرچ یونیورسٹی میں اردن کے طالب علم نے مولانا مودودیؒ اور نظریات سیاست شرعیہ کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے ڈگری حاصل کی۔ ایک طالب علم نے "اسلامی ریاست کا تصور کیا ہے" پر ڈگری لی۔ مکہ یونیورسٹی (ام القراء) میں ایم اے کرنے والے طلباء نے مولانا مودودیؒ اور طرز تفسیر "مولانا مودودیؒ اور طریقۂ دعوت انقلاب" اور ایک طالبہ نے "مولانا مودودی اور تعلیمی نظریات" پر مقالہ پیش کر کے ڈگریاں حاصل کیں۔ مدینہ یونیورسٹی میں ایک نوجوان نے "مولانا اور ان کے اسلوب دعوت" کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مولانا خلیل حامدی نے کہا کہ تعلیمی اداروں میں مولانا مرحوم کی فکر پر جو تحقیق ہو رہی ہے یہ ان پر اعتماد اور مقبولیت کی علامت ہے مولانا خلیل حامدی نے عرب ملکوں میں افغانستان پر روسی جارحیت کے سلسلے میں تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہاں کے عام شہری کا دل مجاہدین افغانستان کے ساتھ دھڑکتا ہے اور عرب ملکوں میں روسی لابی اور ان کے حامی بھی افغانستان پر روس کے ظالمانہ حملہ سے شرمندہ و شرمندہ نظر آتے ہیں وہاں کے عوام مجاہدین کی سیاسی اور مادی امداد میں پیش پیش رہتے ہیں البتہ حکمرانوں کی بین الاقوامی مساعی صرف زبانی حد تک نظر آتی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۲) تو ماں بچے کے تخلیقی عمل کے بعد وضع حمل سے فراغت پاتے ہی اس کی رضاعت سے فارغ ہوتے ہوتے پھر یہ سلسلہ دوبارہ چل پڑتا ہے۔ اس لیے عورت فطری طور پر پابند ہوتی ہے اس لیے اسلام نے بھی اس کے دائرۂ عمل کو گھر تک محدود رکھتے ہوئے اس کو خاندانی ذمہ داریوں کا بوجھ سپرد کیا ہے۔ اس کے علاوہ گھر سے باہر کی لاتعداد ذمہ داریاں اسلام مرد کے حوالے کر دیتا ہے۔ جس کی صلاحیت اس میں پہلے ہی سے ہوتی ہے اور جن کی ادائیگی سے اس کی شخصیت نہ صرف تعمیر ہوتی ہے بلکہ اس میں نکھار بھی آتا ہے اور اس کا ارتقاء بھی ہوتا ہے۔

(باقی آئندہ)

ترکی میں
نفاذِ اسلام کی کامیاب جدّوجہد

(محمود الازہر ندوی)

ادھر کچھ دنوں سے ترکی اور عالم اسلام اور خاص طور سے عرب ممالک سے تعلقات اخبارات کے موضوع بن رہے ہیں اور آئے دن ایسی خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ ترکی اور مسلم دنیا کے درمیان تعاون میں اضافہ کے اقدامات کئے جا رہے ہیں تجارت کو فروغ دینے کے لئے بامقصد اور مثبت اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ان ملکوں کے تعلقات میں اضافہ و تیزی کی وجہ دو چیزیں ہیں، ایک تو معاشی اور دوسرا دینی و عقائدی

ترکی میں اسلام پسند اور مغرب نواز و کمیونسٹوں اور سیکولر کمالیوں کی کشمکش کوئی نئی بات نہیں رہی ہے مصطفےٰ کمال اتاترک نے ترک عوام کو عالم اسلام سے علیحدہ اور دور کرنے کے لئے وہ تمام اقدامات کئے جہاں تک اس کے ذہن کی رسائی ممکن تھی یعنی خلافت کا عظیم رشتہ جو عالم اسلام کا سرمایۂ افتخار و عزت و عظمت تھا کو ختم کر کے عالم اسلام کو پارہ پارہ کیا اور ترکی کو مغرب کی گود میں ڈال دیا اور اسلامی تشخص کی جتنی خصوصیات ہو سکتی تھیں اس کو ختم کر دیا۔ عربی رسم الخط کو بدل دیا پردہ اور دینی تعلیم کو ممنوع قرار دیدیا۔ مگر وقت نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے اور قوم نے ان تمام پابندیوں کے باوجود اپنے کو اسلام سے متعلق رکھا اور اسلام کو بحیثیت مذہب کے تسلیم کیا۔ ۱۹۸۰ء میں جب فوج نے اقتدار پر قبضہ کیا تو وہ گویا ترکی کی نجات دہندہ کی حیثیت سے سامنے آئی کیونکہ وہ حکمران طبقہ کو کئی بار خبردار کر چکی تھی کہ وہ ملک میں خون خرابہ کو دیر تک برداشت نہ کرے گی اور ترکی کی معیشت کو تباہ ہوتے ہوئے تماشائی نہ دیکھے گی۔ فوج نے حسب وعدہ ۱۹۸۳ء میں انتخابات کرائے اور زمام اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالہ کر دیا۔ مگر عوام حکومت کی مرضی اور خواہش کے خلاف مدر لینڈ پارٹی جس کی قیادت ایک الیکٹریکل انجینئر کر رہے تھے، کو بھاری اکثریت سے برسر اقتدار لے آئے اور یہ تبدیلی ملک و ملت دونوں کے لیے فال نیک تصور کی گئی کیونکہ مدر لینڈ کے قائد ترگت اوزال خود تو ایک الیکٹریکل انجینئر تھے مگر وہ ملک کو بچانے اور تعمیر کرنے کی

پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ فوجی حکومت کے دور میں نائب وزیر اعظم کی حیثیت سے ملک کے اہم عہدوں پر فائز رہنے سے قبل کے زمانے میں سکریٹریٹ میں اقتصادی امور کے نگراں تھے اور ملک کو درپیش مسائل سے پوری طرح واقف تھے اور عوام کو جن مشکلات کا سامنا تھا وہ بھی ان کے سامنے تھے۔ وہ بنفس نفیس عقائدی اور دینی لحاظ سے بھی کم مضبوط نہ تھے ان کے ساتھ ملی پارٹی کے گہرے تعلقات تھے اور وہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ملی سلامت پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے ازمیر کے ساحلی شہر سے انتخابات میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت ملی سلامت پارٹی کے نائب صدر ان کے بھائی کرگت اوزال تھے۔ اس لحاظ سے وہ سیکولرلسٹ نہیں ہیں۔ وہ نماز روزے کے پابند ہیں اور وہ دیہی علاقوں میں بے حد مقبول ہیں اور انہی کے ووٹوں پر کامیاب ہوئے ہیں۔

ترکی کے درپیش مسائل میں سب سے اہم دہشت پسندی پر قابو پایا اور معیشت کو مثبت اساس پر استوار کیا۔ انھوں نے اس میدان میں اتنی تیزی سے اقدامات کیے کہ اس پر عالمی اداروں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ اس کے بعد کا مرحلہ ترکی کے لیے اس سے زیادہ تابناک اور روشن رہا کیونکہ ترکی نے اپنے قدیم رشتے، قدیم ثقافت اور قدیم محبت و عقیدت جو اس کی تاریخ کا تابناک اور روشن پہلو ہے پر غور کرنا شروع کیا اور عالم اسلام کے مسائل میں دلچسپی لینے لگا۔ کیونکہ انہیں عالم اسلام کے تعاون کی ضرورت تھی اور عالم اسلام کو ان کے تجربے کی۔

نومبر کے اوائل میں مشترکہ اسلامی عالمی منڈی کے قیام پر غور کرنے کے لیے استنبول میں عالم اسلام کا ایک اجلاس ہوا اس میں ۴۸ ممالک کے وزرائے تجارت و صنعت نے شرکت کی اور اس میں ۷۵ نکاتی منصوبے پر غور کیا گیا۔ اس میں ترکی نے جو کہ میزبان ملک تھا گرم جوشی سے حصہ لیا اور ایک مثبت و تعمیری منصوبہ پیش کیا جو عالم اسلام کے مفاد میں تھا اور ان ہی منصوبوں کے ذریعے خود کو بھی عالم اسلام سے قریب تر کر لیا اور عالم اسلام سے صنعت و حرفت اور ایمان و عقیدہ دونوں میدانوں میں تعلقات کو وسیع تر بنیادوں پر استوار کرنے لگا۔

ترکی یہ جانتا تھا کہ اس کا یہ طرز عمل مغربی لابی کو پسند نہ آئے گا کیونکہ ترکی یورپ کے دروازے پر ہے اگر وہ عقیدہ و ایمان میں اسی طرح مضبوط ہو گیا جس طرح ایک زمانہ میں تھا تو یورپ کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہوگا اور مغربی لابی کے ان احساسات کی وجہ سے ترکی کے وزیر اعظم ترگت اوزال نے اپنے موقف کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ مغربی ملکوں کی تشویش کے باوجود ترکی اسلامی ملکوں کے ساتھ تعلقات بڑھاتا رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ ترکی اور اسلامی ملکوں کے روابط کے بارے میں مغربی ملکوں کے خدشات بے بنیاد ہیں۔ مغربی ملکوں کو سوچنا چاہیے کہ ترکی کی ۹۰ فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ کیا وہ ہم سے اسلام ترک کرانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو اپنے مسلمان بھائیوں سے تعلقات بہتر بنانا ہیں۔ عثمانی خلافت کے دور ہی سے

مسلمان ایک عظیم معاشرے کی طرح اکٹھے رہتے ہیں اور عرب اور غیر عرب کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ ترکی عرب اور ایشیا میں واقع ہے اس لیے وہ مغربی دنیا اور عالمِ اسلام کے درمیان پل کا کام دیتا ہے اور اسلامی دنیا کے ساتھ تعلقات بنانے کی بڑی گنجائش ہے اور کئی شعبے ایسے ہیں کہ جن میں تعاون کی ضرورت ہے۔

اور دوسری چیز جو ترکی کے لیے باعثِ فخر اور مسلمانوں کے لیے موجبِ عزت و احترام ہے کہ ترکی عالمِ اسلام سے علیحدہ ہو جانے اور کٹ جانے کے بعد عالمِ اسلام کے زمرے میں شامل ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان کے وزیرِ صنعت و تجارت جناب الٰہی بخش صاحب نے کہا کہ ترکی میں اسلامی قوانین کا نفاذ ایک خوش آیند اقدام معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترکی میں اسلامی تبدیلی آتی جا رہی ہے اور اس کے اسلامی ممالک سے تعلقات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جمہوریہ ترکی میں بڑی تبدیلی آ رہی ہے وہ اسلامی برادری میں سرگرمی کے ساتھ شامل ہو رہا ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ترکی میں جس کا آئین سیکولر ہے۔ اسلامی قوانین کا نفاذ کیا جا رہا ہے اور اسلام کسی کا ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ پورے ترک معاشرے کا اجتماعی معاملہ بن گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ترکی میں شراب پر مکمل پابندی لگا دی گئی ہے اور نمازِ جمعہ کے اجتماعات میں وزراء اور اعلیٰ حکام بھی عوام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ترکی میں یہ احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ ہمارا تشخص اسلام ہی کی بنیاد پر قائم ہے اور اس پر عمل کر کے ہم دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ترکی میں احیاءِ اسلام کی جدوجہد اور عوام کے اسلام سے والہانہ ربط و تعلق نے متعدد بار مغربی لابی کو مجبور کیا ہے کہ وہ اس پر مختلف قسم کے سیاسی اور معاشی دباؤ ڈالے کہ وہ اپنا رشتہ اسلام سے توڑ لے اور وقتی طور پر انہیں کامیابی بھی ہوئی اور اسلام پسندوں کو قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا مگر جو عقیدت قوم کے مزاج اور رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی اور ان کے دل و جان میں صدیوں سے پروان چڑھی وہ کیسے نکل سکتی ہے اس سے قبل اسلام پسند جماعت ملی سلامت پارٹی پر پابندی لگائی گئی اور اس کے سربراہ کو جیل کی آہنی سلاخوں میں دھکیل دیا گیا۔ ترک عوام باشعور ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی فلاح و خیر کس میں ہے ان کو ماضی میں بھی عزت و افتخار کیوں کر حاصل ہوا اور اس وقت بھی ان کو عزت و احترام کیونکر حاصل ہو سکتا ہے اور ملک کو کس طرح سرخروئی حاصل ہو سکتی ہے اور وہ کس طرح اپنے ماضی کی تاریخ کا ایک جز بنکر تابناک مستقبل اور روشن دنوں کی تعمیر کر سکتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلامی رشتے میں کیا طاقت ہے اسلامی اخوت میں کتنی کشش ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے اور عالمِ اسلام کے درمیان کیا چیز مشترک ہے اور ان کا ملک کا ورثہ کیا اور کس میں ان کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

مغرب بہت ہوشیار ہے وہ بھی خوب سمجھتا ہے کہ ترکی عالم اسلام سے قریب ہو کر ان کے شانہ بشانہ چلنے لگے گا تو اسے مغرب کی فکر کم اور مشرق کی فکر زیادہ رہے گی کیونکہ وہ عالم اسلام کا ایک اہم جز ہوگا اور اس کا کردار بھی مرکزی ہوگا۔ دنیا جانتی ہے کہ ترک فوجوں نے یورپ کا مرد بیمار ہونے کی حالت میں کن کن علاقوں میں اسلام کی روشنی پھیلائی اور ترک انجینیروں اور مزدوروں کا یورپ کی صنعتی ترقی میں کتنا عظیم حصہ ہے۔ اب وہ اپنے ملک کو منتقل کیے جا رہے ہیں۔ اگر ان کی قوت عمل مشرق کو حاصل ہوگئی تو عالم اسلام کو صنعتی ترقی کے لیے ایک وسیلہ اور تجربہ کار افراد اس میدان میں مل جائیں گے اور عالم اسلام کو مضبوط بنیادیں حاصل ہو جائیں گی اور اپنے ایمانی رشتہ کی وجہ سے وہاں اسلام کے خفتہ تخیل میں ایک نئی روح اور زندگی پیدا ہو جائے گی۔

ترکی نے عالم اسلام کی پاسبانی کا کام عہد ماضی میں بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ اپنی ایمانی حرارت اور جوش سے پورے یورپ کو مرعوب کر رکھا ہے اور ان علاقوں میں اسلام کی شمع اسی نے روشن کی اور یورپ کو ایمان کا درس دیا اور ترکی کو اپنے مرکز یعنی اسلام کی طرف واپسی سے عالم اسلام کو صرف طاقت و قوت اور اعتماد ہی حاصل نہ ہوگا بلکہ ترک قوم کو بھی تفوق حاصل ہوگا اور اس علاقہ سے انتشاری کیفیت دور کرنے میں مدد ملے گی لہذا ترکی میں احیاء اسلام کی کوششیں اور عالم اسلام کے حلقہ میں موثر انداز میں ایک خوش آئند بات اور فال نیک ہے اور اس کے نتائج مثبت اور تعمیری نکلیں گے جو عالم اسلام کا سرمایہ افتخار ہوگا۔

(بقیہ صفحہ ۴۵)

پہاڑوں کے زیادہ تر مسلمان جنھیں "چوروت" کہا جاتا ہے، چوڑیاں فروخت کر کے اور اپنی ٹکڑوں میں منقسم تھوڑی سی زمین پر کاشت کر کے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔ ان مسلمانوں کے پاس اوسطاً (۰.۸۶) ہیکٹر کھیت ہیں ترائی کے وہ مسلمان جن کے پاس بالکل کھیت نہیں ہیں مزدوری کر کے اپنی روزی کماتے ہیں، کچھ دوسرے لوگ رکشا چلاتے ہیں اور روزمرہ کمانے والے مزدور ہیں اور اس کا لب لباب یہ ہے کہ ترائی کے مسلمان اقتصادی طور پر بہت زیادہ پریشان حال ہیں۔ ویسے تو پورے نیپال ہی میں عام طور سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت روبہ زوال ہے۔

(باقی)

مصنف: حامد انصاری

نیپال میں مسلمان

(ترجمہ:- حافظ محمد نسیم قریشی)

عظیم ہمالیہ کے دامن میں واقع نیپال ایک چھوٹا سا ملک ہے جو جنوب میں ہندوستان سے اور شمال میں چینی تبت سے گھرا ہوا ہے۔ اس کا کل رقبہ تقریباً (۵۴۳۶۲) مربع میل ہے۔ جدید نیپال کی سرحدیں اٹھارہویں صدی عیسوی میں متعین کی گئی تھیں حالانکہ یہ سلطنت زمانہ قدیم سے خود مختار اور سیاسی اہمیت کی حامل رہی ہے۔

رقبہ کے لحاظ سے بہت ہی چھوٹا ملک نیپال قطعہ زمین کے لحاظ سے مختلف النوع ہے۔ چنانچہ جنوب میں اگر ترائی کا علاقہ ہے تو وسطی حصہ میں پہاڑی سلسلے نیز نشیبی زمین واقع ہے اور شمال میں ہمیشہ برف پوش رہنے والی ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیاں بلند ہیں اور ان میں ہی دنیا کی بلند ترین چوٹی "ایورسٹ" بھی جلوہ فگن ہے۔

خطہ زمین کی مانند لسانی، تہذیبی اعتبار سے بھی نیپال مختلف النوع ہے۔ اس ملک میں کم سے کم چالیس تہذیبی اور لسانی معاشرے ہیں۔ اس گنتی میں وہ چھوٹے چھوٹے لسانی، نسلی اور تہذیبی معاشرے شامل نہیں ہیں جن کی تعداد محض چند ہزار ہے۔ نیپالی زبان بولنے والے ہندوؤں کا گروہ ان سب پر حاوی ہے۔

ان گروہوں میں تبتی زبان بولنے والے منگول شمال میں اونچے اونچے ہمالیائی خطوں میں رہتے ہیں جہاں کی آب و ہوا نہایت سرد ہے اور جو آٹھ ہزار سے سولہ ہزار کی فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ہمالیہ کے جنوب میں دلکش و دل فریب کوہستانی وادیاں واقع ہیں جہاں تبتی، برمی نیز انڈو آرین زبان بولنے والے مختلف کوہستانی نیز وادیائی لوگ رہتے ہیں یہ مقام سطح سمندر سے ساڑھے تین ہزار سے لے کر سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں کی آب و ہوا خشک و معتدل و گرم معتدل ہے۔ یہی سب سے زیادہ گھنا اور بسا ہوا علاقہ ہے اور یہیں کل آبادی کی ساٹھ فی صد تعداد رہتی ہے۔

جغرافیائی ماحول کے لحاظ سے ترائی کا مشرقی علاقہ مغربی علاقے سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ حقیقت میں یہ علاقہ شمالی ہندوستان کی عظیم گنگا ندی کی وادی کا ایک مزید پھیلا ہوا حصہ ہے۔ یہاں کی بلندی سطح سمندر سے بمشکل ۲۵۰ فٹ

ہے اور آب و ہوا گرم مانسونی ہے۔ اس علاقے کے معاشرتی رسم و رواج، مذہبی عقائد، شادی بیاہ کی رسومات حتیٰ کہ اقتصادیات نسلی گروہوں اور نیپال کی سرحدوں سے ملحق ہندوستانی علاقوں کے اثر کی وجہ سے کچھ حد تک جدا جدا ہیں۔ نیپال کی تقریباً چالیس فی صد آبادی اسی ترائی کے علاقے میں رہتی ہے۔

انتظامی طور سے پورے ملک کو ۷۵ ضلعوں (۱۴) زونز نیز چار پلاننگ ریجن میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ ہر ضلع میں اس کی آبادی کے لحاظ سے کئی کئی گاؤں پنچایتیں ہیں۔ ہر زون میں (۴) سے (۷) ضلع شامل ہیں اور ہر پلاننگ ریجن (۳) سے (۵) ضلعوں پر مشتمل ہے۔

تاریخی پس منظر

قطعیت کے ساتھ یہ نشان دہی کرنا مشکل ہے کہ نیپال میں سب سے پہلے مسلمان کب وارد ہوئے لیکن حقیقت ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے ہی عرب دنیا ملک نیپال سے واقف تھی۔ ۹۸۲ء میں شائع ایک عربی کتاب "حدود العالم" میں نیپال کا ذکر ہے اور اس کتاب میں یہ تذکرہ بھی ملتا ہے کہ عرب ملکوں کو نیپال سے مشک برآمد کی جاتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں نیپال پر خاندان لچھوی کے دور حکمرانی کے دوران مشک اہم برآمدات میں سے ایک تھی۔ اشو ورما کے سنگ کتبات (نقوش) کے مطابق لوہا، کیمر، اون، مشک اور کانسے کے برتن نیپال سے مختلف ممالک کو برآمد کیے جاتے تھے۔ جنوبی ہندوستان کے راجہ یادو کرشنا کے کتبات بھی اس امر کے گواہ ہیں۔ پھر بھی یہ بات بالکل صاف نہیں ہے کہ عربوں کے ساتھ نیپال کے تجارتی روابط براہ راست تھے یا بالواسطہ۔ حالانکہ لچھوی بادشاہوں کے زمانے میں نیپالی تاجروں کے روابط تبتی، چینی اور ہندی تجار سے براہ راست تھے۔ اور یہ بین الاقوامی سوداگر "سرتھواہ" کے نام سے جانے جاتے تھے۔

اس کے بعد کئی صدیوں کی تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ بارھویں صدی کے اختتام کے دوران شمالی ہند میں مسلم سلطنت کے قیام کے بعد نیپال پر اسلامی اثرات کے بارے میں پھر تاریخ گویا ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں نالندہ اور وکرم شیلا یونیورسٹیوں کے بہت سے ہندو عالم و فاضل ہندوستان سے بھاگ کر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے بودھ بھکشو بھی یہاں پہنچ گئے جنہوں نے اس ملک کو بودھ تعلیم اور بودھ مذہب کا اہم ترین مرکز بنایا۔

ہندوستان کی مسلم حکومت اور نیپال کی ہندو سلطنت کے درمیان براہ راست تصادم ۱۳۲۴ء میں اس وقت واقع ہوا جب کہ نیپال کی ترائی کے سمرہ علاقے کے حکمراں ہرسنگھ دیو نے دلی کے سلطان غیاث الدین تغلق کی فوجوں پر حملہ بول دیا۔ [illegible] اس معرکہ میں راجہ ہرسنگھ دیو کو شکست فاش ہوئی اور وہ پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس زمانے میں اس

علاقہ کی تین سیاسی قوتوں میں سے ایک راجدھانی "سمروں گڑھ" تہس نہس کردی گئی۔

ایک چوتھائی صدی بعد بنگال کے مسلم حکمراں سلطان شمس الدین نے وادی کاٹھمنڈو پر یورش بول دیا۔ اس زمانہ میں ملّا راجاؤں کی راجدھانی بھگتا پور تھی۔ چنانچہ بھگتا پور کو دیگر شہروں کانتی پور اور للت پور کے ساتھ زبردست نقصان اٹھانے پڑے لیکن خوش قسمتی سے حملہ آور واپس چلے گئے اور نیپال پر پھر سے نیپالیوں کا اقتدار قایم ہوگیا۔

مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں نیپال پر مسلم اثرات زیادہ نمایاں ہوگئے۔ حکمراں طبقہ میں خاص طور سے مسلم تہذیب کی عکاسی ہونے لگی نیز انتظامی و فوجی امور میں مسلم اثرات سرایت کرنے لگے۔ بھگتا پور، للت پور، اور کانتی پور جیسے عظیم شہروں کی تعمیر نو میں اسلامی فن تعمیر کی جھلک نمایاں تھی۔ وادی کاٹھمنڈو میں تعمیر کیا جانے والا چار ستون برج بھی اسلامی فن تعمیر کا شاہد ہے۔ مسلم اثرات کا ایک دوسرا قابل ذکر ثبوت توپوں کا لگایا جانا بھی تھا۔ جس کے واضح ثبوت ہمیں عہد وسطیٰ کے آخری دور کے درمیان "مم جنگ" اور "گورکھا" کی کوہستانی سلطنتوں میں ملتے ہیں۔

طرز معاشرت و فن تعمیر کے ساتھ ساتھ اصطلاحات پر بھی مسلم اثرات کی چھاپ پڑی۔ دیوان، بخشی، قاضی سردار، امراؤ، کوتوال اور منصب جیسے الفاظ اس اثر کے گواہ ہیں۔ علاوہ ازیں اردو اور فارسی زبان سے واقفیت تہذیب و تمدن کی علامت تصور کی جانے لگی۔ سکوں پر نقش کیے جانے کے لیے راجہ پرتاپ ملا اردو رسم الخط کا استعمال کرتا تھا۔ ہنومان کے مشہور معروف حجری ستون پر دیگر (۱۵) زبانوں کے ساتھ ہی ساتھ اردو رسم خط بھی موجود ہے ملا راجاؤں کو زبان فارسی سے اس قدر شغف تھا کہ انھوں نے فارسی کلام کا ایک مجموعہ مرتب کرایا جس کا نام تھا "فارسی شاعری کی جھلک" اور جس میں نواری زبان میں توضیحی کلمات بھی تحریر تھے۔ بہت سے راجہ اپنی دستخط بھی اردو رسم خط میں کرتے تھے۔ پربت کے راجہ کا اپنے بھائی کے نام تحریر کیا ہوا خط اس کی ایک اچھی مثال ہے۔

اس عہد کے راجاؤں نے لباس کے معاملے میں بھی مسلم طرز کو اپنا لیا تھا۔ ملّا راجاؤں کے مجسموں اور شبیہوں اور گورکھا حکمراں، راجا پرتھوی نتی شاہ کے مجسمے میں بھی مسلم اثر واضح ہے۔ لباس میں یہ اثرات عماموں سے لیکر پاپوش تک میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

نیپالی تاریخ کے مطابق نیپال میں مسلمان سب سے پہلے پندرہویں صدی عیسوی میں عہد رتنا ملا میں آئے اور دائمی سکونت اختیار کرلی اور اس علاقہ میں بین الاقوامی تجارت و سوداگری میں ان لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان تجارت کے علاوہ کچھ مسلم فقرا اور درویش بھی نیپال وارد ہوئے اور بس گئے لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی جبکہ نیپال کو اپنا وطن بنانے والے تجار کی تعداد کثیر تھی۔ ملا راجاؤں نے ان مسلمان کو دائمی طور پر رہائش پذیر ہوجانے کی اجازت

مرحمت فرمادی اور راجہ پرتھوی نارائن شاہ کے زمانے میں بھی اسی پالیسی پر عمل ہوتا رہا کچھ مسلمان دست کار اور فن کار کی حیثیت سے بھی نیپال آئے۔ خاندان شاہ کے حکمرانوں کے عہد میں چین اور دوسرے ممالک کے سفارتی وفود میں مسلمان مترجم کے روپ میں شامل کیے گئے۔

ونشاولی (تاریخی حقائق) کے مطابق کچھ مسلمانوں نے راجہ بھاسکر ملا (۱۷۰۰ء) سے انتہائی قربت حاصل کرلی تھی۔ وہ درباریوں اور مشیروں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوگئے تھے چونکہ اس عہد میں "نوار" اور "خاص" قبائل کے شرفاء اور امراء خاص درباری تھے۔ اس لیے ان کو مسلمانوں کا عروج ایک آنکھ نہ بھایا اور ان لوگوں نے پردیسی لوگوں کے خلاف سازشیں کرنا شروع کردیں۔ دو سال کے عرصہ میں یہ اندرونی خلفشار رہا بالآخر مسلمانوں کی مراجعت اور مقامی شرفاء اور امراء کی فتح پر ختم ہوا

نیپال میں مسلمانوں کی تاریخ کا یہ ایک انتہائی مختصر خاکہ ہے جس کا بنیادی مقصد ان مختلف کتبات، تاریخی ریکارڈ اور حقائق نیز مستند دستاویزات جن میں کہ تاریخ مدفون ہے کی جانب منعطف کرنا ہے اور جنھیں محققین نیز نیپالی تاریخ کے طلبہ کی مساعی جمیلہ کا انتظار ہے۔

نیپال کی مسلم آبادی

۱۹۷۱ء کی شائع شدہ مردم شماری رپورٹ کے اعداد کے مطابق مسلمان کل نیپال کی آبادی (ایک کروڑ پندرہ لاکھ پچپن ہزار نو سو ترپن) کا ۳۰ء۳ فی صد ہیں یعنی مسلمانوں کی کل آبادی تین لاکھ اکیاون ہزار ایک سو چھپن ہے۔ جبکہ ہندو ایک کروڑ تین لاکھ تیس ہزار نو اور بودھی ۴۱۱۴۶۶ کی تعداد میں ہیں۔ اس طرح مسلمان نیپال میں دوسری سب سے بڑی اقلیت ہیں

نیپال کے سب (۷۵) ضلعوں کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق مسلمان صرف ۷۱ ضلعوں میں رہتے ہیں۔ نیپال کے تمام ضلعوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مسلمان یعنی اپنی کل آبادی کا ۱۶ء۹ فی صد کپل وستو ضلع میں رہتے ہیں اور انتظامی طور سے چار منطقوں میں منقسم نیپال کے "وسطی ترقیاتی علاقہ" میں بسنے والے مسلمان، نیپال کی کل مسلم آبادی کا نصف فی صد ہیں اور سب سے کم مسلمان فار ویسٹرن ڈویلپمنٹ ریجن میں سکونت پذیر ہیں۔

روزگار اور پیشے

"سنٹرل بیورو آف اسٹیٹکس" اور "نیشنل پلاننگ کمیشن" نامی ادارے سارے نیپال کے لیے یکساں لیبر پالیسی وضع کرتے ہیں۔ روزگار کے اعداد و شمار میں مسلمانوں کے بارے میں کوئی الگ تذکرہ نہیں ملتا۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۸۵ء تک کے ۶ مدتی منصوبے جن پر اب تک عمل درآمد کیا جا چکا ہے محنت (لیبر) کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی ضرورت پر زور دیتے ہیں

چھٹے منصوبے (۸۵-۱۹۸۰ء) کا تو یہ بنیادی مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ روزگار فراہم کر کے آہستہ آہستہ غریبی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس منصوبے کے دوسرے مقاصد میں بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنا سماجی ڈھانچے کی از سر نو تعمیر نیز قدرتی وسائل کی حفاظت اور ترقی شامل ہیں۔ باوجود ان پالیسیوں کے نیپال پر اس وقت بیروزگاری کا مہیب سایہ برقرار ہے۔ نیپال جیسے ملک میں جہاں کی (۹۰) فی صد سے بھی زیادہ آبادی کا پیشہ زراعت ہے۔ پہاڑی علاقوں میں ایک مزدور سال بھر میں اوسطاً صرف (۵۵) دن اور ترائی کے علاقہ میں ۱۸۰ دن ہی مزدوری کر پاتا ہے۔ حالانکہ مکمل روزگار کے لیے سال میں ۲۵۰ سے ۳۰۰ تک مزدوری کے دن میسر ہونا چاہئیں۔

نیپال میں مسلم اکثریت کاشتکاری کرتی ہے اور مسلمانوں کی اقتصادی حالت نیپال کے دیگر باشندوں سے مشابہ ہے۔ مسلمانوں کے پاس اوسطاً ایک بیگہ زمین ہے جو بہت زیادہ ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ زراعت کے قدیم طرز کو اپنانے اور آبپاشی کے لیے مانسونی بارش پر مکمل انحصار کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کی قابل کاشت زمین کی پیداوار زبردست انحطاط کا شکار ہے۔ مسلم زرعی مزدور ابھی تک کسی اور اقتصادی سیکٹر میں کھپائے نہیں جاسکتے ہیں۔

کاشتکاری کے علاوہ مسلمان سرکاری، نیم سرکاری، نیز نجی زمروں میں بھی برسرروزگار دکھائی دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی علیحدہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ محکمہ آبپاشی میں ایک ڈپٹی ڈائرکٹر، سپریم کورٹ کے ایک جج، وزارت زراعت میں ۳ فرسٹ کلاس آفیسروں، ۳ سینیر ڈاکٹروں، محکمہ ترقیات میں دو انجینیروں اور چار اوورسیروں اور تین ہیلتھ اسسٹنٹس سے مصنف ذاتی طور سے واقف ہے۔ تربھون یونیورسٹی (کاٹھمنڈو) میں ۵ لکچرر مسلمان بھی ہیں اور اسی طرح محکمۂ آثار قدیمہ میں ایک مسلم خاتون بھی برسرروزگار ہیں۔ مندرجہ بالا کے علاوہ مختلف سرکاری محکموں میں تھوڑے سے مسلمان نان گزیٹیڈ آفیسر اور کلرک بھی پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی اس طرح سرکاری محکموں میں کل ملازمین کے مقابلہ میں مسلمانوں کی نمائندگی برائے نام ہے جب کہ برہمن چھتری اور نواری کل ملازمین کا ۸۶ فی صد ہیں نجی زمروں میں مسلمان بہت ہی تھوڑے ہیں۔ آج کل بشمول عرب دنیا کے ممالک غیر میں روزگار کے مواقع کی تلاش کے لیے بہت سے نیپالی مسلمان اپنے ملک سے باہر جارہے ہیں ان میں اکثریت کاٹھمنڈو کے مسلمانوں کی ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر نچلے طبقہ کے کاریگر، ڈرائیور، معمار وغیرہ ہوتے ہیں۔

حالانکہ کاٹھمنڈو کے مسلمان خود کاشتکاری نہیں کرتے ہیں پھر بھی ترائی کے علاقے اور وادی کاٹھمنڈو میں ان کے کھیت واقع ہیں۔ کاٹھمنڈو کے زیادہ تر مسلمان تجارت پیشہ نیز دوکاندار ہیں اور ترائی میں بسنے والے مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا رہن سہن کافی اچھا ہے۔ کاٹھمنڈو کے ہر کشمیری مسلم گھرانے میں ایک حاجی آپ کو ضرور ملے گا۔ (باقی ص ۵۹ پر)

نفس کبھی بوڑھا نہیں ہوتا

میں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جس کی عمر ۷۰ سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ اس کا جسم کمزور تھا۔ صحت بھی اچھی نہ تھی۔ لیکن اس کے حواس بجا تھے۔ عقل بھی پوری طرح کام کر رہی تھی۔ وہ شہرت چاہتا تھا۔ جاہ و منصب کا طالب تھا۔ عیش و نشاط کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہرت حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دے۔ دولت کا حریص تھا اور اسے حاصل کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کے ۲۴ گھنٹوں میں شاید ایسا کوئی وقت نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی آخرت اور انجام کے بارے میں کچھ سوچ سکتا ہو۔ دنیا، حصولِ دنیا بس یہی اس کی آرزو تھی۔ اور اسی کوشش میں دن رات لگا رہتا تھا۔ وہ کافر نہ تھا مسلمان تھا۔ حد یہ ہے کہ اس عمر میں وہ نوجوان لڑکیوں کو گھورتا اور اس کی خواہش تھی کہ کوئی حسین کم عمر لڑکی اس کی بیوی بن جاتی۔ یہ پتہ نہیں کہ وہ اس پر کبھی کوئی شرم محسوس کرتا تھا یا نہیں؟ لطف یہ ہے کہ وہ نمازیں پڑھتا، وعظ کی مجلسوں میں شریک ہی نہ ہوتا بلکہ وہ خود بھی وعظ کہتا۔ آخرت پر تقریریں اتنی فراٹے سے کرتا کہ لوگ یہ سمجھتے کہ آخرت کا خیال کرنے والا اس سے بڑھ کر کوئی اور نہ ہوگا۔ میں نے بادشاہوں اور رئیسوں کی تاریخ میں ان کی بڑھاپے کی ہوس کاریوں کی داستانیں تو پڑھی تھیں، لیکن میرا بوڑھا نہ تو کہیں کا بادشاہ تھا اور نہ رئیس۔ ریاست کیلئے کوشاں تو ضرور تھا مگر حاصل نہیں کر سکا تھا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ آخر اس بوڑھے کی یہ حالت کیوں ہے؟ اب تو اس کے مرنے کے دن ہیں۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہے اگر کوئی حسین اور کم عمر لڑکی اس کو مل جائے تو یہ کیا کرے گا۔ پھر مجھے محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دعائیں ذہن میں آ گئیں اور ان کی پوری معنویت ذہن میں اتر گئی ہے۔ ایک دعا کا فقرہ یہ ہے اللھم انی اعوذ بک من نفس لا تشبع (اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں ایسے نفس سے جو آسودہ نہیں ہوتا)۔ شبع کے معنی صرف شکم سیری کے نہیں ہیں۔ در اصل ایسے نفس سے پناہ مانگی گئی ہے جو آسودہ نہیں ہوتا۔ نہ کھانے سے نہ پینے سے نہ جاہ و منصب سے اور نہ جنسی بوالہوسی سے۔ دوسری دعا کا فقرہ یہ ہے اللھم اجعل خیر عمری آخرہ (اے اللہ میری آخری عمر کو بہترین بنا دے) اور جب میں نے اس بوڑھے کے بارے میں اپنے قلب و ضمیر سے سوال کیا تو یہ جواب ملا۔

"نفس کبھی بوڑھا نہیں ہوتا"

(بقیہ ارشادات رسول) پھر پلک جھپکتے دوسرے فرشتے اس کو ملک الموت کے ہاتھ سے لے لیتے اور اسکو ٹاٹ کے ٹکڑوں میں لپیٹ دیتے ہیں پھر اس سے ایسی بدبو نکلتی ہے جیسی سطح زمین پر سب سے زیادہ سڑی ہوئی لاش سے نکلتی ہے پھر اس کو لیکر فرشتے اوپر چڑھتے ہیں جب وہ دوسرے فرشتوں کی کسی جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں یہ کس خبیث کی روح ہے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں کی روح ہے۔ اس کو اس بدترین نام سے یاد کرتے ہیں جس سے وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آسمان دنیا کے پاس پہنچ کر جب اس کے لیے دروازہ کھلواتے ہیں تو اس کے لیے دروازہ کھولا نہیں جاتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا	ان کے لیے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ	جائیں گے۔ ان کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے
فِي سَمِّ الْخِيَاطِ [1]	جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کا نامۂ اعمال تحت الثریٰ کے اندر سجین میں درج کرو پھر اس کی روح زمین کی طرف پھینک ماری جاتی ہے۔ آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ	اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان
مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ	سے گر گیا اب یا تو پرندے اسے اچک لے جائیں
تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ [2]	گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے

پھر اسکی روح اس کے جسم میں ڈالدی جاتی ہے۔ دو فرشتے آتے ہیں اسکو بٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ تیرا دین کیا ہے؟ ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ اس شخص کے بارے میں کیا جانتا ہے جو تمہارے اندر مبعوث کیے گئے۔ ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد منادی آسمان سے ندا دیتا ہے۔ میرا بندہ جھوٹ بولا۔ اسکی قبر میں آگ کا فرش بچھا دو اور اس کے لیے دوزخ کا ایک دروازہ کھول دو۔ اس سے دوزخ کی لپٹیں آنے لگتی ہیں۔ اسکی قبر تنگ کردی جاتی ہے اور قبر اسکو دبا دیتی ہے۔ پھر اس کے پاس ایک شخص آتا ہے بدصورت، برے لباس اور بری مہک والا۔ وہ کہتا ہے تجھے بشارت ہو اس چیز کی جو تجھے بری لگے گی۔ یہ تیرا وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ وہ کہے گا تو کون ہے؟ تیرا چہرہ تو ایسے شخص کا ہے جو شر لاتا ہے۔ وہ جواب دے گا۔ میں تیرا عمل خبیث ہوں۔ تب وہ کہے گا۔ اے میرے رب تو قیامت قائم نہ کر۔

(تفسیر ابن کثیر بحوالہ مسند امام احمد)

نوٹ:۔ یہ اپنے موضوع پر سب سے مفصل حدیث ہے۔ اس کے اجزا مسلم شریف، نسائی شریف اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ یہ حدیث ایمان و عمل صالح کی ترغیب اور کفر و بدعملی سے اجتناب کا سبق دیتی ہے

[1] یہ سورۃ الاعراف کی آیت ۴۰ کا ایک حصہ ہے۔ [2] یہ سورۃ الحج کی آیت ۳۱ کا ایک حصہ ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تازہ اہم تصنیف

دینِ اسلام اور اوّلینِ مسلمانوں کی

دو متضاد تصویریں

(عقائد اہلِ سنت و عقائد فرقۂ اثنا عشریہ کا تقابلی مطالعہ)

سید المرسلین خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علوِ شان، بعثتِ عظمیٰ کے مقاصد و نتائج، انسان کی فطری صلاحیت و اصلاح پذیری کی رو سے اور غیر جانبدار تاریخ کی شہادت کی روشنی میں کون سی (دعوتی و اصلاحی کام کرنے والوں کے لئے) حوصلہ افزا و ہمت آفریں اور ایک صاحبِ انصاف کے لئے قابلِ قبول اور مطابق واقعہ ہے؟ —— تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور اہلِ نظر کے لئے دعوتِ فکر۔

معیاری و اعلیٰ کتابت، آفسیٹ طباعت

قیمت: اردو ایڈیشن چھ ۶ روپے

عربی، انگریزی اور فارسی ایڈیشن زیرِ طبع

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

ندوہ پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

MONTHLY
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN
NEW DELHI-110002

Regd No D.NO.-(DN)-348
R. NO.- 42893/84
April 85

دہلی آرٹ پریس میں چھپا۔

جلد: ۲	شعبان ۱۴۰۵ھ مطابق مئی ۱۹۸۵ء	شمارہ: ۵

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے
جناب سید احمد عروج قادری، مدیر "زندگی نو" گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

پرنٹر پبلشر ... نے ... پرنٹنگ پریس ... سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ زندگی نو ۱۵۲۵، سوئی والان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۷۳۲۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

میں ۵ اپریل ۱۹۸۵ء کو کالکا میل سے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی مدظلہ، اور جناب امین الحسن رضوی ایڈیٹر ریڈینس دہلی کی معیت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے ساتویں سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ ہوا۔ یہ اجلاس ۶-۷ اپریل کو کلکتہ میں منعقد ہو رہا تھا۔ اجلاس ۹ بجے دن سے شروع ہونے والا تھا۔ گاڑی تقریباً ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ اس لیے ہم لوگ ۹ بجے کے بعد اسٹیشن پہنچے۔ جماعت اسلامی کے رفقاء موجود تھے۔ ہم لوگ ان کے ساتھ برادرم جناب ناصر صاحب کے مکان گئے اور وہاں سے ناشتہ کرنے کے بعد جب اجتماع گاہ پہنچے تو دیر ہو چکی تھی اور مسلم پرسنل لا کے موجودہ صدر محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی خطبہ صدارت پیش فرمانے والے ہی تھے۔ مولانا نے پہلے تحریری خطبہ پیش نہ کرنے کی معذرت کی اور بتایا کہ متعدد اندرونی و بیرونی اسفار کی وجہ سے وہ تحریری خطبہ صدارت نہیں لکھ سکے۔ انھوں نے زبانی ایک بلیغ اور پرجوش خطبہ دیا۔ اپنے اس خطبہ میں انھوں نے تین بنیادی باتوں کی توضیح کی۔

(۱) مسلم پرسنل لا کے قوانین وحی الٰہی کے ذریعے آسمان سے اترے ہیں۔ یہ کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں اس لیے اس میں ترمیم و تنسیخ کا حق کسی کو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کسی حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دینے اور کسی حرام کو حلال قرار دینے کا حق تو انبیاء کرام علیہم کو بھی حاصل نہیں تھا۔ (۲) عبادت صرف نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مولانا نے کہا کہ ان دو بنیادی باتوں کو نہ جاننے یا نظر انداز کرنے کی وجہ سے بعض ایسے مسلمان جھوں نے کتاب و سنت کا علم حاصل نہیں کیا ہے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ (۳) مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی دعوت دراصل دعوت ارتداد ہے مسلمان اس کو قبول نہیں کریں گے بلکہ اس کا

مقابلہ کریں گے۔ اس موقع پر مولانا کی خطابت خاصی پرجوش ہو گئی تھی۔ یہی بات تمام علماء کرام کہتے آرہے ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ باتیں اتنی بار دہرائی جاچکی ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ جہاں تک جماعت اسلامی ہند کا تعلق ہے اس نے اپنے ابتدائی قیام ہی سے ملی مسائل میں مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کو اولین اہمیت دی ہے۔ اس ساتویں اجلاس میں جب امیر جماعت اسلامی ہند نے اظہار خیال کیا تو اپنے اس خطبۂ صدارت سے جو ۱۹۶۲ء میں پٹنہ کے مسلم کنونشن میں دیا تھا متعدد حصے پڑھ کر سنائے جس میں یہ بات بھی تھی کہ جب تک دستور ہند کے رہنما اصول سے دفعہ ۴۴ کو ختم نہ کیا جائے یکساں سول کوڈ کی تلوار مسلمانوں کے سر پر لٹکتی ہی رہے گی۔ خود مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام میں جماعت اسلامی ہند نے جو رول ادا کیا ہے وہ تاریخ میں محفوظ ہو چکا ہے۔ آئندہ کوئی منصف مورخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ فی الحال یہی ایک پلیٹ فارم ہے جس پر مسلمانوں کی تمام تنظیمیں فرقے اور طبقے اکٹھا ہیں۔ ہمارا مقصد مسلم پرسنل لاء کا تحفظ ہے۔ اس پلیٹ فارم پر کسی تنظیم کے قابض ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور اگر خدانخواستہ کسی نے اس پر قبضہ کرنے اور دوسروں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو وہ نہ صرف اس متحدہ محاذ کو نقصان پہنچائے گا بلکہ خود مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کو خطرے میں ڈال دے گا۔ اس اجلاس میں جو قراردادیں پاس ہوئی ہیں اور جو کمیٹیاں بنی ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عمل کی توفیق بھی عطا کرے۔ شہید مینار کے وسیع میدان میں جو جلسۂ عام ہوا وہ بھی شاندار تھا۔ بعض اردو اخبارات کا اندازہ ہے کہ تقریباً پانچ لاکھ آدمی جمع ہو گئے تھے۔ میں نے خود انسانوں کے اس سمندر کو دیکھا ہے۔ "مسلم پرسنل لاء" کے نام سے ایک مختصر مقالہ زندگی نو کی اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔ برادرم سید علی صاحب کے واسطے سے یہ مقالہ ۱۱ اپریل ۸۵ء کے روزنامہ مشرق کلکتہ میں بھی شائع ہو چکا ہے اس اجلاس کے دوران میں خود اخبار مشرق نے بھی مسلم پرسنل لاء پر ایک نمبر شائع کیا ہے۔ انگریزی اور بنگلہ اخبارات نے بھی مختصر رودادیں شائع کی تھیں۔ کلکتہ کے مسلمان لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اتنے بڑے اجتماع کا انتظام کیا اور اپنی جان اور اپنے مال سے اس کو کامیاب بنایا۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ نام و نمود، شہرت طلبی اور ذاتی و گروہی مفادات کے شر سے محفوظ رکھے آمین۔

اگرچہ کلکتہ میرے مولد (مسکن ریاست بہار) سے قریب ہے لیکن اب تک وہاں جانے کا موقع نہیں ملا

تھا یعنی سیر و تفریح کے لیے سفر پر طبیعت کبھی مائل نہیں رہی۔ مسلم پرسنل لا کے ساتویں اجلاس نے اس کا موقع فراہم کر دیا۔ انگریزوں کی حکومت میں یہ شہر اس کی پہلی راجدھانی رہ چکا ہے۔ اس آئی ایم کے چند افراد کی ایک مجلس میں مختصر سوال و جواب اور مختصر خطاب کا موقع ملا جو ایک گھنٹہ جاری رہا۔ اسی دن یعنی ۹ اپریل کو ریاست مغربی بنگال کے مختلف اضلاع کے نظماء کی نشست بھی تھی اس میں مختصر خطاب کی سعادت حاصل ہوئی۔ متعدد رفقاء کے بعض سوالات کے جوابات اور ان کی بعض الجھنوں کو اپنے علم و فہم کی حد تک دور کرنے کے مواقع بھی ملتے رہے۔

کلکتہ بھارت کا بہت بڑا شہر ہے بلکہ آبادی کی کثرت کے لحاظ سے شاید سب سے بڑا شہر ہے اس میں دیکھنے کی اور ان سے استفادے کی بہت سی چیزیں ہیں۔ لیکن ایک دن میں یہ کام کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ برلا پلانیٹیریم جو دنیا کا سب سے بڑا پلانیٹیریم کہا جاتا ہے اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ نیشنل عجائب خانہ کی بھی مختصر سیر کی۔ اس میں جانوروں کے جو مجسمے بنائے گئے ہیں وہ انسانی صنعت گری کے اچھے نمونے ہیں۔ اس سیر کا حاصل میرے لیے فارسی کا ایک شعر ہے جو گول چوکھٹے میں خوش خط لکھا ہوا شیشے کی الماری میں بند تھا وہ یہ شعر ہے:۔

جہاں اے برادر نماند بکس   دل اندر جہاں آفریں بند و بس

اس شعر کا مفہوم اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے۔

کسی کا جہاں ساتھ دیتا نہیں   جہاں آفریں کو بنا دل نشیں

یہ دنیا اے برادر کسی کا ساتھ نہیں دیتی اس لیے خالق کائنات کو اپنے دل میں بسا اور اسی سے دل لگا اور بس یہی کافی ہے۔ زو چڑیا گھر یا زندہ عجائب خانہ بھی دیکھا وہ بہت بڑے حلقے میں آباد ہے۔ اس کو چند گھنٹوں میں پوری طرح نہیں دیکھا جا سکتا۔ جو حصہ میں دیکھ سکا وہ مجھے پسند نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ جو جانور مر جاتے ہیں ان کی جگہ زندہ جانور مہیا کرنے کا ابھی کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ اس زیر زمین ٹرین پر بھی بیٹھنے اور جہاں تک لائن تعمیر ہو چکی ہے اس میں سفر کرنے کا موقع بھی ملا مجھے افسوس ہے کہ میں نہ مدرسہ عالیہ جا سکا اور نہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ کی سیر کر سکا۔ میں امیر حلقہ بنگال مولانا محمد یعقوب اور امیر شہر کلکتہ جناب سید علی، ان کے آفس سکریٹری عزیزم جناب حافظ نور الحق اور دیگر رفقاء کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش کی اور اپنا وقت صرف کیا۔ جناب ناصر کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی کار ہمارے لیے ہر وقت تیار رکھی اور میزبانی کا حق ادا کیا۔

دینِ قیّم کی طرف رُخ جما دو

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝

ترجمہ: پس (اے نبی اور نبی کے پیروؤ!) یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ساخت بدلی نہیں جا سکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور ڈرو اس سے اور نماز قائم کرو اور نہ ہو جاؤ ان مشرکوں میں سے جنھوں نے اپنا دین الگ الگ بنا لیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔

تمہید: آج میں نے اقامت دین (اور اظہار (غلبہ) دین) کی آیتوں کا انتخاب نہیں کیا ہے جو سورہ توبہ، سورہ شوریٰ، سورہ صف اور دوسری سورتوں میں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ماخذ صرف وہی آیتیں نہیں ہیں بلکہ پورا قرآن ہے۔ عبادات، معاملات اور اخلاق کی آیتیں بھی ہماری پوری توجہ کی اسی طرح مستحق ہیں جس طرح وہ آیتیں جن میں ہم کو اقامت دین کا حکم دیا گیا ہے بلکہ عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق آیتیں کچھ زیادہ توجہ کی مستحق ہیں کیونکہ ان پر عمل کیے بغیر اور اپنے آپ کو اللہ کے سانچوں میں ڈھالے بغیر صحیح طور پر اقامت دین کا کام کیا ہی نہیں جا سکتا۔

تشریح: سابق تین آیتوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم پورے دین پر عمل کریں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح کی

پہلی آیت کے پہلے فقرے "پس (اے نبی اور نبی کے پیروو!)" میں لفظ "پس" یہ کہتی ہے کہ اس "پس" کا مفہوم کیا ہے؟ عربی زبان کے حرف الفا (ف) جس کا ترجمہ اردو میں پس کیا جاتا ہے اس کی پوری تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے یہاں صرف یہ اشارہ کرنا ہے کہ "پس" کا لفظ پہلے کچھ کہی ہوئی باتوں اور حقیقتوں کا ایک حاصل ہوا کرتا اور یہ بتاتا ہے کہ ان باتوں اور حقیقتوں کے بعد اب کیا کرنا ہے۔ ان زیر تشریح آیتوں سے پہلے بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ان میں نمایاں تر شرک کی تردید ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کا اعلان ہے اور یہ ہے کہ تمہارے مخالفین محض اپنے ہوائے نفس کی پیروی کر رہے ہیں اور تمہاری مخالفتوں میں سرگرم ہیں۔ پس جب تم نے یہ جان لیا کہ شرک بے بنیاد ہے کسی کے پاس کوئی اقتدار و اختیار نہیں ہے۔ تمہاری مخالفتوں اور مزاحمتوں میں کوئی معقولیت نہیں ہے، صرف خواہشات نفس کی پیروی ہے پس تم کو اور تمہارے پیروؤں کو یہ کرنا چاہیے۔ تمہیں یہ روش اختیار کرنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ تم یکسو ہو کر اس دین پر جم جاؤ اور اس فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

"الدین" سے مراد وہ دین حق اسلام ہے جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا دین رہا ہے اور جسے دیکر اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا تھا اور جس کی تکمیل آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کردی گئی ہے۔ یکسو ہو کر اس دین پر رخ جمانے کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی انسان نے اسلام قبول کر لیا تو اب اس کو کسی دوسرے طریق زندگی کی طرف رخ نہ کرنا چاہیے۔ صراط مستقیم اسلام کے دونوں طرف کفر، شرک، الحاد اور معصیت کی خاردار جھاڑیاں ہیں۔ اگر کوئی شخص دین حق کی طرف رخ نہ جمائے، سیدھا اس راستے پر نہ چلے بلکہ ادھر ادھر رخ موڑتا رہے تو سخت اندیشہ ہے کہ وہ کسی جھاڑی میں پھنس جائے اور اس کی راہ کھوٹی ہو یا پھنسا رہ جائے تو اپنی منزل رضائے الٰہی تک پہنچ ہی نہ سکے۔ قرآن کریم میں حنیف کی صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیان کی گئی ہے۔ تو جس طرح وہ شرک و کفر کے تمام علائق سے کٹ کر صرف دین توحید سے جڑ گئے تھے اسی طرح ہر مسلمان کو کرنا چاہیے۔

وہ فطرت کیا ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

وہ فطرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی دوسرا نہ خالق ہے نہ مالک ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کا رب اور اس کا معبود ہے۔ راستہ اپنی پوری زندگی اللہ و رسول ہی کی اطاعت میں گزارنی ہے۔ یہی اس کی آزمائش ہے۔ اگر کوئی انسان اپنے آپ کو خود مختار سمجھے جب بھی اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرے گا

اور اگر اللہ کے سوا کسی اور کو خدا قرار دے جب بھی اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرے گا۔ متعدد احادیث میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ نے بھی اس آیت کے تحت وہ احادیث پیش کر دی ہیں۔

اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ نے انسان کو اپنا بندہ بنایا تو وہ اسی کا بندہ رہے گا۔ انسان کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ کسی اور کا بندہ بن سکے خواہ وہ اپنی نادانی اور گمراہی کی وجہ سے اپنے آپ کو کسی اور کا بندہ بنالے۔ اس سے یہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی کہ وہ کسی اور کا بندہ بن جائے۔ البتہ وہ اپنی گمراہی کی وجہ سے اپنا انجام ضرور تباہ کرلے گا۔ وہ کسی دوسرے کو اپنا معبود بنا کر دنیا میں سکونِ قلب، امن اور چین سے اور آخرت میں خدا کی مغفرت و رحمت سے محروم ہو جائے گا۔ قرآن کریم نے بھی ہمیں بتایا ہے کہ اللہ نے ہر انسان سے اس کی تخلیق سے بہت پہلے یہ اقرار لے لیا ہے کہ صرف اللہ ہی اس کا رب ہے۔ وہی الٰہ واحد اور رب واحد ہے اس کے سوا نہ کوئی الٰہ ہے اور نہ رب۔

یہی سیدھا اور راست دین ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دینِ توحید۔ اسلام کے علاوہ جتنے خود ساختہ ادیان ہیں۔ وہ بہت ٹیڑھے اور کج و پیچ سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی دین انسان کو خدا کی خوشنودی کی منزل تک نہیں پہنچا سکتا سیدھا اور راست دین تو صرف اسلام ہے اور صرف یہی انسان کی فلاح دارین کا واحد ضامن ہے۔

مگر اکثر لوگ جانتے نہیں

یعنی سیدھا دین تو یہی دینِ فطرت ہے مگر ان لوگوں کی اکثریت جنہیں یہ حقیقت بتائی جا رہی ہے وہ نادانی کی وجہ سے اس کا مقابلہ کر رہے ہیں اور اپنے کفر و شرک پر اصرار اور اس کی مزاحمت میں اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔

بعد کی دو آیتوں میں کہ اس دینِ حق کی طرف یکسو ہو کر رخ جمانے اور اس پر جمنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اس کے لیے تین چیزیں تو مثبت بتائی گئی ہیں اور ایک منفی۔ انابت، تقویٰ اور اقامتِ صلوٰۃ تو مثبت چیزیں ہیں اور شرک سے بیزاری اور اس کا انکار منفی چیز ہے۔ انابت اور تقویٰ کا تعلق تو انسان کے دل سے ہے اور اقامتِ صلوٰۃ کا تعلق انسان کے دل سے بھی ہے اور اس کے جوارح سے بھی

انابت الی اللہ قلب کی ایک کیفیت اور صفت ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ مومن اپنی پوری

زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتا رہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جو مومن کو اللہ و رسول کے احکام کی تعمیل اور ان کی ممنوعات سے اجتناب پر آمادہ رکھتی ہے اور اگر کوئی قصور ہو جائے تو پورے تضرع کے ساتھ اللہ سے استغفار کا داعیہ پیدا کرتی ہے

تقویٰ خوف خدا کی بجلی کا وہ کرنٹ ہے جو قلب انسانی کے بلب کو روشن رکھتا ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ کرنٹ غائب ہو جائے تو دل کا بلب بجھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سے تقویٰ کا حکم اتنی بار دیا گیا ہے کہ اس کا شمار کرنا آسان نہیں ہے۔

اقامت صلوٰۃ کا مفہوم پورے اہتمام اور ان تمام شرائط کے ساتھ نماز ادا کرنا ہے جو کتاب و سنت میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نماز صرف پڑھ لی جائے۔ مثال کے طور پر فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی ضروری قید کتاب و سنت میں لگائی گئی ہے۔ عذر شرعی کے بغیر تنہا فرض نماز پڑھنے سے یا تو نماز ادا ہوتی ہی نہیں یا بہت ناقص ادا ہوتی ہے۔ اس مسئلے میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال، آپ کا اسوہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کا مطالعہ ضروری اور بہت مفید ہے۔

شرک سے انکار اور بیزاری

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مشرکین نے خواہشات کی پیروی اور شیطان کے اغوا سے دین فطرت سے انحراف کیا اور طرح طرح کے مشرکانہ گروہوں میں بٹ گئے اور ان کا ہر گروہ اپنی گمرہی میں مگن ہے اس طرح اے مسلمانو! تم نہ ہو جانا۔ مشرکین نے توحید گم کر دی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی خواہشات نفس اور اغوائے شیطانی کے تحت مشرکانہ عقائد و اعمال میں مبتلا ہو جاؤ۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس کا لحاظ نہیں رکھا اور آج وہ بھی مشرکانہ اعمال و عقائد اختیار کر کے گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ مجھے اور آپ لوگوں کو شرک کے شائبے سے بھی اپنے کو بچائے رکھنے کی پوری کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

نوٹ: رکانپور میں صرف ارکان کے سہ روزہ تربیتی اجتماع میں یہ درس دیا گیا تھا۔ یہ اجلاس ۱۵ تا ۱۷ مارچ ۱۹۸۴ء کو منعقد ہوا تھا۔ یہ اس درس کی تلخیص ہے۔

اسلامی نظام معاشرت

اعتدال و توازن کا شاہکار

(۳)

(پروفیسر عمر حیات خاں غوری)

اس وجہ سے :-

(۱) اسلام، انسان ہونے کی حیثیت سے مرد عورت میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک جو حقوق مرد کو حاصل ہیں ان سب کی عورت بھی مستحق ہے

(۲) اسلام عورت سے بھی انہیں امور پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے جس پر ایمان لانا وہ مردوں کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔

(۳) اسلام عورت پر بھی وہی فرائض عائد کرتا ہے جو مرد پر عائد ہیں۔

(۴) اسلام عورت سے بھی اسی قرآن مجید کی تلاوت کراتا ہے جس کا وہ مرد سے مطالبہ کرتا ہے۔

(۵) اسلام کے نزدیک عورت بھی اپنے اعمال کے لیے خدا کے سامنے اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح مرد کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔

(۶) آخرت میں بھی عورت کی اسی طرح مغفرت ہوگی جس طرح مرد کی ہوگی۔

(۷) اسلام کے نزدیک عورت بھی اسی طرح معزز ہے جس طرح مرد

(۸) مرد کی مانند عورت بھی اپنی دولت اور جائداد کی بالکلیہ مالک ہوتی ہے جس پر اس کی مرضی کے بغیر اس کا شوہر بھی تصرف نہیں کر سکتا۔

(۹) اسلام عورت کی جان کو بھی اتنا ہی قیمتی سمجھتا ہے جتنا کہ اس کے نزدیک مرد کی جان قیمتی ہے۔

(۱۰) اسلام عورت کو بھی مرد کی مانند ترکہ میں سے میراث حاصل کرنے کا حق دیتا ہے
(۱۱) قانونی اور انسانی حقوق کے بارے میں عورت بھی مرد ہی کی طرح مساوی قرار دی گئی ہے۔
(۱۲) اسلام شادی کے ذریعہ عورت کی شخصیت کو مرد میں ضم نہیں کرتا بلکہ اس کے بعد بھی اس کی انفرادیت کو تسلیم کرتا ہے۔
(۱۳) اسلام شوہر اور بیوی دونوں کو ایک دوسرے کا رفیق حیات قرار دیتا ہے۔ وہ ان میں سے نہ تو کسی کو عابد قرار دیتا ہے اور نہ معبود۔

قرآن مجید عورت اور مرد کی اس مساوات کو بڑے ہی بلیغ انداز میں بیان کرتے ہوئے عورت کو مرد کا لباس اور مرد کو عورت کا لباس قرار دیتا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ	وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو

اور اس طرح اسلام بیوی اور شوہر کے درمیان بے پناہ قربت اور اپنائیت کے احساسات بیدار کر دیتا ہے۔ لباس کا کام شخصیت میں وقار پیدا کرنا، موسم کے اثرات سے محفوظ رکھنا اور جسم کے عیوب کو چھپائے رکھنا ہوتا ہے۔ بیوی اور شوہر ایک دوسرے کی یہ ضرورتیں بڑی خوبی سے پوری کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ لباس کا سب سے بڑا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورت دونوں کے جنسی اعضاء کو دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھتا ہے۔ مگر اسی وقت وہ ان سے سب سے زیادہ قریب بھی رہتا ہے۔ اسی طرح لباس جنسی اعضاء مرد اور دنیا کے درمیان میں پردہ کا کام کرتا ہے۔ شوہر بیوی کے لیے اور بیوی شوہر کے لیے بالکل یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے جنسی اعضاء ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں مگر آپس میں ان میں کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے لیے راز داری، قربت، اپنائیت اور اعتماد کی علامت بن جاتے ہیں۔ اس لیے آیت کے اسلوب نے مرد اور عورت کی مساوات کے تصور کا کامیاب اظہار کیا ہے۔ معاشرے کی ان دونوں صنفوں کی مساوات سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ کا نظام اس طور پر مرتب و مدون کیا گیا ہو کہ اس کے پیدا کردہ ماحول میں مرد اور عورت دونوں آزاد ماحول میں سانس لے سکیں۔ لفظ آزادی اپنے مکمل تصور میں بڑا ہی حسین، دل کش اور جاذب توجہ لفظ ہے۔ مگر اس دنیا میں مطلق آزادی کا کہیں نہ تو کوئی وجود ہی ہے اور نہ اس کے وجود پذیر ہونے کا

کوئی امکان ہے اس لیے کہ اس دنیا کا نظام ہی کچھ ایسے اصولوں پر استوار ہے کہ یہاں آزادی کسی ایک شے کو بھی میسر نہیں ہے۔ ایک شخص کی آزادی اس وقت دوسرے کی زحمت اور غلامی بھی بن سکتی ہے اور بن جاتی ہے۔ اس لیے اس کائنات میں آزادی اور غلامی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ غلامی کے بغیر آزادی کا یہاں کوئی تصور نہیں ہے۔ چاند اپنے محور میں پوری طرح آزاد ہے مگر آزادی کے نقشہ میں سورج کے مدار میں اس کا داخلہ اسی وقت پورے نظام کی تباہی بھی ہے وہ اپنے مدار میں گردش کرنے کے لیے آزاد ہے مگر اسی آزادی کے ساتھ یہ غلامی بھی لگی ہوئی ہے کہ وہ اس گردش کے ساتھ ساتھ زمین کے گرد طواف بھی کرتا رہے۔ آزادی کے نشہ میں سڑک پر سونے والے شخص کو آزادی موت کی آغوش میں بھی سلا سکتی ہے۔ اس وجہ سے دنیا میں آزادی کا مطلق کوئی تصور نہیں ہے۔ بلکہ یہاں آزادی کا ایک ایسا محدود تصور پایا جاتا ہے جو متعدد پابندیوں سے جکڑا ہوتا ہے تاکہ انہیں پابندیوں میں آدمی اپنی آزادی سے اس طرح مستفید ہوتا رہے کہ اس کی آزادی کسی دوسرے کی آزادی کے لیے رکاوٹ پیدا نہ کرسکے۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو کر لے

چنانچہ اسلام بھی کائنات میں جاری آزادی کے اس تصور کو قبول کرتا ہے اور انسانی معاشرے کے چاند اور سورج (عورت اور مرد) کی گردش کے لیے ان کے محور اس طرح متعین کر دیتا ہے کہ دونوں اپنے اپنے محور کی حدود میں رہتے ہوئے کامل آزادی کا لطف اٹھاتے اور اپنی شخصیت کا ارتقاء او تکمیل کرتے رہیں۔ وہ نہ چاند (عورت) کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنا محور چھوڑ کر سورج کے حدود میں داخل ہونے کی کوشش کرنے کی غلطی کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چاند (عورت) کی تباہی پر منتج ہوگا۔ (یورپی معاشرہ اس کی بہترین مثال ہے) اور نہ سورج کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ چاند کے محور میں مداخلت کرنے کی گستاخی کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا انجام بھی چاند کی تباہی پر منتج ہوگا۔ اس لیے اسلام عورت کو آزادی کا ماحول فراہم کرنے کے لیے اس کے دائرہ عمل کو مرد سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ دونوں اپنے اپنے دائرہ میں اس طرح مرتکز ہو کر رہ جائیں کہ ایک دوسرے کا خیال ہی نہ رہے اس لیے کہ یہ بھی نظام شمسی کی موت پر منتج ہوگا۔ اس لیے دونوں کے محوروں کے بالکل علیحدہ ہونے کے باوجود جس طرح کائنات میں سیارے قوت کشش سے ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں تعاون

دیتے رہتے ہیں اسی طرح اسلام معاشرہ میں عورت اور مرد کے دائرۂ عمل کے علیحدہ ہونے کے باوجود انہیں ایک دوسرے سے بالکل ہی بے تعلق نہیں ہونے دیتا بلکہ انہیں ایک دوسرے کا معاون و محافظ بنا کر اپنے معاشرتی نظام کو چلاتا ہے اور نکاح اسی رشتہ کو استوار کرنے کا نام ہے جس سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ آسمان انسانی کے کس سورج کو کس چاند کی فکر کرنا اور کس چاند کو کس سورج سے منسلک رہنا چاہیے تاکہ بار بار قوت کشش کی سمت اور حدود کے بدلتے رہنے سے نظام شمسی اعتدال و توازن سے محروم نہ ہو جائے۔ کیونکہ اعتدال و توازن کی محرومی ہی تباہی کا اصلی سبب ہوتی ہے۔ جو لوگ عورت سے اپنے دائرہ کار سے نکل کر مرد کے میدان میں گھس آنے کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ گویا چاند سے کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے محور کو چھوڑ کر سورج کے مدار میں گھس آئے۔ شاید انہیں اس کے انجام کی خبر نہیں ہے یا وہ انجام سے اس لیے بے نیاز ہیں کہ بالآخر تباہی کی زد سے وہ تو محفوظ ہی رہیں گے۔ اگر تباہ ہوگی تو عورت ہی ہوگی اور مغربی معاشرے کی موجودہ حالت اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

اسلام کا معاشرتی نظام چونکہ خدا تعالیٰ کا مرتب کردہ ہے جو عورت اور مرد دونوں کا خالق ہے اسے عورت و مرد دونوں عزیز ہیں اور چونکہ وہ کسی کی تباہی سے بے تعلق نہیں رہ سکتا اس لیے اس نے اس نظام میں اس بات کی پوری رعایت رکھی ہے کہ عورت کی آزادی کا پورا تحفظ بھی ہو اور وہ کسی خطرے سے دوچار بھی نہ ہو۔ اس لیے اسلام عورت اور مرد کے تعلق کا واحد ذریعہ نکاح کو قرار دیتا ہے اور اس کے علاوہ سارے دوسرے ذرائع جن سے کوئی مرد کسی عورت سے جنسی تعلق قائم کرے انہیں حرام قرار دیتا ہے۔ چنانچہ نکاح کی پابندی عائد کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَالِكُمْ	ان محرمات کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں سب
أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ	تمہارے لیے حلال ہیں مگر (صرف اسی شکل میں
مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ	کہ) اپنے مال خرچ کر کے ان کو اپنے نکاح
(النساء - ۲۴)	میں لے آؤ نہ یہ کہ آزاد شہوت رانیاں کرنے لگو

ایسے بدکردار لوگوں سے اپنے معاشرے کو پاک رکھنے کے لیے اسلام زنا کو بے حیائی اور بدترین راستہ قرار دیتے ہوئے اس عمل سے نفرت دلاتا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ	اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو حقیقت یہ ہے

فَاحِشَۃً وَّسَاءَ سَبِیْلًا (بنی اسرائیل ۳۲) کیونکہ وہ سراسر بے حیائی ہے اور بدترین راستہ ہے
سورۂ مومنون میں نماز میں خشوع رہنے کے ساتھ شرمگاہوں کی حفاظت کو کامیابی کے لیے لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ ۔۔۔۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حَافِظُوْنَ	یقیناً کامیاب ہوئے اہل ایمان، جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (عفت و پاکدامنی کی زندگی گذارتے ہیں)۔

حضور نے فرمایا۔

من یضمن لی مابین لحییہ وما بین رجلیہ اضمن لہ الجنۃ (بخاری و مسلم)	جو مجھے اپنی زبان اور اپنی شرمگاہ (کو خدا کی نافرمانی سے محفوظ رکھنے) کی ضمانت دے میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔

ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نئی نئی جنسی لذت کے متوالوں پر خدا لعنت فرماتا ہے۔ لعن اللہ الذواقین والذواقات اللہ نے ان مردوں اور عورتوں پر لعنت بھیجی ہے جو نئی نئی جنسی لذتیں چکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا قرآنی آیات اور احادیث اور اسی مضمون کی دوسری آیات اور احادیث کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام عورت اور مرد دونوں کے دائرہ عمل کو علیحدہ کرکے اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی کسی دوسرے کے دائرۂ عمل میں مداخلت کرکے اس کی آزادی کو برباد نہ کرے اور ایک دوسرے کے لیے ایسے خطرات پیدا کرنے کا سبب نہ بنے جس سے کسی کی آزادی مجروح ہو اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں رکاوٹ پیدا ہو۔ زنا جنسی استحصال کی بدترین شکل ہے اور جنسی استحصال جسمانی ذہنی اور نفسیاتی استحصال پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اسلام اپنے معاشرے میں اس کو سختی سے روک دیتا ہے اور کسی حال میں بھی اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے

چنانچہ ان ساری کوششوں کے باوجود بھی جب کوئی شخص مسلم معاشرے میں زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اسلام ایسے شخص کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت اپنے معاشرے میں کسی قیمت پر بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتا اس لیے

کہ اس کے نزدیک "فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید ہے" لہٰذا وہ اپنے افراد سے اپنے معاشرے کو پاک رکھنے کے لیے سزا تجویز کرتا ہے۔

"زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور خدا کے دین کے معاملہ میں ان پر ترس کھانے کا جذبہ تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم خدا اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے۔" (النور-۲)

تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں اور اگر کوئی خبیث نفس اس کے ارتکاب کی جرأت کر رہا ہو تو مجرم کا انجام دیکھ کر باز آجائے۔

الغرض اسلام جب مرد اور عورت کے لیے آزادی اور مساوات کا اعلان کرتا ہے تو یہ محض فریب اور "حکمراں کی ساحری" نہیں ہوتا بلکہ اسلام خود اس کے نفاذ کا ضامن بھی ہوتا ہے اور اس راہ کی ہر رکاوٹ کا علاج بھی خود کر کے دونوں کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد میں اس قدر دیانت دار ہے کہ کسی بیوی کے شوہر کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی بیوی پر زنا کا الزام عائد کرے۔ اگر کوئی شوہر اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسلام شوہر پر اس کو ثابت کرنے کی ذمہ داری ڈالتا ہے۔ اور اگر الزام کو ثابت نہ کر سکے تو اسلام اس کو اسّی کوڑوں کی سزا دیتا ہے اور اس رشتہ کو منقطع کر دیتا ہے۔ اس طرح اسلام نے اپنے معاشرے میں عورت اور مرد دونوں کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔

اسلام خدا تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے۔ اس دین کو بھیجنے والا اپنے بندوں سے ماں سے بھی ستر گنا زیادہ محبت کرنے والا بھی ہے۔ اس لیے اسلامی معاشرت میں زانی کے لیے اتنی سخت سزا تجویز کر کے ہی مطمئن نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا مقصد معاشرے میں ساز ماحول پیدا کرتا ہے تاکہ مرد اور عورت دونوں کی شخصیت کے ارتقاء کا مناسب ماحول پیدا ہو سکے۔ اس لیے وہ صرف سزائیں تجویز کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ اپنے حفاظتی انتظامات بھی کرتا ہے جن کی موجودگی میں زنا تک پہنچنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ سب سے پہلے وہ عورت کے دائرہ عمل کے گرد ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرتا ہے جس کے اندر رہ کر عورت کامل آزادی، بے فکری اور بے خوفی کے ساتھ مساوات اور آزادی سے لطف اندوز ہوتی رہے۔ اسلام کے تعمیر کردہ اس قلعہ کا نام پردہ ہے۔ وہ پردہ کے ذریعہ مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط پر پابندی عائد کر دیتا ہے۔ جس کے

نتیجہ میں عورت ہمیشہ بنی ٹھنی رہ کر اس کی توجہ اپنی جانب ملتفت کرنے سے باز رہ جاتی ہے اور نہ مرد اپنے اوقات اور صلاحیتیں عورت کی تاک جھانک اور اس کو اپنی جانب ملتفت کرنے میں ضائع کرتا ہے۔ اسلام اس قلعہ میں عورت کو محفوظ کر کے اس میں تالا لگا دیتا ہے اور اس کی چابی نکاح کی تقریب میں اس کے شوہر کے حوالے کر دیتا ہے، تاکہ اس حریم ناز میں اس ایک مرد کے علاوہ کوئی دوسرا داخل ہی نہ ہو سکے۔ وہ اس قلعہ کو عورت کے لیے محبس دوام بھی نہیں بننے دیتا۔ اس لیے عزیز قریب رشتہ داروں سے ملنے ملانے کی اس کو پوری آزادی بھی دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ مردوں اور عورتوں کو دو حصوں — محرم اور غیر محرم میں تقسیم کر کے مردوں اور عورتوں کے اس گروہ کو جس کو اس قلعہ کے قریب جانے کی اجازت ہوتی ہے ایک دوسرے پر حرام قرار دے دیتا ہے۔ یعنی کسی حالت میں ان کی آپس میں شادی ہو ہی نہیں سکتی اور اس طرح زنا کے فتنہ کو ختم کر کے ان رشتوں میں پاکیزگی تقدس اور خلوص پیدا کر دیتا ہے۔ وہ لوگ احمق ہیں جو اس حفاظتی قلعہ کو عورت کے لیے قید خانہ اور اس کی غلامی کہتے ہیں۔ البتہ یہ وہ لوگ ضرور ہو سکتے ہیں جو عورت کی نسوانیت پر شب خون مارنے کے متمنی ہوں جسے اسلام کے اس قلعہ نے ناممکن بنا دیا ہے۔

اسلام محض عورت کی عصمت و عفت اور اس کی پاک دامنی کی حفاظت کے لیے اس قلعہ کی تعمیر سے بھی مطمئن نہیں ہو جاتا بلکہ نکاح کی شاہراہ کے علاوہ اس قلعہ میں داخلہ کے سارے راستے مسدود کر دیتا ہے اور ان دیواروں کے چاروں طرف محافظ چوکیاں تعمیر کر دیتا ہے تاکہ دور دور تک کوئی خطرہ ہی پیدا نہ ہو سکے۔ وہ والدین کو حکم دیتا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد فوراً اپنی لڑکی کی شادی کر دیں۔ نوجوانوں کو حکم دیتا ہے کہ تجرد کی زندگی ختم کر کے فوراً کسی عورت کو اپنے نکاح میں لے آئیں۔ چنانچہ احادیث میں ہے: آنحضور ﷺ نے فرمایا۔

" نکاح میری سنت ہے جو اس سے کتراتا ہے وہ میرا نہیں ہے "

دوسری حدیث میں فرمایا۔ " کنوارے کی نماز پر شادی شدہ کی نماز کئی درجہ فضیلت رکھتی ہے۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا۔ " اسلام میں ترک نکاح نہیں "

ایک اور حدیث میں فرمایا۔ " دنیا ایک بازار ہے جس کا بہترین سامان نیک عورت ہے "

حضرت انس کی حدیث میں ارشاد ہوا جو " اللہ سے طاہر و مطہر (پاک اور پاکیزہ) ہو کر ملنا چاہتا ہے اسے شادی کرنا چاہیے " حضرت ابو ذر رضی عکاف بن بشر تمیمی کے بارے میں کہتے ہیں کہ باوجود استطاعت شادی نہ کرنے پر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا " تب تو تم اخوان الشیاطین میں ہو۔ تمہارے کنوارے تمہارے بدتر لوگ

ہیں جن کی موت بھی بدتر ہے۔ تم شیطان کو کیوں موقع دیتے ہو اس کا تو بہترین ہتھیار عورتیں ہی ہیں۔

حضرت انس سے روایت ہے "جس نے نکاح کیا اس نے آدھا ایمان مکمل کر لیا۔ اب باقی نصف میں اسے اللہ سے ڈرنا چاہیے"

معاشرہ میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو غربت و افلاس کے خوف سے نکاح سے پرہیز کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے شادی کر لی تو اخراجات بڑھ جائیں گے اور معیار زندگی گھٹ جائے گا۔ اسلام اس ذہن کو ایمان کی کمزوری اور خدا کی رزاقیت میں شبہہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو حضور نے نصیحت فرمائی "عورتوں سے نکاح کرو وہ تمہاری آمدنی میں برکت کا ذریعہ ہوں گی۔ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ تین شخصوں کی اعانت اللہ اپنے ذمہ لیتا ہے۔ ایک غلام کا آزاد کرنے والا، دوسرے بنجر زمین آباد کرنے والا، تیسرا وہ جو خدا کے بھروسے پر شادی کرتا ہے

اس طرح اسلام نے نہ صرف یہ کہ اس محافظ قلعہ کو تعمیر کر کے مطمئن نہیں ہو گیا بلکہ اس میں شب خون مارنے والے سارے ہی لوگوں کو شادی کی ترغیب دے کر اس کے لیے پیدا ہونے والے سارے خطرات کو جڑ سے مٹا دیا۔ اس کے باوجود اس نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ مردوں میں آزادی سے گھومتی پھریں نہ پھریں اپنی زینتوں کو شوہروں کے علاوہ باقی سارے مردوں سے چھپائے رکھیں۔ جسم کے نشیب و فراز کی نمائش سے اجتناب کریں آواز کرنے والا زیور اور تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلیں۔ ناگزیر حالات میں اگر نکلنا ہی پڑے تو اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھک کر نکلیں تاکہ مردوں کے لیے دعوت نظارہ کی ترغیب کا سبب نہ بن سکیں تو دوسری طرف مردوں کو بھی حکم دیا کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور عورتوں کو گھورتے نہ پھریں۔ اس لیے کہ زنا کا نقطۂ آغاز ہی بے نظر بازی ہے۔ اسی لیے اسلام نظر کے اس عمل تک کو آنکھوں کے زنا سے تعبیر کرتا ہے۔ عورت کی آواز بھی جادو جگانے میں کسی سے کم نہیں ہے اس لیے اسلام انہیں یہ بھی ہدایت دیتا ہے کہ وہ اس طرح بات نہ کریں کہ غیر مردوں تک ان کی آواز جائے اور آواز کے اثر سے ان کے دلوں میں دیکھنے کی خواہش ہو

الغرض اسلام نے جہاں عورت کی آزادی کی حفاظت کے لیے اور اسے جنسی استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے جس قلعہ کو تعمیر کیا تھا اس کی دیوار کے چاروں طرف محافظ چوکیاں بنا کر اور حفاظتی تدابیر اختیار کر کے اسے کلی طور پر محفوظ کر دیا ہے اس کے بعد اگر کوئی خبیث النفس زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اسلام ایسے لوگوں سے معاشرے کو پاک کرنے کا انتظام بھی کر دیتا ہے۔

ان سارے انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد اسلام مسئلۂ تناسل کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور اس

کی تعیین کرنے کی فکر کرتا ہے کہ عورت اور مرد میں تعلقات کی نوعیت کیا ہو؟ وہ اس مسئلہ کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اس لیے کہ اسلام کے نزدیک انسانی معاشرہ کی بنیادی خاندان ہے جس کا آغاز ایک عورت کے جنسی تعلق سے ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی معاشرہ ایک فلک بوس عمارت ہے جس کی ایک ایک اینٹ کو خاندان کا نام دے دیا گیا ہے اس لیے اس عمارت کا حسن استحکام اور دوام کا انحصار اس پر ہے کہ اس کی ایک ایک اینٹ ٹھوس، مضبوط اور پختہ بنی ہوئی ہو۔ ساتھ ہی ان کی تشکیل دوسری اینٹوں کی رعایت رکھتے ہوئے کی گئی ہو۔ اس لیے اسلام سب سے زیادہ توجہ معاشرتی عمارت کی ایک ایک اینٹ پر مرکوز کر دیتا ہے پھر چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لیے وہ جہاں مرد اور عورت کے معاشرتی حدود مقرر کرنے میں نظام کائنات سے ہم آہنگی کی فکر کرتا ہے وہیں دونوں کے جنسی تعلق کی ابتدا ہی میں بھی فطرت کے اشاروں کو نظر انداز نہیں کرتا

اگر فطرت کے اشاروں اور اس کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے انسانی جسم (مرد اور عورت) کی تخلیقی انفرادیت پر نظر رکھی جائے تو ہمیں فطرت کے واضح اشارات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے نر اور مادہ کے درمیان تعلق کی نوعیت اس نوعیت سے بالکل مختلف ہونی چاہیے جو ہمیں حیوانات میں نظر آتی ہے۔ سارے حیوانات اپنی مادہ بھی رکھتے ہیں مگر ان میں عضو تناسل کو جسم کے کھلے حصہ میں رکھا گیا ہے اس کے برخلاف عورت کے عضو تولید کو ایک ایسے مقام پر محفوظ کر دیا گیا ہے جہاں وہ پوری طور پر اس کی مرضی کے تابع رہتا ہے اور اسے اس وقت تک استعمال نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ عورت کی مرضی اس میں شامل نہ ہو خواہ وہ جبر و ظلم ہی سے کیوں نہ حاصل کی گئی ہو۔ اس کے برخلاف مرد انہ عضو تناسل کو جسم کے کھلے مقام پر رکھا گیا ہے لیکن جانوروں کے عضو تناسل کو پیروں کے نیچے پیٹ میں چھپا دیا گیا ہے۔

انسان اور جانور کے جوڑوں میں اعضاء تناسل کے مقام کا یہ تعین اپنے اندر بڑی رہنمائی رکھتا ہے۔ جانوروں میں مرد کے عضو تناسل کو چھپا کر مادہ کے عضو کو کھلی جگہ رکھنا انسانوں میں مادہ کے عضو تناسل کو چھپا کر، مرد کے عضو کو کھلی جگہ دینا، بالکل الٹی اسکیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جانور کی مادہ کو اپنے نر سے چونکہ کوئی جنسی خطرہ موجود نہیں ہے اس لیے اس کے عضو کو کھلی جگہ دے دی گئی ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جانوروں میں جنسی حس مخصوص ایام اور موسم ہی میں بیدار ہوتی ہے اور باقی پورے سال ان کی جنسی حس خوابیدہ رہتی ہے اس لیے نر کے عضو کو بھی چھپا کر محفوظ کر دیا گیا ہے اور مادہ کے عضو کے لیے بھی چونکہ کوئی خطرہ نہیں اس لیے عمومی و نیل تف کی سہولت کے لیے اس کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف چونکہ انسانی جوڑے میں یہ جنسی

کے نہ کوئی مخصوص ایام ہیں اور نہ کوئی مخصوص موسم' ان کی یہ حس ہمیشہ بیدار رہتی ہے اس لیے مرد کے عضو کو نہ تو چھپایا ہی گیا ہے اور نہ اس کے تحفظ کے لیے ایسی جگہ متعین کی گئی ہے جہاں اس کے اظہار میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہو اس وجہ سے انسان کی مادہ اپنے نر کے جنسی حملوں کے ذریعہ ہمیشہ استحصال کے خطرہ میں رہتی ہے اس لیے اس کے عضو کو چھپا کر ایسی جگہ رکھ دیا گیا جہاں سے اسے اس وقت تک استعمال کیا ہی نہیں جا سکتا جب تک کہ اس کی مرضی بھی اس میں شامل نہ ہو۔

انسانی جوڑے میں جنسی اعضا کی یہ ساخت اور ان کے مقام کی یہ تخصیص اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ انسانی جوڑے میں جنسی حس ہمیشہ موجود رہے گی اور یہ کہ ان دونوں میں مرد ہمیشہ جارح رہے گا اور انسان کی سماجی تاریخ شاہد ہے کہ عورت ہمیشہ مرد کی جنسی جارحیت کا شکار بنائی جاتی رہی ہے۔ عورت کے جنسی مقام کا تعین اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ اس کے عضو کو وہ مخصوص مقام اسی لیے دیا گیا ہے کہ عورت اپنی قوت کی حد تک اس کا دفاع کرے اور آسانی سے استحصال کے لیے مجبور نہ کی جا سکے۔ قدرت کے اس انتظام سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ عورت کے لیے آزادی اور مساوات کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قدرت کی طرح سماجی ضابطہ بھی اس طور پر مرتب کیا جائے کہ عورت کو مرد کی جارحیت سے نجات مل سکے اور مرد اسے مجبور کر کے اس کا جنسی استحصال نہ کر سکے۔ اگر اس تعین کے فرق کا منشا یہ نہ ہوتا اور قدرت بھی اس کی مؤید نہ ہوتی کہ عورت کو سماج میں جنسی استحصال سے بچانے کا اہتمام کیا جائے تو بڑی آسانی سے اس کے جنسی عضو کو بھی جسم کے کسی نمایاں مقام پر رکھا جا سکتا تھا۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدرت عورت کو پوری جنسی آزادی دینا چاہتی ہے اور اس معاملہ میں بھی وہ اتنی مساوات برتتی ہے کہ اس عمل کے لیے صرف مرد کی رضامندی کافی نہیں ہے' بلکہ اس کے ساتھ عورت کی رضامندی بھی مساوی طور پر ضروری ہے۔ قدرت عورت کو شریک اور شاہراہ بنا کر مرد کی مسافر قرار نہیں دیتی جیسا کہ بعض مغربی فلسفیوں کے نظریات سے مترشح ہوتا ہے اس لیے سماجی ضوابط میں قدرت کے اس منشا کو ملحوظ رکھنا لازمی امر ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب جب بھی انسان نے قدرت کے اس اشارے کو نظر انداز کیا ہے لازمی طور پر معاشرے کو تباہی سے دوچار ہونا پڑا ہے اور لاتعداد جنسی جرائم اور امراض کے ساتھ جنسی انارکی نے جنم لیا ہے۔

(سید احمد قادری)

میرا یہ مختصر مقالہ حسب ذیل نکات پر مشتمل ہوگا :-

(۱) تمہید (۲) مسلم پرسنل کی اصطلاح اور اس کا پس منظر (۳) مسلم پرسنل لا کن مسائل کا مجموعہ ہے ؟
(۴) مسلم پرسنل لا کی اہمیت (۵) مسلمانوں کی ذمہ داریاں (۶) مسلم پرسنل لا کے مسئلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے

تمہید

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ انگریزوں ہی کے عہد حکومت میں شروع ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس میں تبدیلیوں کے اقدامات شروع کر دیئے تھے لیکن وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اپنے اپنے پرسنل لا سے گہرا لگاؤ ہے، جذباتی بھی اور عقیدے کا بھی اس لیے انھوں نے اس ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ مسلمانوں نے جنگ آزادی میں جو بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کا ایک بڑا محرک یہ خیال تھا کہ جب تک سمندر پار کے غیر ملکی حکمرانوں کو نکال باہر نہ کیا جائے؟ ان کا دین، ان کے شخصی قوانین، ان کی تہذیب اور ان کا ملی تشخص خطرات سے دوچار رہے گا۔ علمائے کرام بھی یہی ان کو سمجھاتے رہے کہ ساری خرابیوں کی جڑ انگریز ہیں ان کو نکال دو، تو تم ہر طرح محفوظ ہو جاؤ گے یہ ایک لمبی داستان ہے اس وقت اس کو دہرانا نہیں ہے

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہمارے ملک پر آزادی کا آفتاب طلوع ہوا تو مسلمانوں نے اطمینان کی سانس لی کہ اب ہم آزاد ہو گئے ہیں اس لیے ہماری زبان، ہماری تہذیب، ہماری انفرادیت اور مسلم پرسنل لا پر کوئی آنچ نہ آئے گی بلکہ ہماری یہ تمام چیزیں آزاد فضا میں فروغ پائیں گی اور ہم امن و سکون سے اپنی

صلاحیتیں ملک کی تعمیر میں صرف کر سکیں گے۔ علماء کی سمجھائی ہوئی بات انہیں یاد آ رہی تھی لیکن آزادی کا آفتاب ابھی افق سے بلند بھی نہ ہوا تھا کہ ان پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ یہ تھی۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جب ہندوستان کا دستور پاس ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے سروں پر یکساں سول کوڈ کی تلوار لٹک رہی ہے۔ مسلم پرسنل لا پر خطرات کے بادل اسی وقت افق پر نمودار ہو گئے تھے اور اب ۲۷ سال کی مدت میں ان سیاہ بادلوں نے پورے افق کو گھیر لیا ہے۔ دستور ہند میں ایک طرف تو اقلیتوں کو بہت سے بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں اور دوسری طرف رہنما اصولوں میں یکساں سول کوڈ کو پورے ملک میں نافذ کرنے کا وعدہ بھی کر لیا گیا ہے۔ "سرکاری پالیسی کے رہنما اصول" میں دفعہ ۴۴ کے متن کا ترجمہ یہ ہے :-

"حکومت شہریوں کے لیے ایک ایسا مشترکہ سول کوڈ رائج کرنے کے لیے جدوجہد کرے گی جس کا نفاذ ہندوستان کے طول و عرض میں ہو۔"

دستور ساز اسمبلی کے متعدد مسلم و غیر مسلم ممبروں نے اس رہنما اصول پر اعتراض کیا تھا اور بعض مسلمان ممبروں نے ترمیم بھی پیش کی تھی لیکن ان کی ترمیم منظور نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر امبیدکر نے جن کی نگرانی میں دستور بن رہا تھا۔ اقلیت سے تعلق رکھنے والے ممبروں کو یقین دہانی کرائی تھی اور دستور ساز اسمبلی میں اس کا اعلان کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا :-

حکومت کو محض اختیار دیا جا رہا ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی شخصی قوانین ختم کرنا اس کے لیے لازم ہو گا۔ کسی صاحب کو یہ خطرہ نہیں ہونا چاہیے کہ محض یہ اختیار مل جانے کے باعث حکومت فوراً اس پر عمل کرنے پر مصر ہو جائے گی خواہ ملک کے مسلمان یا عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے۔ حکومت کے اختیارات ہمیشہ محدود ہوتے ہیں خواہ آپ انہیں لفظی طور پر کتنا ہی لامحدود کر دیں کیونکہ حکومت کو اپنے اختیارات کے استعمال میں مختلف فرقوں کے جذبات کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی گورنمنٹ اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کر سکتی جس کے نتیجے میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر کسی وقت گورنمنٹ ایسا کرنے کی سوچے تو اسے فاتر العقل کہنا چاہیے

(طاہر محمود: مسلم پرسنل کے تحفظ کا مسئلہ)

لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ یقین دہانی سیاسی طفلانہ تسلی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حکومت نے دفعہ ۴۴ کو اپنا نصب العین بنائے رکھا ہے اور وہ تدریج یکساں سول کوڈ کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ وہ اپنے ملازمین پر بلا تفریق مذہب، تعدد ازدواج کا دروازہ بند کر چکی ہے اور ان کے لیے یک زوجگی کو لازم قرار دے چکی ہے۔ وہ اسپیشل میرج ایکٹ پاس کر چکی ہے جس کے تحت ایک مسلمان عورت اپنا مذہب تبدیل کیے بغیر غیر مسلم سے شادی کر سکتی ہے اور جس کے تحت وہ اپنے شوہر کی نصف جائداد کی مالک ہو جاتی ہے صوبہ یوپی وغیرہ کی اسمبلیاں زرعی ایکٹ پاس کر چکی ہیں اور یہ ایکٹ مسلمانوں پر بھی نافذ ہے۔ ان ایکٹوں میں زرعی زمین کی وراثت کے ضابطے، اسلامی شریعت کے بالکل خلاف بنائے گئے ہیں۔ مسلم پرسنل لا کے جو قوانین ابھی بدلے نہیں گئے ہیں، انہیں بدلنے کی بھی ہمہ جہتی کوششیں جاری ہیں اور ان کی سنگینی روز بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ اس مسئلے کے تعلق سے صورت حال کا مختصر ترین جائزہ ہے۔

مسلم پرسنل لا کی اصطلاح اور اس کا پس منظر

مسلم پرسنل لا کی اصطلاح انگریزوں نے وضع کی ہے اور انہیں کے عہد حکومت میں رائج ہوئی ہے عربی زبان میں پرسنل لا کے لیے "الاحوال الشخصیہ" کی اصطلاح بنائی گئی ہے۔ چونکہ یہ اصطلاح انگریزوں کی وضع کی ہوئی ہے اور دستور ہند کے بنیادی حقوق میں بھی یہ داخل ہے اس لیے جدید تعلیم یافتہ مسلمان جو مسلم پرسنل لا میں تبدیلی چاہتے ہیں، مسلمانوں کو یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ:-

> "مسلم پرسنل لا میں جب کسی ترمیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اس کی مخالفت میں سب سے بڑی دلیل یہی پیش کی جاتی ہے کہ شریعت، دین اسلام کا جزو لاینفک ہے اس لیے اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ شریعت کی پابندی قانونی حیثیت سے فرض ہے اور اخلاقی حیثیت سے لازمی ہے اس لیے اس میں قطع و برید نہیں کی جا سکتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے نام سے جو قانون رائج ہے اسے "شریعت" کا درجہ دینا ہی غلط ہے۔ یہ پرسنل لا غیر دینی ہے جسے دستور ہند نے (جو "اسلامی" نہیں غیر دینی آئین ہے) رائج کیا ہے۔ یہ دستور ہندوستان میں صرف مذہب اسلام ہی کو سچا مذہب تصور نہیں کرتا ہے۔ آج جو کچھ پرسنل لا میں پایا جاتا ہے اس کا صرف ایک جزو اسلامی شریعت سے مطابقت رکھتا ہے ورنہ وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یہی ہے کہ ملک میں

یکساں قانون ہو۔" [1]

اس عبارت میں اگرچہ پروفیسر صاحب نے ایک سچی بات بھی لکھ دی ہے لیکن اصل غرض مسلمانوں کو مغالطہ دینا ہی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے طویل مقالے میں خود لکھ چکے ہیں اور اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ شریعت ایکٹ جس میں خود ان کے بقول مسلم پرسنل لا کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، ۱۹۳۷ء میں پاس ہوا تھا اور اس وقت حکومت انگریزوں کی تھی۔ اس وقت دستور ہند کا وجود بھی نہ تھا۔ دستور ہند نے صرف اتنا کیا ہے کہ شریعت ایکٹ اور مسلم پرسنل لا کو باقی رکھا ہے، منسوخ نہیں کیا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ مروجہ مسلم پرسنل لا یا شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کو شریعت کا درجہ دینا ہی غلط ہے، ایک مغالطہ ہے۔ عقل و فہم رکھنے والا کوئی بھی مسلمان ۱۹۳۷ء کے اس ایکٹ کو شریعت کا درجہ نہیں دیتا ہے بلکہ جن شرعی احکام کے تحفظ اور مسلمانوں کو قانوناً ان کا پابند بنانے کے لیے شریعت ایکٹ پاس کرایا گیا تھا مسلمان ان شرعی احکام و قوانین کو اسلامی اور شریعت اسلامیہ کا جزو لازم سمجھتے ہیں اور ان میں کسی ترمیم کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر میراث میں بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ دینا شریعت کا قانون ہے اور اس میں ترمیم کرنے یا اسے بدلنے کو وہ شریعت میں مداخلت قرار دیتے یا اس کو مداخلت فی الدین سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نکاح، طلاق، خلع، میراث وغیرہ کے احکام اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے ہیں کسی انگلستانی یا ہندوستانی سرکار کا عطیہ نہیں ہیں۔

پروفیسر صاحب نے یہ سچی بات لکھ دی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں کی گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ ملک میں یکساں قانون نافذ ہو۔" ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں وہ یکساں سول کوڈ کی طرف اقدامات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حکومت کے بعض ذمہ داروں نے بھی اس کو مخفی نہیں رکھا ہے اور اپنے بعض بیانات میں صراحت کے ساتھ یہ بات کہی ہے۔

مسلم پرسنل لا کی اصطلاح کا پس منظر یہ ہے کہ یورپ میں جب نشاۃ ثانیہ کا دور آیا تو سیاست کو مذہب سے بالکل الگ کر دیا گیا اور صرف چنگیزی باقی رہ گئی۔ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" مذہب کو پرائیوٹ معاملہ قرار دیا گیا۔ خدا کا عقیدہ، اس کی پرستش اور نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ مسائل کو شخصی کہا گیا۔ اسی تصور کے پیش نظر ہندوستان میں انگریزوں نے اس طرح کے مسائل کے لیے مسلم پرسنل کی اصطلاح وضع کی۔ یہ اصطلاح اسلامی تصور دین کے نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی غلط ہے

---

[1] پروفیسر آصف فیضی بحوالہ مسلم پرسنل لا نمبر ماہنامہ زندگی رامپور دسمبر و جنوری ۷۲-۱۹۷۳ء

کہ اس کو مسلم لا قرار دیا گیا حالانکہ نکاح طلاق وغیرہ کا قانون اسلامک لا ہے اور اس اعتبار سے بھی غلط ہے کہ اس کو پرسنل لا کہا گیا ہے حالانکہ یہ قانون حقیقی معنے میں شخصی نہیں بلکہ معاشرتی ہے۔ یہ قوانین اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مسلم قوم کی بنیاد کسی وطن یا نسل یا زبان یا رنگ پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم پرسنل لا جن قوانین کا مجموعہ ہے وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ہے۔ یہ کوئی قومی اور وطنی مسئلہ نہیں بلکہ ہمارا ملی مسئلہ ہے اور ملت اسلامیہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔

مسلم پرسنل لا کن مسائل کا مجموعہ ہے

ہندوستان میں جو مسلم پرسنل لا نافذ ہے وہ درج ذیل مسائل کا مجموعہ ہے۔

نکاح یا شادی، مہر، طلاق، فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء، ثبوت نسب، گارجین شپ (ولایت) یعنی ولی اور سرپرست ہونے کا مسئلہ، نفقہ، وقف، ہبہ، شفعہ، وصیت، وراثت، ریاست اور جائداد کا انتظام۔

یہی مسائل اور ان کی جزئیات ہیں جن کو مسلم پرسنل لا کہتے ہیں اور انہیں کے لیے محمڈن لا کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ قانون کی کتابوں میں ان میں سے ہر مسئلہ ایک مستقل چیپٹر (باب) میں زیر بحث آتا ہے۔ مسلم پرسنل لا کی یہ فہرست میں نے اس خالد رشید ال ایل ایم علی گڈھ کی کتاب مسلم لا سے حاصل کی ہے

مسلم پرسنل لا کی اہمیت

میں اس کی اہمیت پر تین نکات میں گفتگو کروں گا۔ اہمیت بحیثیت دین۔ اہمیت بحیثیت تہذیب۔ اہمیت بحیثیت انفرادیت و تشخصیت۔

اہمیت بحیثیت دین

اوپر جن مسائل کا ذکر آیا ہے ان کی دینی اہمیت یہ ہے کہ وہ شریعت اسلامیہ کا اسی طرح جزو لاینفک ہیں جس طرح مثال کے طور پر عبادات — نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اس کا جزو لاینفک ہیں۔ دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اسلام ایک مکمل دین، مکمل ضابطۂ حیات اور مکمل طریق زندگی کا نام ہے اور یہ دین قیامت تک کے لیے واجب الاتباع اور ناقابل ترمیم و تنسیخ ہے۔

(۱) اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور

عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۝ (المائدہ : ۳) — اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے

اس آیت کریمہ میں دو باتیں بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ دین اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا دین ہے اور دوسری یہ کہ اس کی تکمیل کر دی گئی ہے اس میں کوئی نقص یا عیب نہیں ہے کہ اس میں کسی ترمیم یا تنسیخ کی ضرورت پیش آئے

(۲) قرآن کریم میں جس طرح کے الفاظ عبادت کی فرضیت کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اسی طرح معاشرتی احکام کے بارے میں بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر نماز کے لئے کہا گیا ہے :۔

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا ۝ (النساء: ۱۰۳) — بے شک نماز ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ لازم کیا گیا ہے۔

روزے کے بارے میں ہے :۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرہ ۱۸۳) — تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح نکاح سے متعلق متعدد احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے

كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ (النساء : ۲۴) — تم پر اللہ نے (ان قوانین کو) فرض ٹھہرا دیا ہے

آیت میراث نازل ہونے سے پہلے والدین اور قرابت داروں کے لئے وصیت کا حکم دیا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (البقرہ: ۱۸۰) — تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لئے معروف طریقے سے وصیت کرے یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔

حکم اللہ (اللہ کا حکم) کے الفاظ بھی آئے ہیں ہجرت کرنے والی مومن عورتوں کے لئے نہ کفار حلال ہیں اور نہ وہ کفار کے لئے حلال ہیں اور اسی ذیل کے چند مسائل کے بعد ہے :۔

ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (الممتحنہ ۱۰) — یہ اللہ کا حکم ہے وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

امر اللہ (اللہ کا امر و حکم) کے الفاظ بھی آئے ہیں، عدت کے بعض احکام دینے کے بعد کہا گیا

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝ (الطلاق۔ ۵)	یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا۔

فریضۃ کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ میراث کے احکام دیتے ہوئے کہا گیا ہے :۔

فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (النساء : ۱۱)	یہ (حصے وراثت کے) اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ہیں، یقیناً اللہ علیم و حکیم ہے۔

وصیۃ کے لفظ سے بھی مؤکد کیا گیا ہے اللہ کی طرف سے وصیت، کسی مؤکد حکم کو کہتے ہیں۔ میراث ہی کے سلسلے میں ہے :۔

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ (النساء۔ ۱۲)	یہ اللہ کی طرف سے وصیت (یعنی تاکید کا حکم) ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔

حدود اللہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں) معاشرتی احکام و قوانین کو حدود اللہ کہا گیا اور ان سے تجاوز کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ طلاق اور خلع کے بعض احکام دینے کے بعد کہا گیا ہے :۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (بقرہ: ۲۲۹)	یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔

جزا و سزا ــــ اس پہلو سے دیکھیے تو عبادات کی بجاآوری پر جو جزا اور ترک کرنے کی جو سزا قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے وہی جزا معاشرتی احکام کی بجاآوری کے لیے اور وہی سزا ان کی خلاف ورزی کے لیے بیان کی گئی ہے۔ احکام وراثت کی تفصیل کے بعد فرمایا گیا ہے :۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۭ	یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں

وَذَالِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ٥ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ٥

(نساء - ۱۳ - ۱۴)

بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیگا۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیگا اور اس کے لیے رسواکن سزا ہے۔

آیت ۱۳ میں وہ بشارت دی گئی ہے جو مومن کے لیے سب سے بڑی بشارت ہے اور آیت ۱۴ میں وہ وعید سنائی گئی ہے جس سے مومن کے جسم پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ ان آیتوں کو پڑھنے اور سمجھ لینے کے بعد اگر کوئی شخص نکاح وطلاق ووراثت وغیرہ کے احکام کو دینی احکام نہیں سمجھتا یا ان کو شریعت اسلامیہ کا جزو لاینفک قرار نہیں دیتا تو وہ تین قسموں میں سے کسی ایک قسم میں داخل ہے۔ وہ قرآن پر ایمان نہ رکھتا ہوگا یا متعصب ہوگا یا فاترالعقل۔

دینی اہمیت کا ایک اور پہلو

جن لوگوں نے پورے قرآن کا سمجھ کر مطالعہ کیا ہے وہ اس سے واقف ہوں گے کہ قرآن کریم میں جس تفصیل سے نکاح، طلاق، خلع اور وراثت کے احکام بیان کیے گئے ہیں اتنی تفصیل سے نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج کے احکام بھی بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ اس کی توجیہ جو کچھ بھی کی جائے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان احکام کی اہمیت سے کوئی مومن انکار نہیں کر سکتا۔ احادیث نبوی کا حال یہ ہے کہ اگر صرف کتاب النکاح کی احادیث کے ترجمے کر کے ان کی تشریح کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

اہمیت بحیثیت تہذیب

اس وقت مجھے نہ دنیا کی دوسری قوموں اور ملکوں کی تہذیبوں پر گفتگو کرنی ہے اور نہ اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی کی تفصیل کرنی ہے۔ یہاں موضوع کی مناسبت سے صرف اتنی بات عرض کرنی ہے کہ اسلامی تہذیب اسلام کے سکھائے ہوئے عقائد اور عبادات و کائنات کے بارے میں اس کے دیے ہوئے تصورات کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس نے اسلامی معاشرے کو مہذب اور پاکیزہ رکھنے کے لیے مستقل اور اٹل اقدار عطا کی ہیں ان اقدار کی حفاظت ہی پر اسلامی تہذیب کی بقا موقوف ہے۔ مثال کے طور پر اسلام نے ہمیں حیا، عصمت و عفت اور

پاکی و اتحاد، تحفظ نسب، بیویوں کے ساتھ عدل و حسن معاشرت، مرد اور عورت کے درمیان ان کی پیدائشی خصوصیات و امتیازات کے فرق کی بنا پر درجہ بندی اور اس طرح کی دوسری مستقل اور لازوال اقدار دی ہیں۔ نکاح، طلاق، خلع، میراث اور دوسرے احکام و قوانین ان اقدار کے بہت بڑے مظاہر ہیں۔ اگر انہیں ختم کر دیا جائے یا ان کی جگہ دوسری اقدار لے آئی جائیں تو ملت اسلامیہ تہذیبی طور پر ایک دریوزہ گر ملت بن جائے گی۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ دولت ایمان کی حفاظت کے لیے بھی عائلی و معاشرتی احکام پر عمل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً نکاح کے سلسلے میں اسلام کا ایک قانون یہ ہے کہ اہل اسلام اور اہل شرک و کفر کے درمیان رشتۂ مناکحت قائم نہیں ہو سکتا اس کی وجہ یہی ہے کہ اگر ایسا کیا جائے تو اس اختلاط سے ایمان و اسلام کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۲۱ میں یہ قانون تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے ہم اس کا ترجمہ و تشریح یہاں پیش کرتے ہیں

"تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں ایک مومن لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں ایک مومن غلام، مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو۔ یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

تشریح: "یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں" یہ ہے علت و مصلحت اس حکم کی جو مشرکین سے شادی بیاہ کا تعلق نہ رکھنے کے متعلق اوپر بیان ہوا تھا۔ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک گہرا تمدنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ قلبی تعلق ہو تو جہاں اس امر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اس کے خاندان اور آئندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرز زندگی کا نقش ثبت ہو گا وہیں اس امر کا بھی امکان ہے کہ مشرک شوہر یا بیوی کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن شوہر یا بیوی، بلکہ اس کا خاندان اور دونوں کی نسل تک متاثر ہو جائے گی اور غالب امکان اس امر کا ہے کہ ایسے ازدواج سے اسلام

اور کفر و شرک کی ایک ایسی معجون مرکب اس گھر اور اس خاندان میں پرورش پائے گی جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو وہ محض اپنے جذبات شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر اور اس کے خاندان میں کافرانہ و مشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر و شرک سے متاثر ہو جائے۔ اگر بالفرض ایک مرد مومن کسی فرد مشرک کے عشق میں مبتلا ہو جائے تب بھی اس کے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین و اخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے۔ [1]

اہمیت بحیثیت انفرادیت و شخصیت

مسلمانوں کی انفرادیت اور ملی تشخص کے لیے بھی ان کے عائلی و معاشرتی قانون کا باقی رہنا ضروری ہے اس لیے مسلم پرسنل لا کا خاتمہ درحقیقت ان کے ملی تشخص کی موت کے مترادف ہوگا۔ بالخصوص ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں اور حکومت کی باگ ان کے ہاتھوں میں نہ ہو۔ ایسے ممالک میں اگر نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ کے اسلامی قوانین بھی ختم کر دیے جائیں تو خواہ وہ نام کے مسلمان باقی رہیں لیکن حقیقی معنے میں ان پر ملت اسلامیہ کا اطلاق نہ ہو سکے گا۔ ہندوستان میں ایسے نام کے مسلمان آج بھی موجود ہیں اور یہی لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ ہو جائے۔

مسلمانوں کی ذمہ داریاں

اس عنوان کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ مسلمان جب تک اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کریں حکومت سے اس کی ذمہ داری ادا کرنے کا مطالبہ عجیب سی شے ہے۔

(۱) مسلمانوں کی سب سے پہلی اور اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان قوانین پر خود عمل کریں جن کو باقی رکھنے کا مطالبہ حکومت سے کر رہے ہیں۔ نکاح، طلاق، خلع اور تقسیم میراث وغیرہ میں وہ خود عملی طور پر شریعت کے احکام کی جو خلاف ورزیاں کر رہے ہیں اس سے باز آجائیں۔ یہ ان کے ایمان کا تقاضا بھی ہے اور مسلم پرسنل لا کی بقا کا مؤثر ترین عامل بھی ہے۔ جو لوگ مثال کے طور پر مسلمان عورتوں کی مظلومیت کو دلیل بنا کر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی جانی چاہیے یا یکساں سول کوڈ نافذ کر دیا جانا چاہیے ان کا محرک خواہ کچھ بھی

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۶۹

ہو اور ان کی دلیل خواہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اہل معاشرہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم پرسنل لا جن مسائل کا مجموعہ ہے اور جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ان میں سے کون سا مسئلہ ایسا ہے جس میں وہ شریعت کے حکم اور منشا کی خلاف ورزی نہیں کر رہے ہیں۔ غلط محرکات کے تحت نکاح، نان نفقہ اور برتاؤ میں بیویوں پر ظلم، طلاق کا بے محابا اور وحشیانہ استعمال، تقسیم میراث میں کھلی ہوئی ناانصافی، وصیت اور ہبہ کے شرعی احکام کی عملی تردید، آخر وہ کونسی چیز ہے جس کی مثالیں مسلم معاشرے میں کم ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں محرمات ابدیہ یعنی ہمیشہ کے لیے حرام عورتوں سے نکاح کا رواج بھی موجود ہے۔

اس لیے سب سے پہلے انہیں اپنے طرز عمل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اغیار کو اپنے نمونۂ عمل سے بہانہ مہیا نہ کرنا چاہیے۔

شرعی احکام کے مکلف جس طرح مرد ہیں اسی طرح عورتیں بھی ہیں اس لیے مخاطب دونوں ہی ہیں۔ دونوں کو شرعی احکام سے واقف اور ان پر عامل ہونا چاہیے۔

(۲) پڑھے لکھے اور مسائل سے واقف مسلمانوں کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نکاح، طلاق، خلع اور تقسیم میراث وغیرہ مسائل میں شرعی احکام پر خود عمل کریں اور دوسری یہ کہ مسلم پرسنل لا سے متعلق مسائل کا علم ان لوگوں میں پھیلائیں جو ان سے ناواقف ہیں۔ اگرچہ اس باب میں خاصہ کام ہوا ہے لیکن جہالت جس حد تک پھیلی ہوئی ہے اس کے لحاظ سے بہت کم ہوا ہے۔

(۳) "قضاء شرعی کا قیام ضروری ہے" اس عنوان سے ایک مختصر مقالہ ماہنامہ زندگی کے مسلم پرسنل لا (جلد ۵۰-۵۱ شمارہ ۶-۱ دسمبر ۷۲ جنوری ۱۹۷۳ء) میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کو یہاں دہرانا موجب طوالت ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ نکاح، طلاق، فسخ نکاح اور تقسیم میراث وغیرہ مسائل کا صحیح حل یہ ہے کہ ان امور و معاملات کے فیصلے مسلمان قاضی کیا کریں۔ ۱۸۶۴ء تک ہندوستان میں شرعی عدالتیں قائم تھیں اور مسلمانوں کے شرعی معاملات کے فیصلے مسلمان قاضی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کی جماعت سے کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد انگریزوں نے شرعی عدالتیں ختم کر دیں۔ مسلم پرسنل لا یا محمڈن لا کو برقرار رکھا اور قاضی کا محکمہ توڑ دیا۔ قضاء شرعی کی ضرورت یہ ہے کہ شرعی معاملات میں غیر مسلم منصفوں اور ججوں کے فیصلے شرعاً نافذ ہی نہیں ہوتے۔ اور اس مسئلے پر تمام علمائے امت کا اجماع ہے۔

اس مقالے میں میں نے لکھا تھا:

فقہاء کی ان تصریحات کو پڑھیے اور پھر اس مصیبت پر نظر ڈالیے جس میں ہم مسلمان انگریزوں کے عہد سے آج تک مبتلا ہیں۔ اس وقت سے لیکر آج تک مسلمانوں کے سیکڑوں، ہزاروں دینی معاملات کے فیصلے غیر مسلم ججوں اور حاکموں نے کیے ہیں۔ یہاں تک کہ فسخ نکاح کے بھی نہ جانے کتنے فیصلے کیے جا چکے ہیں۔ گے۔ تمام فیصلے جو انھوں نے ماضی میں کیے وہ شرعاً نافذ نہیں ہوئے اور آئندہ بھی جو فیصلے ہوں گے وہ نافذ اور جائز نہ ہوں گے۔ یہ اتنی بڑی مصیبت ہے کہ اس کے تصور ہی سے دل بے چین ہوتا ہے۔"

قضاء شرعی کا قیام ایک دشوار کام ہے اس لیے جب تک تمام ملک میں اس کا انتظام نہ ہو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ شرعی پنچایتیں کم سے کم ہر بڑے شہر میں تشکیل دیں اور مسلمان اپنے شرعی معاملات انھیں پنچایتوں میں لے جائیں۔

(۴) خطبہ جمعہ میں، خطبہ نکاح میں، وعظ کی مجلسوں میں، سیرت النبی کے جلسوں میں مسلمانوں کو اسلام کے عائلی و معاشرتی مسائل سے بھی اسی طرح واقف کرایا جائے جس طرح عبادات سے واقف کرایا جاتا ہے عائلی مسائل کے مختلف موضوعات پر وعظ کیے جائیں اور تقریریں کی جائیں۔

(۵) صاحب ثروت مسلمان شادی کے موقع پر کافی روپیے ایسی چیزوں پر خرچ کرتے ہیں جو غیر ضروری ہوتی ہیں اس کا حاصل عام طور پر نام و نمود کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر وہ شاندار دعوت نامے چھپوا کر تقسیم کرنے اور نکاح کے وقت مٹھائی تقسیم کرنے کے بجائے اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی مخلصانہ نیت سے نکاح اور اس سے متعلقہ مسائل پر مشتمل کوئی قابل اعتماد پمفلٹ چھپوا کر زیادہ سے زیادہ تقسیم کریں۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے مسئلہ میں کیا پیش رفت ہوئی

ہندوستان کے مسلمان، انگریزوں کے زمانے ہی سے اس مسئلے میں چیخ پکار کر رہے اور صدائے احتجاج بلند کرتے آ رہے ہیں۔ اس جد و جہد میں ایک بڑی پیش رفت وہ عظیم الشان کل ہند کنونشن ہے جو مسلم پرسنل لا کے مسئلے پر بمبئی میں ۲۷-۲۸ دسمبر کو منعقد ہوا تھا، وہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک ایسا نمائندہ کنونشن تھا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی کسی ایک پلیٹ فارم پر یا اسٹیج پر تمام سیاسی و دینی پارٹیوں، فقہی مسلکوں، تمام تنظیموں، علمی اداروں، مدرسوں اور خانقاہوں کا اکٹھا ہو جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو مدتوں یاد رہے گا۔ اس کنونشن کے انعقاد میں جماعت اسلامی ہند کے ارکان اور اس کے متوسلین و متفقین نے اہم رول ادا کیا ہے۔ آج

کنونشن نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کی تھی اور یہ بورڈ کام کر رہا ہے ۔ جس زمانے میں یہ کنونشن منعقد ہوا اس وقت مسلم پرسنل لا کو ختم کرکے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی مہم بہت تیز تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حکومت اس طرح کا کوئی اقدام کرنے والی ہے ۔ مسلمانوں کے اس اتحاد و اتفاق کا یہ اثر پڑا کہ دشمنان اسلام کی مہم سرد پڑ گئی اور حکومت کو اعلان کرنا پڑا کہ جب تک مسلمان خود نہ کہیں گے مسلم پرسنل میں تبدیلی نہیں کی جائے گی ۔ لیکن بعض مستقل تنظیمیں گاہے گاہے نام نہاد مسلمان عورتوں کے ڈرامے کراتی رہتی ہیں اور ان کو حکومت کی خاموش حمایت حاصل ہے ۔ اس کنونشن کے بعد تقریباً ملک بھر میں مسلمان خواتین کے بھی بڑے بڑے اجتماعات ہوئے تھے اور انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اسلام کے دیے ہوئے عائلی قوانین بہترین اور مبنی بر عدل ہیں اور مسلم خواتین ان قوانین سے نہ صرف مطمئن ہیں بلکہ ان پر فخر کرتی ہیں ۔ کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایک کامیابی یہ ہے کہ متبنیٰ کے بارے میں جو قانون پاس ہوا ہے اس سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے ۔ اس وقت مسلمانوں کے اوقاف کے بارے میں جو ایکٹ بنا ہے وہ ناقص ہے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہا ہے افسوس یہ ہے کہ دو ضروری اور مفید تجویزوں کے سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی ہے ۔ ایک تجویز یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا جو عدالتوں میں زیر عمل ہے اس کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ اس میں کہاں کہاں شریعت سے انحراف کیا گیا ہے ۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ علماء اور مسلم ماہرین قانون کی کوئی مجلس یا بورڈ موجودہ عائلی قوانین پر کتاب و سنت کی روشنی میں نظر ثانی کرے اور یہ دیکھے کہ موجودہ حالات و ضروریات کے تحت کتاب و سنت کے اندر رہتے ہوئے کیا اصلاحات ہو سکتی ہیں کہ شریعت کا منشا بھی پورا ہو اور مسائل بھی حل ہوں ۔

یہ دونوں تجویزیں اب تک زیر عمل نہیں لائی جا سکی ہیں ۔ اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اس جدوجہد میں کامیابی اور قوانین شریعت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

میں بھی حاضر تھا وہاں

تاثرات اور حقائق

(۱۵)

(جناب حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی)

بہرحال صحابہ رضی اللہ عنہم کے پچاس کے برابر اجر و ثواب کے سلسلے میں ملاحظہ ہو مولانا علی میاں صاحب، مولانا الیاس صاحب کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

ایک دوسرے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

جس مذہب کے لیے ہزاروں جانوں کا طیب خاطر سے پیش کر دینا اس کی قیمت کے لیے کافی نہیں ہو سکتا اور جس مذہب کی اصلی قیمت سوزش جگر اور خون دیدہ بہانا تھی اس کے لیے ہمارا یہ برائے نام قدموں کا اٹھانا اور اس قدر ضعیف اور کم مقدار اپنی محنتوں کا وابستہ رکھنا اصلی فریضہ سے کچھ نسبت نہیں رکھتا لیکن خدائے پاک کی ذرہ نوازی اور مراحم خسروانہ اور اس اخیر زمانہ والوں کے لیے ان کی مساعی پر صحابہ کے پچاس کے برابر اجر و ثواب کے ملنے کی خوش خبریاں اور سچے وعدے اور لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا کی بشارتیں ہماری ان مساعی کے بارے میں بڑی امیدیں دلا رہی ہیں[1]

اب ان حضرات کو جو مولانا مودودی کی تحریروں سے زبردستی اہانت صحابہ رضی اللہ عنہم کا پہلو نکالنے کی مہم چلائے ہوئے تھے۔ مندرجہ بالا تحریر میں اہانت صحابہ رضی اللہ عنہم کا کوئی پہلو نظر نہ آنے اور بعض احادیث کو اس مہم پر منطبق کرنے کو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی دینی دعوت ص ۲۰۴

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

اب رہا معاملہ حریف کا تو اس کی تو خواہ دس ہزار مزید کوتاہیاں بھی مولانا علی میاں صاحب گنوا دیں مگر اس سے تو پھر بھی اللہ کے دین سے کھیلنے کی کوئی وجہ جواز مولانا کے لیے فراہم نہیں ہو سکتی۔ اب رہی بات علم کتاب و سنت کی تو وہ ایسا معاملہ نہیں کہ محض تعلی و تعریض سے تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے تسلیم کرنے کا معیار تو یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ مصنف نے خود اپنی تصنیفات میں کتاب و سنت کی تعلیم کو کتنا ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ اس غرض سے جب مولانا کی تصنیف "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" کا ان کی دوسری تصنیفات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ افسوسناک حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ مولانا کا علم کتاب و سنت کے تابع نہیں بلکہ اس کا کچھ حصہ تو ان کی محبوب شخصیتوں کی حرکات و سکنات کے تابع ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے کہ مولانا کے یہاں یہ تبدیلی "جماعت اسلامی" سے نکلنے کے بعد پیدا ہوئی تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس تبدیلی میں معاصرت کے فتنہ کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ مولانا نے اپنی تصنیف "سیرت سید احمد شہیدؒ" کی اشاعت سے قبل بھی بہت سے مضامین لکھے ہیں اور اس کی اشاعت کے بعد بھی اور ان مضامین کو اب بھی اس زمانے کے رسالوں کی فائلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں نہ تو کہیں ایسی کوئی چیز ملے گی اور نہ کہیں تضاد نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ مولانا کا خادم رہنے کی حیثیت سے مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں جس وقت مولانا کی خدمت سے مولانا مودودی کی خدمت میں گیا تو مولانا کو اس حال میں چھوڑ کر گیا تھا کہ خواہ ان کے جسم کی بوٹی بوٹی بھی کاٹ ڈالی جائے تو وہ اسے بخوشی قبول کر سکتے تھے مگر کتاب و سنت کے سلسلے میں عملاً وہ موقف نہیں اختیار کر سکتے تھے جو انھوں نے "جماعت اسلامی" سے نکلنے کے بعد آہستہ آہستہ اختیار کیا۔ اور پھر وہ "مغربی فلسفوں اور نظامہائے حیات" اور "عمل اور رد عمل" کے چکر میں ایسا گرفتار ہوئے کہ انھیں اللہ کی کتاب میں بھی مولانا مودودی کی تحریروں، تعبیروں، "طریق فکر" اور "رد عمل" کے "عکس اور سائے" نظر آنے لگے اور انھوں نے بھی اللہ کی کتاب کے ان سارے حصوں کی صورت بگاڑنی شروع کر دی جو اسلام کے غلبہ و تمکن سے متعلق ہیں۔

پھر اسی کے ساتھ کشف و الہام کو بنیاد بنا کر مولانا حدود اللہ کو توڑ ڈالتے ہیں اور اس توڑ پھوڑ کے نتیجہ میں دین کا جو حصہ برآمد ہوتا ہے، اسے "اصل دین" قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور اس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ طریقہ ہی "اصلی طریقۂ نبوی" کے زیادہ مشابہ و قریب ہے۔ اور اس کی طرف مسلمانوں کو توجہ

کرنی فرض اور لازمی ہے" پھر اسی پر اکتفا نہیں جاتا بلکہ مولانا الیاس صاحب پر الہام شدہ" اصولوں پر عمل کی کوتاہی کو موجب عذاب الٰہی قرار دے کر نجات اخروی کا ان پر انحصار کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح مولانا علی میاں صاحب کی یہ تصنیف' ان کے تقویٰ و فکر آخرت کا آئینہ اور ان کے علم کتاب و سنت پر ایک داغ ہے۔ اور یہ داغ نہ تو" ماحول کے اثرات اور عمل و ردعمل کے سلسلے سے آزاد ہو کر کتاب و سنت کے براہ راست مطالعہ اور" جدید فلسفوں اور نظامہائے حیات کی آہنی گرفت اور جسم و جان میں پیوست ہو جانے والے اثرات سے واقفیت" کا دعویٰ کرنے سے دھل سکتا ہے اور نہ" عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کے قسم کی بہت سی کتابوں کی تصنیف سے۔ اس داغ کو دھونے کے لیے تو مولانا کو ان چیزوں کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا پڑے گا۔

اسی طرح مولانا کی تصنیف" عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" میں بھی ماحول کے اثرات اور عمل و ردعمل کے سلسلے سے آزاد ہو کر کتاب و سنت کے براہ راست مطالعہ اور جدید علم و فلسفہ سے واقفیت کی کوئی جھلک نہیں دکھائی دیتی۔ اس سے تو لِس کردار کشی میں مولانا کی مہارت ہی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ مولانا موصوف مولانا مودودی کی کتاب" قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ الٰہ' رب' عبادت' دین" پر دینی نقد و احتساب کا فریضہ انجام دینے کے لیے بیٹھتے ہیں تو تنقید کے جدید اصولوں کو کون کہے وہ تنقید کے ان اصولوں کو بھی فراموش کر ڈالتے ہیں جو تاریخ ادب عربی پڑھاتے ہوئے انھوں نے خود ہم دیگروں کو پڑھایا تھا اور جن کا اعادہ اکثر وہ دوران گفتگو کیا کرتے تھے۔ پھر وہ نہ کتاب کے مشتملات کو ہاتھ لگانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں اور نہ یہ بتانے کی کہ مولانا مودودی نے لغت اور قرآن کے استعمال کی رو سے الٰہ' رب' عبادت اور دین کے الفاظ کا جو مفہوم متعین کیا ہے وہ غلط ہے یا صحیح۔

بس مولانا مودودی کی کتاب کے مقدمے سے اس عبارت کا انتخاب کرتے ہیں۔

عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ" الٰہ" کے کیا معنی ہیں اور" رب" کسے کہتے ہیں' کیونکہ یہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے' انہیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم میں ہوتا ہے۔ اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا" الٰہ" اور" رب" ہے۔　　　اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں تو وہ پوری بات کو پا گئے انہیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہو گیا کہ دوسروں کے

لیے کس چیز کی نفی کی جارہی ہے اور اللہ کے لیے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے'
جنھوں نے مخالفت کی، یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و
ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان
لائے کہ اس عقیدہ کو قبول کرنے نہیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہوگا۔

اسی طرح "عبادت" اور "دین" کے الفاظ بھی ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے' ان
کو معلوم تھا کہ "عبد" کسے کہتے ہیں' عبودیت کس حالت کا نام ہے۔ عبادت سے کون سا
رویہ مراد ہے اور "دین" کا کیا مفہوم ہے اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ سب کی عبادت
چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کرو اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ تو انہیں
قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی۔ وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے
نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت
سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے' یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت
محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہو گیا' اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق
کی کمی تھی' اور دوسری وجہ یہ تھی' کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان
کے لئے "الٰہ" اور "رب" اور "دین" و "عبادت" کے وہ معنی باقی نہ رہے تھے' جو
نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے' انھیں دونوں وجوہ سے دور اخیر
کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان
معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے' مثلاً لفظ "الٰہ" کو قریب قریب بتوں اور
اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنا دیا گیا' "رب" کو پالنے اور پوسنے والے' یا پروردگار کا مترادف
ٹھہرایا گیا' "عبادت" کے معنی پوجا اور پرستش کے کئے گئے' "دین" کو دھرم اور مذہب
اور ریلیجن کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا۔

"طاغوت" کا ترجمہ بت یا شیطان کیا جانے لگا' نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی
سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا ہے[1]

[1] قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

مولانا مودودی کی کتاب کا متذکرہ بالا اقتباس جسے مولانا علی میاں صاحب نے اپنی کتاب میں دو اقتباسات کی صورت میں نقل کیا ہے، اسے نقل کرنے کے بعد وہ نہ تو اس تاریخی تجزیہ سے کوئی تعرض کرتے ہیں جو متعلقہ الفاظ کے معانی و مفاہیم کی تبدیلی کے سلسلہ میں مندرجہ بالا عبارت میں کیا گیا تھا اور نہ ان نتائج سے کوئی تعرض کرتے ہیں جو اس صورت حال میں پیدا ہوگئے تھے اور جنہیں اگلے ہی پیراگراف میں بیان کر دیا گیا تھا اور نہ تصنیف کی اس غایت کی طرف دھیان دیتے ہیں جسے مصنف نے صاف صاف الفاظ میں اس طرح بیان کر دیا تھا۔ ملاحظہ ہو۔

اگرچہ میں اس سے پہلے اپنے متعدد مضامین میں ان کے مفہوم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن جو کچھ اب تک میں نے اپنے بیان کیا ہے وہ نہ تو بجائے خود تمام غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لیے کافی ہے اور نہ اس سے لوگوں کو پوری طرح اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ لغت اور آیات قرآنی سے استشہاد کے بغیر لوگ میری ہر تشریح کو میری ذاتی رائے سمجھتے ہیں اور میری رائے کم از کم ان لوگوں کے لیے تو اطمینان کی موجب نہیں ہو سکتی جو مجھ سے اختلاف رائے رکھتے ہوں۔ اس مضمون میں کوشش کروں گا کہ ان چاروں اصطلاحوں کا مکمل مفہوم واضح کر دوں اور کوئی ایسی بات بیان نہ کروں جس کا ثبوت لغت اور قرآن سے نہ ملتا ہو

غرض مولانا علی میاں صاحب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکتی ہے تو مولانا مودودی کی مندرجہ ذیل عبارت۔

بس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آ رہے ہیں، ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔

اور اس عبارت کو مولانا علی میاں صاحب مولانا مودودی کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا بہانہ بنا لیتے ہیں اور موضوع سے ہٹ کر غیر متعلقہ مباحث اور بدیہیات پر خامہ فرسائی کر کے اور مفروضات پر قائم مقدمات سے نتائج اخذ کر کے "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" تصنیف کر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ امت کی صلاحیت اخذ و فہم اور قرآن کی خصوصیت" اپانت وافادیت" کے ذیل میں وہ مولانا مودودی کی مندرجہ بالا

عبارتوں کے متعلق یہ احکام صادر فرماتے ہیں :۔

ان عبارتوں کا پڑھنے والا جس کا مطالعہ گہرا اور وسیع نہیں ہے، اور جو اس حقیقت سے واقف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عام گمراہی اور دین سے ایسی نا آشنائی سے محفوظ رکھا ہے، جو زمان و مکان کے حدود سے بے نیاز ہو کر ساری امت پر سایہ فگن ہو، یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ قرآن مجید کی حقیقت اس طویل مدت تک امت کی (یا زیادہ محتاط الفاظ میں امت کے اکثر افراد کی) نگاہ سے اوجھل رہی اور امت بحیثیت مجموعی ان بنیادی الفاظ کی حقیقت ہی سے بے خبر رہی، جن کے گرد اس کتاب کا پورا نظام گردش کرتا ہے اور جن پر اس کی تعلیمات اور دعوت کی عمارت قائم ہے، اور یہ پردہ اس (بیسویں) صدی کے وسط ہی میں اٹھ سکا۔ یہ نتیجہ اگرچہ بادی النظر میں کچھ زیادہ اہم اور سنگین نہ معلوم ہو، لیکن اس کے اثرات ذہن و دماغ، اور طرز فکر پر بڑے گہرے اور دور رس ہیں، اس لئے کہ یہ اس امت کی صلاحیت ہی میں شک و شبہ پیدا کر دیتا ہے، جو نہ صرف اس دین و پیغام کی حامل ہے، بلکہ اس کو دنیا میں پھیلانے، اس کی تشریح کرنے اور اس کی حفاظت کی بھی ذمہ دار ہے، اور اس سے اس امت کی گذشتہ تاریخ اس کے مجددین، مصلحین اور مجتہدین کے علمی و عملی کارنامے بھی مشکوک اور کم قیمت ہو جاتے ہیں اور آئندہ کے لیے بھی یہ بات بڑی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ کہا اور سمجھا گیا ہے، وہ صحیح ہے اور جو کچھ کہا اور سمجھا جائے گا وہ ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس سے "ظاہر و باطن" اور "مغز و پوست" کے اس فلسفہ اور دینی حقائق کو ایک نہایت عسیر الفہم مسلہ اور چیستان قرار دینے کی سعی کو شہ ملتی ہے جس سے باطنیوں کے مختلف فرقوں نے مختلف زمانوں میں فائدہ اٹھایا [1]

اب جہاں تک اس قسم کی عبارتوں کا معاملہ ہے تو ایسی عبارتیں ذیل کے ہر ایسے مصنف کی کتابوں سے نکال کر دکھائی جا سکتی ہیں جس نے اس قسم کے موضوعات پر کلام کیا ہے اور ایسے مصنفین میں بہت سی مقدس ہستیاں بھی شامل ہیں۔ بہر حال میں نے خود مولانا علی میاں صاحب کی تصنیف حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دعوت" ہی سے چند ایسی عبارتیں نکال دی ہیں۔ اب مولانا خود بھی ملاحظہ فرمائیں اور ان کے

---

[1] عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۲۰ تا ۲۲

معتقدین بھی کہ ان میں سے کوئی ایک عبارت بھی مولانا مودودی کی متعلقہ عبارت سے کم سنگین نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا کے یہاں پیمانے ایک نہیں بلکہ مختلف ہیں۔ اپنے مخالفین کو وہ ایک پیمانہ سے ناپتے ہیں اور اپنی محبوب شخصیتوں کو دوسرے پیمانہ سے اور خود تیسرے پیمانہ کے مطابق کام کرتے ہیں۔

کاش! مولانا نے اس میدان میں اترنے اور رسہ درامبننے کا شوق کرنے سے پہلے اپنے علم کی گہرائی و گیرائی کا تھوڑا سا احساس کر لیا ہوتا تو ان کے علم کا جو بھرم تھا وہ یقیناً باقی رہتا۔ مزید براں یہ میدان بھی اپنے اترنے والوں کے لیے کچھ ایسا ناموافق ثابت ہوا اور اس میدان کی کچھ ایسی خصوصیت رہی کہ اس میں جو سورما بھی اترا خوف خدا اور فکر آخرت سے بالکل بے نیاز ہو کر ہی اترا اور مجھے افسوس ہے کہ جناب مولانا علی میاں صاحب مدظلہ العالی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔

مولانا کی کتاب سے جو اقتباسات دیے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلے تین کتاب پر سید صاحب کے پیش لفظ سے ماخوذ ہیں اور دو اقتباس مولانا علی میاں صاحب کی تحریر سے ماخوذ ہیں۔ اور یہ اقتباسات کتاب کے پہلے صفحہ اور پہلی سطر سے شروع ہو جاتے ہیں اور جناب مولانا سید احمد صاحب قادری ایڈیٹر "زندگی نو" نے اپنی تصنیف "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح پر ایک نظر" میں اس قسم کے بیسوں اقتباسات دے دیے ہیں۔ میں نے نمونے کے طور پر پہلا اقتباس داخل فہرست کر لیا ہے۔

اب ان عبارتوں میں سے کسی بھی ایک عبارت کو مولانا مودودی کی مذکورہ بالا عبارت کی جگہ اور مولانا مودودی کی کتاب کے اقتباسات کی جگہ مولانا علی میاں صاحب کی کتاب "حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت" کے اقتباسات رکھ کر "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کی طرح کی کئی کتابیں تصنیف کی جا سکتی ہیں۔ اور یہ اقتباسات وہ ساری عبارتیں نہیں ہیں جو اس ذیل میں مولانا کی کتاب کے اندر موجود ہیں اور جب تو دمولانا موصوف کی ایک کتاب کا یہ حال ہے۔ تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان کی ساری کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ فہرست کتنی طویل ہو جائے گی

مولانا علی میاں صاحب کی کتاب کی مذکورہ بالا عبارتیں یہ ہیں:۔

اسلام ایک پیغام الٰہی اور اس پیغام کی حامل امت مسلمہ ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف نہ صرف عام مسلمان بلکہ مسلمان علماء و مشائخ تک نے اس سے اعراض اور تغافل برتا، اور

اس حقیقت کو بالکل بھلا دیا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے ایک ہی صدی کے اندر اندر اپنے اس فرض کو بھلا دیا تھا۔ سلاطین اور بادشاہوں نے ملک گیری اور کشور کشائی پر قناعت کی، اور عیش و آرام اور جاگیر و خراج کی دولت کو اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیا، علماء نے درس و تدریس اور فتنوں سے عزلت نشینی کی زندگی پر کفایت کی، درویشوں اور صوفیوں نے تسبیح و سجادہ کی آرائش پر بس کی، اور زندگی کے کاروبار سے اپنے کو الگ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ امت رہبری اور رہنمائی کے بغیر اپنے حال سے غافل ہو کر رہ گئی اور امتِ مسلمہ کی زندگی غرض و غایت اس کے سارے طبقوں کی نگاہوں سے مخفی ہو گئی۔[۲]

اس کے بعد وہ دور آنا شروع ہوا جس میں مدارسِ ظاہر کے مدرس تو باطن کے کورے اور باطن کے روشن دل ظاہر سے عاری ہونے لگے اور عہد بہ عہد ظاہر و باطن کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی تا آنکہ علومِ ظاہر کے لئے مدارس کی چہار دیواری اور تعلیم و تزکیۂ باطن کے لئے خانقاہوں اور ریاضت گاہوں کی تعمیر عمل میں آئی اور وہ مسجدِ نبوی جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علماءِ دین کی جگہ علماءِ دنیا نکلنے لگے، اور باطن کے مدعی علمِ شریعت کے اسرار و کمالات سے جاہل ہو کر رہ گئے۔[۳]

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں آپ کی خاص رہنمائی فرمائی اور آپ کی بصیرت پر یہ حقیقت منکشف کہ جس سرمایہ کے اعتماد پر یہ سارا جمع خرچ ہے وہ سرمایہ ہی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، جس زمین پر ہر قسم کے درخت نصب کئے ہیں وہ زمین ریت کی طرح پاؤں کے نیچے سے کھسکتی جا رہی ہے۔ امہات عقائد میں ضعف پیدا ہو گیا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے اور خود مولانا کے گہرے الفاظ میں "امہات عقائد میں امہات ہونے کی شان نہیں رہی ان میں ثبات عقائد (ضمنی و فروعی عقائد) کی تربیت و پرورش کی طاقت نہیں رہی"۔ خدا کی خدائی اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا یقین کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ما حضر شا

---

[۱] حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت، ص ۱ - [۲] ایضاً، ص ۲ - [۳] ایضاً، ص ۵

کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے، خدا کی بات کا وقار اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام کا وزن اور دین و شریعت کا احترام کم ہو رہا ہے اجر و ثواب کا شوق (ایمان و احتساب) دل سے اٹھتا جا رہا ہے۔ [1]

لوگوں نے غلط فہمی سے سمجھ لیا ہے کہ ایمان تو موجود ہی ہے اس لئے ایمان کے بعد جن چیزوں کا درجہ ہے ان میں مشغول ہو گئے، حالانکہ سب سے پہلے ایمان پیدا کرنے ہی کی ضرورت باقی ہے۔ [2]

قرآن ایک معمہ تھا جسے کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا اور نہ اس میں تدبر کرنے کی ضرورت تھی اس لئے اس پر عمل کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور اس کا بہت سا حصہ منسوخ ہو کر بے کار ہو چکا تھا اور وہ تبرک وقت ضرورت کے لئے ادب و احتیاط کے ساتھ محفوظ رہتا تھا، وہ مردوں کے لئے تھا، زندوں کے لئے نہیں، وہ عوام کی سمجھ سے باہر تھا اور اس کو پڑھ کر ان کی گمراہی کا اندیشہ تھا، رہے علماء ان کو شرعی و ضروری علوم سے اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ قرآن پر غور و تدبر کریں۔

---

[1] سیرت سید احمد شہید مجلس تحقیقات و نشریات لکھنؤ ص۱۳ بحوالہ عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح پر ایک نظر ص ۴۲

[2] ایضاً ص ۴۷

(بقیہ صفحہ ۵۶ تنقید)

ہوئے ہیں۔ حضرت ابو ذرؓ کے شام میں قیام، وہاں سے جلاوطنی، پھر ربذہ میں قیام کے موضوع پر اعتنا سے لکھا ہے لیکن ان کے نظریہ کے مخالف صحابہؓ کے لیے "زر پرست" کا لفظ غیر معقول، سخت اور نامناسب ہے۔ آئندہ اڈیشن میں وہ یہ احتیاط بھی کریں تو بہتر ہے۔ تبصرہ نگار کے خیال میں بعض نقطی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں مثلاً ص ۱۳ پر سورج دہلی کرنیں بکھیر رہا تھا، غالباً دو پہلی غلط چھپ گیا ہے "روپہلی" ہونا چاہیے — صفحہ ۴۹ پر ماہی بسمل" لکھا ہے۔ بسمل کا لفظ عام طور سے مرغ کے لیے استعمال ہوتا ہے مرغ بسمل، اور ماہی کے لیے 'ماہی بے آب'۔ صفحہ ۸۰ پر لکھا ہے۔ اس پر عمر بن الخطابؓ نے حاسد کی طرح کہا۔ یہاں حاسد کا لفظ نامناسب ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب لائق مطالعہ ہے۔

"لفظ اتباع"

(سید احمد قادری)

خط

"کل کی ڈاک سے "زندگی نو" کا مارچ ۱۹۸۶ء کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارہ میں آپ نے میری کتاب "قومی یک جہتی اور اسلام" پر تبصرہ فرمایا ہے۔ شکریہ کے ساتھ چند خادمانہ معروضات پیش خدمت ہیں۔ امید ہے کہ قریبی اشاعت میں شائع فرما کر مشکور فرمائیں گے

(۱) آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب "قوم پروری" کے نقطۂ نظر سے لکھی ہے اور لفظ "قوم پروری" کو واوین میں تحریر فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کے محتاط رویہ کا مشکور رہوں گا کہ آپ نے "قوم پرستی" نہیں لکھا۔ میرے نزدیک "قوم پروری" اپنے صحیح اور مثبت معنوں میں نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور ہندوستانی مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اسلام کی واضح تعلیمات کی روشنی میں ہندی قوم کی ذہنی، اخلاقی اور سماجی پرورش کرتے رہے۔

(۲) مصنف کا مختصر تعارف، پیش لفظ کے صفحات کی تعداد، ابواب کی تعداد، حرف آخر اور کتابیات کے سرسری ذکر کے بعد آپ ایک دم کتاب کے باب ششم "محکوم مسلمانوں کے فرائض" پر آگئے ہیں۔ اس عنوان پر چونکہ فطری بات ہے۔ لیکن چونکہ صرف اسی ایک باب کو پڑھنا اور فیصلہ کر لینا صحافتی ذمہ داری کے منافی ہے۔ اس باب کا مقام ساتواں ہے اس سے پہلے پیش لفظ اور پانچ ابواب ہیں اور اس کے بعد باب ہفتم اور صرف آخر ہے۔ اور ہر حصہ ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ البتہ اگر زبردستی

الگ کر لیا جائے تو ضرور بے جوڑ محسوس ہوگا۔ اگر میرا ایڈیشن "نقد، حرفِ آخر" باب چہارم "قومی یکجہتی اور اس کے مقاصد" اور باب پنجم "یکجہتی کا اسلامی تصور" کو بہ نظر انصاف پڑھا جائے تو کتاب اور اس کے مصنف مترجم کے بارے میں جو رائے قائم کی گئی ہے وہ غلط ثابت ہوگی۔

(۳) جہاں تک باب ششم میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے اقتباسات کا تعلق ہے آپ نے اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اصل کتاب آپ کے سامنے نہیں ہے۔ ذرا کرم ایک بار آپ سیرت شبلی جلد اول مکتبہ معارف اعظم گڑھ سنہ ۱۹۵۴ء کو دیکھ لیں اس کے بعد فیصلہ کریں کہ آیا یہ اقتباسات واقعی ان کے ہیں یا میرے اختراع ہیں۔

۴۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مذکورہ حوالے میں نے براہ راست مقالات شبلی سے لیے ہیں جس میں یہ اقتباسات اسی عنوان کے تحت ہیں جس کی عبارت پر آپ کی نظر گئی ہے۔ عربی عبارتوں کا ترجمہ بھی علامہ موصوف ہی کا ہے۔ میں نے خود نہیں کیا ہے۔ ترجمہ پر تبصرہ فرماتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "اگر یہ ترجمہ علامہ شبلی نے کیا ہے تو حیرت انگیز ہے اور اگر مصنف نے کیا ہے تو حد درجہ افسوسناک ہے۔" ایک ہی معاملہ میں علامہ شبلیؒ اور مصنف کے لیے "حیرت انگیز" اور "حد درجہ افسوسناک" کا فرق مراتب کیوں ہے؟ میرا ذہن اس "شخصیت پرستی" کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے۔

دوسری طرف آپ نے آخر میں تحریر فرمایا۔ "اب غور کیجیے کہ اس مسئلے بحث کا کیا تعلق ہے جس کی ذیل میں مصنف نے اس پیش کیا اور بالکل غلط ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ بات ندوہ کے کسی استاد کے لیے کسی طرح مناسب نہیں تھی۔" شاید اسی چھٹے باب کے "کارنامے" پر ان کو مالی تعاون ملا ہوگا۔

میں نے اس باب کی تمہید میں لکھا ہے کہ میں ربط و تسلسل کا لحاظ رکھتے ہوئے علامہ شبلی کے اقتباسات نقل کر رہا ہوں۔ اس لیے اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہ اصل مرجع تبصرہ نگار کے سامنے نہیں ہے۔ براہ راست مصنف کو غلط نتیجہ نکالنے اور "بالکل غلط ترجمہ کے ساتھ پیش کرنے" کے لیے مورد الزام ٹھہرانا اور یہ کہنا کہ یہ بات ندوہ کے کسی استاد کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھی۔

کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دوسری بات کہہ کر قارئین "زندگی نو" کو مغالطہ میں ڈالنے کی بے واقعہ کوشش کی گئی ہے۔ علامہ شبلیؒ ہوتے تو وہی اس کا جواب دیتے کہ مسئلے کا بحث سے کیا تعلق ہے۔

رہی یہ بات کہ "شاید اس چھپے باب کے کارنامے" پر مالی تعاون ملا ہوگا۔ تو میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فخر الدین کمیٹی ایک خود مختار نیم سرکاری ادارہ ہے جس کو مسودات کے انتخاب اور تعاون کی منظوری کا پورا اختیار حاصل ہے۔ اس سلسلے میں صرف اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اس کے تعاون سے شائع ہونے والے مواد سے کسی کی دل آزاری نہ ہوتی ہو ورنہ یہاں "کسی کارنامہ" پر خصوصی توجہ نہیں دی جاتی۔ اگر آپ اس کے تعاون سے شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو بات واضح ہو جائے گی۔

آخر میں صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ "اتباع" کا ترجمہ "پیچھا کرنا" بہرحال غلط ہے۔ اگر اپنی مرضی سے مطابق عربی الفاظ کے معنوں میں یہ تحریف روا رکھی گئی تو قرآن حکیم کی بہت سی آیتوں کا مفہوم بدل جائے گا۔ امید ہے کہ کوئی بات خلاف مزاج ہوگی تو معاف فرمائیں گے۔ والسلام

جواب

تبصرہ نگار کا مصنف کی تمام باتوں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے اور نہ کسی مصنف کا کسی کے تبصرے سے متفق ہونا ضروری ہے لیکن فاضل مصنف نے اپنے خط کے آخر میں یہ جو لکھا ہے کہ :-

"اِتّباع" کا ترجمہ "پیچھا کرنا" بہرحال غلط ہے۔ اگر اپنی مرضی سے مطابق عربی الفاظ کے معنوں میں یہ تحریف روا رکھی گئی تو قرآن حکیم کی بہت سی آیتوں کا مفہوم بدل جائے گا۔"

انہی آخری جملوں کی وجہ سے میں نے ان کو ایک خط بھیجا تھا کہ آپ کا خط اپنے جواب کے ساتھ میں شائع کر دوں گا اور یہ مخلصانہ مشورہ بھی دیا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو علماء — مولانا مفتی محمد ظہور اور مولانا برہان الدین سنبھلی صاحبان — سے وہ مشورہ کر لیں کہ فقہی عبارت کے جس مقام پر ترجمہ کو میں نے غلط کہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ مجھے علم نہیں کہ میرا ارسال کردہ پوسٹ کارڈ اُن کو ملا یا نہیں میں اب اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ مقالات شبلی جلد اول میرے سامنے نہیں ہے۔ مصنف کا خط آنے کے بعد ایک لائبریری میں جا کر مولانا شبلی کے اس مقالے کو پڑھنا پڑا۔ مصنف کا سوال صحیح ہے اور اب یقین کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ مولانا شبلی کا ترجمہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے غلط ترجمہ کیوں کیا تھا اس پر قیاس سے کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ شخصیت پرستی حرام،

لیکن فرق مراتب ضروری ہے۔ مصنف نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ شاید وہ فرق مراتب کے قائل نہیں ہیں۔

تیسری بات یہ کہ میں نے ان کی کتاب کے باب ششم کو کیوں "بے جوڑ" لکھا اس کی وجہ بھی لکھی تھی

چوتھی بات یہ کہ اتباع کا ترجمہ "پیچھا کرنا" نہ غلط ہے اور نہ تحریف۔ میں بہت اختصار کے ساتھ اس کے بارے میں چند باتیں عرض کرتا ہوں

"یہ بات ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہوگی کہ شرعی اصطلاحیں لغوی معنے ہی کے لحاظ سے بنی ہیں لیکن معلوم نہیں یہ غلط فہمی کس طرح پیدا ہوگئی ہے کہ اصطلاح بن جانے کے بعد اس کا لغوی معنے غیر مستعمل ہوجاتا ہے۔ یہ غلط فہمی اونچے درجے کے اہل علم میں بھی پائی جاتی ہے۔ لفظ "بدعت" کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں "زندگی اپریل ۱۹۶۸ء کے رسائل و مسائل میں تفصیل سے اس پر اظہار خیال کیا تھا اور قرآن کریم کی آیات پیش کرکے بتایا تھا کہ کوئی اصطلاح مقرر ہوجانے کے بعد بھی قرآن کریم میں اس کے لغوی معنے کے لحاظ سے بھی اس کے استعمالات موجود ہیں یہاں اس کی پوری تفصیل دہرائی نہیں جاسکتی صرف ایک لفظ "حدیث" کو سامنے رکھ لیا جائے تو کافی ہے اس کے ایک اصطلاحی معنی ہیں اور ایک لغوی معنی ــــ لغوی معنی ہی کے لحاظ سے خود قرآن کریم کو قرآن میں بھی اور احادیث میں بھی "حدیث" کہا گیا ہے۔ آج اسی غلط فہمی کی بنا پر لفظ اتباع پر اظہار خیال کرنا پڑ رہا ہے۔ لفظ اتباع تبع کے مادے سے بنا ہے۔ تبع کے لغوی معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں۔ یا پہلے سے گئے ہوئے شخص یا اشخاص سے مل جانے کے ہیں۔ "تبع" کا لفظ متعدی دو ابواب میں استعمال ہوتا ہے ان میں سے دو باب افتعال اور باب افعال ہیں، باب افتعال سے اتّباع بنا ہے اور باب افعال سے اتْباع لغوی معنی کے لحاظ سے قاموس میں اس کے وہی معنی دیئے ہیں جو تبع کے ہیں۔ قاموس میں ہے۔ الاتّباع والاتْباع کالتبع

اسی لغوی معنی پیچھے چلنے کے لحاظ سے اللہ و رسول کی اطاعت اور فرماں برداری کی اصطلاح بنی ہے لیکن اس کے لغوی معنی غیر مستعمل نہیں ہوئے ہیں بلکہ قرآن میں یہ دونوں اتّباع اور اتْباع لغوی معنی میں بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت لوط علیہ السلام کو جب اپنے مومنوں کے ساتھ بستی سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تو یہ حکم بھی دیا گیا:۔

اِتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ سورہ حجر رکوع ۵۔ اس کا ترجمہ شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند رحمہما اللہ نے یہ کیا ہے۔ "اور تو چل ان کے پیچھے" ظاہر ہے کہ یہ لفظ اپنے لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اطاعت

اور فرماں برداری کے معنے میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح لفظ اتباع پیچھے چلنے اور پیچھا کرنے کے معنے میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ (یونس رکوع ۹) اس کا ترجمہ شاہ عبدالقادر اور شیخ الہندؒ نے یہ کیا ہے۔ "پھر پیچھا کیا فرعون اور اس کے لشکر نے"۔

زیر بحث فقہی عبارت میں بھی لفظ اتباع قطعی طور پر لغوی ہی معنے میں استعمال ہوا ہے اس عبارت میں اس کا ترجمہ اطاعت کرنا ایک ایسی غلطی ہے جس کی توجیہ مشکل ہے۔ تحریف میں نے نہیں کی ہے بلکہ اس شخص نے کی ہے جس نے فقہ کی اس عبارت میں اتباع کا ترجمہ "اور ہم پر ان کی اطاعت فرض ہوگی" کیا ہے۔ میں نے فقہ کے اس مقام کی ایک مختصر توضیح بھی کی تھی لیکن شاید مصنف نے اس کی طرف قصداً توجہ نہیں کی۔ آخر میں مصنف کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ کسی معتمد علیہ عالم یا مفتی سے فقہ کے اس مقام کو سمجھ لیں۔

میرے دو ڈراؤنے خواب

خط میں نے اپنا گھر فروخت کر کے اپنی لڑکی کا بیاہ کیا تھا۔ اس کے بعد ایک بار ایسا خواب دیکھا کہ مجھے کوئی شخص قتل کے الزام میں پھنسانا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ میں بے قصور ہوں مگر احتیاطاً چھپ کر رہتا ہوں۔ دوسری بار پھر یہ خواب دیکھا کہ میں نے کسی شخص معمولی قصور پر کسی کو قتل کر دیا ہے۔ ان دو خوابوں کی وجہ سے میں پریشان ہوں۔ مہربانی فرما کر اس کی تعبیر بتلائیے تاکہ مجھے سکون حاصل ہو۔

جواب

اس وقت خواب پر کوئی تفصیلی گفتگو مقصود نہیں ہے۔ صرف آپ کے سوال کے پیش نظر چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

خواب کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ اچھے خواب اور برے خواب۔ اچھے خواب اللہ کی طرف سے ایک قسم کی بشارت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ وضو کر رہا ہے یا نماز پڑھ رہا ہے یا کعبہ کا طواف کر رہا ہے۔ برے خواب عام طور سے دو وجوہ سے آتے ہیں۔ وہ برے خیالات جو ذہن و دماغ میں آتے ہیں وہی خواب میں نظر آجاتے ہیں۔ یا شیطانی خواب ہوتے ہیں جو کسی ڈر اور خوف میں مبتلا کرنے کے لیے وہ دکھاتا ہے۔ بخاری شریف کی کتاب التعبیر میں بعض صحابہ کا یہ قول منقول ہے کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) حدیث النفس یعنی دل میں جو وسوسے اور برے خیالات آتے ہیں وہی خواب میں دکھائی

دیتے ہیں۔ (۲) تحزین الشیطان یعنی شیطان کسی کو ڈرا اور خوف میں مبتلا کرنے کے لئے ڈراونے خواب دکھاتا ہے۔ (۳) بشریٰ من اللہ یعنی اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی بشارت ۔۔۔ برے اور ڈراونے خوابوں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے کو بیدار ہونے کے بعد شیطان سے پناہ مانگنی چاہئے۔ مثلاً اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم یا لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھ کر بائیں طرف تھوک دینا چاہئے نیز یہ کہ برے خواب کسی دوسرے سے بیان نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح اس برے اور ڈراونے خواب سے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور بعض حدیثوں میں یہ بھی ہے کہ برا خواب دیکھ کر جب بیدار ہو تو وضو کرکے دو رکعت نفل نماز پڑھ لے ۔۔۔ مجھے خواب کی تعبیر میں کوئی دخل نہیں ہے لیکن آپ کا خواب یا تو تخویف الشیطان سے تعلق رکھتا ہے یا حدیث النفس ہے ۔۔۔ آئندہ آپ برے خواب کسی سے بیان نہ کریں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کریں ۔۔۔ اس بات کا جائزہ لے لینا بہتر ہوگا کہ کہیں آپ مغلوب الغضب اور مشتعل مزاج تو نہیں ہیں یعنی ایسا تو نہیں کہ معمولی باتوں پر آپ کو بہت غصہ آجاتا اور مشتعل ہو جاتے ہوں۔ اگر خدانخواستہ اس طرح کی کوئی بات ہو تو اپنے غصے اور اشتعال پر قابو پانے کی پوری کوشش کیجئے۔ آپ نے جو ڈراونا خواب دیکھا ہے اس کو ذہن سے نکال دیجئے اور مطمئن زندگی بسر کیجئے، وضو کرکے دو رکعت نفل پڑھ کر شیطان سے پناہ مانگئے۔ اور اللہ سے دعا کیجئے تو بہتر ہے۔ ایک بات یہ کہ آپ اپنے ذہن کو برے خیالات سے خالی رکھنے کی سعی کیجئے اگر ایسے وسوسے اور برے خیالات آئیں تو انہیں فوراً ذہن سے نکال کر اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جایا کیجئے۔ آخر میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ برے اور ڈراونے خوابوں کا ایک سبب معدے کی خرابی بھی ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو کسی اچھے طبیب سے مشورہ کرکے دوا استعمال کرنی چاہئے۔

عشرۂ مبشّرہ اور ان کے والدین کے نام

خط:۔ ایک ضرورت پیش آگئی ہے اس لئے دس جنتیوں اور ان کے باپ ماں کے نام لکھیے مہربانی ہوگی۔

جواب

عشرۂ مبشرہ کے ناموں میں بھی برکت ہے اس لئے آپ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔ اس

کے بعد ایک مشورہ بھی پیش کروں گا۔ دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو عشرہ مبشرہ اس لئے کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بیک وقت ان دسوں صحابیوں کو جنت کی بشارت دی تھی اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف انہیں دس صحابیوں کو آپ نے جنت کی بشارت دی تھی بلکہ دوسرے اور بہت سے صحابہ اور صحابیات ہیں جن کو آپ نے جنت کی بشارت دی ہے۔ عشرہ مبشرہ میں چار خلفائے راشدین ہیں میں پہلے انہیں کا ذکر کروں گا ان کے بعد چھ دوسرے صحابیوں کا ذکر کروں گا۔

(۱) عبداللہ نام، ابوبکر کنیت (آپ اسی کنیت سے مشہور ہوئے) صدیق اور عتیق لقب، والد کا نام عثمان کنیت ابوقحافہ (اسی کنیت سے مشہور ہیں) والدہ کا نام سلمیٰ، کنیت ام الخیر۔

(۲) عمر نام، ابوحفص کنیت، فاروق لقب، والد کا نام خطاب، والدہ کا نام حنتمہ

(۳) عثمان نام، ابوعبداللہ اور ابوعمرو کنیت ذوالنورین لقب والد کا نام عفان، والدہ کا نام اروی

(۴) علی نام، ابوتراب اور ابوالحسن کنیت، حیدر لقب، والد کا نام ابوطالب، والدہ کا نام فاطمہ۔

(۵) طلحہ نام، ابومحمد کنیت، فیاض لقب، والد کا نام عبیداللہ، والدہ کا نام الصعبہ۔

(۶) زبیر نام والد کا نام عوام والدہ کا نام صفیہ (نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپی)

(۷) سعد نام، ابواسحاق کنیت، والد کا نام وقاص، کنیت ابووقاص حضرت سعد، سعد بن ابی وقاص سے مشہور ہیں۔ والدہ کا نام حضورؐ کے مادری رشتے سے ماموں تھے۔

(۸) سعید نام، ابوالاعور کنیت، والد کا نام زید بن عمرو بن نفیل، والدہ کا نام فاطمہ بنت بعجہ

(۹) عبدالرحمٰن نام، کنیت ابومحمد والد کا نام عوف۔ ان کی والدہ کا نام شفا۔

(۱۰) عامر نام ابوعبیدہ کنیت، والد کا نام عبداللہ والدہ کا نام ام غنم

مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے یہاں ایک لائبریری قائم کرنے کی کوشش کیجئے جس میں سیرت النبی اور صحابہ کرامؓ کی سیرتوں کی کتابیں بھی جمع کیجئے اردو زبان میں ان سب پر مستند کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

بنگالی مسلمانوں کی علامہ اقبال سے عقیدت

بنگلہ دیش اسلامی تحریک کو نمایاں حیثیت حاصل ہے

ڈھاکہ سے موصول ہونے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کا یوم ولادت بنگلہ دیش کے مختلف شہروں میں بڑے جوش و خروش سے منایا گیا، بے شمار مقررین نے جلسوں سے خطاب کیا اور مطالبہ کیا کہ اقبال کی تقریبات سرکاری پیمانے پر منانے کے اقدامات کیے جائیں۔ اقبال کے اسلامی نظریات خصوصاً قومیت، وطنیت اور ثقافت کے بارے میں ان کے افکار کو جس طرح دنیا بھر کے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہے اسی طرح بنگال کے مسلمان بھی اقبال کے کلام سے متاثر ہوئے۔ قاضی نذر الاسلام اور قاضی غلام مصطفےٰ نے بنگلہ زبان میں اقبال کے کلام و پیغام کو عام کرنے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ پاکستان سے علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد سیاسی سطح پر جو اختلافات پیدا ہوئے اگر ان کا ادبی و ثقافتی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ بنگلہ دیش میں اسلامی تحریک اسی طرح برقرار ہے جس طرح پاکستان کے زمانہ میں تھی۔ یہی نہیں بلکہ وہاں اسلامی محرومی کا احساس دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور اگر سیاسی طور پر نہ سہی تو دوسرے ذرائع سے اب اس کا برملا اظہار بھی کیا جانے لگا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سیاسی مغائرت اقبال کی مقبولیت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی اور جیسا کہ موصولہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ بنگلہ دیش میں اقبال کے افکار و پیغام کو از سر نو اجاگر کیا جا رہا ہے اور اسلام کے حوالہ سے سیاسی یگانگت کے تصورات فروغ پا رہے ہیں۔ یوم اقبال کے حالیہ جلسوں میں ممتاز دانشمندوں نے شرکت کی۔ مقررین نے اپنی تقریروں میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔ یہی نہیں بلکہ ان جلسوں میں متعدد مطالبات بھی کیے گئے ان میں بعض مطالبات کا تعلق اقبال اور قائد اعظم

سے تھا۔ بنگلہ دیش کی کئی انجمنوں اور تنظیموں نے ان جلسوں کا انتظام و انصرام کیا تھا۔ یوم اقبال کی تقریبا
ملک بھر میں شایان شان طریقے پر منائی گئیں جن میں ہزاروں افراد نے شرکت کی اور دو درجن سے زیادہ
اکابرین نے خطاب کیا اور شعراء نے منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر
کہ ان جلسوں میں وہ نوجوان پیش پیش تھے جنھوں نے بنگلہ دیش کے قیام کے بعد شعور حاصل کیا اور اپنے وطن
کے نظامتی حقائق سے بہتر طور پر واقف ہونے کی وجہ سے جذباتی نعرہ بازیوں سے علیحدہ ہو کر نئے تعمیری
منصوبوں کی تکمیل میں سرگرم ہیں۔

اقبال نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کے قیام کی تجویز الہ آباد کے اجلاس میں پیش کی تھی۔ پھر ۱۹۴۰ء میں
قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ لاہور میں تو صرف قرارداد ہی پاس ہوئی تھی لیکن بنگال کے مسلمان ۱۹۴۱ء ہی
سے اپنے وطن کو پوربو پاکستان کہنے لگے تھے۔ کلکتہ میں پوربو پاکستان انیسیا سوسائٹی ۱۹۴۲ء میں قائم ہوئی
اور اسی سال ڈھاکہ میں بھی پوربو پاکستان شاہتو سنگ کا قیام عمل میں آیا۔ بنگلہ کے مشہور شاعر کیقباد ۱۸۵۷ء
کی لڑائی سے چھ سال پہلے پیدا ہوئے اور پاکستان بننے کے چھ سال بعد وفات پائی۔ اس عہد میں یوں تو کئی
مسلمان شعراء مقبول ہوئے لیکن شرف حسین نے شاعری کو نئے رجحانات سے متعارف کرانے میں نمایاں کام کیا۔ اسمٰعیل
حسین شیرازی اقبال کے ہم عصر تھے۔ بنگلہ کے علاوہ اردو اور فارسی سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اقبال کا
براہ راست مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ ان کی ادبی سماجی اور سیاسی خدمات بنگالیوں کی نگاہ میں قابل قدر ہیں
ان کے بعد قاضی نذر الاسلام نے شہرت حاصل کیا۔ ان کا آبائی وطن عظیم آباد (بہار) تھا۔ انھوں نے حافظ
شیرازی کے علاوہ مرزا غالب اور وحشت کے کلام کا خصوصیت سے مطالعہ کیا تھا اور اقبال کے کلام سے بے حد
متاثر تھے۔ وہ عربی اور ترکی سے بھی قدرے واقف تھے انھوں نے انور پاشا مصطفےٰ کمال اور سعد زاغلول کی تحریکوں
سے بھی نمایاں اثر حاصل کیا۔ قاضی نذر الاسلام نے اقبال کے افکار کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا تھا اور
ڈاکٹر انعام الحق وہ بنگلہ شاعروں میں پاکستان کا خواب دیکھنے والے پہلے شاعر تھے۔ چنانچہ جہاں تک بنگلہ شاعری
کا تعلق ہے اس میں پاکستانی روایت بہت گہری اور مضبوط ہے جسے مصنوعی اور جذباتی نعروں سے ختم نہیں کیا
جا سکتا۔ قاضی غلام مصطفےٰ نے مسدس حالی کا ترجمہ کیا اور کلام اقبال کے نام سے اقبال کی منتخب نظموں کو
بنگلہ کا جامہ پہنایا وہ اسلام کی عالمگیر وحدت اور اسلام کے نظریہ وطنیت سے بہت متاثر اور شاعری میں اسلامی
قدروں کے علمبردار تھے۔

پاکستان کے قیام کے بعد مشرقی پاکستان میں اقبال کے نظریات کو بہت فروغ ہوا۔ اردو اور بنگلہ میں متعدد تصانیف وجود میں آئیں اور اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے بنگلہ تراجم شائع ہوئے۔ البتہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بنگالی عصبیت کے تحت اقبال کے وقار کو دھچکا لگا۔ لیکن مجیب الرحمٰن کے زوال کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ چنانچہ بنگلہ دیش میں اقبال کی تحریک کو دوبارہ عروج ہوا۔ بنگلہ دیش نے عالم اسلام کے گوناگوں مسائل میں نمایاں کردار ادا کیا اور اسلامی اتحاد و سالمیت کی ہم نوائی میں کسی دوسرے اسلامی ملک سے پیچھے نہیں۔ فلسطین، کشمیر، افغانستان، قبرص، لبنان اور ایران و عراق کی لڑائی وغیرہ جیسے اہم معاملات میں بنگلہ دیش نے قابل تعریف موقف اختیار کیا۔ اس نے قبرص کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور افغان مجاہدین کو ڈھاکہ میں اپنا دفتر کھولنے کی اجازت دی۔ بنگالی مجاہدین بھی فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل سے جنگ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان گوناگوں واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے سانحہ سے قطع نظر بنگلہ دیش میں اسلامی تحریک کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یوم اقبال کے موقع پر بنگلہ دیش میں جو اہتمام کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے لوگ نہ صرف اقبال کے معتقد ہیں بلکہ مغربی پاکستان سے بھی والہانہ تعلقات قائم کرنے کے متمنی ہیں۔ مزید برآں ان جلسوں میں گاندھی جینتی کے خلاف غم و غصہ کا شدید اظہار کیا گیا۔ یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہاں کے لوگ اب ہندوؤں اور بھارتیوں کی سازش اور استحصال سے بخوبی واقف ہو گئے ہیں اور اپنی آزادی کے تحفظ اور علمی ترقی کے لیے وہ نظام اختیار کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اصولوں پر قائم ہو۔

ڈھاکہ سے آمدہ اطلاعات میں بتایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش کے مختلف شہروں میں یوم اقبال کی تقریبات منعقد ہوئیں۔ بنگلہ دیش اسلامی فاؤنڈیشن اور اسلامی کلچرل سنٹر کے زیر اہتمام خصوصی جلسے ہوئے۔ ڈھاکہ میں مولانا عبدالجبار رحیم کہاری کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ اس جلسہ سے متعدد مقررین نے خطاب کیا۔ جلسہ میں مطالبہ کیا گیا کہ سابقہ اقبال کمیٹی کو بحال کر کے اسے مزید ترقی دی جائے اور اقبال کی ساری تصانیف کا بنگلہ زبان میں ترجمہ شائع کیا جائے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے اقبال ہال کے نام کو بھی دوبارہ بحال کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ مولانا عبدالجبار رحیم کہاری نے اقبال کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال دنیا کے دوسرے مسلمانوں کی طرح بنگال کے مسلمانوں کی بھی آزادی کے خواہاں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا تعلق تقسیم بنگال کے واقعہ سے پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں بنگال کے مسلمانوں کا حق اقبال پر کہیں

زیادہ ہے۔ آج جس طرح قوم اور وطن کا تصور لامعنی بن چکا ہے۔ اسی طرح زبان کی حیثیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن مشکل یہی ہے کہ ہم سمجھ میں آنے والی باتوں کو بھی سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور سان عصبیتوں میں جکڑے رہنا پسند کرتے ہیں جو ہمیں آزادی کی بجائے غلامی کی طرف لے جاتی ہیں

اسلامی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام جو جلسہ ہوا اس میں بنگلہ کے مشہور شاعر محمود نے بھی شرکت کی اور اقبال کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ مولوی محمد ضمیر علی اور مولوی ابو الکلام آزاد نے بھی تقریریں کیں اور اقبال کے شاعرانہ محاسن سے بھی آگاہ کیا۔ ابو الکلام آزاد نے اردو اور فارسی اشعار کے حوالہ سے اقبال کے اسلامی نظریات کی تشریح کی اور کہا کہ انیسویں صدی میں ساری دنیا کے مسلمان مصائب و آلام کا شکار رہے۔ اقبال نے مسلمانوں کی ہمت کے لیے انہیں سامراجی طاقتوں سے مقابلہ کے لیے فکری و شعوری طور پر تیار کیا اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی تلقین کی اور انہیں وہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ اتحاد و اتفاق میں عروج اور اختلاف میں زوال ہے۔

مولوی ضمیر علی نے بھی ایک لمبی تقریر کی جس میں مسلمانان ہند کی موجودہ صدی کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تاریخ کا محاکمہ کیا۔ انھوں نے مسلم ہند کے رہنماؤں میں اقبال اور قائد اعظم کا خصوصیت سے ذکر کیا اور کہا کہ ان لوگوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد وطن کا نظریہ وضع کیا۔ اس کے لیے عملی جد و جہد کی اور بڑے ایثار کے بعد کامیابی حاصل کی۔ آج اقبال اور قائد اعظم کی تعلیمات پر عمل کرنے ہی میں ہماری نجات ہے۔ اگر ہمیں اپنی آزادی عزیز ہے اور ہم اپنی اور اپنی آئندہ نسلوں کی بقا چاہتے ہیں تو اقبال اور قائد اعظم کی تعلیمات ہی ہمارے لیے جائے پناہ ہے

جلسہ کے مہمان خصوصی دیوان محمد اشرف تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا انھوں نے کہا کہ اقبال نے بنی نوع انسان کو انقلاب کا جو پیغام دیا وہ ایک زندہ و تابندہ پیغام ہے جس کے ذریعے انسانیت کو معراج کمال پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ آج ساری دنیا طرح طرح کے مسائل اور قسم قسم کے تذبذب میں گھری ہوئی ہے۔ جمہوریت اور اشتراکیت کے نظریات میں کوئی افادیت باقی نہیں رہی۔ شمال کے لوگ جنوب کے لوگوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ اقبال نے ان سب سے چھٹکارے کی صورت بتائی ہے۔ ان کی رہنمائی عمل و یقین کا ایک مینار ہے آج قومیت اور وطنیت کے نظریات خونی نظریات ثابت ہو چکے ہیں۔ اقبال نے سالوں کے غور و فکر اور عمرانی تاریخ کے عمیق مطالعہ کے بعد انسانیت کا سنگ میل نصب کیا ہے۔ اگر آج کے انسان کو امن اور آشتی کی تلاش ہے اور وہ اپنے محدود دائرے سے نکل کر کھلی فضا میں جینے کا آرزو مند ہے تو اقبال کے تصورات ہی ہم کو وہ

کو راہ دکھائیں گے بلکہ بات تو یوں بنے گی اگر میں کہوں کہ اقبال نے دنیا کے اندھے انسانوں کے ہاتھ میں وہ لاٹھی تھما دی ہے جس سے ہر آنکھ والے کو اپنی روشنی بچانا مشکل ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیش کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ ہر آنکھ دکھانے والے کے چیلنج کو قبول کرے اور اقوام کی برادری میں اپنے تشخص کا بہانگ دہل اعلان کرے۔ مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ٹیگور غیر منقسم ہندوستان کا قومی شاعر ہے۔ ہمیں بھی یہ فیصلہ قبول ہے۔ ٹیگور کا کلام انگریزی، روسی، اردو، فارسی اور عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مصر سے ان کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ٹیگور نے تو خود اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور اقبال کی عظمت جنوبی ایشیا کی سرحدوں میں محدود نہیں۔ وہ ایک آفاقی شاعر ہیں اور جنوبی مشرق کے براعظموں میں رہنے والے دنیا کے دو تہائی انسانوں کے نمائندہ ہیں۔ اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ غریبوں کمزوروں اور مجبوروں کا شاعر ہے لیکن اس کا کلام غریب ہے نہ کمزور اور نہ ہی مجبور۔

بنگلہ دیش کی انجمن ہلال کے اہتمام سے بھی ایک جلسہ ہوا۔ اس میں روزنامہ دیش کے مدیر مولوی ثناء اللہ نوری نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اقبال اسلامی نشاۃ ثانیہ کے شاعر ہیں ان کے خیالات و نظریات اور موقف فلسفہ کو نہ تو جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک سوشل فلاسفر اور سیاسی رفارمر تھے ان کے خیالات اسلام کی تشریحات ہیں۔ انھوں نے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا پیغام ہماری روح میں رچا بسا ہے لہٰذا اسے کسی صورت میں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ہر واقعہ نیا تقاضا پیدا کرتا ہے۔ اقبال نے تغیرات ہی کو ثبات قرار دیا ہے۔ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہ ہو گا لہٰذا ہمیں اپنی قومی بقا کے لیے یقیناً ان کے افکار سے استفادہ کرنا چاہیے۔ جس نے اپنی لازوال شاعری سے برصغیر کے مسلمانوں کو بیداری کی روشنی عطا کی ہے اسی میں ہماری اور ہمارے دیش کی نجات ہے۔

انڈونیشیا میں اسلام دشمن چالیں

انڈونیشیا کے صدر سوہارتو نے فوج کا سربراہ اب ایک کیتھولک عیسائی جرنیل بینی مردانی کو بنایا ہے اسے متعدد اعلیٰ جرنیلوں پر ترجیح دے کر فوج کا سربراہ بنایا گیا ہے۔ سوہارتو کو عیسائی جرنیل اس لیے منظور تھا کہ جیسا وہ اس کا دم بھرتا ہے، ویسا کسی مسلمان جرنیل سے ممکن نہیں۔

فوج کی سربراہی حاصل کرنے کے بعد جنرل مردانی نے پورے زور شور سے سوہارتو کی سیکولرازم کی پالیسی کو نافذ کرنا شروع کر دیا ہے۔ جنرل مردانی نے جاوا کے علماء اور ائمہ مساجد کو دھمکی دی ہے کہ وہ مساجد کو حکومت کی مخالفت کا اڈہ ہرگز نہ بننے دیں اور نہ اپنے خطابات میں حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو انھیں فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ مردانی نے یہ دھمکی علماء کو اس کانفرنس کے موقع پر دی جب ہزاروں علماء حکومت کے اس اصرار پر غور کے لئے جمع ہوئے کہ ہر انجمن اور ادارے کو پنچ شیلا کو اپنے اغراض و مقاصد میں سرفہرست رکھنا چاہئے۔ علماء نے حکومت کی اس ہدایت پر سخت احتجاج کیا۔ جو مظاہرین کے ایک اجتماع کو منتشر کرنے کے لئے پچھلے برس اختیار کی گئی تھی۔ اطلاعات کے مطابق جب عوام نے پولیس کی ایک موٹر سائیکل جلا دی تو پولیس نے فوج کو بلا لیا اور فوج نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جس سے ۲۰۰ مسلمان شہید ہو گئے۔ انڈونیشیا کی حکومت نے اسے بالکل ہلکا اور معمولی واقعہ بنا کر پیش کیا۔ سرکاری خبر رساں ایجنسی کے مطابق صرف اٹھارہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ جو صریح جھوٹ ہے۔

مسلمانوں کا یہ قتل عام ستمبر ۱۹۸۴ء میں ہوا تھا۔ مسلمانوں کو مزید دبانے کے لئے جنرل مردانی کے حکم سے ۱۳۱ علماء کو گرفتار کر لیا گیا تاکہ وہ اپنی تقاریر کے ذریعے ملک میں حکومت کے خلاف تحریک نہ چلائیں۔

انڈونیشیا میں فوج کے سربراہ (کمانڈر انچیف) کا عہدہ کابینہ کے وزیر کے برابر ہوتا ہے چونکہ انڈونیشیا میں ۱۹۶۵ء سے فوجی راج ہے اس لئے فوج کے کمانڈر انچیف کو کابینہ کے اجلاس میں بھی بلایا جاتا

جنرل مردانی مسلمانوں کو دبانے کے لئے جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ گویا حکومت کے ایک ذمہ دار ستون کی حیثیت سے کر رہا ہے۔

جنرل مردانی کمانڈر انچیف بننے کے بعد بڑی فنکاری کے ساتھ اپنے آدمیوں کو آگے لا رہا ہے۔ حال ہی میں ۲۴ بڑے افسروں کو ریٹائرڈ کر کے اپنے ہم خیال افسروں کو ترقی دی ہے۔ اس کے سربراہ بننے کے مطابق عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں بھی تیز تر ہو گئی ہیں اور بعض باشعور مسلمانوں کو یہ خدشہ ہے کہ عیسائی جرنیل کہیں مسلمانوں کے ملک پر قبضے کی منصوبہ بندی نہ کر رہا ہو۔

صدر سوہارتو انڈونیشیا کو لادینیت کی جانب فوج ہی کے سہارے سے لے جا رہا ہے اور عیسائی آبادی حکومت کی اس پالیسی سے بہت خوش ہے۔ جاوا کے اندر حکومت کچھ زیادہ ہی سختی برت رہی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق انہی ایام میں وزارت تعلیم کی جانب سے ایک حکم جاری کیا گیا ہے کہ کوئی لڑکی اوڑھنی لے کر نہ آئے۔ جن لڑکیوں نے اس حکم کی پابندی سے انکار کر دیا انہیں تعلیم گاہوں سے خارج کر دیا گیا ہے۔ انڈونیشیا سے آمدہ اطلاعات کے مطابق تعلیم گاہوں سے خارج کی جانے والی لڑکیوں کی تعداد کم از کم ۶۰۰ ہے۔

بلغاریہ میں مسلم کشی

بلغاریہ کی ریاست کسی زمانے میں سلطنت عثمانیہ کا حصہ ہوتی تھی۔ سلطنت عثمانیہ ختم ہوئی تو اس کے دوسرے حصوں کی طرح بلغاریہ بھی مغربی طاقتوں کے قبضے میں آ گیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد یہ مشرقی یورپ کے ایک جزو کی حیثیت سے روس کے زیر اثر آ گیا اور ۱۹۴۶ء سے اب تک کمیونسٹ پارٹی کے زیر تسلط ہے۔

کمیونسٹ پارٹی نے بلغاریہ کو پوری طرح سے ایک لادین اور مذہب دشمن ریاست بنا دیا ہے۔ تمام زمین حکومتی تحویل میں لے کر کسانوں اور مزارعوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ یہی صورت صنعت و حرفت کے ساتھ کی گئی ہے۔ بلغاریہ میں اب شاید ہی کوئی نجی ادارہ باقی رہا ہو۔ کمیونسٹ فلسفے کے مطابق مذہب کو بھی اجتماعی زندگی سے رخصت کر دیا گیا ہے اور الحاد کی تعلیم زبردستی دی جانے لگی ہے۔ بلغاریہ اب اس حد تک روس کی غلامی میں جا چکا ہے کہ مشرقی یورپ میں جو بھی تحریک کارروائی ہوتی ہے۔ یورپ پر

ناکام حملے کے بعد انکشاف ہوا ہے کہ اس میں بلغاریہ کا ہاتھ تھا۔ ہے روس نے مشرقی یورپ میں اپنا جاسوسی نظام پھیلانے کے لئے بلغاریہ کو اپنا مستقل اڈہ بنالیا ہے۔ بلغاریہ کی اکثریتی آبادی عیسائی ہے مسلمانوں کی آبادی بیس فیصد کے قریب ہے۔ مسلمان آبادی ترکی النسل ہے اور اسلامی روایات کے بے حد پابند ہیں بلغاریہ کی کمیونسٹ حکومت نے بارہ برس ہوئے ایک قرارداد کے ذریعہ طے کیا تھا کہ مسلمانوں کا نام ونشان بلغاریہ سے مٹادینا چاہیئے۔ کیونکہ بلغاری قوم کی ترقی کی راہ میں مسلمان حائل ہیں۔ یہ اپنی انفرادیت سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

بلغاریہ میں شدید سنسر ہے، تمام اخبارات سرکاری ہیں اور اس کا خصوصی انتظام ہے کہ بلغاریہ کی کوئی خبر باہر نہ جانے پائے۔ لیکن حال ہی میں بعض ذرائع سے بلغاریہ کے مسلمانوں نے دردناک صورتحال کا کچھ احوال باہر بھجوایا ہے، اس پر بلغاریہ کے قریبی حلقوں سے تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ بلغاریہ میں مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کی فی الواقع مہم چل رہی ہے۔ ایک تازہ رپورٹ کے مطابق :-

> حال قریب میں مسلمانوں پر شدید ظلم وستم توڑا گیا ہے۔ مسلمان سینکڑوں کی تعداد میں شہید کئے گئے ہیں۔ ان کو پکڑا جاتا ہے پھر ان کو بری طرح مارا پیٹا جاتا ہے۔ مسلمان عورتیں بھی ظالموں کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہیں۔ بلغاری حکومت کا مسلمانوں سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے اسلامی نام ترک کر دیں۔

سرکاری پالیسی کے مطابق اسلامی نام والے کو نہ تو سرکاری ملازمت ملے گی نہ اس کے بچوں کو اسکول میں داخلہ دیا جائے گا۔ پولیس مسلمان علاقوں میں گھر گھر جاکر چھان بین کر رہی ہے اور مسلمانوں میں سرکاری فارم تقسیم کررہی ہے تاکہ مسلمان اپنے نئے نام کے مطابق اپنے شناختی کارڈ بنوائیں۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کو اپنی مادری زبان ترکی میں بھی تعلیم کی اجازت نہیں اور نہ ترکی زبان میں کوئی کتاب حکومت کی اجازت کے بغیر شائع ہوسکتی ہے۔ اسلامی لباس پہن کر سرعام آنا بھی ممنوع ہے۔

> یہ سرعام نماز پڑھنا اور روزے رکھنا بھی ناپسندیدہ ہے۔ بلغاریہ کی اکثر مساجد منہدم کی جاچکی ہیں۔ بعض مساجد اور تعلیمی مدرسوں میں کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر یا تفریح گاہیں قائم ہیں۔

بلغاریہ کے مسلمان اس وقت شدید کرب وابتلاء میں ہیں۔ اس سے بھی افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ عالم اسلام کسی مسلمان اقلیت کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

تنقید و تبصرہ

سیرت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ مؤلفہ جناب ابن عبدالشکور صفحات ۱۳۴ کاغذ عمدہ، کتابت اچھی اور آفسٹ کی طباعت، گرد پوش پر کشش۔ قیمت: ۱۲/- عارف پبلیکیشنز ۱۹۵ انار کلی چلم روڈ۔ بنگلور۔

چونکہ مدیر زندگی نو کو کوئی معاون میسر نہیں ہے اس لیے کتابوں پر تبصرے بھی اسی کو کرنے پڑتے ہیں اور وہ کتاب پڑھے بغیر تبصرہ نہیں کرتا اس لیے دوسرے کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے اس میں بہت تاخیر ہو جاتی ہے ابن عبدالشکور صاحب کی کئی کتابوں پر تبصرے زندگی میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب پر جلد تبصرے کے لیے مرتب کے کئی خطوط آ چکے ہیں۔ اس لیے اس کتاب پر سرسری نظر ڈال کر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ پوری کتاب کے پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب عمدہ کاغذ، عمدہ ٹائٹل اور آفسٹ کی طباعت کے ساتھ شائع کی ہے اور اس پر کافی روپیے خرچ کیے ہیں۔ یہ کتاب جماعت پرنٹنگ سنٹر رامپور یوپی کے ذریعہ چھپی ہے اور اچھی چھپی ہے۔ بہت عرصہ گزرا میں نے حضرت ابوذر پر مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی ایک کتاب پڑھی تھی اور اب یہ کتاب پڑھی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں مفصل فہرست مضامین موجود ہے۔ اس لیے اس سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے مرتب نے اپنے انداز میں حضرت ابوذرؓ کا تعارف کرایا ہے جو فی الواقع اس کتاب کا تعارف ہے۔ جناب ابن عبدالشکور کا انداز بیان اچھا ہوتا ہے۔ تعارف کی حقیقت واضح کرنے کے لیے ۲۵، ۲۶ صفحات میں انھوں نے آیات قرآنی پیش کر کے متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کیا ہے۔ ان صفحات کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ فہرست مضامین سے بھی اور سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب کتاب نے تذکرہ ابوذرؓ کے وہ تمام پہلو جمع کر دیے ہیں جو احادیث و سیر میں موجود ہیں اور آخر میں ایک بہت اچھا کام یہ کیا ہے کہ حضرت ابوذرؓ سے جو احادیث مروی ہیں ان کے ترجمے جمع کر دیے ہیں اور یہ ترجمے ۴۳ صفحات میں پھیلے (باقی صفحہ ۴ پر)

MONTHLY Regd No. D.NO.-(DN)-348
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN
NEW DELHI-110002
R. NO.- 42893/84
MAY 85

ماہنامہ
زندگی نو
نئی دہلی ۲

جلد: ۲	رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق جون ۱۹۸۵ء	شمارہ: ۶

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے
جناب سید احمد عروج قادری، مدیر زندگی نو، گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں چھپوا کر
دفتر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۶۵۳۱۳ فون: ۲۶۳۲۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

ناانصافی کی ایک نئی قسم لباس انصاف میں پوشیدہ کہہ رہی ہے کہ اے مسلمانو! مجھے یہ لباس ہندوستان کی عدالت عالیہ نے عطا کیا ہے اس لئے تم میرے لباس کو دیکھو جو مسلمان عورتوں کی ہمدردی کے نور سے جگمگا رہا ہے۔ تم میرے اندر مت جھانکو، میرا لباس نہ سرکاؤ، ورنہ یہ جگمگاہٹ سیاہی میں بدل جائے گی۔ انصاف، ناانصافی کا روپ دھارے گا۔

۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس کا جو فیصلہ صادر فرمایا ہے۔ وہ حیرت انگیز تو نہیں ہے مگر افسوسناک ضرور ہے۔ معزز جج صاحبان بھی آسمان سے اترے ہوئے فرشتے نہیں ہوتے بلکہ وہ بھی اپنے معاشرے کے افراد ہوتے ہیں۔ جیسا معاشرہ ویسے جج ـــ اپنے فیصلہ میں انھوں نے جس ذہن کا مظاہرہ کیا ہے وہ اسی معاشرے کے ذہن کا آئینہ دار ہے جس سے وہ وابستہ ہیں۔ اب تک حکومت سے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مطالبہ بعض ہندو تنظیمیں کر رہی تھیں۔ اس تازہ فیصلے میں اس کی زوردار وکالت جج صاحبان نے خود سنبھال لی ہے اور حکومت سے اس انداز میں بات کہی ہے جیسے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے لیے وہ ان تنظیموں سے زیادہ بے چین اور مضطرب ہیں۔ مسلمانوں کے علیحدہ ملی تشخص کو برداشت کرنے کے لیے وہ جج صاحبان بھی تیار نہیں ہیں اس لیے کہ ان کے خیال میں یہ قومی یک جہتی کو نقصان پہنچانے والی چیز ہے ـ اسلام کے عائلی قوانین اس قدر مضبوط ہیں اور مسلمانوں کا ملی تشخص اس قدر جاندار ہے کہ اس کو یورپ کی نشاۃ ثانیہ مسلمان حکومتیں ختم کر سکیں اور نہ روس جو اول درجے کا مطلق العنان سامراج ہے اس کو بالکلیہ ختم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ مجھے تو ان دانشوروں کی دانش قابل رحم معلوم ہوتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حکومتی ڈنڈے اور عدالتی فیصلوں کے ذریعے وہ مسلمانوں کے ملی تشخص کو ختم کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ مجھے تسلیم ہے کہ بحثوں کا وقت گزر چکا ہے اور اب مسلمانوں کے متحدہ پلیٹ فارم کو عملی تدابیر مرتب کر کے ان کو روبہ عمل

لانے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ مطلقہ مسلمان عورت کے نان ونفقہ کی بحث نئی نہیں ہے۔ بہت عرصہ سے چل رہی ہے۔ میں نے ماہنامہ زندگی رام پور جلد ۲ ۵ مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۴ء کے مشترک شمارے میں "مطلقہ کا نان نفقہ" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا۔

سپریم کورٹ کے اس تازہ فیصلے پر کئی پہلوؤں سے علمی انداز میں گفتگو کی جاسکتی ہے۔ کسی عدالتی فیصلے کے بارے میں سب سے پہلی چیز جو مسلمانوں کے سامنے آتی ہے اور آنی چاہیے وہ اس کا شرعی پہلو ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو یہ فیصلہ اسلامی شریعت میں صریح مداخلت ہے۔ افسوس ہے کہ بعض وہ مسلمان بھی جو اسلامی شریعت پر ایمان رکھتے ہیں، اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اس کو شریعت میں مداخلت نہیں سمجھتے اور اس کی حمایت میں مراسلے شائع کرتے ہیں۔ میں نے اسی طرح کے ایک مراسلے کے جواب میں چند مختصر نکات پیش کرکے حقیقت واضح کی تھی۔ اب کچھ تفصیل اور اضافے کے ساتھ وہی نکات پیش کر رہا ہوں۔

(۱) مسلم پرسنل لا جن قوانین کا مجموعہ ہے اس کے بارے میں بعض مسلمانوں کے ذہن بھی صاف نہیں ہیں۔ وہ ان کو کچھ ایسی چیزیں سمجھتے ہیں جو شریعت نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو دی ہیں حالانکہ مسلم پرسنل لا سہولتوں کا نام نہیں ہے، بلکہ نکاح، طلاق، خلع، وراثت وغیرہ کے ان احکام وقوانین کا نام ہے جو کتاب وسنت یعنی قرآن مجید اور صحیح احادیث نبوی نے ہمیں دیے ہیں اور وہ احکام شریعت اسلامیہ کا ٹھیک اسی طرح جزو ہیں جس طرح مثال کے طور پر پنجوقتہ نمازوں اور رمضان المبارک کے روزوں کے احکام شریعت کا جزو ہیں۔

پانچ وقت کی فرض نمازوں اور رمضان کے روزوں میں کمی بیشی کا کسی کو حق نہیں ٹھیک اسی طرح نکاح، طلاق کے ان قوانین میں جن کو شریعت نے ضروری قرار دیا ہے کسی کو ان میں ترمیم کرنے یا بدلنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ ان قوانین کی اہمیت کے مختلف پہلوؤں پر میرا ایک مختصر مقالہ مسلم پرسنل لا کے عنوان سے اخبار مشرق کلکتہ اور زندگی نو کے گزشتہ مئی ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اگر اس کو سامنے رکھ لیا جائے تو ان قوانین کی حیثیت واہمیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

(۲) مطلقہ عورت کے بارے میں کتاب وسنت اور اجماع امت نے شوہر پر جو چیز لازم قرار دی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اس نے مہر ادا نہیں کیا ہے تو مہر ادا کرے اور عدت میں اس کے نان ونفقہ کا انتظام کرے اور عدت

ختم ہو جانے کے بعد اس کو حسن سلوک کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت کر دے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے نے اس پر قانوناً جو اضافہ کیا ہے وہ شریعت میں مداخلت ہے یا نہیں؟ اگر کوئی عدالت مثال کے طور پر بالفرض رمضان کے ۳۰ روزوں پر اضافہ کر کے ۳۱ دن کے روزے لازم کر دے تو ہر مسلمان اس کو مداخلت فی الدین قرار دے گا لیکن بعض مسلمان عائلی قوانین کی حیثیت و نوعیت سے اتنے ناواقف ہیں کہ عدالت عالیہ کے اس فیصلے کو شریعت میں مداخلت قرار نہیں دیتے اور اس کی حمایت میں مراسلے شائع کراتے ہیں۔ اس لیے یہ کام بھی بہت ضروری ہے کہ خود مسلمانوں کو مسلم پرسنل لا کے قوانین کی نوعیت، حیثیت اور اہمیت سے واقف کرایا جائے۔

(۳) عدت ختم ہو جانے کے بعد مطلقہ عورت شوہر کے لیے اسی طرح اجنبی ہو جاتی ہے جس طرح دوسری اجنبی عورتیں دونوں کے درمیان میاں بیوی کا تعلق (نکاح) ختم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح دوسری اجنبی عورتوں کے لیے لازم ہے کہ اجنبی مردوں سے پردہ کریں اسی طرح اس مطلقہ عورت کے لیے لازم ہے کہ اپنے پہلے شوہر سے پردہ کرے بلکہ طلاق مغلظہ کی عورت تو دوسری اجنبی عورتوں سے بھی بڑھ کر اجنبی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس سے اس وقت تک دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا جب تک وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح و مباشرت نہ لے پھر وہ اس کو طلاق نہ دے اور اس طلاق کی عدت نہ گزر جائے اسی مرحلے کا نام "حلالہ" ہے جبکہ کسی دوسری اجنبی عورت سے نکاح کرنے کے لیے یہ پابندی نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ طلاق مغلظہ والی عورت اپنے سابق شوہر کے لیے دوسری اجنبی عورتوں سے بھی زیادہ اجنبی ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی ضابطہ ایسا ہے جو مطلقہ عورت اور طلاق دینے والے شوہر کے درمیان جبکہ عدت ختم ہو چکی ہو اس قسم کی اجنبیت تسلیم نہیں کرتا تو وہ اسلامی ضابطہ نہیں بلکہ غیر اسلامی ضابطہ ہے۔ ان تین نکات کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ہر مسلمان یہ سمجھ سکتا ہے کہ سپریم کورٹ نے طلاق دینے والے مرد پر یہ جو لازم قرار دیا ہے کہ وہ اپنی مطلقہ کو اس وقت تک نان نفقہ دے جب تک وہ دوسری شادی نہ کر لے یا تاحیات اس کو نان نفقہ دے تو یہ شیعہ صریح طور پر مسلم پرسنل لا میں مداخلت اور اس کو بدل ڈالنا ہے۔

(۴) یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ مرد اپنی بیوی کے نان و نفقہ کا ذمہ دار اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس سے استمتاع کرتا ہے (یعنی اس کی قربت سے فائدہ اٹھاتا اور اولاد حاصل کرتا ہے) طلاق کی عدت گزر جانے کے بعد استمتاع تو دور کی بات ہے وہ اس کو بے پردہ دیکھ بھی نہیں سکتا تو اس پر اس عورت کا نان و نفقہ لازم کرنا کس چیز کا معاوضہ ہوگا؟ ہمارے فقہائے کرام نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے میکے میں بیٹھ رہے اور شوہر کے بلانے کے باوجود اس کے گھر نہ جائے تو اس عورت کا نان و نفقہ ساقط ہو جاتا

ہے وہ اپنے شوہر سے اس کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ سپریم کورٹ کے فیصلے میں مطلقہ عورت کے لیے عدت ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کے شوہر پر اس کا نان و نفقہ لازم قرار دیا گیا ہے۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(۵) بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس طرح حکومتیں اپنے ملازمین کو مدت ملازمت ختم ہو جانے کے بعد پنشن دیتی ہیں، اسی طرح اگر مطلقہ عورت کو اس کی خدمت کے صلے میں اس کی دوسری شادی تک یا تاحیات نان و نفقہ دے تو اس میں کیا حرج ہے؟ انھوں نے شاید یہ سوچا نہیں کہ اس طرح وہ عورت کا درجہ کتنا گھٹا رہے ہیں۔ اسلامی شریعت نے بیوی کو ملازمہ اور خادمہ کی حیثیت نہیں دی ہے اور نہ شوہر کو اس کے حاکم کی، بلکہ عورت کو اس سے بہت اونچا مقام عطا کیا ہے۔ اس نے عورت کو مربی کی طرح صاحب عزت وجود تسلیم کیا ہے۔ اس کو گھر کی مالکہ کا مقام دیا ہے، نہ کہ خادمہ اور ملازمہ کا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ حکومت اگر اپنے کسی ملازم کو اس کے کسی جرم کی پاداش میں ملازمت سے نکال دے تو وہ اس کو پنشن نہیں دیتی بلکہ بعض اوقات اس ملازم کو جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ طلاق کی حیثیت بھی بیوی کو قید نکاح سے آزاد کر دینے ہی کی ہے۔ اگر شوہر اور بیوی کے مزاج میں اتنا تفاوت ہو کہ کسی طرح نباہ نہ ہو سکتا ہو یا بیوی میں ایسی سرکشی اور زبان درازی پائی جاتی ہو جو ناقابل اصلاح بن چکی ہو یا اسی طرح کی کوئی اور بات ہو تو شریعت نے پوری حکمت اور انصاف کے ساتھ طلاق یا خلع کا قانون بنایا ہے تاکہ گھر دوزخ نہ بنے اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں کیونکہ جو خرابیاں کسی عورت میں پائی جاتی ہوں وہ مرد میں بھی پائی جا سکتی ہیں۔ اسلام نے ہر حال میں طلاق کو جرم قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اگر عورت مجرم ہو تو بعض حالات میں طلاق ایک ضروری کام بن سکتا ہے۔ یقیناً طلاق ابغض المباحات ہے یعنی جائز چیزوں میں ایک ایسی چیز ہے جو ناپسندیدہ ہے۔ اس حدیث میں بھی طلاق کو مباحات ہی میں داخل کیا گیا ہے، اس کو قابل سزا جرم قرار نہیں دیا گیا ہے۔ ان مختصر اشارات میں ان مسائل کی تفصیل پیش نہیں کی جا سکتی۔

(۶) مطلقہ عورت کو شریعت نے بے سہارا نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس کی کفالت، دوسری شادی تک یا تاحیات اس کے وارثوں پر لازم قرار دی ہے۔ اگر مطلقہ عورت محتاج ہے اور اس کا کوئی بیٹا یا بیٹے مالدار ہیں تو ان پر اپنی ماں کی کفالت لازم ہے یا اس کی اولاد نہیں، اور ہے تو خود محتاج ہے تو اس مطلقہ کے باپ پر اگر وہ صاحب مال ہے تو اس کی کفالت ضروری ہے۔ اگر قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور کے مال دار رشتہ داروں پر اس کی کفالت لازم کی جائے گی اور اگر کوئی بھی نہ ہو تو پھر اسلامی حکومت کا بیت المال اس کی مدد کرے گا۔ سپریم کورٹ کے

جج صاحبان ہی نہیں، بہت سے مسلمان بھی ان مسائل سے ناواقف ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ بہت سے مسلمان نادانی کی وجہ سے یا نفسانی محرکات کے تحت یا شدتِ غضب میں طلاق کا غلط استعمال کر رہے ہیں لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ شرعی قوانین بدل دیے جائیں جس کا کسی کو حق نہیں بلکہ اس کی دوسری تدبیریں بھی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔

یہ تو شرعی نقطۂ نظر سے سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے پر ایک نظر تھی۔ اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی چند اشارات مناسب معلوم ہوتے ہیں ان سے بھی اس فیصلے کی قباحتیں معلوم ہوں گی۔

(۱) ہمارے لیے یہ پہلو نہایت تشویشناک ہے کہ قرآن کریم اور احادیث نبوی کی تشریح و تعبیر اور ان سے مسائل کا استنباط وہ لوگ کرنے لگیں جنھوں نے اس کا علم حاصل نہیں کیا۔ معلوم نہیں کہ ابھی ہم مسلمانوں کو کیا کچھ دیکھنا پڑے گا۔ یہ خطرہ بھی کم المناک نہیں ہے کہ سپریم کورٹ کے وہ معزز جج صاحبان جنھوں نے قرآن و حدیث کا علم حاصل نہیں کیا بلکہ وہ قرآن کو کلام اللہ اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ بھی نہیں مانتے۔ آیاتِ قرآنی کی من مانی تفسیر و تعبیر پر اتر آئے ہیں۔ بے شک ان کے قلم کو ہم روک نہیں سکتے لیکن اتنی موٹی بات تو انھیں سمجھنی چاہیے تھی کہ تیرہ سو برس تک جو بات آیاتِ قرآنی سے کسی مسلمان قاضی کو معلوم نہیں ہوئی وہ ان کو معلوم ہو گئی ہے۔ کیا اس کو اپنے منصب اور اس کے اختیارات کا صحیح استعمال کہا جا سکتا ہے؟ اسلام کی پوری تاریخ اس سے خالی ہے کہ کسی عالم، مفسر، محدث، فقیہ اور قاضی نے سورۃ البقرہ کی آیات ۲۴۱ اور ۲۴۲ سے وہ بات نکالی ہو، جو جج صاحبان نے نکالی ہے اور عصر حاضر کے سوا مسلمانوں کی پوری تاریخ اس سے بھی خالی ہے کہ کسی مسلمان مطلقہ عورت نے طلاق کی عدت گزر جانے کے بعد کسی عدالت میں یہ مقدمہ دائر کیا ہو کہ اس کو تا نکاح ثانی یا تا حیات طلاق دینے والے شوہر سے نان و نفقہ دلوایا جائے۔ یہ ہماری شامت اعمال ہے کہ ہمارے دینی مسائل کا فیصلہ وہ لوگ کر رہے ہیں جو خود مومن بھی نہیں ہیں۔

(۲) جج صاحبان کا فیصلہ ان کے اپنے تصورات پر مبنی ہے جو وہ نکاح و طلاق کے بارے میں رکھتے ہیں ورنہ کسی اجنبی مرد پر کسی اجنبی عورت کا نان نفقہ لازم قرار دینا نہ تو مبنی بر انصاف ہے اور نہ مبنی بر عقل۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مسلمان بیوہ عورت اپنے محلے یا اپنی بستی کے کسی اجنبی مسلمان مرد پر یہ مقدمہ دائر کر دے کہ اس مرد سے اس کو تاحیات خرچ دلوایا جائے تاکہ وہ اپنی زندگی آرام سے بسر کر سکے تو کیا محض اس دلیل کی بنا پر کہ

دونوں ایک ہی محلے یا ایک ہی بستی میں رہتے ہیں، یہ فیصلہ کر دینا نہ مبنی بر عقل اور مبنی بر انصاف ہو سکتا ہے کہ وہ اجنبی مرد اس بیوہ عورت کا تاحیات، خرچ برداشت کرے۔

(۳) بظاہر تو فیصلہ عورتوں کے ساتھ ہمدردی سے سرشار نظر آتا ہے لیکن فی الواقع یہ ان کے ساتھ ہمدردی نہیں بلکہ ان کو، ان کے شوہروں کو بلکہ پورے مسلم معاشرے کو طرح طرح کے مصائب و مشکلات اور ان کو اخلاقی خرابیوں میں مبتلا کر دینے کے مترادف ہے کیونکہ یہ فیصلہ شاہ بانو تک باقی نہیں رہے گا وہ بوڑھی ہو چکی ہیں، یہ جوان مطلقہ عورتوں کے لیے بھی نظیر کا کام دے گا۔ اس کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مقدمات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ دوسرا یہ کہ ناپسندیدہ عورت، شوہر کے گھر میں پڑی رہے گی۔ شوہر نہ اس سے میاں بیوی کے تعلقات قائم رکھے گا اور نہ اس کو طلاق دے گا۔ اگر طلاق دے تو اس عورت کی دوسری شادی تک یا اس کی زندگی بھر نان و نفقہ ادا کرے اسی طرح وہ گھر دوزخ بنا رہے گا۔ اندیشہ اس کا بھی ہے کہ دونوں فواحش کے مرتکب ہوں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کا بھی اندیشہ ہے کہ شوہر اس عورت کی زندگی ختم کر دینے کی بات سوچنے لگے۔ غیر مسلم معاشرے میں اس طرح کا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ شوہر نے اپنی ناپسندیدہ بیوی سے نجات حاصل کرنے اپنی پسندیدہ عورت سے شادی کرنے کے لیے اس کو قتل کرا دیا۔ کاش جج صاحبان اسلام کے خاندانی قوانین کی حکمتیں اور مصلحتیں سمجھنے کی کوشش کرتے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مسلم معاشرے کی اصلاح اسلام کے عائلی قوانین پر عمل کرنے سے ہوگی۔ اس طرح کے فیصلوں سے کبھی نہیں ہو سکتی۔

(۴) شریعت نے مرد کو طلاق دینے کا جو حق دیا ہے اس کو اس فیصلے نے بالکل بے معنی بنا رکھ دیا ہے۔ طلاق ناپسندیدہ اور سرکش بیوی سے نجات حاصل کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہے لیکن اس فیصلے نے طلاق کے بعد بھی اس کو اس کے شوہر کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس فیصلے کی وجہ سے سرکش اور بد طینت عورتوں کی سرکشی اور بد طینتی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کیونکہ انہیں یہ اطمینان حاصل ہو گا کہ اگر شوہر نے ان کی سرکشی اور بد طینتی کی وجہ سے طلاق دے بھی دی تو وہ اس کے سر پر مسلط رہیں گی۔ اس طرح یہ فیصلہ مسلم عورتوں کے اخلاقی اصلاح کا دروازہ بھی بند کر رہا ہے۔ بلاشبہ جج صاحبان نے یہ فیصلہ مسلم معاشرے کو دوسرے معاشروں کے ہم رنگ و ہم سطح بنانے کے لیے کیا ہے۔

ممنوعات سے اجتناب
اور
احکام کی تعمیل میں بنیادی فرق

عن ابی ھریرۃ عبد الرحمن بن صخر رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما نھیتکم عنہ فاجتنبوہ وما امرتکم بہ فاتوا منہ ما استطعتم فانما اھلک الذین من قبلکم کثرۃ مسائلھم واختلافھم علی انبیائھم (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ عبد الرحمن بن صخر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ میں نے تمہیں جن چیزوں سے منع کر دیا ہے اس سے اجتناب کرو اور میں نے تمہیں جن چیزوں کا حکم دیا ہے انہیں بحد استطاعت انجام دو۔ بلا شبہ تم سے پہلے کے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ ان کے کثرت سوالات نے اور اپنے انبیاء سے اختلافات نے۔

تشریح

میں نے یہ حدیث امام محی الدین نووی شارح مسلم کی کتاب "الاربعین النوویۃ" سے نقل کی ہے۔ یہ ایک متفق علیہ حدیث ہے یعنی بخاری شریف میں بھی ہے اور مسلم شریف میں بھی۔ اس مختصر ترین حدیث سے چند اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں ان میں سے میرے نزدیک سب سے اہم اور بنیادی بات وہ ہے جس کو میں نے اوپر عنوان بنایا ہے۔ ہم سب لوگ جانتے ہیں کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں اللہ اور اس کے رسول نے روک دیا ہے، منع کر دیا ہے انہیں چیزوں کو عربی میں منہیات، ممنوعات یا نواہی کہا جاتا ہے اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں انہیں کرنے کا حکم دیا ہے انہیں کو اوامر و احکام کہا جاتا ہے۔ نہی کسی کام کے نہ کرنے کو کہتے ہیں اور امر کسی کام کے کرنے کو کہتے (باقی ص ۵۵)

تحریک اسلامی کی تاریخ

(سید احمد قادری)

انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت اسلامی یا تحریک اسلامی کی جو تاریخ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چار ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلا دور حضرت نوحؑ سے شروع ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک چلتا ہے۔ دوسرا دور حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہو کر حضرت اسحاق و یعقوب علیہم السلام تک جاری رہتا ہے۔ تیسرا دور تمام تر انبیاء بنی اسرائیل کا دور ہے جس کے پہلے نبی حضرت یوسف اور آخری نبی و رسول حضرت عیسیٰ علیہما السلام تھے۔ چوتھا دور اللہ کے آخری نبی و رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوتا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ کیونکہ اب نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ کوئی کتاب اترنے والی ہے۔ حضورؐ پر نبوت و رسالت ختم کر دی گئی۔ دین اسلام کی تکمیل ہو گئی۔ آخری کتاب — قرآن حکیم — نازل ہو چکی۔ اب امت مسلمہ آپؐ کے مشن کی امین ہے اور اسی کو قیامت تک وہ کام انجام دیتے رہنا ہے جس کے لیے آپؐ کی بعثت ہوئی تھی۔

حلقہ ٹملناڈ کے ارکان اور منتخب کارکنوں کا سہ روزہ تربیتی اجتماع ۷ دسمبر ۸۴ء سے ۹ دسمبر ۸۴ء تک منعقد ہوا تھا۔ اس کی ایک مختصر روداد جنوری ۸۵ء کے ماہنامہ زندگی نو میں شائع کر دی گئی تھی اسی اجتماع میں "تحریک اسلامی کی تاریخ" کے عنوان سے ایک نامکمل مقالہ میں نے پڑھا تھا وہ رفقاء کو بہت پسند آیا تھا اور بعض رفقاء کی فرمائش تھی کہ اس کو جلد سے جلد مکمل کر کے زندگی نو میں شائع کیا جائے۔ اسی وعدہ کا ایفاء شروع ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ مکمل ہو سکے ناظرین ہے کہ میرے پاس مختلف علوم و فنون کی تاریخ اتی

کوئی بڑی لائبریری ہے اور نہ اتنی فرصت ہے کہ دوسری لائبریریوں سے استفادہ کرسکیں۔ اس لیے اس مقالے کو محض نقش اول کی حیثیت حاصل ہے۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ اس مقالے میں کوئی غلطی ہو تو اس سے اس حقیر کو مطلع کریں۔ اس کے علاوہ میں ان کے مفید مشوروں کا بھی محتاج ہوں۔

تمہید میں پہلے اس غلط فہمی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو لفظ "تحریک" سے بعض ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے یا پیدا کی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے اسلام کو "تحریک" بنا کر اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اسلام تحریک نہیں ہے بلکہ دین ہے جو اللہ نے انسانوں کے لیے اتارا ہے۔ تحریکیں تو انسانی اذہان کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے اسلام کو نہ تحریک کہا ہے اور نہ تحریک بنایا ہے بلکہ یہ لفظ اسلام کو غالب کرنے کی جدوجہد کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اسلام کو ایک جامد شے بنا کر رکھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ عام اذہان سے دین اسلام کو ادیان باطلہ پر غالب کرنے کا خیال بھی نکل گیا تھا۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا مجددانہ کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت اور تاریخ اسلامی کے محکم دلائل سے یہ ثابت کیا کہ دین اسلام کوئی جامد و ساکن اور غیر متحرک دین نہیں ہے بلکہ ایک ڈائنمک فورس ہے اور آسمان سے اس لیے اترا ہے کہ انسانی اذہان کے گھڑے ہوئے ادیان کو شکست دے۔ انسانیت کو ظلم و ستم اور عقیدہ و عمل کی تاریکیوں سے نکال کر عدل و انصاف اور حق کی روشنی کی طرف لے آئے۔ جماعت اسلامی نہ صرف یہ کہ اسلام کو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین سمجھتی ہے بلکہ اس دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنے کی جدوجہد کو امت مسلمہ کا مقصد بعثت قرار دیتی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں وہ خود دین اسلام کے لیے "مذہب" کا لفظ استعمال کرتے ہیں حالانکہ دین اسلام کے لیے یہ لفظ نہ قرآن میں آیا ہے، نہ احادیث میں اور نہ اقوال صحابہ و تابعین میں، اس کے لیے معترضین کے پاس وجہ جواز کیا ہے؟ دین اسلام کے لیے "مذہب" کے لفظ نے اس کا حلیہ بگاڑنے میں اچھا خاصا رول ادا کیا ہے کیونکہ مسلمان، اسلام کو بھی اسی طرح کا ایک مذہب سمجھنے لگے جس طرح عیسائی عیسائیت کو، یہودی یہودیت کو اور ہندو سناتن دھرم کو سمجھتے ہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ جماعت اسلامی صرف تحریک کا لفظ استعمال نہیں کرتی بلکہ "دعوت" کا لفظ بھی استعمال کرتی ہے جس طرح وہ اپنی سعی و کوشش کو تحریک اسلامی کہتی ہے اسی طرح وہ اس کو دعوت اسلامی بھی کہتی ہے۔ "دعوت" کا لفظ قرآن کریم کا لفظ ہے۔

تحریک اسلامی کی تاریخ

تاریخ تحریک اسلامی کے صحیح مطالعے کے لیے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ تاریخ انسانی کے بارے میں قرآن کا نظریہ کیا ہے؟ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی تاریخ شرک کی تاریکی سے نہیں بلکہ توحید کی روشنی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے ثبوت میں اس نے سب سے پہلے انسان کی تخلیق پر سے وہ پردہ اٹھایا ہے جس کو خود انسان نہیں اٹھا سکتا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ سب سے پہلے انسان آدم تھے جو مٹی سے پیدا کیے گئے تھے اور وہی سب سے پہلے نبی بھی تھے۔ یہ حقیقت قرآن حکیم کی متعدد سورتوں میں کہیں اجمال اور کہیں کچھ تفصیل سے پیش کی گئی ہے اور یہ مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے قرآن کریم کا ایک اہم موضوع بحث ہے۔ اس کے علاوہ اس نے متعدد مقامات پر یہ بھی واضح کیا ہے کہ پہلے تمام انسان "امۃ واحدۃ" تھے اختلافات بعد کو پیدا ہوئے اور پھر یہ امت واحدہ بیسیوں فرقوں میں بٹ گئی۔ یہ بات سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۳ میں کچھ تفصیل سے کہی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

> ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے۔) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں
>
> لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔ (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتداء میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔(۱)

---

(۱) یونس آیت ۱۹۔ انبیاء ۹۲۔۹۳۔ المومنون ۵۲۔۵۳ کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔

اس تفسیر کے تعلق میں تاریخ انسانی اور تحریک اسلامی دونوں کو جاننے کے لیے یہ ایک اہم دستاویز ہے موضوع گفتگو کی اہمیت کے پیش نظر ہم متعدد مفسرین کی تشریحات' یہاں نقل کرتے ہیں۔ مفسر ابن کثیر نے جو تشریح کی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

لوگ ملت آدم پر قائم رہے یہاں تک کہ ان میں بت پرستی پھیلی تو ان کی طرف اللہ نے نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا وہ سب سے پہلے رسول تھے جن کو اللہ نے زمین والوں کی طرف بھیجا اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوگئے تھے ان کا فیصلہ کرے اور اختلاف ان لوگوں نے کیا جن کو حق دیا جا چکا تھا۔ (۲)

ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان دس قرون یعنی ایک ہزار برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اولاد آدم ملت آدم یعنی توحید پر کب تک قائم رہی اور کب شرک میں مبتلا ہوئی اس کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی یہ تشریح کی ہے۔

ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر "مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی۔ پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کیا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسل آدم راہ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات' فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہش مند تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام

(۲) مختصر ابن کثیر ج ا ص ۱۸۷

کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور اپنی ایک نئی امت بنالے بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہ حق کو واضح کر کے انہیں پھر سے ایک امت بنا دیں (۳)

مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں لکھا ہے :۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ایک ہی دین دیا اور ایک ہی امت بنائی لیکن لوگوں نے اس دین میں اختلاف کیا اور اس کے نتیجے میں تحزب اور گروہ بندی میں مبتلا ہوئے تو اللہ نے اپنے انبیاء بھیجے کہ وہ لوگوں کو دین میں اختلاف کے نتائج بد سے آگاہ کریں اور حق پر قائم رہنے والوں کو کامیابی اور نجات کی خوشخبری سنا دیں۔ اللہ نے ان نبیوں کو کتابیں عطا فرمائیں یہ کتابیں حق یعنی قول فیصل کے ساتھ اتریں تا کہ ان تمام نزاعات کا جو دین حق میں پیدا کردی گئی تھی۔ فیصلہ کر کے از سر نو حق کو اجاگر کر دیا جائے لیکن جن امتوں کو یہ حق عطا ہوا انھوں نے نہایت واضح دلائل کی روشنی میں اس حق کو سمجھ لینے کے بعد محض آپس کی ضد م ضدا کے سبب سے خود ہی اس حق میں اختلاف کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار حق کی وضاحت کے باوجود اختلاف قائم رہا اور انہیں لوگوں کے ہاتھوں قائم رہا جو حق کے امین بنائے گئے تھے۔ (۴)

ان چاروں قولوں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ انسان نے اپنی زندگی کا سفر تاریکی میں نہیں بلکہ روشنی میں شروع کیا تھا اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اختلاف محض ناواقفیت ہی کی وجہ سے نہیں کیا جاتا بلکہ حق کو اچھی طرح پہچان لینے کے بعد ضد، ہٹ دھرمی، ذاتی مفاد یا جھوٹے وقار اور عارضی اقتدار کے تحفظ کے لیے بھی کیا جاتا ہے اور یہی اختلاف ہمیشہ قوموں کے لیے تباہ کن رہا ہے۔

تحریک اسلامی سے کیا مراد ہے؟

آگے بڑھنے سے پہلے یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرے نزدیک تحریک اسلامی سے کیا مراد ہے۔ تحریک اسلامی اس سعی و عمل اور جدوجہد کا نام ہے جو اقامت دین (اس تشریح کے ساتھ جو دستور جماعت اسلامی ہند میں ہے) کے لیے کی جاتی ہے۔ ایک شخص توحید کی اس آن بان اور اس شان سے دعوت دیتا

(۳) تفہیم القرآن ج ا ص ۱۶۲-۱۶۳ (۴) تدبر قرآن ج ا ص ۴۵۹

ہے کہ وہ وقت کے مشرکانہ نظام کے لیے چیلنج بن جاتی ہے۔ سعید روحیں اس دعوت توحید کو قبول کر لیتی ہیں اور پھر اقامت دین کی انفرادی جدوجہد اجتماعی جدوجہد میں بدل جاتی ہے اور اگر کوئی دوسرا ایک شخص بھی اس دعوت کو قبول نہ کرے تو داعی کی تنہا ذات ایک امت بن جاتی ہے وہ حق کے لیے اپنی قوم سے کش مکش کرتا ہوا اپنے رب سے جا ملتا ہے اور وہاں کامیاب و بامراد قرار پاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی کوئی ایسی ٹھنڈی تبلیغ جس سے نظام باطل کو کوئی تشویش نہ ہو اور نہ اس سے اقتدار وقت کی پیشانی پر کوئی بل پڑے۔ تحریک اسلامی نہیں ہے کیونکہ تحریک اسلامی اس جدوجہد کا نام ہے جو دین اسلام کو ادیان باطلہ پر غالب کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔

مطالعۂ تاریخ تحریک اسلامی کے دو طریقے

ایک طریقہ یہ ہے کہ عہد خلافت راشدہ کے بعد یہ معلوم کیا جائے کہ دنیا بھر میں کہاں کہاں اسلامی نظام حیات کو برپا کرنے کی تحریکیں اٹھیں اور ان تحریکوں کے نتائج کیا نکلے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دعوت اسلامی یا تحریک اسلامی کے آغاز سے سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک کی تاریخ سے یہ معلوم کیا جائے کہ دعوت اسلامی کے اصول کیا تھے؟ اس کے ساتھ دشمنان حق کی روش کیا تھی؟ اس کے مراحل کیا تھے اور نتائج کیا نکلے؟

پہلا ایک تحقیقی کام کا طریقہ ہے جو فی الحال ہمارے لیے کچھ زیادہ مفید بھی نہیں اور میرے پاس اس تحقیق کے لیے ذرائع و وسائل بھی نہیں اس لیے میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ ہمارے لیے مفید ہے بلکہ یہ جانچنے کی سب سے مستند اور سب سے بہتر کسوٹی بھی ہے کہ کون سی تحریک اسلامی ہے اور کونسی غیر اسلامی یا محض تبلیغی و اصلاحی۔

دعوت اسلامی کی ابتدا اور اس کا پہلا دور

دعوت اسلامی یا تحریک اسلامی کی تاریخ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ وہ سب سے پہلے رسول ہیں جو اپنی مشرک قوم میں کار رسالت کی انجام دہی کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے نذیر مبین اور رسول رب العلمین ہونے کا اعلان کیا۔ حضرت نوح اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے انذار اور تبشیر کا مرکزی مضمون آخرت کے ابدی انجام سے آگاہ کرنا تھا۔ اللہ کے وفاداروں کے لیے جنت اور باغیوں کے لیے جہنم۔ آخرت کی ابدی بدانجامی اور دنیا کے عذاب سے بچنے کے لیے حضرت نوح علیہ السلام نے جو اصولی دعوت پیش کی وہ تین اجزا پر مشتمل تھی۔

(۱) صرف اللہ واحد کی عبادت (۲) اللہ کا تقویٰ (۳) رسول کی اطاعت
سورۂ نوح میں ان تینوں اجزا کا ایک ہی فقرے میں ذکر کیا گیا ہے۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ — یہ کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو
اَطِیْعُوْنِ ۝ — اور میری اطاعت کرو۔

کسی جگہ صرف بندگی رب کی دعوت کا ذکر ہے (الاعراف ۵۹) اور کہیں تقویٰ اللہ اور اطاعت رسول کا۔ (الشعراء۔ ۱۰۸) اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا (الاعراف) میں تمہارے لیے معتبر رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ (الشعراء)

یہ تھی وہ اصولی اور بنیادی دعوت جو سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی مشرک قوم کے سامنے پیش کی۔ میں یہاں بندگی رب، تقویٰ اور اطاعت رسول کی تفصیل و تشریح نہیں کروں گا کیونکہ یہ ایک لمبا کام ہے۔

شرک و بت پرستی کی ابتدا کیسے ہوئی

یہ یاد دہانی بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ شرک و بت پرستی کی ابتدا کیسے ہوئی اس میں ہمارے لیے بھی بڑی عبرت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور متعدد علمائے تفسیر نے کیا ہے کہ بت پرستی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب کچھ صالحین وفات پا گئے تو ان کی قوم نے ان پر مسجدیں تعمیر کیں اور ان میں ان کی تصویریں بنائیں تاکہ ان کے حالات اور ان کی عبادتیں یاد آتی رہیں اور وہ ان کی مشابہت اختیار کر سکیں جب اس پر ایک مدت گزر گئی تو لوگوں نے ان تصویروں کے مجسمے بنا ڈالے اور جب اس پر ایک مدت گزر گئی تو لوگوں نے ان بتوں کو پوجنا شروع کر دیا اور ان بتوں کے وہی نام رکھے جو ان وفات یافتہ صالحین کے تھے یعنی ود۔ یغوث یعوق۔ نسر۔ جب بت پرستی کا معاملہ شدت اختیار کر گیا تو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے نوح کو رسول بنا کر بھیجا اور انھوں نے اپنی قوم کو اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کی عبادت کا حکم دیا۔ (۵)

---

(۵) مختصر تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۰۸ مطبوعہ دار القرآن الکریم بیروت

تعجب یہ ہے کہ عرب میں مختلف قبائل نے انہیں ناموں کے بت بنا لیے تھے۔ اس کی تفصیل ابن کثیر میں بھی ہے۔ مولانا مودودی نے سورۂ نوح کی تفسیر میں اس کی تفصیل دے دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بت پرستی صالحین (نیک لوگ) کی عقیدت میں غلو سے شروع ہوئی پہلے تصویریں بنیں پھر ان کے مجسمے تیار کیے گئے اور پھر انہیں پوجنے لگے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے بزرگوں کے ناموں پر مسجدیں اور ان کی تصویریں بنائی تھیں ان کا مقصد برا نہ تھا۔ مسلمان جو زندہ بزرگوں اور بزرگوں کی قبروں کو پوج رہے ہیں اس کا سبب بھی غلوئے عقیدت ہی ہے۔ قوم نوح کے تو صرف پانچ بتوں کا ذکر ہے اور مسلمان جن زندہ بزرگوں اور مردہ بزرگوں کی قبروں کو پوج رہے ہیں ان کا شمار مشکل ہے۔

قوم نوح کی روش

قوم نوح کی روش حضرت نوح اور ان کی دعوت توحید کے ساتھ کیا رہی؟ اس سوال کا جواب بھی تفصیل چاہتا ہے جس کی اس مختصر مقالے میں گنجائش نہیں ہے۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ چند باتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں:۔

حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب اور ان کی دعوت توحید کا انکار، یہ اصل ہے ان کی تمام کارستانیوں کی۔ یہ جان لینا ضروری ہے کہ حضرت نوح کی دعوت سے سرداران قوم میں کھلبلی کیوں مچی اور اس کی مخالفت مخاصمت کا طوفان کیوں اٹھا؟ اگر ان کی دعوت ٹھنڈی اور بے جان تبلیغ ہوتی تو انھیں سنگسار کرنے کی دھمکی کبھی نہ دی جاتی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ صرف اللہ کی بندگی کی دعوت اور اس حقیقت کا اعلان کہ ما لکم من اللہ غیرہ کہ یعنی اللہ کے سوا تمہارا کوئی معبود، کوئی خدا اور کوئی حاکم نہیں ہے۔ ربوبیت، الوہیت صرف ایک ذات۔ ذات الٰہی کے ساتھ مختص ہے۔ یہ ایک دھماکہ تھا جس سے ایک طرف ان کے تمام معبودان باطل اوندھے منہ گرے پڑے تھے اور دوسری طرف ان کی بے قید سرداری کے تخت لرزنے لگے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت نوح نے صرف بندگی رب کی دعوت نہیں دی تھی بلکہ سلطان کائنات کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی اطاعت کا بھی پرزور مطالبہ کیا تھا۔ ان کے اس مطالبہ نے پورے نظام شرک کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور سرداران قوم نے اس کو بجا طور پر اپنے ناجائز اقتدار کی موت سمجھ لیا تھا۔ بندگی رب کی دعوت کے ساتھ اطاعت رسول کے مطالبہ کو ہر زمانے میں مشرک سیٹھوں، ساہوکاروں، بدکاروں اور ظالم و جابر بادشاہوں اور سرداروں نے اپنی موت قرار دیا ہے۔ پھر انھوں نے اپنے نظام باطل اور اپنے اقتدار کو بچانے

کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے، بلکہ وہ اپنے بعد آنے والے مشرکین کے لیے نمونہ بن گئے۔
غالباً ان کا سب سے پہلا ردعمل یہ تھا کہ انھوں نے حضرت نوحؑ کو گمراہ قرار دیا۔ (الاعراف)
یہ الزام نتیجہ تھا تقلیدِ آباء کا ـــ وہ اپنے باپ دادا کو بت پوجتے دیکھتے آ رہے تھے اور اسی
کو راہ ہدایت سمجھ بیٹھے تھے جب انھیں الٰہ واحد کی عبادت کی دعوت ملی تو انھوں نے اس کو باپ دادا
کے طریقے کے خلاف جان کر اسے گمراہی قرار دے دیا۔ آج بھی ہم اور آپ دیکھتے ہیں کہ خاندانی رسم و رواج
کے خلاف خواہ وہ رواج کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو، آواز اٹھانا اپنے آپ کو نکو بنا لینے کے مترادف ہے۔
عام طور سے مسلمان دین اسلام کا جو تصور رکھتے اور جس طریقے پر وہ چل رہے ہیں اسی کو صحیح و قدیم سمجھتے
ہیں اگر آپ ان کے سامنے وہ دین اور وہ طریقہ پیش کریں جو سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش
کیا تھا تو وہ اس کو نیا دین قرار دیں گے۔ الٹی گنگا بہہ رہی ہے جو نیا ہے وہ پرانا بن گیا ہے اور
جو پرانا ہے اس کو نیا سمجھا جانے لگا ہے۔

حق سے دشمنی کی انتہا

جیسے جیسے دعوت توحید و اطاعت رسول کا آوازہ بلند ہوتا گیا ویسے ویسے سرداران قوم کے
غصہ کا تھرمامیٹر بڑھتا گیا۔ انھوں نے دعوت قبول نہ کرنے کے لیے بہانے بنائے۔ طرح طرح کے مکر کیے جس
کو حضرت نوحؑ نے "مکراً کبّاراً" (نوح ۲۲) بہت بڑا مکر کہا ہے۔ قسم قسم کی سازشیں کیں، بے بنیاد
الزامات لگائے اور ان کو اتنی اذیتیں دیں کہ خود خدا نے اس کو کرب عظیم (الانبیاء: ۷۶) یعنی شدید
رنج و غم کہا ہے۔ یہاں تک کہ ظالم سرداروں نے ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دے ڈالی جو ہمیشہ
مخالفت و مخاصمت کا آخری نقطہ ہوتا ہے۔

انھوں نے کہا اے نوح! اگر تو باز نہ آیا تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا۔ (الشعراء-۱۱۶)

حضرت نوحؑ کی روش

اس کے برعکس حضرت نوح علیہ السلام کی روش کیا رہی؟ اس کو دو جملوں میں ادا کیا جائے تو
کہا جا سکتا ہے۔ بے نظیر صبر و تحمل اور بے مثال بے خوفی ـــ حضرت نوحؑ نے ساڑھے نو سو برس تک کرب
عظیم میں زندگی گزاری (العنکبوت-۱۴) انھوں نے اپنی قوم کو سمجھانے، ان کو دعوت حق پہنچانے اور
قبول دعوت کے صلے میں آخرت کے علاوہ دنیوی فلاح و کامرانی کی بشارت سنانے میں کوئی کسر باقی نہ

جھوٹی۔ ان کی تمام گستاخیوں اور اذیتوں پر صبر کرتے رہے اور دعوت پہنچاتے رہے۔ آج ساڑھے نو سو برس کی اس صبر آزما زندگی کا تصور بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی بے مثال بے خوفی کا ذکر سورۂ یونس میں ہے :۔

> ان کو نوح کا قصہ سناؤ، اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے برادران قوم اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسا اللہ پر ہے۔ تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو اس کو خوب سوچ سمجھ لو تا کہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے۔ پھر اس کو میرے خلاف عمل میں لے آؤ۔ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ (یونس-۷۱)

اللہ پر توکل اور دشمنان حق سے بے خوفی کا یہ ایک بے مثال نمونہ ہے جو تاریخ تحریک اسلامی میں پہلی بار پیش کیا گیا تھا اور بعد کے ادوار میں اس کی پیروی کی جاتی رہی ہے۔

نتیجہ کیا نکلا؟

دعوت اسلامی کے اس پہلے دور میں ہجرت اور جنگ کے مرحلے پیش نہیں آئے۔ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی براہ راست نگرانی میں دعوت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ جب امہال (مہلت دینا) کا وہ وقت ختم ہو گیا جو اللہ نے مقرر کیا تھا تو اس نے اپنی قوت قاہرہ سے انبیاء کو جھٹلانے والوں، دعوت توحید کا انکار کرنے والوں، بدکاروں اور بدمعاشوں کو تباہ اور بے نشان کر دیا۔ اپنے رسولوں کی مدد کی ان کو نجات دی اور اس طرح منکرین حق پر ان کو غالب کر دیا۔ قوم نوح بھی بے مثال طوفان کے ذریعے تباہ کر دی گئی اور کشتی نوح کے ذریعے صرف وہ لوگ بچا لیے گئے جو ایمان لے آئے تھے۔ اللہ بے نیاز ہے اور اس کا قانون بے لاگ ہے۔ اسی لیے حضرت نوح کی بیوی اور ان کا بیٹا دونوں آب عذاب الٰہی میں غرق ہو کر رہے اور بیٹے کی غرقابی کی صراحت سورۂ ہود میں ہے۔ وہ آیتیں پڑھنے والے پر عبرت کا ایک دروازہ کھول دیتی ہیں۔ اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت نوح سے پہلے گزرے ہیں مگر قرآن میں ان کے کام کی تفصیل نہیں ہے۔

دوسرا دور ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم

کے درمیان ایک ہزار سال کی مدت ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ اس مدت میں کتنے انبیاء علیہم السلام آئے اس کی تعیین کا کوئی مستند ذریعہ موجود نہیں ہے۔ اس مدت کے صرف دو نبیوں کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام۔ عاد حضرت ہودؑ کی قوم اور ثمود حضرت صالحؑ کی قوم تھی۔ یہ دونوں قومیں، قوم نوح کے مقابلے میں زیادہ طاقتور زور آور اور متمدن تھیں۔ اگر اس موضوع پر کوئی کتاب لکھنی ہوتی تو میں آیات قرآن کے حوالے دے کر تفصیل سے اس پر لکھتا۔ یہاں اختصار کے ساتھ اتنا لکھنا کافی ہے کہ ان دونوں نبیوں نے بھی اپنی مشرک قوموں کو وہی دعوت دی جو حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو دی تھی۔ اصولی طور پر دونوں میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں ہے۔ وہی بندگی رب تقویٰ اور اطاعت رسول کی دعوت۔ ان قوموں کی روش بھی وہی رہی جو قوم نوح کی تھی اور ان دونوں نبیوں کا رویہ بھی وہی رہا جو حضرت نوح کا تھا اور نتیجہ بھی ایک ہی تھا۔ ان دونوں قوموں پر بھی اللہ کا عذاب آیا۔ البتہ عذاب کی نوعیت مختلف تھی۔ قوم نوح طوفان آب سے ہلاک کی گئی تھی۔ ان دونوں قوموں پر جس نوعیت کا عذاب آیا اس کی تحقیق علامہ فراہی نے تفصیل سے کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

> اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے سرمائی بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب بھیجا۔ چونکہ اصل تباہی زیادہ تر ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے مؤثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے سرا کے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہری کر دینے والی چیخ بھی چھپی ہوئی تھی جس طرح کہ قوم عاد پر رعد و برق والے بادل بھیجے۔ (۶)

دعوت اسلامی کا دوسرا دور

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں دعوت اسلامی کی تاریخ کا دوسرا ورق کھلا۔ بت کدۂ آزر سے ابراہیم بت شکن کا ظہور اللہ رب العزت کی مشیت قدرت حکمت اور رحمت کی ایک ایسی مثال ہے جس کے تصور سے ایمان میں تازگی آتی، روح پر اطمینان و سکون کی پھوار پڑتی اور باطل کے مقابلہ میں غلبہ حق کی امید میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک اصولی دعوت کا تعلق ہے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اور نہ اس میں قیامت تک کوئی فرق آ سکتا ہے۔ توحید، آخرت، بندگی رب اور اطاعت رسول ان میں کون سی چیز منگائی اور دقتی ہے کہ اس میں فرق آئے۔ البتہ دور اول کی قوموں کے مقابلہ میں قوم ابراہیم کی روش اور سخت ہو گئی تھی۔ اگلے انبیاء کو ان کی قوموں نے قتل کی

(۶) تدبر قرآن ج ۲ ص ۹۸۰

حضرت دھمکی دی تھی لیکن قوم ابراہیم نے ان کو عملاً آگ کے الاؤ میں جھونک دیا تھا۔ اللہ کی مدد چونکہ شامل حال تھی اس لیے آگ کا الاؤ ان کے لیے گل و گلزار بن گیا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے باپ زندہ تھے۔ بت ساز، بت فروش اور سب سے بڑے مذہبی پروہت تھے اس لیے دعوت توحید انھوں نے اپنے گھر سے شروع کی تھی تیسرا بڑا فرق یہ ہے کہ اس دور میں ہجرت کا مرحلہ بھی پیش آگیا۔

یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب وقت آگیا تھا کہ دعوت اسلامی محدود حلقوں سے نکل کر دنیا کے وسیع حلقوں میں پھیلے۔ نیز یہ کہ حضرت ابراہیم پہلے رسول ہیں جن کو ایک بادشاہ سے مقابلہ پیش آیا اور دربار شاہی میں بھی انھوں نے صدائے حق بلند کی۔ قوم ابراہیم سیاسی حیثیت سے بھی پہلی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم اور ترقی یافتہ تھی اس لیے کہ دنیا منتشر قبائلی سسٹم سے ملوکیت کی طرف بڑھ آئی تھی۔ حضرت ابراہیم کی ہجرت کے بعد قوم کے نتیجے میں یہ فرق آیا کہ اس کو آسمانی عذاب سے ہلاک نہیں کیا گیا بلکہ نمرود اور اس کی قوم کو دوسرے انسانوں کے ذریعے سزا دی گئی۔ اس کی شان و شوکت اور حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور پہلے جو لوگ حاکم تھے وہ محکوم بنا دیے گئے۔

> اُر کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم کے زمانے میں حکمراں تھا اس کے بانی اول کا نام اُرنمو تھا جس نے ۲۳۰۰ برس قبل مسیح ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی اس کے حدود مملکت مشرق میں سوسہ سے لیکر مغرب میں لبنان تک پھیلے ہوئے تھے اس سے اس خاندان کو نمو کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور اس قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی۔ شروع میں پہلے عیلامیوں نے ار کو تباہ کیا اور نمرود کو نناّر کے بت سمیت پکڑ لے گئے۔ پھر سرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لرسہ اور اُر دونوں زیر حکم ہو گئے۔ (۷)

حضرت ابراہیم کی اپنے باپ کے سامنے تقریر

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے سامنے جو دعوتی تقریر کی تھی اور باپ نے اس کے جواب میں جس سختی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا تھا اور اس کے جواب میں انھوں نے جس نرمی اور رحم دلی کا ثبوت پیش کیا تھا

(۷) تفہیم القرآن ج ۱ ص ۵۵۵

وہ اپنے بزرگوں تک دعوت حق پہنچانے کا ایک ایسا نمونہ ہے جو قیامت تک کام آتا رہے گا اور تمام داعیان حق کے لیے مثال بنا رہے گا۔ یہ سرگزشت سورۂ مریم آیات ۴۱ تا ۴۸ میں بیان کی گئی ہے۔ ان کی تقریر تین آیتوں میں ہے اور ہر جملہ یا ابت (ابا جان) سے شروع ہوا ہے۔ ابا جان ابا جان کی تکرار سے وہ دلسوزی اور رحمدلی ٹپکی پڑتی ہے جو ان کے دل میں اپنے باپ کے لیے تھی اور جب باپ نے ان کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی اور ان کو گھر سے نکال دیا جب بھی ان کی پیشانی پر کوئی شکن نہ پڑی اور وہ اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کا وعدہ کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل گئے اور اس وقت تک اپنے باپ کے لیے دعا کرتے رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے روک نہ دیا۔ قوم کے سامنے انھوں نے جو مفصل تقریریں کی ہیں۔ وہ بھی سورۂ البقرۃ، العنکبوت اور دوسری سورتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے بتکدے میں گھس کر عملاً بت شکنی کی تھی

حضرت ابراہیم کی آزمائشیں

حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ کو ان کے دوست، اللہ نے جس طرح آزمایا وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا مودودیؒ نے چند جملوں میں اس کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

> قرآن میں مختلف مقامات پر ان تمام سخت آزمائشوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے جن سے گزر کر حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کیا تھا کہ انہیں بنی نوع انسان کا امام و رہنما بنایا جائے جس وقت سے حق ان پر منکشف ہوا اس وقت سے لیکر مرتے وقت تک ان کی پوری زندگی قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان محبت کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو حضرت ابراہیم نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں جن سے آدمی ڈرتا ہے، ان میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا جسے انھوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔

حضرت ابراہیم کی ہجرت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے جو تقریریں کی ہیں، جو مکالمے ہوئے ہیں، نمرود کے دربار میں جو مباحثہ ہوا ہے اور جن طریقوں سے انھوں نے قوم کو توحید کی طرف لانے کی سعی کی ہے۔ یہ سب کچھ قرآن میں موجود ہے۔ آگ کے الاؤ میں ڈالے جانے کا واقعہ بھی قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر ان سب پر تفصیل سے گفتگو

(۸) تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۱۰

کی جائے تو یہ مقالہ ایک کتاب کی ضخامت اختیار کرے گا۔ اس لیے ہم اس تفصیل کو ترک کر رہے ہیں۔ ہجرت کا واقعہ چونکہ اسی دور میں سب سے پہلے پیش آیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس پر الگ سے چند سطریں لکھی جائیں۔ ان کی دعوت توحید کی وجہ سے جب ان کا وطن ان کا دشمن بن گیا۔ وقت کی حکومت، پوری قوم ان کا خاندان یہاں تک کہ ان کا باپ ان کے خون کا پیاسا ہو گیا اور آخر سب نے مل کر ان کو زندہ جلا دینے کے لیے ان کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا تو انھوں نے خدا کے حکم سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ انھوں نے ہجرت کے وقت الفاظ کیا استعمال کیے تھے۔ یہ الفاظ ان کے حنیف یعنی سب سے کٹ کر اللہ کے ساتھ جڑ جانے کی ایک مستقل دلیل ہیں۔ سورہ العنکبوت میں ہے کہ ہجرت کے وقت ان کے الفاظ یہ تھے۔

وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (العنکبوت ۲۶)	اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ وہ زبردست ہے اور حکیم ہے

"میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں" کتنا رس ہے ان الفاظ میں، اللہ کی محبت، اس کی حکمت، اس کی قوت اور اس کی ہدایت پر ایمان و توکل کا ایک خزانہ ہے ان الفاظ میں۔ حضرت ابراہیم اپنے اس وطن کو چھوڑ رہے تھے جس سے باہر وہ کبھی نہ نکلے تھے۔ انہیں خبر نہ تھی کہ وہ کہاں جائیں گے، کہاں ٹھہریں گے لیکن جس خدا کی خاطر وہ نکل رہے تھے وہ مدد اور رہنمائی کے لیے ان کے ساتھ تھا چنانچہ سورۂ صافات میں یہ بات واضح ہو گئی اس میں جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں: —

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔ (الصّٰفّٰت: ۹۸)	اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہی میری رہنمائی فرمائے گا۔

اس ہجرت میں لوط علیہ السلام ان کے ساتھ تھے اس کی صراحت قرآن میں ہے اور ان کی بیوی حضرت سارہ ان کے ساتھ تھیں اس کا اشارہ قرآن میں ہے۔ ان تین بندگان خدا کا یہ قافلہ ایک نامعلوم مستقر کی طرف نکل پڑا اور ان کے ہادی خدائے رحمن و رحیم نے انہیں شام کی بابرکت سرزمین میں پہنچا دیا۔

وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء۔ ۷۱)	اور ہم اسے (یعنی ابراہیم کو) اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔

یہ برکتوں والی سرزمین شام و فلسطین کا علاقہ تھا۔

ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا دین بھی ایک ہے اور ملت بھی ایک ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ صرف انہیں کا نام لیکر ان کی ملت کے اتباع کا حکم مختلف اسالیب بیان میں دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی دوسرے نبی و رسول کو حاصل نہیں ہوئی۔ یہ حقیر اپنی تقریروں اور درس قرآن میں بھی اس کا ذکر کرتا رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اور ہمارے لیے اس میں کیا سبق ہے؟ میں بعد کو اس پر روشنی ڈالوں گا۔ چونکہ اس حقیر کے نزدیک تاریخ تحریک اسلامی میں اس کی خاص اہمیت ہے اس لیے یہاں پہلے ان آیات کے ترجمے پیش کیے جارہے ہیں جن میں ملت ابراہیمی کا ذکر ہے۔ قرآن مجید کی ترتیب سور کے لحاظ سے سب سے پہلے سورۂ البقرہ میں اس کا ذکر ملتا ہے:-

۱۔ اب کون ہے جو ملت ابراہیم سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو۔ اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے۔ (البقرہ ۱۳۱)

۲۔ یہودی کہتے ہیں کہ یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو، نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ۔ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا (البقرہ ۱۳۵)

۳۔ کہو۔ اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے۔ تم کو یکسو ہو کر ملت ابراہیم کی پیروی کرنی چاہئے اور ابراہیم شرک کرنے والوں سے نہ تھا۔ (آل عمران ۹۵)

۴۔ اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ملت ابراہیم کی پیروی کی۔ اس ابراہیم کی ملت کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنالیا تھا (النساء ۱۲۵)

۵۔ اے محمد کہو، میرے رب نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ ابراہیم کی ملت جس کو یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ (الانعام ۱۶۱)

۶۔ پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ یکسو ہو کر ابراہیم کی ملت پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ (النحل ۱۲۳)

۷۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی

(تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ، بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔　　(الحج آخری آیت)

ان سات آیتوں میں مکی آیتیں بھی ہیں اور مدنی آیتیں بھی۔ ترتیب نزولی کے لحاظ سے سب سے پہلے ملت ابراہیم کا ذکر سورۂ انعام میں آیا ہے۔ اوپر مع ترجمہ پڑھیے۔ اس میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ نے ان کو صراط مستقیم کی ہدایت دے دی ہے۔ یعنی سیدھا راستہ بالکل ٹھیک دین اور اسی دین قیم کی تعبیر ملت ابراہیم سے کی گئی ہے۔ اس طرح ملت ابراہیم کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ اس آیت کے بعد سورۂ انعام کی یہ آیت ہے:-

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝

کہو میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں

ان دو آیتوں میں ملت ابراہیم یعنی ملت اسلام کا پورا جوہر کھینچ آیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:-

"یعنی تم دین میں جتنی چاہو راہیں نکالو اور جس قدر چاہو معبود ٹھیرالو۔ مجھ کو تو میرا پروردگار صراط مستقیم بتلا چکا اور وہی خالص توحید اور کامل تفویض و توکل کا راستہ ہے جس پر موحد اعظم ابو الانبیاء ابراہیم خلیل اللہ بڑے زور و شور سے چلے جن کا نام آج بھی تمام عرب اور کل ادیان سماویہ عظمت و احترام سے لیتے ہیں۔"

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي کی آیت کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:-

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ملت ابراہیم اور ملت اسلام کی اصل روح کی تعبیر کرائی گئی ہے۔ نماز اور قربانی، زندگی اور موت دونوں میں غور کیجیے، نہایت حسین تقابل ہے۔ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ جو اس ملت پر ہے وہ جیتا ہے تو خدا کے لیے اور مرتا ہے تو خدا کے لیے۔ اس کی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔ یہ از ابتدا تا

[illegible] ... ساتھی ہیں ... [illegible]
کوئی ساتھی نہیں۔ یہ پوری کی پوری بغیر کسی تقسیم و تجزیہ اور بغیر کسی تحفظ استثناء کے صرف اللہ وحدہٗ لاشریک
کے لیے ہے۔ فرمایا کہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین۔ یہی میری فطرت ہے اور اسی کی
مجھے اوپر سے ہدایت آئی ہے۔ اس وجہ سے میں نے سب سے آگے بڑھ کر اس قلادہ کو اپنی گردن میں ڈالا
مطلب یہ ہے کہ میں تو اس راہ پر چل پڑا ہوں اب جس میں ہمت ہو اس راہ میں میرا ساتھ دے۔ میں اپنا
سفر دوسروں کے انتظار میں ملتوی نہیں کر سکتا۔ (۹)

کتنی دل نشیں ہے یہ تشریح۔ جس اسلام کے غلبے کے لیے تحریک چلائی جا رہی ہے اس کو سمجھنے کے لیے سورۂ
انعام کے آخری رکوع کی آیتیں بہت مفید ہیں۔

سورۂ انعام کی آیتوں کے بعد سورۂ نحل کی آیت پر غور کیجیے۔ اوپر جس کا ترجمہ ملے میں ہے۔ اس میں
صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو۔ فی الحقیقت ملت ابراہیم
ہی ملت اسلام ہے۔ اس کے بعد سورۂ حج کی آیت آتی ہے جس کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس آیت نے تو
ملت ابراہیم کو آئینہ بنا دیا ہے۔ امت مسلمہ کا مقصد وجود اور اس کے تقاضے سب اس میں آگئے ہیں۔

اس کے بعد بقرہ، آل عمران اور النساء کی چار آیتیں گویا انہیں تین آیتوں کی تکمیل ہیں۔

وجوہ اب اس پر غور کرنا چاہیے کہ ملت ابراہیم کی یہ خصوصیت کن وجوہ سے ہے۔ مولانا مودودیؒ
نے اس کی تین وجوہ لکھی ہیں: -

اگرچہ اسلام کو ملت نوح، ملت موسیٰ، ملت عیسیٰ بھی اسی طرح کہا جا سکتا ہے جس طرح ملت
ابراہیم لیکن قرآن مجید میں اس کو بار بار ملت ابراہیم کہہ کر اس کے اتباع کی دعوت تین وجوہ سے دی
گئی ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب تھے اور وہ حضرت ابراہیم سے جس قدر
مانوس تھے کسی اور سے نہ تھے۔ ان کی تاریخ روایات اور معتقدات میں جس شخصیت کا
رسوخ و اثر رچا ہوا تھا وہ حضرت ابراہیم ہی کی شخصیت تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت
ابراہیم ہی وہ شخص تھے جن کی بزرگی پر یہودی، عیسائی، مسلمان، مشرکین عرب اور مشرق اوسط
کے صابی سب متفق تھے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ان سب ملتوں کی پیدائش

---

(۹) تدبر قرآن جلد ۲ ص ۵۸۶، ۵۸۷

سے پہلے گزرے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور صابئیت کے متعلق تو معلوم ہے کہ سب بعد کی پیداوار ہیں۔ رہے مشرکین عرب تو وہ بھی یہ مانتے تھے کہ ان کے ہاں بت پرستی کا رواج عمرو بن لحی سے شروع ہوا جو بنی خزاعہ کا سردار تھا اور مآب (موآب) کے علاقہ سے ہبل نامی بت لے آیا تھا۔ اس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سو سال قبل مسیح کا ہے۔ لہٰذا یہ ملت بھی حضرت ابراہیم کے صدیوں بعد پیدا ہوئی۔ اس صورت حال میں قرآن جب کہتا ہے کہ ان ملتوں کے بجائے ملت ابراہیم کو اختیار کرو تو وہ دراصل اس حقیقت پر متنبہ کرتا ہے کہ اگر حضرت ابراہیم برحق اور برسر ہدایت تھے اور ان ملتوں میں سے کسی کے پیرو نہ تھے تو لامحالہ پھر وہی ملت، اصل ملت حق ہے نہ کہ یہ بعد کی ملتیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسی ملت کی طرف ہے۔ (۱۰)

اس حقیر کے نزدیک اس کی کئی وجوہ اور ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے رسول ہیں جن کو امامت عامہ کا منصب عطا کیا گیا یعنی اللہ نے آپ کو امام الناس بنایا تھا۔ ان سے پہلے جو انبیاء کرام آئے وہ صرف اپنی قوموں کے لیے مبعوث ہوئے تھے ان میں سے کسی کو امام الناس کا منصب عطا نہیں کیا گیا تھا۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۴ کا مطالعہ کیجیے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝	یاد کرو کہ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا۔ میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کیا اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟ اس نے جواب دیا، میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔
(البقرۃ۔۱۲۴)	

امام یعنی قدوۃ فی الدین (۱۱) اماماً قدوۃ یقتدی بہ ویحتذی حذوہ (۱۲) پیشوا و مقتدیٰ جن کی اقتداء کی جائے اور جن کے نمونے پر عمل کیا جائے وہ کلمات کیا تھے جن میں پورا اترنے کا یہ صلہ ان کو ملا کہ بنی نوع انسان کے امام اور پیشوا بنا دیئے گئے۔ یہ وہ آزمائشی احکام تھے جو اللہ نے ان کو دیئے تھے۔ محمد بن اسحاق

---

(۱۰) تفہیم القرآن ج ۳ ص ۲۵۵ (۱۱) جلالین (۱۲) مختصر تفسیر ابن کثیر

نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان کلمات سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے حکم سے مباحثہ کیا
اور انھوں نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس سے مباحثہ کیا جب ان کی قوم نے دعوت توحید کی سزا دینے کے لیے آگ
کا الاؤ جلایا تو اللہ نے ان کو حکم دیا کہ آگ میں کود پڑو اور وہ بے خطر کود پڑے ۔ ع

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

اللہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے وطن، گھر بار، دوست احباب اور اپنے شہر کو اللہ کے لیے چھوڑ دیں اور وہ
سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن سے ہجرت کر گئے ۔ اللہ نے ان کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو اللہ کے نام پر قربان کر دیں اور
انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر چھری چلا دی ۔ (۱۳)

مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے :۔

"یوں تو ان امتحانات میں سے ہر امتحان نہایت کٹھن تھا لیکن خاص طور پر بیٹے کی قربانی والا امتحان
تو ایک ایسا امتحان تھا جس میں پورا اترنا تو الگ رہا ۔ اس کا تصور بھی ایک عظیم امتحان تھا لیکن جب
حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں بھی پورے اتر گئے تو اللہ تعالے نے ان سے یہ وعدہ فرمایا کہ اِنِّی
جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں) یہ ایک ہی وعدہ بیک
وقت دو وعدوں پر مشتمل ہے ۔ ایک تو اس پر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے عظیم قومیں پیدا
ہوں گی ۔ دوسرے اس پر کہ حضرت ابراہیم السلام ان سب کے پیشوا ہوں گے ۔ اس عظیم انعام کے
حق دار وہ صرف اس وجہ سے قرار پائے کہ انھوں نے اللہ کی خاطر نہ صرف اپنے خاندان
اور اپنی قوم کو چھوڑا بلکہ ایک دشت غربت میں اپنے اس اکلوتے فرزند کو بھی قربان کرنے پر آمادہ
ہو گئے جو اس بڑھاپے اور اس تنہائی میں ان کی تمام تمناؤں کا واحد مرکز تھا ۔ (۱۴)

تاریخ تحریک اسلامی کے یہ وہ اسباق ہیں جنھیں ہم بھول گئے ہیں اور یہ کہہ اٹھے ہیں ۔ ع

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

جب حضرت ابراہیمؑ کو امام الناس بنایا گیا تو نہ ہی حق دار تھے کہ ان کا نام لے کر ان کی ملت کے اتباع
کا حکم دیا جاتا اور یہ فی الواقع دیا گیا ۔ دوسری وجہ یہ کہ قرآن نے ان کو امام الموحدین کی شکل میں پیش کیا ہے ۔ ان
کا نمایاں ترین لقب حنیف ہے (یعنی وہ یک سو تھے ۔ سب سے کٹ کر صرف اللہ سے جڑ گئے تھے) اور انھیں کے لیے

---

(۱۳) مختصر تفسیر ابن کثیر سے ماخوذ (۱۴) تدبر قرآن ج ۱ ص ۲۸۱، ۲۸۲

وما كان من المشركين ٥ ولم يك من المشركين ٥ کی تکرار کی گئی ہے۔ (۱۵) اس لیے وہ حق دار تھے کہ ان کی ملت کی پیروی کا حکم دیا جاتا اور یہی سبب ہے کہ اہل کتاب اور امت مسلمہ دونوں کو حنیف بننے کا حکم دیا گیا ہے۔

حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔ (الحج - ۳۱)	یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔
وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ (البینہ)	اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے بالکل خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر۔

ضمناً یہ وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ "امت مسلمہ" کا لقب سب سے پہلے حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہی نے استعمال کیا تھا اور امت مسلمہ کا وجود ابراہیم خلیل اللہ اور اسمٰعیل ذبیح اللہ ہی کی دعا کا ثمرہ ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرۃ ۱۲۸)	اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع و فرماں بردار) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔

سب سے پہلے باپ بیٹے نے جس چیز کی دعا کی ہے وہ خود اپنے مسلم بنائے جانے کی ہے۔ مسلم کے معنی خدا کے کامل فرماں بردار کے ہیں۔ اس سے کئی حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان و اسلام اور طلب خشیت و تقویٰ کی دعاؤں میں انسان سب سے پہلے اپنے آپ کو سامنے رکھے۔ یہ چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی بھی مستغنی ہو سکے اگرچہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔ دوسری یہ کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل جیسے مسلم کامل بھی جن کے ذریعہ سے دنیا اسلام کے نام اور اس کی روح سے آشنا ہوئی اپنے مسلم بنائے جانے کے لیے دعا کرتے تھے۔ تیسری حقیقت جو خاص اس موقع سے تعلق رکھنے والی اور نظم کلام کو کھولنے والی ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریخی موقع پر جب کہ وہ اپنے مشن کا مرکز تعمیر کر رہے تھے، اپنے لیے جس چیز کی دعا کی تھی مسلم بنائے جانے کی کی تھی نہ کہ یہودی یا نصرانی

(۱۵) البقرہ۔ آل عمران۔ الانعام۔ النحل۔

بنائے جانے کی۔ (۱۶)

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ کی تشریح

اپنے مسلم بنائے جانے کی دعا کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے اپنی ذریت کے اندر سے ایک پوری امت مسلمہ کے اٹھائے جانے کی بھی اس موقع پر دعا فرمائی۔ اس دعا میں چونکہ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کی ذریت میں سے صرف حضرت اسمٰعیل شریک تھے اس وجہ سے اس کا واضح مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ یہ انہی کی اولاد سے متعلق تھی چنانچہ انہیں کی نسل کے اندر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا اور آپ کی دعوت سے وہ امت مسلمہ ظہور میں آئی جس کے لیے دعا کی گئی تھی۔ (۱۷)

تیسری وجہ یہ ہے کہ شرک اور مشرکین سے تبری اور ان سے ترک موالات کے لیے امت مسلمہ کے سامنے حضرت ابراہیم ہی کو بطور اسوہ پیش کیا گیا ہے:۔

"تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا: "ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ" (الممتحنہ۔۴)

ہم نے تم سے کفر کیا یعنی ہم تمہارے کافر ہیں۔ نہ تمہیں حق پر مانتے ہیں نہ تمہارے دین کو۔ اللہ پر ایمان کا لازمی تقاضا طاغوت سے کفر ہے۔ فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقى لا انفصام لها۔ پس جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے درحقیقت ایک مضبوط سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ البقرہ ۲۵۶ (۱۸)

آگے آیت ۶ میں پھر فرمایا:۔

انہی لوگوں کے طرز عمل میں تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روز آخر کا امیدوار ہو۔ اس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے (الممتحنہ)

---

(۱۶) تدبر قرآن ج ۱ ص ۲۹۴ (۱۷) ایضاً ص ۲۹۵ (۱۸) تفہیم القرآن ج ۵ ص ۴۴۴

اس کا واضح تقاضا یہ تھا کہ ملتِ ابراہیمی کو ملتِ اسلام قرار دیا جائے۔

سبق اس پوری بحث کے مطالعہ سے تحریکِ اسلامی کے ہر کارکن کو جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ مشرک سے بیزاری اور مشرکین سے ترکِ موالات میں ہمارے لیے اسوہ حضرت ابراہیم ہیں۔ سورۂ ممتحنہ کی آیتوں نے اس کو قطعی بنا دیا ہے اس کے علاوہ ملتِ ابراہیمی چونکہ ملتِ اسلام ہے اور قرآن مجید نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ابراہیم کے حقیقی پیرو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس ساتھی ہیں اس لیے بات یہ بنی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی ملتِ ابراہیم کی پیروی ہے۔

ابراہیم کے ساتھ نسبت کے سب سے زیادہ حقدار وہ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی۔ پھر یہ پیغمبر ہیں اور جو ان پر ایمان لائے اور اللہ اہلِ ایمان کا ساتھی ہے۔ (آل عمران - ۶۸)

تمام انبیائے کرام ہمارے مقتدا ہیں لیکن اصلاً پیروی ہمیں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کرنی ہے جن کو ملت ابراہیم کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کے مکلف ہیں

تاریخ تحریک اسلامی کے دوسرے دور کی کچھ مزید باتیں

اس حقیر کے ذہنی نقشے کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا دور حضرت یعقوب علیہ السلام تک طویل ہے۔ اس دور میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر قرآن میں کچھ تفصیل سے ہے۔ حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام اپنے خاندانوں کی اصلاح پر مامور تھے۔ ان دونوں کو کفار و مشرکین میں کارِ نبوت انجام دینے پر مامور نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ پورے قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کا مستقر مکہ معظمہ تھا ان کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ قرآن میں کیا گیا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ ان کے ساتھ انھوں نے اپنے وطن عراق سے ہجرت کی تھی۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کے زیر تربیت رہے تھے۔ ان کے ساتھ متعدد مقامات پر انھوں نے دعوتی سفر بھی کیا تھا آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کو اس علاقے میں نبی بنا کر بھیجا جو آج کل شرق اردن کہا جاتا ہے۔ جن شہروں یا بستیوں میں وہ بھیجے گئے تھے اس کا مرکزی شہر سدوم تھا۔ وہ جس قوم کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے تھے وہ سخت بے حیا اور بدکار قوم تھی ہم جنسی اس میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ عورتوں سے متنفر ہو گئے تھے بغیر غیرت و ضمیر فطری اولاد کی عادت تا نیر بن گئی تھی۔ حضرت لوطؑ نے ایک عرصے تک ان کی اصلاح کی

...ملی لیکن انھوں نے نہ اسلام قبول کیا اور نہ اس عمل سے باز آئی۔ یہاں تک کہ جب اس کی مہلت[illegible] کی مدت ختم ہو گئی تو حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ہی میں اس قوم پر عذاب کا کوڑا برسا اور وہ نیست و نابود کر دی گئی۔ اس قوم پر کنکر پتھر برسانے والی آندھی کا عذاب آیا ہے اور غالباً اس کے ساتھ سخت زلزلہ بھی تھا جس نے ان کی بستیوں کو تلپٹ کر دیا۔ ان کی بستیاں زمین میں دفن ہو گئیں اور ان کی جگہ پر پانی نکل آیا۔ بحر مردار جس کو بحر لوط بھی کہا جاتا ہے غالباً اسی زلزلے سے پیدا ہوا تھا۔ اس قوم کا قصہ بھی قرآن کی متعدد سورتوں میں ...

حضرت اسحاقؑ و یعقوب علیہما السلام

حضرت اسحاقؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ ان کے پوتے تھے۔ ان دونوں کی بشارت ایک ساتھ حضرت ابراہیمؑ کو دی گئی تھی۔ اس بشارت کا ذکر سورۂ ہود میں ہے اور پھر متعدد سورتوں میں ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے جو فرشتے اللہ تعالیٰ نے بھیجے تھے وہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچے تھے۔ انھوں نے ایک طرف قوم لوط پر عذاب کی خبر ان کو دی تھی اور دوسری طرف ان کو بیٹے اور پوتے کی بشارت بھی سنائی تھی۔ سورۂ ہود کی ان آیتوں کے ترجمے یہ ہیں: —

> اور دیکھو ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لیے ہوئے پہنچے۔ کہا تم پر سلام ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا تم پر بھی سلام ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا (ان کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا۔ انھوں نے کہا، ڈرو نہیں۔ ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ابراہیم کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی، وہ یہ سنکر ہنس دی۔ پھر ہم نے اس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی۔ وہ بولی۔ ہائے میری کم بختی۔ کیا اب میرے یہاں اولاد ہوگی جبکہ میں بڑھیا پھونس ہو گئی اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے کہا اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والو! تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے۔ (ہود ۶۹ تا ۷۳)

بائبل میں ہے اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۱۰۰ برس اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ برس تھی۔ ان آیتوں میں ... اسحاق ہی ان پر گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے۔ فلسطین کا مقام حبرون حضرت ابراہیمؑ کا مستقر بھی تھا اور حضرت اسحاق کا بھی اور مصر منتقل ہونے سے پہلے حضرت یعقوبؑ کا بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت اسحاق و یعقوب فلسطین کے محدود ...

ملت اور اپنی آل اولاد کی اصلاح پر مامور کیے گئے تھے۔ قرآن کریم کے پہلے پارے کے آخر میں یہود و نصاریٰ کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے دلائل کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے طریق زندگی اور ان کی ملت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس ذیل میں یہ بھی ہے کہ حضرت اسحاق و یعقوب بھی اسی ملت پر تھے جو ابراہیم خلیل اللہ کی ملت تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بھی وہی وصیت کی تھی جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اپنی اولاد کو کی تھی ان آیتوں کے ترجمے یہ ہیں:۔

اب کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو۔ اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟ ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہو گا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا"۔ اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ اپنی اولاد کو کر گیا اس نے کہا تھا کہ "میرے بچو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے۔ لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا"۔ پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا۔ بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ ان سب نے جواب دیا "ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگ ابراہیمؑ اسمٰعیل و اسحاق نے خدا مانا ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔ (البقرہ: ۱۳۰ تا ۱۳۳)

آیت ۱۳۰ سے آیت ۱۳۳ تک کی آیتیں دو پہلوؤں سے خاص اہمیت رکھتی ہیں ایک اس پہلو سے کہ ان سے حضرت ابراہیم و اسحاق و یعقوب علیہم السلام کے بارے میں اجمالی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور دوسرے اس پہلو سے کہ یہود و نصاریٰ کے جواب میں مسلمانوں سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے اس سے امت مسلمہ کی بھی ایک واضح تعریف ہمارے سامنے آتی ہے۔ سورۂ یوسف سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر اپنی نعمت کی تکمیل کی تھی اسی طرح حضرت اسحاق و یعقوب پر بھی کی تھی اور سورہ صٰفّٰت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے خلیل پر اپنی برکت نازل کی تھی اسی طرح حضرت اسحاقؑ کو بھی اپنی برکت سے نوازا تھا

اور تجھ پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے۔ تیرا رب علیم و حکیم ہے۔ (یوسف ۶)

اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی ایک نبی صالحین میں سے اور اسے اور اسحاق کو برکت دی

(الصٰفّٰت: ۱۱۲-۱۱۳)

شاہ عبدالقادر دہلوی کی رائے یہ ہے کہ اس سورہ میں بارکنا علیہ کے مرجع حضرت اسمٰعیل ہیں اور علی ذریتھما کے مرجع حضرت اسمٰعیل و اسحاق ہیں ـــــ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صبر اور توکل علی اللہ کا جو اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا تھا اس کی تفصیل سورۃ یوسف میں پڑھنی چاہیے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

ذریت ابراہیمؑ کی عالمگیر امامت حضرت ابراہیم کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ کو ملی۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹے اور حضرت اسحاق کی پیدائش سے پہلے اکلوتے بیٹے بھی تھے۔ حضرت اسحاق، حضرت اسمٰعیل کے عظیم الشان واقعۂ قربانی کے بعد پیدا ہوئے تھے وہ حضرت اسمٰعیل سے تیرہ سال چھوٹے تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے اور حضرت اسحاقؑ حضرت سارہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا۔ اس لیے نسل ابراہیمی کی یہ شاخ بنی اسرائیل کہلائی اور حضرت اسمٰعیل کی نسل سے جو شاخ چلی وہ بنی اسمٰعیل کہلائی۔ عرب حجاز کے جدِ اعلیٰ حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کو اللہ تعالےٰ کے حکم سے سرزمین مکہ میں اس وقت لابسایا تھا کہ ابھی وہ شیرخوار بچے تھے اور مکہ ایک سنسان مقام اور آبادی سے خالی تھا۔ وہ اپنے شیرخوار بچے اور ان کی والدہ ماجدہ کو اس جگہ لاکر چھوڑ گئے تھے جہاں آج زمزم ہے۔ پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ بخاری شریف میں مروی ہے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سیرت سرورِ عالم میں حصہ دوم ص ۵۶ میں اس واقعہ کو اردو میں پیش کردیا گیا ہے۔ میں طوالت کے خوف سے اس کی تفصیل ترک کرتا ہوں جس جگہ کعبہ کی تعمیر ہونی تھی وہاں حضرت اسمٰعیل کو بسانا دراصل اس بات کی تمہید تھی کہ اسی سرزمین پر اس شیرخوار بچے کی ذریت میں "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" پیدا ہوگا جو گلشن انبیاء کا گل سرسبد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

چھوڑ کر جاتے وقت کی دعا

سورۂ ابراہیم میں ایک ہی جگہ ان کی متعدد دعائیں جمع کردی گئی ہیں جو انھوں نے مختلف مواقع پر کی تھیں پہلی دعا یہ ہے۔

اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے میرے رب اس سرزمین کو پرامن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب ان بتوں نے لوگوں

میں سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو، تو بخشنے والا مہربان ہے۔" (ابراہیم: ۳۵-۳۶)

اس دعا کے بارے میں حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس وقت کی تھی جب وہ اپنے شیر خوار بیٹے اور بیوی کو چھوڑ کر حبرون (فلسطین) واپس جا رہے تھے۔ دوسری دعا انھوں نے یہ کی تھی

اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔ (آیت۔ ۳۷)

اس دعا کے تحت ابن کثیر نے لکھا ہے:۔

وهذا يدل ان هذا دعاء ثان بعد الدعاء الاول الذى دعا به عند ما ولى هاجر وولدها وذالك قبل بناء البيت وهذا بعد بنائه تاكيدا ورغبة الى الله عز وجل ولهذا قال عند بيتك المحرم (۱۹)	یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ دوسری دعا ہو اس پہلی دعا کے بعد جو انھوں نے اس وقت کی تھی جب وہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو چھوڑ کر جا رہے تھے اور وہ دعا بیت اللہ کی تعمیر سے پہلے کی ہے اور یہ دوسری دعا اس کی تعمیر کے بعد تاکید کے لیے اور اللہ عزوجل کی خاطر رغبت کے اظہار کے لیے اس لیے انھوں نے عند بیتک المحرم کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ "عند بيتك المحرم (تیرے محترم گھر کے پاس) کے فقرے کو انھوں نے اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ یہ دعا بیت اللہ کی تعمیر کے بعد انھوں نے کی تھی اور پہلی دعا تعمیر سے پہلے حضرت اسمٰعیل کو چھوڑ کر جاتے وقت اور بعض علماء و مفسرین نے اس دعا کو بھی تعمیر بیت اللہ سے پہلے وقت کی قرار دیا ہے جب وہ دونوں کو چھوڑ کر واپس جا رہے تھے اور اس کی تائید امام بخاری کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ (۲۰) مولانا مودودی نے بخاری کی جس حدیث کا ترجمہ کیا ہے اس میں یہ بھی ہے:۔

(۱۹) مختصر تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۰۲ (۲۰) ایضاً ج ا ص ۱۲۳

حضرت ابراہیم جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہ ماں بیٹے نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف (یعنی اس جگہ کی طرف جہاں آخر کار انہیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا) رخ کیا اور اللہ سے عرض کیا۔ پروردگار! میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصہ کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے تاکہ اے پروردگار! یہ یہاں نماز قائم کریں لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکر گزار بنیں (۲۱)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو جیسا کہ اوپر گزر چکا امامت عامہ کا منصب عظیم عطا فرمایا تھا اور ان کو اپنے بیٹے اسمٰعیل کی مدد سے اس گھر کی تعمیر کا حکم دیا جو اس سطح زمین پر خدا کا سب سے پہلا گھر ہے جو تمام انسانوں کے لیے تیار کیا گیا۔ کعبہ۔ جو دعوت توحید و اشاعت اسلام کا عالمگیر مرکز اور قیامت تک دنیا کے تمام مسلمانوں کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ اسی دل سے ان کے شرائین میں ایمان و اسلام کی بجلی دوڑتی ہے یہ واضح دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم کے بعد حضرت اسمٰعیل ہی امامت عامہ کے وارث بنائے گئے تھے اور وہی بیت اللہ کے سب سے پہلے متولی ہوئے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا وہی ہے
بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ	جو مکہ میں ہے۔ عالم والوں کے لیے برکت اور
(آل عمران ۹۶)	ہدایت کا مرکز

اس مرکز ہدایت کی نگرانی کا ذمہ دار ایک ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل دونوں کو بنایا گیا تھا اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ (البقرہ۔ ۱۲۵)

"پاک صاف رکھنے" سے مقصد یہ تھا کہ ان ساری چیزوں سے پاک صاف رکھنا ہے جو اس گھر کے مقصد تعمیر کے منافی ہوں، عام اس سے کہ وہ گندگی اور نجاست ہو جس سے عبادت گزاروں کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو، یا ارباب لہو ولعب کے ہنگامے ہوں جن سے ان کی یکسوئی میں خلل واقع ہو یا اصنام و اوثان ہوں جو خدا کے گھر کو شرک و بت پرستی کا گڑھ بنا کے رکھ دیں ان ساری چیزوں سے اس گھر کو پاک رکھنے کی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل پہ ذمہ داری

(۱) تفسیر سرور عالم ج ۲ ص ۵۷

ڈال دی گئی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اس ذمہ داری کا حق ادا کیا۔" (۲۲)

"پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اسے پاک رکھا جائے۔ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانۂ خدا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک، معبود، حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا اس نے حقیقت میں اسے گندا کر دیا۔" (۲۳)

صفات

حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نمایاں ترین صفت حلم تھی۔ یہ صفت صرف حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابراہیم کے لیے دو جگہ، سورۂ توبہ آیت ۱۱۴ اور سورۂ ہود آیت ۷۵ میں اور حضرت اسمٰعیل کے لیے سورۂ الصٰفٰت آیت ۱۰۱ میں۔ ان کے حلم کا سب سے بڑا مظاہرہ ان کی اپنی قربانی کے واقعے میں ہوا۔ ان کی دوسری صفت صبر تھی۔ (الانبیاء - ۸۵) واقعۂ قربانی میں اس صفت کا بھی شاہد عدل ہے۔ اقبال نے کہا ہے۔ سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی۔ میرے نزدیک اس سے بڑا اور اہم سوال یہ ہے کہ ان کو آداب بندگی کس نے سکھائے تھے۔ انھیں کس نے بتایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو خواب دیکھا وہ امر الٰہی تھا اور پھر اس امر الٰہی کے آگے انھوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ	ابا جان! آپ کو جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اسے
سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ	کر ڈالیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں
الصَّابِرِينَ (الصٰفٰت - ۱۰۲)	میں سے پائیں گے۔

یہ جواب حلم، علم اور صبر تینوں ہی صفات کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ حضرت ابراہیم کا اپنے اس بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو جانا جو ان کی دعا کا پھل، ان کی تمناؤں کا منظر اور ان کا عصائے پیری تھا۔ بلا شبہ ان کے حلم، ان کے صبر، ان کے اسلام اور ان کی محبت الٰہی کی نادر الوجود مثال ہے لیکن حضرت اسمٰعیل کا بلا تامل ذبح ہو جانے پر تیار ہو جانا کیا کم نادر الوجود ہے؟ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے دونوں کے اسلام کا ایک ہی صیغے میں ذکر کیا ہے۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ	آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور

(۲۲) تدبر قرآن ج ۱ ص ۲۸۸ (۲۳) تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۱۱

لِلْجَبِیْنِ ۝ (ایضاً ۱۰۳)　　ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا۔

یہ واقعہ اور اس کی تفصیل ہر سال ذی الحجہ میں ہمارے سامنے آتی رہتی ہے اس لیے میں نے یہاں تفصیل ترک کر دی ہے۔

قرآن میں خاص اہتمام سے ان کا ذکر

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ (یاد کرو کتاب میں) کے فقرے سے سورۂ مریم میں جن انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر ہے ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی ہیں۔

اور کتاب میں اسمٰعیل کی سرگذشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ وعدے کا سچا اور رسول اور نبی تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ (۵۵-۵۴)

حضرت اسحاق علیہ السلام کو قرآن میں صرف نبی کہا گیا ہے اور حضرت اسمٰعیل کو رسول اور نبی کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو نبوت کے ساتھ رسالت بھی ملی تھی۔ ان کو رسالت کب ملی تھی اس کی صراحت کہیں نہیں ہے جبکہ حاضر کے بعض محققین نے یہ قیاس کیا ہے کہ تعمیر کعبہ کے بعد ان کو منصب نبوت و رسالت پر سرفراز کیا گیا ہوگا۔ اوپر آیت ۵۴ میں ان کی جو صفت بیان کی گئی ہے وہ "صادق الوعد" کی ہے یعنی وہ وعدے کے سچے اور پکے تھے۔ وعدے کی سچائی کا سب سے بڑا مظاہرہ واقعۂ قربانی میں ہوا۔ اپنے والد سے جو وعدہ انھوں نے کیا اس کو پورا کرنے میں ذرہ برابر جھجک انھوں نے نہیں دکھائی اور بے جھجک چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ دی۔ صادق الوعد کی تشریح مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ کی ہے۔

یہ یاد رکھیے کہ صادق الوعد بظاہر مرکب تو صرف دو لفظوں سے ہے لیکن یہ مومن و مسلم کے کردار کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اللہ کا جو بندہ اپنے رب سے کیے ہوئے عہد میں راست باز ہے اور اس کی خاطر اپنی گردن کٹوا سکتا ہے۔ اس نے ایمان و اسلام کی معراج حاصل کر لی۔ رہے وہ لوگ جو ابراہیم و اسمٰعیل کے نام پر محض نسب فروشی اور نام نہاد تفاخر کر رہے تھے ان کے سامنے قرآن نے آئینہ رکھ دیا ہے کہ وہ اس میں اپنی سیاہ روئی کا مشاہدہ کر لیں۔ (۲۴)

اوپر آیت ۵۵ میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور دوسری یہ کہ وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ پہلی بات کے سلسلے میں حضرت اسمٰعیل کا خاص مشن کے ذیلی عنوان سے مولانا اصلاحی نے لکھا ہے:-

---

(۲۴) تدبر قرآن ج ۴ ص ۱۲۱

نماز اور زکوٰۃ جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں تمام حقوق اللہ اور تمام حقوق العباد کی ایک جامع تعبیر ہے۔ ان ہی دو چیزوں پر تمام شرائع کی بنیاد ہے جس نے ان کا اہتمام کیا اس نے تمام دین و شریعت کو قائم کیا اور جس نے ان کو ہدم کیا اس نے پورے دین کو ہدم کیا (۲۵)

دوسری بات کے سلسلے میں "خدا کا کامل العیار بندہ" کے ذیلی عنوان سے وہ لکھتے ہیں:۔

وکان عند ربہ مرضیًا ایک جامع تعریف ہے کہ اس کے بعد اس پر ایک حرف کے اضافے کی بھی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نگاہوں میں بالکل ٹھیک ٹھیک ویسے ہی تھے جیسا وہ اپنے بندے کے لیے چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ تو جس کے لیے خود پروردگار یہ شہادت دے کہ وہ اس کی پسند کے معیار پر پورا اترا اس سے بڑھ کر کامل العیار اور کون ہو سکتا ہے۔ (۲۶)

توراۃ سے پہلے صحف ابراہیم کی شریعت نافذ رہی

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہونے والے صحیفوں میں جو شریعت تھی حضرت اسمٰعیل السلام اسی شریعت کے حامل اور اسی پر عامل تھے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحف موسیٰ یعنی توراۃ سے پہلے تک خاندان ابراہیمی کی دونوں شاخیں ۔۔ اسمٰعیلی و اسرائیلی ۔ اسی شریعت پر عامل تھیں جو صحف ابراہیم میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ صحف ابراہیم اور توراۃ کے درمیان کسی صحیفہ کے نازل ہونے کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن میں دو مقامات میں صحف ابراہیم کا ذکر ہے اور دونوں ہی جگہ صحف موسیٰ کے ساتھ ہے۔ سورۃ النجم کی آیات ۳۶۔ ۳۷ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔"

اور سورۃ الاعلیٰ کی دو آخری آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:۔

"یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی۔ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔"

سورۃ النجم میں دونوں کے ذکر کے بعد ان کی تعلیمات کا ایک خلاصہ بیان کیا گیا ہے اور سورۃ الاعلیٰ میں پہلے کچھ تعلیمات بیان کرنے کے بعد ان دونوں پیغمبروں کے صحیفوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔۔ تیسری دلیل سورۃ یوسف میں

(۲۵) ایضاً (۲۶) ایضاً

ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی ابن یمین پر جب چوری کا الزام لگا اور حضرت یوسف کے کارندوں نے ان کے بھائیوں سے اس کی سزا دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا تھا۔

انھوں نے کہا اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے ہمارے یہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے۔ (آیت-۷۵)

"ہمارے یہاں" اس سے مراد خاندان ابراہیمی ہے۔ اس آیت کے تحت مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے:۔

وھکذا کانت شریعۃ ابراھیم علیہ السلام ان السارق یدفع الی المسروق منہ (۲۷)	اور اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی شریعت تھی کہ چور اس شخص کے حوالہ کر دیا جاتا تھا جس کی اس نے چوری کی ہو۔

تفہیم القرآن میں ہے:۔

خیال رہے کہ یہ بھائی خاندان ابراہیمی کے افراد تھے لہذا انھوں نے چوری کے معاملے میں جو قانون بیان کیا وہ شریعت ابراہیمی کا قانون تھا یعنی یہ کہ چور اس شخص کی غلامی میں دے دیا جائے جس کا مال اس نے چرایا ہو۔ (۲۸)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ نے اپنے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:۔

"یہ شریعت ابراہیمی میں چور کی سزا تھی یعنی جس کے پاس سے چوری نکلے وہ ایک سال تک غلام ہو کر رہے"(۲۹)

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک مصر میں حضرت یوسف کی یاد باقی تھی اور ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں اس وقت تک وہی شریعت نافذ رہی ہوگی جس پر حضرت یوسف عامل رہے ہوں گے اور وہ شریعت ابراہیمی کے سوا کوئی دوسری شریعت نہیں ہو سکتی۔ فرعون کے دربار میں رجل مومن کی جو تقریر ہے اس میں انھوں نے کہا ہے۔

"اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بشارت لیکر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا اب ان کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا۔ (آیت-۳۴)

اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک مصر میں حضرت یوسف ہی نہیں بلکہ ان کی تعلیمات کا تذکرہ بھی مصر میں

(۲۷) مختصر تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۵۷۔ (۲۸) تفہیم القرآن ج ۲ ص ۴۰۴۔ (۲۹) حاشیہ عثمانی

موجود تھا جہاں تک بنی اسمٰعیل کا تعلق ہے تو حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک کوئی نبی ان میں مبعوث ہی نہیں ہوا اس لیے وہ اسی شریعت کے مکلف تھے جو انہیں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام سے ملی تھی۔

وہ کثیرالاولاد تھے

تورات میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنی چاہی تو فرشتے نے ندا دی کہ ہاتھ روک لو اور یہ الفاظ کہے:۔

خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا۔ میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریت کی طرح پھیلا دوں گا (۳۰)

یہ نسل میں برکت اس طرح اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی کہ حضرت اسمٰعیل کو بارہ بیٹے عطا کیے۔ بیٹیاں کتنی تھیں۔ یہ نہیں معلوم۔ مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:۔

عرب کے علماء انساب اور بائیبل کا متفقہ بیان ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے کہ جب مکہ پر بنو جرہم کا قبضہ ہو گیا تو اولاد اسمٰعیل کا بہت تھوڑا حصہ اس شہر میں بسا رہ گیا باقی سب عرب کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ تاریخ اس باب میں خاموش ہے کہ ان بارہ بیٹوں کی اولاد کہاں کہاں گئی اور کون کون سے قبائل ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔ (۳۱)

کار نبوت و رسالت

چونکہ کعبہ کو یہ عالمگیر دعوت اسلامی کا مرکز ہے اس لیے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا دائرہ محدود نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد رسالت ہی میں کعبہ پورے عرب کا مرکز بن گیا تھا۔ عرب کے اطراف و جوانب سے لوگ حج کے لیے کعبہ ہی آتے تھے۔ بنی جرہم ان کی کار نبوت و رسالت کا ایک خاص قبیلہ تھا۔ اسی قبیلے میں وہ پلے بڑھے تھے اور اسی قبیلے کے ایک سردار کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ انکی اولاد کی تعداد کم تھی اس لیے انکے بڑے بیٹے کی نیابت وفات کے بعد بنی جرہم ہی کعبہ کی تولیت پر قابض ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں کا امام بنایا تھا۔ انھوں نے اپنی ذریت کے لیے بھی اس کی درخواست کی تھی۔ اس کے جواب میں کہا گیا تھا "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے" (البقرہ: ۱۲۴) حضرت اسمٰعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت عطا فرمائی

(۳۰) سیرۃ النبی ج ۱ بحوالہ تورات تکوین اصحاح ۲۲، آیت ۵۵۔ (۳۱) تفسیر سرور عالم حصہ دوم ص ۴۰

اور ان کی نسل میں آخری نبی و رسول کے سوا کوئی نبی نہیں آیا اس لیے آخری نبی کی بعثت تک وہی "امام الناس" تھے۔ یہ منصب بنی اسرائیل کو بھی حاصل ہوا تھا لیکن ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے یہ منصب ان سے چھین لیا گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد باضابطہ طور پر یہ منصب

بنی اسرائیل سے چھین کر امت مسلمہ کے حوالے کر دیا گیا اور اس وقت بنی اسمٰعیل ہی کی تعداد زیادہ تھی۔
اگرچہ حضرت اسمٰعیل کی کار رسالت کی تفصیل تاریخوں میں نہیں ملتی۔ لیکن اس کا اندازہ ان اثرات سے کیا جا سکتا ہے جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت تک موجود تھے۔ اس سلسلے میں سورۂ ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی سامنے رکھنی چاہیے۔

اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو ایک بن کھیتی کی زمین میں بسایا ہے۔ اے ہمارے رب میں نے اس لیے بسایا ہے کہ یہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تا کہ یہ تیرا شکر ادا کریں۔ (ابراہیم ۳۷)

اس آیت میں درحقیقت حضرت اسمٰعیل کی پوری دعوت آگئی ہے۔ اس آیت میں فارزقهم من الثمرات کا جو فقرہ ہے اس کے بارے میں حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے :۔

ای لیکون ذالک عونا لهم علی طاعتک تاکہ یہ تیری اطاعت پر ان کا مددگار رہو۔

مکہ چونکہ وادی غیر ذی زرع تھا اس لیے ضروری تھا کہ مکہ والوں کو رزق کی طرف سے اطمینان دلایا جائے۔

اثرات: تمام پوری تاریخ انبیاء میں ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی (جبکہ ان کے اندر کوئی نبی نہ آیا تھا) ان کے عقائد و اعمال کے اتنے اثرات باقی نہیں رہے جتنے حضرت اسمٰعیل کے اثرات باقی تھے۔
ڈھائی ہزار برس کے بعد آخری نبی کی بعثت بنی اسمٰعیل میں ہوئی۔ اس وقت تک ابراہیمی و اسماعیلی دعوت اور ان کے اعمال حسنہ کے اثرات باقی تھے جن میں مشرکین عرب نے طرح طرح کی خرابیاں پیدا کر دی تھیں۔ علما نے اس پر کتابیں لکھی ہیں کہ وہ کیا چیزیں تھیں جن میں اصلاح کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں باقی رکھا۔ میں یہاں چند اثرات کا ذکر کرتا ہوں۔ سب سے پہلے عقاید۔
اللہ کا عقیدہ نہ صرف یہ کہ مشرکین عرب میں موجود تھا بلکہ وہ اللہ کے بارے میں وہ کچھ مانتے تھے کہ آج بہت سے مسلمان بھی اس سے نا آشنا ہیں۔ مشرکین کی خرابی یہ تھی کہ انھوں نے اللہ کی ذات، صفات اور حقوق میں طرح طرح

کے شرک کی آمیزش کر ڈالی تھی۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت بھی وہ اللہ کے خالق، مالک الکل، پانی برسانے والا غلہ اگانے والا اور مدبر کائنات مانتے تھے اور آج حال یہ ہے کہ تدبیر کائنات کا بہت سے کام مسلمانوں نے قطب الاقطاب اور قیوم زماں کے حوالے کر دیے ہیں۔ اللہ کے بارے میں مشرکین کے کچھ عقائد جگہ جگہ قرآن کریم میں بیان کیے گئے ہیں اور بطور الزام ان پر یہ حجت قائم کی گئی ہے کہ جب یہ سب کچھ مانتے ہو تو پھر دوسروں کو اللہ کی عبادت و اطاعت میں شریک کیوں ٹھہراتے ہو۔ میں یہاں چند آیتوں کے ترجمے پیش کرتا ہوں۔ سورۂ البقرہ میں جہاں تمام انسانوں کو بندگیِ رب کی دعوت دی گئی ہے۔ کہا گیا ہے:۔

لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے۔ تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی اور اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھہراؤ۔ (البقرہ۔ ۲۲)

اس آیت کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے

یہ دلیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ تم خدا کا کوئی ہمسر نہ ٹھہراؤ درآں حالیکہ تم جانتے ہو۔ "تم جانتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کو مانتے ہو کہ زمین کا اس صورت میں پیدا ہونا اور آسمان کا اس شکل میں وجود میں آنا خدا ہی کی قدرت سے ہوا ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور نے نہیں بنایا ہے۔ اس اقرار کے بعد آسمان و زمین کے انتظام میں کسی کو خدا کا شریک ماننا ایک ایسی بے جوڑ بات ہے جو بالکل واضح ہے۔ قرآن نے یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے[۳۲]

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:۔

یعنی جب تم خود بھی اس بات کے قائل ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں تو پھر تمہاری بندگی صرف اسی کے لیے خاص ہونی چاہیے۔ دوسرا کون اس کا حق دار ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجالاؤ؟ دوسروں کو اللہ کا مدمقابل ٹھہرانے سے مراد یہ ہے کہ بندگی و عبادت کی مختلف اقسام میں سے کسی قسم کا رویہ خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ برتا جائے۔ (۳۳)

(۳۲) تدبر قرآن ج ۱ (۳۳) تفہیم القرآن ج ۱

سورۂ یونس کی ایک آیت کا ترجمہ بھی پڑھیے۔

ان سے پوچھو کون تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے۔ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور کون جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے۔ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ (یونس-۳۱)

یہاں اس قسم کی تمام آیتوں کا استقصا مقصود نہیں۔ ان شاء اللہ چوتھے دور میں کچھ زیادہ تفصیل پیش کی جائے گی۔ میں نے "زندگی" میں "جاہلیت کے عقیدے" کے عنوان سے جولائی ۶۵ء کے شمارے میں ایک مقالہ بھی شائع کیا تھا۔

مشرکین عرب کے اعمال

مشرکین عرب نے شرک کے اثر سے اپنے اعمال میں بھی بہت سی خرابیاں پیدا کر لی تھیں۔ یہاں تک کہ شرم و حیا کے لحاظ سے جو انسان کا امتیاز ہے وہ بہت نیچے گر گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ابراہیمی شریعت کے بہت سے احکام توارثاً چلے آرہے تھے۔ میں یہاں چند کا ذکر کروں گا۔ پہلے "سرور عالم" جلد دوم کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں جو موضوع سے متعلق ہے:-

اگرچہ تاریخ میں حضرت اسمٰعیل کی زندگی کے حالات اور ان کے رسالت کے کام کی کچھ تفصیلات نہیں ملتیں لیکن ان کی رسالت کے کامیاب ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کو تمام عرب میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ حج اور عمرے کے لیے تمام اطراف و نواحی سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے رہے مناسک حج تقریباً وہی رہے جو ابتدا میں مقرر کیے گئے تھے صفا اور مروہ کی سعی اور ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانی کا طریقہ بھی عربوں میں رائج رہا جو بلاشبہ حضرت ہاجرہ کی سعی اور حضرت ابراہیم کی قربانی کی یادگار تھا۔ حج اور عمرے کی خاطر چار مہینوں کی حرمت بھی تمام اہل عرب میں مسلّم رہی اور دین ابراہیمی کے دوسرے بہت سے شعائر بھی عربوں میں مروج رہے مثلاً ختنہ، غسل جنابت، جانوروں کو ذبح کرنے اور اونٹوں کو نحر کرنے کا طریقہ، مردوں کو دفن کرنا، نکاح اور طلاق اور احداد (بیوہ کے سوگ) کے قاعدے، بیٹیوں، ماؤں اور بہنوں کو حرام سمجھنا، قصاص اور دیت اور قسامت کے احکام وغیرہ۔ اس کے علاوہ بعض پڑھے لکھے عرب وضو بھی کرتے تھے۔ بعض نماز بھی پڑھتے تھے جیسے قس بن ساعدۃ الایادی۔ حضرت ابوذرؓ بھی اسلام قبول کرنے سے تین سال پہلے ہی نماز پڑھتے تھے۔ اگرچہ معلوم

نہیں کہ وہ کس قسم کی نماز تھی۔ اس کے علاوہ عربوں میں روزہ کا بھی ایک طریقہ رائج تھا، وہ اعتکاف بھی کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جاہلیت میں ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی۔ بہت سی چیزوں کو اہل عرب نیکی کا کام سمجھتے اور ان کی مدح کرتے تھے، مثلاً مہمان اور مسافر کی ضیافت، مساکین کی مدد کرنا اور صلہ رحمی کرنا۔ اگر حضرت اسمٰعیلؑ کی رسالت کو عرب میں غیر معمولی کامیابی حاصل نہ ہوئی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ڈھائی ہزار برس جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبے رہنے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک ان کے پھیلائے ہوئے دین کے آثار باقی اور تمام عرب میں جاری ساری رہتے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی اور ان سے متاثر ہونے والوں کی تبلیغ ہی کا یہ اثر تھا کہ اہل عرب میں حضورؐ کی بعثت کے زمانے تک اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ تصورات پائے جاتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا کیا گیا ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔ زخرف آیت ۸۷، سورۂ عنکبوت آیات ۶۱ تا ۶۳۔ سورۂ مومنون آیات ۸۱ تا ۹۳۔ سورۂ یونس آیات ۲۲۔۲۳۔۳۱۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۶۷ (۳۴)

مولانا مودودیؒ نے اختصار کے ساتھ یہاں جو چیزیں لکھ دی ہیں وہ قرآن کی آیات، احادیث نبوی، سیر، سوانح اور تاریخ کی کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر چیز کے لیے عبارتیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں اس موضوع کو بیان طویل کرنا نہیں چاہتا۔ صرف تفسیر مظہری کی ایک عبارت کا ترجمہ پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنی کن اولادوں کو وصیت کی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے آٹھ بیٹوں — اسمٰعیل اور ان کی ماں ہاجرہ قبطیہ اور اسحاق اور ان کی ماں سارہ اور اپنے چھ بیٹوں کو جن کی ماں قنطورا بنت یقطن الکنعانیہ تھیں (اور جن سے انھوں نے حضرت سارہ کی وفات کے بعد نکاح کیا تھا) وصیت کی تھی اور یعقوب نے اپنے بارہ بیٹوں کو وصیت کی تھی۔ (۳۵)

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تیسرا نکاح حضرت سارہ کی وفات کے بعد قنطورا یا قنطورا سے کیا تھا تو آخری وصیت کے وقت حضرت سارہ کی موجودگی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ میں نے تفسیر مظہری سے یہ روایت صرف اس لیے لی ہے کہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کی کچھ تفصیل موجود ہے۔

(۳۴) سرور عالم ج ۲ ص ۷۰ (۳۵) تفسیر مظہری ج ۱ ص ۱۳۴

مختصر رُوداد سالانہ اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ

جماعت اسلامی ہند

الحمد للہ کہ مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا سالانہ اجلاس ۵ مئی ۱۹۸۵ء کی شام کو انعقاد پذیر ہوا۔ جماعت کی کارکردگی کی سالانہ رپورٹ پیش کی گئی۔ کچھ ضروری امور و مسائل زیر غور آئے اور مناسب فیصلے کیے گئے۔

مرکزی بیت المال کا گوشوارہ آمد و صرف مع آڈٹ رپورٹ پیش کیا گیا۔ ارکان شوریٰ نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے بعض ضروری مشورے بھی دیے

یکم اپریل ۱۹۸۵ء تا ۳۱ مارچ ۸۶ء کا بجٹ منظور کیا گیا۔ متوقع سالانہ آمدنی -/9,57,960 متوقع مصارف -/12,42,000۔ اس طرح -/2,87,040 کا متوقع خسارہ ہے۔ جو متوسلین جماعت کی اعانتوں اور قرض لیکر پورا کیا جائے گا۔

حالات حاضرہ پر تفصیل سے غور ہوا۔ مطلقہ کے نان و نفقہ سے متعلق سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ قرآن مجید کو غیر قانونی قرار دینے کیلیے کلکتہ ہائی کورٹ میں دائر کردہ مقدمہ گجرات کے بھیانک اور مسلسل چلنے والے فسادات، سری لنکا کی سنگین صورت حال پر ارکان مجلس کے شدید تاثرات سامنے آئے اور متعلقہ قراردادیں منظور کی گئیں۔

یہ اجلاس محترم امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ درج ذیل ارکان مجلس شوریٰ شریک اجلاس ہوئے۔

۱۔ جناب سید رشید عثمانی صاحب مہاراشٹر	(۲) جناب عبدالفلاح صاحب اڑیسہ
۳۔ " عبدالعزیز صاحب آندھرا	(۴) " ڈاکٹر احمد سجاد صاحب رانچی

۵۔ مولانا سید احمد عروج قادری زندگی نو (۶) ر اعجاز احمد اسلم صاحب مدراس
۷۔ جناب ٹی کے عبداللہ صاحب کیرلہ (۸) ر کے سی عبداللہ صاحب کیرلہ
(۹) ر انعام الرحمن خاں صاحب ایم پی (۱۰) ر سید حامد حسین صاحب یوپی
(۱۱) ر سید یوسف صاحب مرکز (۱۲) ر محمد سراج الحسن صاحب مرکز
(۱۳) ر محمد شفیع مونس صاحب ر (۱۴) ر افضل حسین قیم صاحب

والسلام افضل حسین قیم جماعت

۱۔ مطلقہ عورت کے نان ونفقہ سے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند نے اپنے سالانہ اجلاس میں مطلقہ عورت کے نان ونفقہ سے متعلق سپریم کورٹ کے فیصلہ مورخہ ۲۳ راپریل ۱۹۸۵ء پر اپنی گہری تشویش اور سخت اضطراب کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کے قول وفعل کے اس تضاد کا کھلا نتیجہ ہے جو مسلم پرسنل لا کے معاملہ میں اس نے اختیار کر رکھا ہے۔

۱۹۷۳ء میں جب ضابطہ فوجداری کی تدوین جدید ہو رہی تھی تو اسی وقت مسلم رہنماؤں نے حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کیا تھا کہ اس کی دفعہ ۱۲۵ سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے کیونکہ مطلقہ عورت کو عقد ثانی تک سابقہ شوہر کی بیوی ماننا مسلمانوں کے قانون نکاح وطلاق میں صریح مداخلت کے مترادف ہے اور آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی نے اس مطالبہ سے اتفاق کیا تھا۔ چنانچہ وزارت داخلہ میں اس وقت کے وزیر مملکت مسٹر رام نواس مردھا نے راجیہ سبھا میں واضح طور پر یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ حکومت ضابطہ فوجداری کے ذریعہ مسلمانوں [illegible] میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی مگر سپریم کورٹ کے فاضل جج صاحبان نے اب یہ کہا ہے کہ حکومت ہند کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ مہر کی رقم طلاق [illegible] پر واجب الادا ہوتی ہے جب کہ ان کے خیال کے مطابق یہ درست نہیں ہے۔ اس طرح گویا ضابطہ فوجداری کی [illegible] (۳) (ب) اب عملاً غیر مؤثر ہو کر رہ گئی ہے۔ اپنے تازہ فیصلہ میں سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے (اپنے خیال کے مطابق) [illegible] کی ایک غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ اصلاح کی ہے کہ مذکورہ مقدمہ میں ضابطہ فوجداری کی متذکرہ دفعہ کا جو تعلق مہر سے جوڑا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ان مباحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت ہند اگر روز اول ہی

ضابطہ فوجداری کی دفعات ۱۲۵، ۱۲۷ سے مسلمانوں کو صریح طور سے مستثنیٰ قرار دیتی تو فاضل جج صاحبان کو بائی طاہرہ یا فضلن بی یا محمد احمد خاں مقدمات کے ذریعہ مسلمانوں کے شرعی قوانین کو اس طرح عملاً بے وقعت بھرانے کا موقع نہ ملتا۔

مرکزی مجلس شوریٰ نے حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنی یقین دہانیوں کو روبہ عمل لائے اور ضابطۂ فوجداری کی مذکورہ دفعات میں فی الفور مناسب ترمیم کر کے مسلمانوں کو ان سے مستثنیٰ کر دے۔ اب ضرورت بھی نمایاں تر ہو گئی ہے کہ آئین کے رہنما اصولوں کے باب میں درج دفعہ ۴۴ کے تعلق سے بھی کوئی واضح اور دوٹوک فیصلہ کیا جائے تاکہ اس کی آڑ میں مسلم پرسنل لا کے خلاف چلائی جانے والی مہم کا سدباب ہو سکے۔

مقدمہ محمد احمد خاں بنام شاہ بانو بیگم کا فیصلہ سناتے ہوئے آئینی بنچ نے جس انداز میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی مداخلت پر نکتہ چینی کی ہے اس سے کوئی اچھا تاثر بہرحال قائم نہیں ہوتا۔ عدالت نے آئین کی دفعہ ۴۴ کے تحت عملی اقدام کے لیے حکومت کو ابھارا ہے تاکہ (اس کے اپنے خیال کے مطابق) مختلف نظریات کے حامل قوانین سے باشندگان ملک کی وفاداریوں کو مٹایا جا سکے اور قومی یکجہتی سہل الحصول ہو جائے۔ مگر تھوڑے غور و فکر کے بعد یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ یہ طرز فکر نہایت خطرناک رجحانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ سپریم کورٹ ہی کے دو فاضل جج صاحبان (جسٹس مرتضیٰ فضل علی اور جسٹس اے ورداراجن) نے ۳ فروری ۸۱ء کو جس غرض سے یہ مقدمہ ایک وسیع تر بنچ کے حوالے کیا تھا وہ یہ تھی کہ مقدمہ بائی طاہرہ اور فضلن بی کے فیصلے انہیں پرسنل لا کے بنیادی تصور طلاق کے منافی اور ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۲۷ (۳) (ب) کے سیدھے سادے مفہوم کے خلاف معلوم ہوئے۔ اس بنا پر ان کا خیال تھا کہ ان کے دور رس اثرات پر مبنی سوالات کا پورا پورا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ مگر اپنے حالیہ فیصلہ میں فاضل جج صاحبان نے قرآن و حدیث کے اور بعض قانون دانوں کی رائیوں کے جس انداز سے حوالے دیے ہیں ان سے ایسا لگتا ہے کہ حق و انصاف کے تقاضوں کی تکمیل کے بجائے انھیں کچھ من پسند تاویلات کے ذریعے ذاتی رجحانات کی توثیق کی زیادہ فکر رہی ہے۔ مہر کی تعریف متعین کرنے میں جہاں ملا اور ڈاکٹر پارس دیوان کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے اور کسی نہ کسی طرح ایک خاص مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہیں ان دونوں صاحبان کی اور طیب جی کی ان تحریروں کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا کہ عدت کی تکمیل پر نان و نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر سے پوری طرح ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں محمد احمد خاں کی طرف سے قانون شرعی کی محافظت کرنے والوں پر سخت تنقید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ ایک غیر ضروری جوش و جذبہ کا مظاہرہ ہے وہیں شاہ بانو کی تائید کرنے والی ایک تنظیم کی ستائش کی

گئی ہے۔ بار بار ڈاکٹر طاہر محمود کے حوالے دیے گئے ہیں کہ کس طرح موصوف نے مسلم پرسنل لا کو ختم کرکے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ حکومت پر کسی وکیل کے حوالے سے یہ طنز بھی کیا گیا ہے کہ اس کے پاس قانون کی قوت ضرور ہے مگر سیاسی جرأت کہاں ہے؟ یہ فقرے اس بات کے غماز ہیں کہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی عدالت کی پروقار آئینی بنچ کے فاضل جج صاحبان سے شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ معیارات نظر انداز ہو گئے ہیں جنھیں ایک آزاد غیر جانبدار اور حق و انصاف کے معاملہ میں حقیقی معنوں میں حساس عدلیہ کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں اگر کچھ لوگوں کے ذہنوں میں یہ وسوسہ پیدا ہوا ہے کہ ہماری عدلیہ خدانخواستہ کہیں پابند عدلیہ کی راہ پر نہ چل پڑے تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے

مجلس شوریٰ نے ملکی عدالتوں کے فاضل حکام سے بجا طور پر اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ وہ ذاتی رجحانات اور میلانات سے بلند تر ہو کر مختلف تہذیبوں کے حامل اپنے ملک کے باشندوں اور مختلف طبقات کے معاملہ میں ان کے رسم و رواج اور شخصی قوانین کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے مبنی بر انصاف فیصلے کریں گے۔

جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے مسلمانانِ ہند کو توجہ دلائی ہے کہ وہ قوانین شرعی کی صحیح معنوں میں پابندی کریں اور یہ یاد دلایا ہے کہ اس معاملہ میں کوتاہی دنیا و آخرت دونوں جگہ خسارہ کا باعث بن سکتی ہے۔ اس میں مزید کوتاہی سے اغیار کو خدا اور رسول کی باتوں کا مذاق اڑانے کا موقع ملتا ہے۔ اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ شرعی پنچایتوں اور نظام قضاۃ کے ذریعے اختلافات و نزاعات کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔

مرکزی مجلس شوریٰ نے مسلم پرسنل لا بورڈ سے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ وہ مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر ان بے انصافیوں کے خاتمہ کے لیے پرامن منظم اور نتیجہ خیز جدوجہد کی رہنمائی کرے گا جن کا ملت اسلامیہ ہند کو سامنا ہے

گجرات کے بھیانک فسادات

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے سالانہ اجلاس میں گجرات کے بھیانک اور قابل مذمت فسادات اور کثیر جانی و مالی نقصانات پر سخت رنج و افسوس اور گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ شہدا کے لیے دعائے مغفرت اور ہلاک شدگان کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے انھیں صبر و تحمل اور ہمت و استقلال کی تلقین کی ہے۔ حکومت گجرات امن و انتظام کو قائم اور عدل و انصاف کے معاملہ میں ناکام رہی ہے

مالی نقصان ہندمیں پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اس کی ذمہ داری یاد دلائی ہے اور اس سے کہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ مجرموں کو ان کے اثر ورسوخ کا کوئی لحاظ کیے بغیر سزا دی جائے اور متاثرہ لوگوں کو ان کے جانی ومالی نقصان کا معاوضہ ادا کیا جائے۔

مجلس شوریٰ نے ان خبروں پر خصوصیت سے انتہائی تشویش کیا ہے کہ امن وانتظام کی ذمہ دار پولیس نے نہ صرف اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کی ہے بلکہ کھلا جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کا یہ رویہ "زبردست مارے اور رونے نہ دے" کی مثل کا مصداق ہو گیا ہے۔

مجلس شوریٰ نے ان اطلاعات پر سخت حیرت اور رنج ظاہر کیا ہے کہ تعلیم گاہوں اور ملازمت کے سلسلے میں ریزرویشن کی پالیسی گھٹیا مفادات کی حصول کی آئینہ دار ہے۔ یہ سراسر غیر عادلانہ اور پالیسی ہے کہ معاشی پس ماندگی کے بجائے ذاتوں، برادریوں کو ریزرویشن کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے رائے کمیشن کی سفارشوں کو بھی قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ الیکشن کے موقع پر اضافہ اعلانات سے اگرچہ حکمراں جماعت کو فائدہ ہوا لیکن اس سے اونچی ذات کے طلبہ برافروختہ اور آمادہ فساد اور اب یہ بات بھی کھل کر سامنے آنے لگی ہے کہ فسادات کو جان بوجھ کر سیاسی مفادات کے لیے فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا ہے۔

مجلس شوریٰ کے نزدیک یہ ایک سخت ظالمانہ اور ناعاقبت اندیشانہ رویہ ہے خواہ اس کی ذمہ داری حکمراں جماعت یا اس کا کوئی گروپ ہو یا وزیر اعظم کے مطابق اس کی ذمہ داری اپوزیشن پر عائد ہو۔

مجلس شوریٰ نے ملک کے عوام اور ذمہ دار جماعتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ امن وامان کی بحالی اور فضا کو خوشگوار بنانے کی مل جل کر فوری اور بھرپور کوشش کریں اور اسی کے ساتھ فراخ دستی سے کام لے کر ستم رسیدہ بھائیوں کے زخموں پر پھایا رکھیں اور بھرپور مالی تعاون کرکے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے انھیں جان ومال کے نقصانات سے محفوظ رکھا۔

سری لنکا کی سنگین صورت حال

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ نے سری لنکا کی اس سنگین صورت حال پر تشویش ظاہر کی ہے جو اس ملک کے باشندوں کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے

وہاں کی حکومت اور تمل باشندوں کے درمیان مسلح تصادم کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ امن و امان درہم برہم ہے۔ قیمتی جانیں آئے دن ضائع ہو رہی ہیں اور تمل باشندوں کی ایک خاصی بڑی تعداد اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان آچکی ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے ملک اور سری لنکا دونوں پڑوسیوں کے باہمی تعلقات متاثر ہو رہے ہیں۔

مرکزی مجلس شوریٰ نے ان واقعات پر مزید تشویش کا اظہار کیا ہے جو حال ہی میں علیحدگی پسند تمل باشندہ اور تمل بولنے والی مسلم آبادی کے درمیان پیش آئے ہیں اور جن کی وجہ سے مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہوتا نظر آرہا ہے۔ مجلس شوریٰ کے نزدیک اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ساری مخلوق خدائے واحد کا کنبہ ہے اور اولادِ آدم ہونے کی حیثیت سے سارے انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس بنا پر نہایت ضروری ہے کہ اس کے مابین محبت اور ایک دوسرے کا احترام ہو اور مل جل کر رہیں۔ دانشمندانہ رواداری اور مخلصانہ تعاون کے ساتھ زندگی گذاریں۔

مجلس شوریٰ نے کہا ہے کہ دوسرے ممالک کی طرح سری لنکا کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کی بھی بہترین راہ یہی ہے کہ وہاں کے باشندے اپنے ملک کی سالمیت اور اتحاد کی قدر پہچانیں۔ امن و امان کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کریں اور اختلافات کو رفع اور مسائل کو حل کرنے کے لیے منصفانہ اصول اختیار کریں جو بحیثیت مجموعی سب کے لیے قابل قبول ہو۔ مجلس شوریٰ نے یہ توقع بھی ظاہر کی ہے کہ سری لنکا کی حکومت فریقین کے سامنے مصالحت کے لیے نئے اور قابل عمل نکات پیش کرے گی اور کرو انکسار اور دانشمندی سے کام لیکر فریقین مسئلہ کا حل تلاش کرلیں گے۔ حکومت ہند اور حکومت سری لنکا کے درمیان مذاکرات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ بھی آگے بڑھے گا اور حکمت و دانائی اور وسعت نظری سے کام لیکر مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اپنا گھر بار چھوڑ کر جو تمل باشندے ہندوستان آگئے ہیں • وہ عزت و وقار کے ساتھ اپنے وطن جلد واپس جاسکیں گے۔

اسلام کا نظامِ معاشرت

اعتدال اور توازن کا شاہکار

(آخری قسط)

(پروفیسر عمر حیات خان غوری)

اس کے علاوہ ایک دوسرے پہلو سے بھی معاملہ کو سمجھنا چاہیے اور یہاں سے بھی دیکھنا چاہیے کہ اس سے قدرت کا منشاء کیا ہے۔ قدرت نے عورت کے عضوِ تولید کے اندر ایک مزید عضو کا اضافہ کیا ہے جو کہ کسی جانور کی مادہ میں موجود نہیں ہے۔ یہ عضو ہے جسے پردۂ بکارت کہا جاتا ہے۔ عضوِ تناسل کے ابتدائی حصہ میں اس عضو کی موجودگی قدرت کا یہ اعلان معلوم ہوتا ہے کہ یہ حریمِ ناز کوئی دھرم شالہ اور سرائے نہیں ہے جس میں جو مسافر چاہے آ کر سکون حاصل کرے اور چلا جائے بلکہ اس کے برخلاف یہ ایک ایسا محفوظ کیا گیا گھر ہے جس کا دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے جب کوئی مرد نکاح کا پروانہ راہداری لیکر حاضر ہو۔ اور ایک بار یہاں سکون حاصل کرنے کے بعد اس کو نبھانے کا عہد کرے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے مطابق عورت کسی یتیم کا مال نہیں ہے کہ جو چاہے استعمال کرے اور جس طرح چاہے برباد کرے بلکہ یہ ایک ایسا مال ہے جو اسی کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے جو اس کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ بھی لیتا ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عورت کے جسم میں مزید ایک عضو کا اضافہ یہ بتلانے کے لیے کیا ہے کہ عورت کو عوامی ملکیت بننے یا کرائے پر چلائے جانے کے لیے نہیں بنایا گیا ہے بلکہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ اسے کسی ایک ہی مرد کے لیے مخصوص ہونا چاہیے اور جب تک کوئی ایسا مرد نہ مل سکے کسی دوسرے مرد کو اس میں ہاتھ لگانے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ اگر قدرت کا یہ منشا نہ ہوتا تو اس مزید عضو کے اضافہ کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

پھر بچے کو دیکھیے۔ پیدائش کے وقت وہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ مکھی بھگانے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ مہینوں بیٹھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ برسوں میں چلنا سیکھتا ہے۔ بولنا سیکھنے کے لیے مسلسل سکھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا بڑا ہوا تو تعلیم و تربیت کا محتاج ہوتا ہے غرض اس کی یہ محتاجی اس وقت تک ٹلتی رہتی ہے جب تک کہ وہ تعلیم و تربیت کا محتاج فراغت حاصل کر کے خود اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ بچہ کی یہ مجبوری اس کی پرورش کی یہ ضرورت مسلسل نگرانی اور تحفظ کی یہ محتاجی اور تعلیم و تربیت کی یہ ضرورت اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ انسانی نسل کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ نظام معاشرت میں شوہر و بیوی کے رشتہ کو ایسا استقلال حاصل رہے کہ یہ رشتہ تا دیر باقی و قائم رکھا جا سکے۔

اسلام اپنے نظام معاشرت کے تعین میں قدرت کے ان سارے اشاروں اور ان سے حاصل ہونے والی رہنمائی کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اس لیے وہ عورت کی عصمت و عفت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور ہر سطح پر اس کے تحفظ کا انتظام کرتا ہے۔ وہ عورت کو نکاح کے ذریعے ایک مرد کے لیے مخصوص کرتا ہے اور زندگی بھر اس رشتے کو نبھانے کا عہد بھی لیتا ہے تا کہ معاشرتی محل کی اینٹ کی یہ اکائیاں مضبوط اور مستحکم رشتے میں منسلک ہو کر ایک مضبوط اکائی بنا سکیں تا کہ ان اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت میں بھی استحکام قائم رہے اور اس کے زیر سایہ انسانیت کی نئی نسل پیدا ہوتی۔ پروان چڑھتی اور تعلیم و تربیت پاتی رہے اور معاشرتی عمارت کو تا دیر قائم رہنے کا موقع میسر آ سکے۔ اسلام قانون قدرت سے بغاوت نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے ہم آہنگ معاشرہ تشکیل کرتا ہے۔

خاندانی نظام کی تشکیل چونکہ اسلام کے ہاتھوں ہو رہی ہے جو اپنی فطرت میں نظم و تربیت اور ڈسپلن کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ جہاں بھی ایک سے دو انسان جمع ہوتے وہ فوراً ان کو ایک نظم میں مجتمع ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر دو شخص ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں تو انہیں بھی مشورہ دیتا ہے کہ اپنے میں سے کسی کو امیر مقرر کر لیں۔ ایسا اسلام خاندانی نظام میں اجتماعیت کو نظر انداز کیسے کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہاں بھی اجتماعیت پیدا کرنے کا حکم دیا ہے۔

اصولی طور پر تو اس کا حکم ہے

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں (البقرہ ۲۲۸)

لیکن اس کے باوجود اجتماعی ڈسپلن پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ شوہر اور بیوی میں سے کسی ایک کو

دوسرے پر فوقیت دی جاتی۔ چنانچہ اس مسئلے کے حل کرنے میں بھی اسلام نے بڑا حکیمانہ طریقہ کار اپنایا ہے جو کہ

(۱) عورت کا دائرہ عمل گھر کی چار دیواری تک محدود ہے جب کہ مرد کا دائرہ عمل ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے

(۲) عورت جسمانی طور پر مرد کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے اس کا امتیاز حسن اور نزاکت ہے جب کہ مرد کا طاقت و قوت، جرات و حوصلہ اور اعصاب کی مضبوطی ہے۔

(۳) عورت ذہنی نفسیاتی اور جسمانی اعتبار سے مرد سے کمتر ہوتی ہے

(۴) عورت پر جذبات کا غلبہ مرد کے مقابلہ میں جلدی ہوتا ہے اور اس کی عقل پر جذبہ بہت جلد غلبہ پا لیتا ہے۔

(۵) عورت جسمی عوارض کی وجہ سے اکثر مریض کی سی حالت میں رہتی ہے جب کہ مرد کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔

(۶) عورت اپنے فطری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں گھر پہ زیادہ رہتی ہے جب کہ مرد زیادہ عرصے تک گھر سے باہر رہ سکتا ہے۔

(۷) گھر کو چلانے کے لیے مالی وسائل کی فراہمی سب سے مشکل مسئلہ ہے جسے اسلام مرد کے ذمہ قرار دیتا ہے اور عورت کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔

(۸) عمل تخلیق میں مرد کو فاعل کی حیثیت حاصل ہے جب کہ عورت کو مفعول کی اور فاعل مفعول سے ہمیشہ افضل تسلیم کیا گیا ہے۔

اس کے بالمقابل اسلام عورت کے ذمے صرف شوہر کی امانتوں کی حفاظت شوہر کی اطاعت بچوں کی پرورش اور اس سے کیے گئے عہد کو دیانت داری اور وفاداری سے نبھانے کو مقرر کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اسلام نے فیصلہ کیا۔ چونکہ

"مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔" (البقرہ ۔ ۲۲۸) اور اس لیے

"مرد عورتوں کے قوام (سرپرست اور نگران) ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔" (النساء ۔ ۳۴)

ان اسباب کی بنا پر اسلام مرد کو عورت کا سربراہ قرار دے کر اسے خاندان کا سربراہ مقرر کر دیتا ہے۔ اس تقرر کے بعد بھی اسلام اس بات کی فکر کرتا ہے کہ کہیں مرد اپنی حیثیت کا غلط استعمال کر کے اس کے محافظ قلعہ کو

قیدخانہ نہ بنا دے اس لیے یہاں بھی اسلام عورت کے لیے تحفظات کا تعین کرتا ہے اور اسے حق دیتا ہے کہ وہ اپنی جائداد کی مالک رہے گی۔ شادی کی وجہ سے شوہر اس کی جائداد کا مالک نہیں بن جاتا۔ اسے اپنے مال پر تصرف کے پورے حقوق حاصل ہیں۔ شوہر پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ شادی کے وقت عورت کو مہر کے نام سے کوئی رقم یا تو اسی وقت ادا کر دے یا جب بھی وہ طلب کرے اسے ادا کرے۔ عورت اس مال کی بھی پورے طور پر مالک ہے۔ اسلام اسے ماں باپ کی جائداد میں سے ترکہ دلاتا ہے اور شوہر کی جائداد میں بھی اس کا حصہ مقرر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ عورت اگر پردہ کا اہتمام کر کے کچھ کمائے تو وہ خود اپنی کمائی کی مالک ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اس کے سارے اخراجات کی ذمہ داری مرد پر ہوتی ہے۔ بیوہ ہونے کی صورت میں اسلام اسے پوری اجازت دیتا ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ شوہر کے مرنے سے نہ وہ منحوس ہو جاتی ہے اور نہ ذلیل و حقیر زندگی و موت خدا کے ہاتھ میں ہے اس لیے اس کا کسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر شادی کے بعد خدانخواستہ تجربے کے بعد معلوم ہو کہ یہ شادی نامناسب فرد کے ساتھ ہو گئی ہے تو اسلام سب سے پہلے عفو و درگذر سے کام لے کر مصالحت کی تدابیر اختیار کرتا ہے اور ساری تدابیر کے ناکام ہو جانے کی صورت میں مرد کو حق دیتا ہے کہ وہ عورت کو طلاق دے دے۔ ساتھ ہی وہ عورت کو بھی حق دیتا ہے کہ وہ اگر محسوس کرے کہ جس مرد سے اس کی شادی ہوئی ہے اس سے نباہ کرنا ممکن نہیں ہوگا تو اسلام اسے حق دیتا ہے کہ وہ شوہر سے خلع کا مطالبہ کر کے اس رشتہ کو منقطع کر دے۔ اس طرح اسلام خدا کے نام کے ساتھ اور اس کی گواہی میں کی گئی شادی کو بھی قیدخانہ نہیں بننے دیتا اور ہر سطح پر عورت کی آزادی اور مساوات کا تحفظ کرتا ہے۔

یہ ہے اسلام کا وہ حکیمانہ اور غیر معمولی طور پر متوازن اور حیرت انگیز معاشرتی نظام جسے اسلام بنی نوع انسان کو دیتا ہے جس کے اپنانے سے وہ ماحول پیدا ہوتا ہے جس میں عورت ہر قسم کے استحصال سے کلی طور پر محفوظ ہو جاتی ہے اور عورت و مرد دونوں کی شخصیتوں کا اپنی انفرادی حیثیت میں کامل ارتقاء ممکن ہو جاتا ہے۔

الغرض دنیا میں قانون اسلام ہی ایک ایسا قانون ہے جو انتہا درجہ کی شان اعتدال رکھے ہوئے ہے جس میں فطرت انسانی کے ایک ایک پہلو حتی کہ نہایت مخفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے۔ اسلامی نظام کے اسی توازن و اعتدال سے متاثر ہو کر مولانا نور دین رقمطراز ہیں۔

"میں اس قانون کی تعریف اسی لیے نہیں کرتا ہوں کہ میں اسلام پر ایمان لایا ہوں۔ بلکہ دراصل

میں اسلام پر ایمان لایا ہی اس لیے ہوں کہ مجھے اس میں کمال درجہ کا توازن و تناسب اور قوانین فطرت کے ساتھ تطابق نظر آتا ہے جسے دیکھ کر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یقیناً اس قانون کا منبع وہی ہے جو زمین و آسمان کا فاطر اور غیب و شہادت کا عالم ہے۔"
(مصنف کی زیر طبع کتاب "مسلم پرسنل لا پر نظر کرم کا پس منظر" کا ایک باب)

(بقیہ ارشادات رسول صفحہ ۸ سے آگے)

ہیں۔ نہی ایک منفی چیز ہے اور امر ایک مثبت بات۔ ان دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ حد استطاعت کا تعلق اصلاً صرف احکام و اوامر سے ہے ممنوعات اور نواہی سے نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کام کے نہ کرنے کے لیے استطاعت یعنی طاقت اور قدرت کی ضرورت نہیں پڑتی اس کی ضرورت کسی کام کو انجام دینے میں پڑتی ہے مثال کے طور پر اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ تم دوسروں کو تکلیف نہ پہنچاؤ تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ میں اس کی استطاعت نہیں ہے کہ تکلیف نہ پہنچاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے اس میں کوئی قید نہیں لگائی ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ جن چیزوں سے آپ نے روک دیا ہے ان سے بالکلیہ اجتناب کرنا چاہیے البتہ جن چیزوں کے کرنے کا آپ نے حکم دیا ہے اس میں حد استطاعت کی قید لگائی ہے اور یہ قید قرآن کریم میں بھی موجود ہے۔ سورۂ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا　　اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

(۲۸۶)

یہاں یہ بات بھی ضمناً لکھ دی جائے تو مناسب ہے کہ اردو زبان میں تکلیف کا لفظ درد، دکھ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن قرآن اور احادیث میں تکلیف کا لفظ کسی کام کا کسی کو مکلف یعنی اس کے انجام دینے کا ذمہ دار بنانے کے معنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں حد استطاعت کی جو قید لگائی گئی ہے اس کے بارے میں دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیں۔ ایک یہ کہ جب اللہ تعالےٰ نے یہ فرما دیا کہ وہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اللہ نے بالخصوص اپنے مومن بندوں کو جو احکام دیے ہیں وہ سب ان کی مقدرت کے اندر ہیں۔ اللہ و رسول کے کسی حکم کے بارے میں کوئی مومن یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کی مقدرت سے باہر ہے وہ اسے کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے

اوامر و احکام میں اس کی مقدرت کا خیال رکھتے ہوئے رخصتیں عطا فرمائی ہیں۔ نماز اس کی ایک واضح مثال ہے۔ فرض نماز میں قیام فرض ہے لیکن اگر کوئی اتنا کمزور یا بیمار ہے کہ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو اسے بیٹھ کر پڑھنے کی رخصت دے دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض حالات میں اشاروں سے بھی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مثال کے طور پر اللہ اور اس کے رسول نے مومنوں پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری عائد کی ہے اسی کے ساتھ انہوں نے یہ رخصت بھی دے دی ہے کہ کسی ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنے میں جان کا خوف ہو تو رخصت ہے لیکن اگر کوئی مومن اپنی جان کی پرواہ نہ کرکے کلمۂ حق ادا کرے تو افضل الجہاد ہوگا اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ کتاب و سنت میں جتنے احکام ہیں وہ سب کرنے کے ہیں اور کوئی مومن بطور خود اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دے سکتا الا یہ کہ شریعت نے اس کو کہیں کوئی رخصت عطا کی ہو۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ممنوعات سے اجتناب، نوافل اور فضائل اعمال سے زیادہ اہم ہے بلکہ ان کی اہمیت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ ممنوعات کے ارتکاب کے ساتھ فرائض و واجبات بھی بے کار اور لاحاصل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ بات بہ کثرت دیکھی جارہی ہے کہ بعض تہجد پڑھنے والے اور ہزاروں دانے کی تسبیح پھیرنے والے افراد، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور جھوٹی گواہی سے بھی اجتناب نہیں کرتے یہ اسی حقیقت سے ناواقف ہونے یا ناواقف بن جانے کا ثبوت ہے۔

اس حدیث شریف میں پہلے کے لوگوں، یعنی یہود کی ہلاکت، ذلت و خواری کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بہانہ سازی کے طور پر اپنے انبیاء کے احکام میں کثرت سے غیر ضروری سوالات کرتے اور اپنے انبیاء کے احکام کی مخالفت بھی کیا کرتے تھے۔ اس ٹکڑے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ کہیں ہم میں بھی وہی بیماری تو پیدا نہیں ہو گئی ہے جو یہودیوں کی بہت پرانی بیماری ہے۔

لاجواب هوائی بے مثال پائیداری
QAMA
क़ामा
क़ामा
قاما
QAMAR ENTERPRISE
CALCUTTA-39 • PATNA-8

MONTHLY
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN
NEW DELHI-110002

Regd No. D.NO.-(DN)-348
R.N. NO.- 42893/84
JUNE 85

صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس میں چھپا۔

ماہنامہ
زندگی نو
نئی دہلی ۲

جلد:- ۳	شوال المکرم ۱۴۰۵ھ مطابق جولائی ۱۹۸۵ء	شمارہ:- ۱۰

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے

جناب سید احمد عروج قادری، مدیر "زندگی نو" گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یو پی)

پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

آج رمضان المبارک کی ۱۶ اور جون کی ۶ تاریخ ہے۔ پورا شمالی ہند جھلسا دینے والی گرمی کے لپیٹ میں ہے اور خلاف معمول شہر رام پور بھی تپ رہا ہے۔ رمضان المبارک کے پہلے عشرے میں لو بھی چلتی رہی۔ اب لو تو نہیں چل رہی لیکن تپش اتنی ہے کہ کسی کروٹ چین نہیں۔ دل و دماغ رمضان المبارک کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر کچھ سوچنے کے لیے آمادہ نہیں اور نہ قلم کسی دوسرے موضوع پر کچھ لکھنے کی طرف مائل ہے۔ اگرچہ یہ سطریں مبارک مہینے کے ختم ہو جانے کے بعد قارئین زندگی نو کے سامنے آئیں گی لیکن امید یہی ہے کہ یہ سطریں بے کار ثابت نہ ہوں گی۔ اس گرم موسم میں جن لوگوں نے رمضان کے پورے روزے رکھے ہوں گے وہ اللہ کا شکر بجا لائیں گے۔ روزے تو فی الواقع گرم موسم ہی کے روزے ہوتے ہیں۔ افطار میں کچھ کھا کر اور پانی پی کر جب روزہ دار کہتا ہے:۔

ذھب الظماء وابتلت العروق	پیاس گئی، رگیں تر ہو گئیں اور اللہ نے چاہا
وثبت الاجر ان شاء اللہ	تو اجر ثابت ہو گیا

تو جسم کی رگ رگ اس کی تصدیق کرتی اور ایک ایسی فرحت دل و دماغ پر چھا جاتی ہے جس کو صرف روزہ دار ہی محسوس کر سکتا ہے۔

للصائم فرحتان۔ فرحۃ عند	روزہ دار کے لیے دو فرحتیں ہیں۔ ایک افطار
فطرہٖ و فرحۃ عند لقاء	کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات
ربہٖ۔	کے وقت

اپنے رب سے ملاقات کے وقت کی فرحت تو انشاءاللہ قیامت میں حاصل ہوگی۔ البتہ افطار کے وقت کی فرحت اسی دنیا میں حاصل ہوتی ہے۔ افطار کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی   اے اللہ میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا

رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ   اور تیرے ہی دیے ہوئے رزق پر افطار کیا

سوال یہ ہے کہ یہ دعا اور ذھب الظماء والی دعا۔ کیا دونوں بیک وقت زبان سے کہی جاتی ہیں یا دونوں میں کچھ وقفہ ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللھم لک صمت والی دعا افطار کرتے ہوئے پڑھی جاتی ہے اور ذھب الظماء والی دعا کچھ کھانے اور پانی یا شربت پینے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ ان دونوں دعاؤں کے معانی سے ناواقف لوگ کچھ کھانے اور پانی پینے سے پہلے ہی ذھب الظماء والی دعا بھی پڑھ دیتے ہیں جو بے محل ہو جاتی ہے۔ میں نے ایک عربی رسالے میں پڑھا کہ کسی نے پانی پینے سے پہلے یہ دعا پڑھی تو ایک جاننے والے نے ان سے پوچھا کہ کیا واقعی پانی پینے سے پہلے آپ کی پیاس جاتی رہی اور آپ کی رگیں تر ہو گئیں؟ انھوں نے ان کو بتایا کہ یہ دعا کچھ کھا پی لینے کے بعد پڑھنی چاہیے تاکہ واقعے کے مطابق ہو۔ ایک اور بات یہ کہ "وعلیٰ رزقک افطرت" کا فقرہ ایک تنبیہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ "رزق" کا لفظ قرآن کریم اور احادیث میں اس روزی کے لیے استعمال ہوا ہے جو حلال ذریعہ سے حاصل ہوئی ہو۔ حرام پر "رزق" کا اطلاق نہیں ہوا ہے اس لیے حرام اور ناجائز ذرائع سے حاصل کی روزی پر وعلیٰ رزقک افطرت (اور تیرے ہی دیے ہوئے رزق پر افطار کیا) کہنا ایک غلط بات ہوگی۔

شہر رمضان کے سایہ فگن ہونے سے چند دن پہلے ایک درس قرآن میں سورۃ توبہ کی آیت قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا یاد دلائی گئی تھی۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے۔

"جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اس سخت گرمی میں نہ نکلو۔" ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔ کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔ (التوبہ۔ ۸۱)

اگرچہ یہ آیت غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی تھی لیکن اس میں جس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے اس کا تعلق صرف غزوہ تبوک سے نہیں ہے۔ گرم موسم کے رمضان سے بھی ہے۔ اگر کوئی مسلمان گرمی اور لو کے تھپیڑوں کی وجہ سے روزے سے جان چرائے اور بہانے بنائے تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔ صحیح احادیث میں آتا ہے کہ دنیا کی آگ جہنم کی آگ کا سترواں جزء ہے وہ انہتر درجے دنیا کی آگ سے بڑھی ہوئی ہے۔ جب آتش دنیا کی حدت اتنی بڑھائی جا سکتی ہے کہ لوہا پگھل کر سیال بن جائے تو اس سے آتش دوزخ کی حدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غزوۂ تبوک غزوات نبوی کا آخری غزوہ تھا۔ موسم بہت گرم تھا۔ قحط کی کیفیت تھی اور سفر دور دراز کا تھا۔ اس موقع پر مدینہ منورہ کے منافقین کا نفاق کھل کر سامنے آگیا تھا اور وہ پوری طرح رسوا ہو گئے تھے اسی لیے اس غزوہ کا ایک نام "غزوۂ فاضحہ" بھی ہے یعنی منافقین کو رسوا کرنے والا غزوہ۔ سورۂ توبہ میں اس غزوے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہاں غزوہ تبوک پر گفتگو مقصود نہیں ہے۔ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا (ان سے کہو کہ جہنم کی آگ زیادہ گرم ہے) اس فقرے نے ذہن کو غزوۂ بدر اور غزوۂ فتح مکہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ یہ دونوں غزوے رمضان المبارک کے گرم موسم میں واقع ہوئے تھے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضؓ نے فرمایا:۔

غزونا مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی رمضان غزوتین یوم بدر والفتح فافطرنا فیہما (ترمذی باب ماجاء فی الرخصۃ للمحارب فی الافطار)	ہم نے رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ کر دو جنگیں لڑیں۔ بدر کا غزوہ اور غزوۂ فتح مکہ اور ان دونوں میں ہم نے روزے نہیں رکھے۔

۱۷ رمضان کو بدر کے مقام پر فریقین کا مقابلہ ہوا۔ جس وقت دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ تین کافروں کے مقابلہ میں ایک مسلمان ہے اور وہ بھی پوری طرح مسلح نہیں ہے تو خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے اور انتہائی خضوع اور تضرع کے ساتھ عرض کرنا شروع کیا۔ خدایا یہ ہیں قریش، اپنے سامان غرور کے ساتھ آئے ہیں تاکہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کریں۔ خداوندا! بس اب آ جائے تیری وہ مدد جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اے خدا اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو روئے زمین پر پھر تیری عبادت نہ ہو گی۔ (تفہیم القرآن ج ۲)

یوم بدر کو سورۂ الانفال میں یوم الفرقان کہا گیا ہے فیصلے کا دن یعنی حق و باطل میں فرق پیدا کرنے والا

دن ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ۔ یوم الفرقان، یوم بدر ہے ۔ اس میں اللہ نے حق و باطل کے درمیان فرق پیدا کردیا ۔ (ابن کثیر بحوالہ حاکم) عروۃ بن الزبیر نے کہا یوم الفرقان وہ دن ہے جس میں اللہ نے حق و باطل کے درمیان فرق پیدا کیا اور وہ بدر کا دن ہے ۔ یہ پہلی جنگ تھی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے ۔ غزوہ بدر پہلا غزوہ اور غزوہ تبوک آخری غزوہ ـــــ سورۂ انفال غزوۂ بدر پر تبصرہ اور اس سے متعلق احکام کی سورہ ہے اسی لیے اس کا نام سورۂ بدر بھی ہے ۔ جزیرۃ العرب میں دین حق کو غالب کردینے کا آخری قلعہ مکہ تھا جس کو کہنا چاہیے کہ عرب کے دارالسلطنت کی حیثیت حاصل تھی ۔ مکۂ معظمہ بھی رمضان المبارک ہی میں فتح ہوا ۔

۱۰ ر رمضان ۸ھ کو کبۂ نبوی نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا ۔ دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں ۔ قبائل عرب راہ میں آ کر ملتے جاتے تھے ۔ مر الظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں ۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے ۔ (سیرت النبی ج ۱)

مکہ معظمہ بڑی آسانی کے ساتھ فتح ہوگیا ۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کیا ۔ نماز پڑھی اور خطبہ دیا ۔

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے ۔ ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں ۔ وہ بھی تھے جن کی تیغ و سناں نے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں ۔ وہ بھی تھے جنھوں نے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کردیا کرتے تھے ۔ وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی ۔ وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا ۔ وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے ـــــ رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا تھا خوف انگیز لہجہ میں پوچھا ۔ تم کو کچھ معلوم ہے ؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں ؟ یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے ؛ شقی تھے بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے پکار اٹھے کہ اخ کریم وابن اخ کریم تو شریف بھائی اور شریف برادرزادہ ہے ۔ ارشاد ہوا :۔ لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم

الطلقاء۔ آج تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔ (سیرۃ النبی ج ۱)

یہ حقیر ربع صدی سے رمضان المبارک کی آمد سے پہلے درس قرآن میں اور تقریروں میں غزوۂ بدر اور فتح مکہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا رہا ہے اور ان کے سامنے یہ سوال رکھتا رہا ہے کہ کیا یوم بدر اور فتح مکہ کا وقوع رمضان المبارک میں کوئی اتفاقی واقعہ تھا؟ یہ سوال اور اس کا جواب "زندگی" کے اشارات میں بھی پیش ہوتا رہا ہے۔ جلد ۴۱ شعبان المعظم ۱۳۸۸ھ مطابق نومبر ۱۹۶۸ء کے اشارات میں ہے:۔

"میرے نزدیک یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ غزوہ بدر بھی رمضان ہی میں واقع ہوا اور فتح مکہ کی جنگ بھی اسی مبارک مہینے میں لڑی گئی بلکہ اللہ کی مشیت نے یہ چاہا کہ غلبہ اسلام کے یہ دونوں اہم واقعات اسی مہینے میں رونما ہوں تاکہ قیامت تک ہر سال مسلمانوں کو یہ یاد آتا رہے کہ رمضان کو نزول قرآن کے مقصد سے خاص مناسبت حاصل اور ان دونوں کے درمیان گہرا ربط موجود ہے۔ دعوت اسلامی کی ابتدا بھی اسی مہینے سے ہوئی ہے اور پورے جزیرۃ العرب پر اس دین حق کو غلبہ بھی اسی مہینے میں حاصل ہوا ہے لیکن آج کتنے مسلمان ہیں جن کو یہ حقیقت یاد ہو اور کتنے ایسے ہیں جو اس حقیقت کو سامنے رکھ کر رمضان کے روزے رکھتے ہوں"

پھر جلد ۵۴ شوال المکرم ۱۳۹۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۰ء کے اشارات میں لکھا گیا:۔

"اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے غزوۂ بدر بھی اسی مہینہ میں ہوا اور غزوۂ فتح مکہ بھی اسی مہینے میں۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جدوجہد تو دور کی بات ہے کتنے مسلمان ہیں جنھیں رمضان میں ان دونوں غزوں کی یاد بھی آتی ہو؟ ان دونوں غزوں کا قرآن اور رمضان سے کوئی تعلق ہے یا نہیں، کون اس سوال پر غور کرتا ہے؟ راقم الحروف کو یقین ہے کہ ان دونوں غزوں کا وقوع رمضان میں محض کوئی اتفاقی امر نہ تھا، نزول قرآن کا آغاز ماہ رمضان میں ہوا اور جس مقصد سے نازل ہوا تھا اس کی تکمیل اور اس کا اتمام بھی اسی مبارک مہینے میں ہوا۔ غزوۂ بدر نے حق و باطل کے درمیان اس طرح فرق پیدا کیا کہ اندھے بھی اسے دیکھنے لگے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام یوم الفرقان رکھا۔ غزوۂ فتح مکہ نے حق کو باطل پر مکمل غلبہ عطا کیا اور رمضان میں ان دونوں

بات کا صاف اشارہ تھا کہ مسلمانوں کو ہر رمضان میں یاد آجائے کہ نزول قرآن کا مقصد کیا ہے؟

فتح مکہ کا ذکر قرآن کریم میں دو جگہ آیا ہے۔ سورۂ حدید آیت ۱۰ میں اور سورۂ النصر میں۔ اس کا کوئی مفصل ذکر یا اس پر کوئی تبصرہ قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ صلح حدیبیہ کو اللہ تعالےٰ نے فتح مبین قرار دیا ہے اور اس سے متعلق ایک پوری سورۃ "الفتح" نازل کی ہے۔ صلح حدیبیہ فتح مکہ کی تمہید تھی۔ مکہ پر چڑھائی سے پہلے ایک صحابی کی غلطی پر سورۃ الممتحنہ کی ابتدائی آیتوں میں بڑے سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے۔ ان آیتوں کی تفسیل اور واقعہ کی تشریح پڑھنے کی چیز ہے۔ ہم طوالت کے خوف سے یہاں صرف اس کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

رمضان المبارک کی ابتدا میں ایک دن کے لیے دہلی کا سفر کرنا پڑا۔ میں رخصت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن میں نے روزہ ترک نہیں کیا۔ رام پور سے دہلی کا سفر ۵-۶ گھنٹوں کا ہے۔ اگر صبح سویرے سفر کیا جائے تو کوئی خاص مشقت برداشت نہیں کرنی پڑتی اور ایسی صورت میں فقہ حنفی اور دوسرے مذاہب فقہ میں روزہ رکھنا افضل ہے۔ سفر میں روزہ کے مسئلے میں ائمہ فقہ کے درمیان اختلاف ہے۔ اہل ظاہر کا خیال یہ ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جائز ہی نہیں ہے۔ وہ لوگ سفر میں افطار یعنی روزہ نہ رکھنے کو واجب قرار دیتے ہیں جس طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک سفر میں قصر صلوٰۃ واجب ہے لیکن صحیح احادیث کی بنا پر جمہور ائمۂ دین نے اہل ظاہر کے مسلک کو رد کر دیا ہے۔ البتہ ان کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے یا افطار یعنی روزہ نہ رکھنا افضل ہے؟

ترمذی شریف کتاب الصوم، باب ماجاء فی کراہیۃ الصوم فی السفر میں حسب ذیل مذاہب فقہ کا ذکر کیا ہے:۔

(۱) سفر میں روزہ رکھنا درست نہیں۔ اگر کوئی رکھ لے تو اعادہ واجب ہے۔ (۲) امام احمد بن حنبل اور امام اسحٰق بن راہویہ کے نزدیک ہر حال میں افطار افضل ہے۔ (۳) سفیان ثوری، امام مالک بن انس اور امام عبداللہ بن مبارک کے نزدیک اگر روزے کی قوت ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے اور اگر کوئی روزہ نہ رکھے تو اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔ امام شافعی کا مسلک بھی تقریباً یہی ہے۔

بدایۃ المجتہد اور المغنی میں صراحت کے ساتھ اہل الظاہر کی طرف یہ مسلک منسوب کیا ہے کہ ان لوگوں کے

نزدیک سفر میں روزہ جائز ہی نہیں ہے۔ جمہور ائمۂ دین کا مسلک یہ ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جائز ہے۔ فطرِ واجب نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک روزہ رکھنا افضل ہے۔ امام احمد اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک روزہ نہ رکھنا افضل ہے اور بعض ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ بات مسافر کے اپنے اختیار کی ہے وہ چاہے تو روزہ رکھے اور چاہے تو نہ رکھے۔ میں نے یہاں دلائل سے قطع نظر کیا ہے اور ضمنی طور پر اس مسئلے کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ بہت سے لوگ ناواقفیت کی وجہ سے سفر میں روزہ نہ رکھنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جیسے اس نے روزہ نہ رکھ کر کوئی قصور کیا ہو یا یہ کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا تقوے کے خلاف ہو حالانکہ قوت کے باوجود سفر میں روزہ نہ رکھنا تقوی کے خلاف نہیں ہے۔

عرصۂ دراز سے اس کی توفیق ملتی رہی ہے کہ رمضان میں بعد نماز فجر محلے کی مسجد میں تھوڑی دیر تذکیر کی خدمت انجام دی جائے۔ اس سال اپنے ضعف کے پیش نظر اس سے معذرت کرنی پڑی لیکن چند دن کے لیے اس کا موقع نکل ہی آیا۔ جی چاہتا ہے کہ ایک دن کی تذکیر میں زندگی نو کے قارئین کو بھی شریک کر لیا جائے۔ ایک دن میں نے یہ حدیث پیش کی۔

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال
قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم یا اباذر لان تغدو
فتعلم اٰیۃ من کتاب اللہ خیر
لک من ان تصلی مائۃ رکعۃ
ولان تغدو فتعلم بابا من
العلم عمل بہ اولم یعمل خیر
لک من ان تصلے الف رکعۃ
رواہ ابن ماجہ باسناد حسن
(الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۵۵ مطبوعہ مصر)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابو ذر تم صبح کو گھر سے نکل کر کتاب اللہ کی ایک آیت سیکھو۔ یہ تمہارے لیے ایک سو رکعتیں پڑھنے سے بہتر ہے اور تم صبح کو گھر سے نکل کر علم کا کوئی باب لوگوں کو سکھاؤ خواہ اس پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یہ تمہارے لیے ایک ہزار رکعتیں پڑھنے سے بہتر ہے۔ یہ حدیث ابن ماجہ نے اچھی سند سے روایت کی ہے۔

ان یغدو وغدا کے معنے صبح کو کہیں جانے کے ہیں۔ عربی زبان میں یہ ایک محاورے کے طور پر

مولانا مودودی کی یاد

سپارک بروک اسلامک سنٹر، برمنگھم کے زیر اہتمام، مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی یاد میں ایک عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس سے پاکستان، ہندوستان اور یورپ کے ممتاز علماء کرام اور مفکرین کے علاوہ پاکستان کے مایۂ ناز خطیب حضرت مولانا علامہ عنایت اللہ گجراتی نے بھی خطاب فرمایا۔ ان کی تقریر کا مکمل متن افادۂ عام کے لیے برائے اشاعت دیا جا رہا ہے۔

محمد سرفراز مدنی

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریمؐ

آج کی کانفرنس کا عنوان وہ عظیم مفکر اسلام اور وحید الدہر شخصیت ہیں جنہوں نے دورِ حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بے مثال اور لازوال کام کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے متعلق اس مختصر سے وقت میں تفصیلی گفتگو تو ممکن نہیں ہے البتہ میں چند پہلوؤں پر گذارشات پیش کروں گا اور یہ وہ پہلو ہیں جن کی روشنی میں تحریک اسلامی کے کارکنوں کو کام کرنا ہے۔ اگر ہم اپنے پروگرام کو اس روشنی میں مرتب کرتے رہیں گے جو قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق سید مرحوم نے ہمارے سامنے رکھی تھی تو ان شاء اللہ یہ قافلۂ حق رواں دواں رہے گا اور ضرور اپنی منزل کو پالے گا جو رضائے حق ہے اور جس کے حصول کی خاطر یہ ساری جدوجہد کر رہے ہیں۔ میں صرف اس وقت ان چار عنوانات کے تحت بات کروں گا۔

(۱) سید مودودیؒ کے دینی فکر کی جامعیت (۲) تحریک جدید کے چیلنج کا موثر ترین جواب

(۳) تحریک اسلامی کا قیام اور نفاذ اسلام کی عملی جدوجہد (۴) سید کی میدان میں ثبات واستقامت۔

برادرانِ اسلام! آپ کو معلوم ہے کہ اللہ کا دین جس کا نام اسلام ہے اس کی بنیاد وحیِ الٰہی اور قرآن مجید ہے اور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جس طرح صحابہ کرام نے دینِ حق کو سنا، قبول کیا اور اس کی عملی تربیت حاصل کی وہی اصل دین ہے۔ اس میں نہ کمی کی جا سکتی ہے نہ زیادتی۔ وہ کامل مکمل اور اکمل دین ہے اور اس دینِ حق کی تبلیغ و ترویج اور اشاعت ہر دور میں اہلِ حق کرتے رہے ہیں اور جب تک یہ دنیا موجود ہے اور اس حق و باطل کی کش مکش جاری ہے۔ یہ کام ہوتا رہے گا۔ برصغیر پاک و ہند میں کئی وجوہ کی بنیاد پر مسلمان اس خالص دین سے ہٹ گئے تھے جو سرورِ عالم اور صحابہ کرام کے ذریعے ملا تھا۔ بعض جزئیات کو قبول کر لیا گیا تھا اور افسوس کہ مسلمان اس جزئی کو کل دین خیال کرتے رہے۔ دین اور سیاست کی تفریق نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد مسلمانوں میں ایک عجیب صورت پیدا کر دی تھی۔ مسلمان اقتدار اور قوتِ نافذہ کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ محض چند عبادات اور رسومات ہی کو کل دین خیال کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف غیر مسلموں کے مسلسل حملوں اور اعتراضات کی وجہ سے مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے والے طبقے سخت پریشان تھے اور وہ کیسا وقت تھا جب دہلی کی جامع مسجد میں خطبہ جمعہ میں خطیب کی آواز بھرا گئی، ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور روتے ہوئے کہا کہ غیر مسلموں نے اسلام پر سخت اعتراضات کیے ہیں۔ ہم ان اعتراضات کا تقریروں میں جواب دیتے ہیں۔ مگر وہ لوگ تو ہماری تقریریں سننے نہیں آتے۔ انھوں نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا کاش کوئی مسلمان ان اعتراضات کا جواب دیتا اور قلم کے ذریعے اسلام کی خدمت کرتا۔ اس مجمع میں اٹھارہ سال کا ایک نوجوان بھی موجود تھا اس نے خطیب شہر کی بات سنی تو اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ اس نوجوان نے کہا یہ کام کون کرے گا۔ یہ کام میں ہی کیوں نہ کروں؟ اور مسلمانوں کے سامنے دینِ حق کی صحیح تصویر کیوں نہ پیش کر دوں جس کی آج شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ چنانچہ یہ نوجوان اٹھا اور اس نے پہلی تصنیف بعنوان "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے پیش کی جو آپ نے بھی پڑھی ہوگی۔ لیکن شاید اکثر لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ ۱۸ سال کے اس نوجوان کے سینے کی گرمی اور اس کے قلم کی جولانیوں نے جہاں اسلام پر حملہ کرنے والوں کے دندان شکن جواب دیے وہاں مسلمانوں کے دلوں میں ایک جذبۂ صادق اور ولولہ تازہ پیدا کر دیا۔ یہ اسلام میں جہاد کے صحیح تصور پر قرآن و سنت کی روشنی میں وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے جس کے ذریعے لاکھوں انسانوں کے ذہن تبدیل ہوئے۔ اور انھیں اسلام کی حقیقی روشنی نظر آئی۔

ایک طرف سید مودودی برصغیر میں ترجمان القرآن کے ذریعہ اسلام کا جامع تصور دنیا کے سامنے پیش کر رہے تھے اور دوسری طرف مصر کی وادیوں میں سید قطب شہیدؒ اسی نغمۂ جانفزا کو دنیا کے کانوں تک پہنچا رہے تھے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی تصانیف کے ذریعے دین کا جامع تصور پیش کیا اور میں پورے یقین سے یہ بات کہتا ہوں کہ مولانا مرحوم کا یہ کارنامہ دور حاضر کا عظیم کارنامہ ہے۔

آپ نے قرآن پاک کی ان اصطلاحات پر علمی اور فکری بحث کی اور وہ الفاظ جن کے معنے مرورِ زمانہ کی وجہ سے اپنی اصلیت کھو چکے تھے ان کے اصل معانی تک لوگوں کے اذہان کو پہنچانے کی جدوجہد کی آپ میں سے اکثر حضرات نے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نامی کتاب ملاحظہ فرمائی ہوگی۔ میرا ایمان ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے الٰہ۔ رب۔ دین اور عبادت کا جو مفہوم ملت اسلامیہ کے سامنے پیش کیا اس نے لوگوں کے ذہن بدل کر رکھ دیے۔ میں ذاتی طور پر ان لوگوں میں شامل ہوں جنہیں علوم اسلامیہ کے طالب علم کی حیثیت حاصل تھی لیکن جب سید مرحوم کے بیان کردہ حقائق کو دیکھا تو دل کی دنیا بدل گئی۔ میرا یقین ہے کہ آج بھی ہم اگر ان اصطلاحات کا صحیح مضمون بیان کرتے رہیں اور لوگوں کو ان کا صحیح مفہوم سمجھاتے رہیں تو ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔

دوسری بات جس کی طرف میں مختصراً آپ کو متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ اس دور میں تہذیب جدید سے مسلمانوں کا متاثر ہونا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پڑھے لکھے لوگ دنیا میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے ایک حجاب سا محسوس کرتے تھے اور لادین رائٹروں نے اپنے ہنگم شور اور زورِ قلم کے ذریعے انہیں باور کرا دیا تھا کہ اسلام تو بس چند رسوم کا مجموعہ ہے اور تم اگر دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ معاذ اللہ کسی نہ کسی طریقے سے اسلام سے اپنا دامن بچا لو۔ اس کا نتیجہ تھا کہ برملا یہ بات کہی جانے لگی تھی کہ اسلام کے پاس اپنا کوئی نظام نہیں ہے جو اس کی تہذیب و تمدن ثقافت اور کلچر میں اس کی راہ نمائی کر سکے۔ اس کے لیے ہمیں غیروں کی غلامی اور دریوزہ گری اختیار کرنا ہوگی۔ تب ہم شاہراہ حیات پر قدم آگے بڑھا سکیں گے۔ ان حالات میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خداداد جذبہ دین اور بے مثال ذہانت اور علم و فکر سے کام لیتے ہوئے تہذیب جدید کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں اور اس دور کے دانشوروں کے جھوٹے ادعا کے تار و پود بکھیر دیے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جو لوگ کچھ عرصہ پہلے اسلام کے نظام کے سرے سے قائل نہ تھے۔ مولانا کی تحریریں پڑھ کر اسلام کے علمبردار اور نظام اسلامی کے لیے بہترین قسم کے

کارکن بن گئے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ کارنامہ کچھ کم ہے۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس طرح کا فکری انقلاب پیدا کرنے والی عبقری شخصیت کتنے علم و فکر کی امین ہوگی جس کی جنبش قلم نے زندگیاں بدل کر رکھ دیں۔

میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو علوم جدیدہ کے ماہر اور دنیا کے مختلف قوانین سے خوب واقف تھے لیکن اسلام کے نظام کو بحیثیت نظام زندگی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے لیکن جب انھوں نے مولانا مرحوم کا لٹریچر پڑھا تو انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ شخص نہ ہوتا تو ہم دولت ایمان سے مالامال نہ ہو سکتے۔ میرے خیال میں کسی کی شخصیت کا اس کے علم کا اس کے فکر کا اس کے ذہن رسا کا اس کی صلاحیتوں کا اس طرح اعتراف کیا جانا دراصل اسلام کی اس صداقت و حقانیت کا اعتراف ہے جو ہماری اصل بنیاد ہے۔ جو ہماری دولت ہے اور جس پر ہم آج بھی اللہ کے فضل و کرم سے ناز کرتے ہیں۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر بہت سی بڑی شخصیتوں کو جانتا ہوں جن کی زندگیاں سید مرحوم کے قلم کے ذریعے تبدیل ہوئیں مگر آج کا موضوع طویل تر ہو جائے گا اس لیے میں اس ذکر کو چھوڑتے ہوئے آپ کے سامنے اپنے تیسرے نکتے کی وضاحت کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس پر غور فرمایئے اور دیکھیے کہ مولانا مرحوم نے عین سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ایک عظیم الشان جماعت کی تشکیل فرمائی اور آپ کے ہاتھوں کا لگایا ہوا یہ پودا پوری دنیا میں اپنی بہاریں دکھا رہا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس طرح فکر اسلامی کو ذہنوں کی طرف منتقل فرمایا اور ایک پاکیزہ جماعت کی تشکیل فرمائی اس جماعت کے کارناموں سے تاریخ انسانی کے ابواب روشن ہیں اور سچ پوچھیے تو یہی مقدس گروہ تھا جس کی بے مثال قربانیاں تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ مولانا مرحوم نے محض اپنی بات کہہ کر یا لکھ کر معاملہ ختم نہیں کر دیا تھا بلکہ اس کے لیے ایک جماعت تیار کی تھی جو عملاً اس مشن کی تکمیل کے لیے مسلسل جد و جہد کرے اور خلق خدا کو اس کے دروازے پر جھکانے کا اہم فریضہ ادا کرے۔ یہ فریضہ شہادت حق یہ فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ فریضہ اقامت دین جو ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید ہے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لیے مصائب و آلام کے طوفانوں کے رخ موڑ کر مسلسل کام کیا عمر بھر کام کیا اور آخر کار وہ جماعت میدان عمل میں لا کھڑی کی جو نہ جھک سکتی ہے، نہ دب سکتی ہے اور نہ رک سکتی ہے۔ اسلامی اجتماعیت کا تقاضا تھا کہ لوگوں کو گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے نجات دلا کر امت مسلمہ کی حیثیت سے سوچنے اور غور کرنے کا موقع دیا جاتا اور لوگ صرف اور صرف مسلمان بن کر سوچنے کے عادی ہو جاتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک اسلامی کے قیام سے پہلے فرقہ بندی کی وبا مسلمانوں کو تباہ کر رہی تھی۔ مولانا نے لوگوں کو اسلام کے راستے

پر ڈالا۔ حبل اللہ سے وابستہ ہونے کی تلقین کی اور مسلمانوں کو ایک جماعت بننے اور قرآنی اصطلاح میں بنیان مرصوص بنکر رہنے کی تبلیغ فرمائی۔ یہ عظیم کارنامہ آپ کے آثار میں شامل ہے اور جب تک اس دنیا میں کوئی ایک شخص بھی اس مشن پر چلتا رہے گا، مولانا مرحوم کے درجات بلند ہوتے رہیں گے۔ یہ جماعت مولانا کی امانت ہے، اسلام کی امانت ہے۔ اس کو قائم رکھنا اور انہی خطوط پر چلانا جو مولانا مرحوم نے اپنے کردار سے روشن کیے تھے ہماری ذمہ داری ہے آج ہمیں دیوبندی بریلوی، شیعہ سنی، اہلحدیث، حنفی بنکر نہیں مسلمان بنکر جینا ہے۔ اور ہر حال میں اپنی اجتماعیت کو قائم رکھنا ہے۔ کتاب ہدیٰ کا یہی وہ سبق ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام نے بنی نوع انسان کو پڑھایا۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا۔ تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ مولانا مرحوم نے ایسی جماعت تیار کی جو فرقوں پر نہیں ملت اسلامیہ کے اتحاد فکر و نظر پر یقین رکھتی ہے۔ اور ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ ہماری دونوں جہان کی کامیابی کا راز افتراق و انتشار میں نہیں، اتفاق اور اتحاد میں ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں جماعتی زندگی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ عقیدہ توحید اتحاد کا سبق دیتا ہے۔ جہاں توحید ہوگی وہاں اتحاد ہوگا جہاں شرک ہوگا وہاں انتشار ہوگا۔ رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہی ایک ایسی ہستی ہے جس پر ایمان لا کر ہم تمام تعصبات سے نجات پا سکتے ہیں۔ آج پوری دنیا گروہوں اور ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ہر طرف اضطراب و بے چینی کا دور دورہ ہے انسانیت تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے جس امت کو اس کرب انگیز ماحول سے پوری انسانیت کو بچانا تھا وہ خود انتشار فکر کا شکار ہے۔ ان حالات میں مسیحا جب خود ہی بیمار ہو تو دوسروں کی شفا کیسے ہوگی۔ آئیے ہم غور کریں کہ ہمیں اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کرنا ہے، ہماری ذمہ داری کیا ہے اور ہم ان ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ میں اس نکتے کی مزید وضاحت کرتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تحریک اسلامی کے کارکن اس سے اچھی طرح آگاہ ہیں البتہ نے آنے والے رفقاء گرامی قدر کی خدمت میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ آپ سید مودودی کے نظریات و خیالات کا بنظر غائر مطالعہ کریں ان کے پروگرام کو سمجھیں اور اس راہ میں ہمارا ساتھ دیں۔ ہم یہ کام ذاتی غرض کے لیے نہیں محض اپنے رب کی رضا کے لیے کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اسلام کی شاہراہ ہے اور ہم اس پر رواں دواں ہیں۔ آخری سانس تک اس راہ پر چلیں گے اور دوسروں کو چلانے کی کوشش کریں گے۔ یہی وہ ذمہ داری ہے جو انسانیت کے محسن اعظم ﷺ نے آخری وقت میں ہمارے سپرد کی تھی جب آپ ﷺ نے فرمایا تھا انی تارک فیکم الثقلین۔ میں تمہارے اندر دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت۔ تم ان سے تمسک کرنا اور ہر حال میں اس کے دامن سے وابستہ رہنا۔ ہم اس دور پر آشوب میں کتاب و سنت کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تحریک اسلامی پوری دنیا میں اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف ہے

کیا قرآنی قصص محض تاریخی سرگذشتیں ہیں؟

(جناب عطاء الرحمٰن ہاشمی)

تو اے بیمار در درد دل مسیحا را چہ می جوئی طبیب مہرباں اینجا۔ دوا اینجا، شفا اینجا

قرآن حکیم، نسل انسانی کی ہدایت و ارشاد، صلاح و فلاح، تقویٰ و پرہیزگاری، عبادت و ریاضت کی کتاب ہے۔ یہ کلام ربانی صحف سماوی کا آخری صحیفہ ہے، جو رہتی دنیا تک اولاد آدم اور ان کی ذریات خواہ وہ عرب ہوں یا عجم، گورے ہوں یا کالے، سرمایہ دار ہوں یا غریب، بادشاہ ہوں یا رعایا۔ ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں کو ان کی طلب اور جستجو، ہمتی اور حیثیت کے مطابق جہالت و اوہام کے گھٹا ٹوپ اندھیروں اور شرک و کفر کی غلیظ گندگیوں سے نکال کر معرفت و بصیرت، ایمان و ایقان کی درخشانی اور ہمہ گیر تابانی کی طرف لانے کی سعی کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

یہ کتاب تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے سراپا رحمت و ہدایت ہے اور نفس نصیحت و فہمائش کے لحاظ سے تمام جن و انس کے حق میں رہبر اور رہ نما ہے۔ یہ اسلام اور خالص دینی توحید اور ہر شعبۂ حیات میں صراط مستقیم پر ہے اور کفر و بت پرستی، بدعات و منکرات اور نفس پرستی کا قلع قمع کرنے والی آسمانی تنزیل ہے نیز حق و باطل حرام و حلال کو کھلے طور پر ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے اور کفر و شرک کے انجام بد سے آگاہ اور متنبہ کرتی ہے۔

یہ قرآن عزیز اس شہنشاہ مقتدر اور مالک کل خدا کا اتارا ہوا ہے جو منکر، باغی، سرکش، طاغی اور ظالم کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑے گا اور دوسری طرف ایسا مہربان اور رؤف و رحیم ہے کہ سعید و متقی ذاکر و شاکر محسن و صابر اور اس کے احکام اوامر و نواہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے کو بے حساب نوازش اور بخشش و نوال

سے مالا مال کرنے والا ہے اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ آیات قرآنیہ کہیں شان لطف و مہر اور کسی جگہ انداز قہر و غضب کی مظہر ہیں۔

یہ کتاب معتقدات، مسائل زندگی، اخلاقیات و ہدایات احکام و شرائع مواعظ و نصائح دعوت و نصیحت، عبرت و بصیرت، تنقید و تبصرہ، زجر و ملامت، انذار و تبشیر، تسکین و تشفی، دلائل و شواہد، اخبار و قصص اور آثار کائنات کا مجموعہ ہے۔ بار بار اور مختلف انداز بیان اور دل پذیر طرز گفتگو اور مکالمہ میں اپنے دلائل و براہین دہراتی ہے اور اپنی بے پناہ معجزانہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے دریا کی روانی اور دل میں اتر جانے والے نشتر رکھتی ہے۔ اس کتاب کے متعلق دوست و دشمن دونوں کا اعتراف و اقرار ہے کہ اس کتاب نے عالمگیر اور ہمہ گیر انقلاب پیدا کر دیا۔ اذہان و قلوب بدل ڈالے فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور بلند اخلاقی قدروں سے انسانیت کو روشناس کیا اور انسان کو اس کے حقیقی مقام و منزل کی آگاہی بخشی اور ساتھ ہی ساتھ ہر گوشہ زندگی کے لیے ایک نیا زاویہ اور نیا اصول و ضابطہ دیا۔

یہ کتاب بار بار اپنے قاری کو تدبر و تفکر، ہوش مندی و آگاہی، دانش و بینش کی دعوت دیتی ہے اور تلاش و جستجو کی وساطت سے رموز و حقائق، اسرار و معارف، معاش و معاد کے جملہ مہمات اور کائنات عالم کے مستور خزانے کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ عناصر کی تسخیر قوانین فطرت کی دریافت علوم ما بعد الطبیعات کے انکشافات اور اس پر غور و فکر کرنے والے کی تحسین و تعریف کرتی ہے کہ خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے انسان علوم مرتبت اور رفعت و حشمت اور تمکین فی الارض حاصل کرے اور اس اثر و نفوذ سے تہذیب و تمدن حضارت و ثقافت، شائستگی اور سلیقہ۔ ایمان باللہ، اعتقاد بالیوم الآخر اور اتباع کتاب و سنت کی روشنی میں ارتقاء کی منزلیں طے کرے۔

قرآن کریم وسیع و عریض اور ہمہ حیثیت نظام زندگی اور دستور عمل کا رہبر ہے۔ جس کا شارع خدائے علیم و خبیر اور جس کا داعی رسول بشیر و نذیر ہے۔

یہ ایک اجمالی خاکہ اور مختصر تعارف اس کتاب مبین کا ہے جس کا موضوع انسان ہے اس حیثیت سے کہ اس کی فلاح و بہبود اور خسران کس چیز میں ہے اور مقصد و مدعا یہ ہے کہ انسان کو صحیح طریق زندگانی کی دعوت اور اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرتا ہے جس سے اس نے انسان کو دنیا میں بھیجتے وقت آگاہ کر دیا تھا۔ لوگوں کی خیر خواہی اور تمام نسل انسانی کی رہنمائی اور سارے عالم میں اسلام کی ضیا باری کیا

کی غایت ہے۔

علامہ سیوطی (پیدائش ۸۳۶ھ وفات ۹۱۱ھ) نے اپنی مشہور کتاب اتقان فی علوم القرآن میں اس کتاب کے وصفی اور صفاتی اسمار کو خود قرآن حکیم سے لیکر پیش کیا ہے جن کی تعداد ۵۵ ہے۔ آج کی صحبت میں اس مضمون کے پڑھنے والوں کی خدمت میں چند مشہور اسمار کا ذکر مع حوالہ آیات کر رہا ہوں تاکہ خود قرآن سے معلوم ہو جائے کہ یہ کتاب اپنے اندر کیا کیا خوبیاں رکھتی اور کن امور کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ نیز قاری اس کی تلاوت کے وقت اس کے صفاتی ناموں پر غور کرے۔

قرآن اس کتاب کا اسم ذات ہے۔ جیسے انہٗ لقرآنٌ کریم۔ انا انزلناہٗ قرآناً عربیًا
اسمائے صفاتی جیسے کلامٌ: حتی یسمعَ کلامَ اللّٰہ۔ نورٌ جیسے انا انزلنا الیکم نوراً مبینا۔ کتابٌ جیسے ذالک الکتاب لا ریب فیہ۔ فرقان۔ نزّل الفرقان علیٰ عبدہٖ۔ مبین۔ حٰمٓ۔ والکتاب المبین۔ حکیمٌ۔ تلک آیاتُ الکتاب الحکیم۔ مہیمن۔ مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب ومہیمنا علیہ۔ حبلٌ واعتصموا بحبل من اللّٰہ جمیعا۔ قیّمٌ۔ قیماً لینذر۔ تنزیلٌ وانہ تنزیل رب العلمین۔ روحٌ۔ واوحینا الیک روحًا من امرنا۔ وحیٌ۔ انما انذرکم بالوحی بیانٌ۔ ھذا بیان للناس۔ حقٌ۔ ان ھذا لھو القصص الحق۔ صدقٌ۔ والذی جاء بالصدق۔ عزیزٌ۔ انہ لکتاب عزیز۔ بلاغٌ۔ ھذا بلاغ للناس

قرآن میں اخبار وقصص اور امم سابقہ کے شئون واحوال اور گذشتہ واقعات کو جا بجا کس لیے بیان کیا گیا ہے۔ کیا محض تاریخ کی کتاب کی طرح ایام ماضیہ اور تاریخی حقیقتوں کو صرف بیان کرنا مقصد ہے؟ ہر چند کہ مستشرقین اور یورپین محققین اور مورخین تمام قرآنی اخبار وقصص کو محض بے بنیاد اور بر خود غلط کہتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ علامہ سید سلیمان ندوی کی تربت پر پھول برسائے کہ آں جناب نے بڑی کدوکاوش کے بعد تاریخی کتابوں اور کتب جغرافیہ سے مواد فراہم کرکے "ارض القرآن" لکھی اور اس میں ان تمام معترضین اور ریب وشک کرنے والوں کا فاضلانہ اور عالمانہ مسکت جواب دیا ہے۔

بہرکیف قرآن مجید میں جا بجا عاد ثمود عمالقہ اور دوسری امم سابقہ کے مساکن، معابد، تہذیب تمدن، صنعت وحرفت، شئون واحوال سیر وکردار اور گزشتہ حادثات کو بیان کیا گیا ہے تاکہ

ان سے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر روشنی پڑے اور اس سے عبرت و موعظت پند و نصیحت کا سبق حاصل کیا جائے۔

قرآنی قصص و اخبار میں بعض کو شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے تاکہ اس سے نسل انسانی کو عموماً اور امت محمدیہ کو خصوصاً عبرت و موعظت کا سبق حاصل ہو اور آں حضرت کے حق میں موجب تسکین و طمانیت خاطر ہو۔ دیکھیے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ یعنی حضرت یوسف اور یعقوب پھر موسیٰ اور فرعون کا واقعہ پھر قبطیوں کی غلامی سے کس طرح بنی اسرائیل کو نجات ملی۔ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد تو شام میں رہتی تھی۔ پھر بنی اسرائیل مصر میں کس طرح آکر بس گئے کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے مقابلہ کی نوبت آئی۔ ان تاریخوں میں حقائق و بصائر بھرے پڑے ہیں۔

اس قصہ کے ضمن میں جن احوال و حوادث کا تذکرہ ہونے والا تھا وہ کئی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے حالات سے مشابہت رکھتے تھے۔ اور ان کا ذکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں موجب تسکین خاطر اور آپ کی قوم کے حق میں موجب عبرت تھا۔ ان وجوہ کے پیش نظر قرآن حکیم میں پورے واقعہ کو کافی شرح و بسط سے بیان فرمایا گیا ہے۔

صبر و استقامت دنیوی اور آخروی فتح و ظفر کی کلید ہے۔ حسد و عداوت کا انجام خذلان اور آخر نقصان ہے۔ عقل انسانی جو ہر لطیف ہے جس کی بدولت آدمی بہت سے مصائب و مشکلات پر غالب آتا ہے اور بالآخر اپنی زندگی کو کامیاب بنا لیتا ہے۔ اخلاقی شرافت اور پاک دامنی انسان کو دشمنوں اور حاسدوں کی نظر میں آخر کار معزز بنا دیتی ہیں یہ اور اس قسم کے بے شمار حقائق اور بصائر ہیں جس پر اس احسن القصص کے ضمن میں تنبیہ فرمایا اور قصہ یوسفؑ کو خوب شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ یعنی جو لوگ اس طرح کے واقعات دریافت کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے یوسف اور ان کے بھائیوں کی سرگزشت میں ہدایت و عبرت کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ اس قصہ کو سن کر حق تعالیٰ کی عظیم قدرت و حکمت کا نقش جم جاتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا بین ثبوت ملتا ہے کہ باوجود امی ہونے کے اور کسی کتاب یا علم سے استفادہ نہ کرنے کے باوجود ایسے منقح اور منضبط تاریخی حقائق کا انکشاف فرما رہے ہیں۔ جن کے بیان کی بجز اعلام الٰہی کے کوئی دوسری توجیہ نہیں ہو سکتی خصوصاً قریش مکہ کے لیے جو یہود کے اکسانے سے اس قصہ کے متعلق حضور اکرم

سے سوال کر رہے ہیں۔ اس واقعہ میں عبرت آموز سبق ہے کہ جس طرح یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے گھر سے نکالا اور رازداری سے قتل یا جلاوطنی کے لیے باہم مشورے کیے طرح طرح سے ایذائیں، اہانت و استخفاف میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ آخر ایک دن وہ آیا کہ یوسف علیہ السلام کی طرف سبھی نادم و محتاج ہو کر آئے اور یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کے

اعلیٰ مناصب پر فائز کیا اور انھوں نے اپنے عروج و اقتدار کے وقت بھائیوں کے جرائم سے چشم پوشی کی اور نہایت دریا دلی سے سب کے قصور معاف فرما دیئے۔ اسی طرح حضور اکرم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف اہلِ قریش اس کے اعزا اور ساکنانِ مکہ نے ناپاک منصوبے باندھے۔ دکھ درد پہنچانے، عزت و آبرو پر حملے کیے حتیٰ کہ وطن چھوڑنے پر مجبور کیا لیکن جلد وہ دن آنے والا تھا جب وطن سے علیحدہ ہو کر آپ کی کامیابی اور رفعتِ شان کا اقبال چمکا اور صرف چند سالوں کے بعد فتح مکہ کا وہ تاریخی واقعہ اور فتح و نصرت کا وہ دن آ پہنچا اور وہ تمام اعداءِ اسلام اور معاندین مفتوح اور مغلوب ہو کر گرفتار کر لیے گئے مگر آپ نے اپنے قومی اور وطنی بھائیوں کی گذشتہ تقصیرات پر بعینہ حضرت یوسف علیہ السلام والے کلمات لا تثریب علیکم الیوم فرما کر قلمِ عفو کھینچ دیا۔

سورہ ہود میں حضرت شعیب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی تذکیر و دعوت کے بعد یہ فرمایا:۔

يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ؁ یعنی اے میری قوم میری ضد اور عداوت کے جوش میں ایسی حرکتیں نہ کرنا جو تم کو گزشتہ اقوام کی طرح سخت تباہ کن عذاب کا مستحق بنا دیں۔ دیکھو نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کی امتوں پر تکذیب و عداوت کی بدولت جو عذاب آئے وہ پوشیدہ نہیں اور لوط علیہ السلام کی قوم کا واقعہ ان سب کے بعد ماضی قریب میں ہوا ہے اس کی یاد تمہارے حافظہ میں تازہ ہوگی، ان نظائر کو فراموش نہ کرو۔

پھر سورہ ہود کے اختتام کے قریب کی آیات پر غور فرمایئے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاۗءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰي لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ یعنی اوپر بہت سے انبیاء و رسل کے قصص مذکور ہوئے تھے۔ اب ختم سورت پر ذکر قصص کی بعض حکمتوں پر تنبیہ فرماتے ہیں ایسی گذشتہ اقوام اور رسل کے

واقعات سنکر پیغمبر اسلام کا قلب بیش از بیش ساکن اور مطمئن ہو سب اور امت کو تحقیقی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن میں نصیحت و تذکیر کا بڑا سامان ہے۔ آدمی جب سنتا ہے کہ میرے ابنائے نوع پہلے فلاں فلاں جرائم کے پاداش میں ہلاک ہو چکے ہیں تو ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ فلاں راستہ اختیار کرنے سے پچھلوں کو نجات ملی ہے تو طبعاً اس کی طرف رخ موڑتا ہے۔ واقعی قرآن کریم میں قصص کا حصہ اس قدر موثر اور مذکر واقع ہوا ہے کہ کوئی شخص جس میں تھوڑا سا آدمیت کا مادہ ہو اور خوف خدا کی ذرا سی رمق دل میں رکھتا ہو وہ ان قصص قرآنی کو سنکر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لاریب قرآنی قصص صرف امم سابقہ کے حالات اور گزشتہ واقعات کو تاریخی طور پر بیان نہیں کرتے بلکہ ان سے قوموں کے عروج و زوال کے اصول و قوانین اخذ کرنے اور سامعین کو عبرت دلانے اور پھر ہر امر میں خوف خدا کو پیش نظر رکھنے کا سبق دیتے ہیں فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ لوگوں کو یہ قصے سنایا کرو۔ شاید کہ یہ غور و فکر کریں۔ (الاعراف ۱۷۶)

قرآنی قصوں کی آیات بینات میں پہلی قوموں کی سرکشی آفات انفسی و آفاقی مصائب و آلام آنے کی حکمت اور مصائب سے ان کے متاثر ہونے کا ذکر ایک نہایت ہی عمدہ پیرایہ میں کیا گیا ہے اور ان کے عروج و زوال کا ایک حقیقت آموز اور عبرت انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے کہ امت مسلمہ جن پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ وہ خود ان سے عبرت و موعظت حاصل کرے اور پھر دنیا کی دوسری قوموں کو ان سے سبق سکھائے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ۝

شورائیت اور نظم و اطاعت

جناب افضل حسین صاحب سکریٹری جنرل جماعت اسلامی ہند

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

محترم بھائیو! اور عزیزو! باہمی مشاورت، نظم و ضبط اور سمع و طاعت کے سلسلے میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی نئی بات نہیں کہنی ہے۔ یہ وہی باتیں ہیں جو آپ حضرات برابر سنتے یا پڑھتے آئے ہیں۔ تذکیر کے لیے میں نے انھیں یک جا کرنے کی کوشش کی ہے۔

محترم حضرات! ہم سب متوسلین جماعت ہیں۔ مشترکہ نصب العین اور ایک ہی مقصد حیات نے ہم سب کو ایک لڑی میں پرو کر ایک برادری کی شکل دے دی ہے۔ ہماری جماعت بہت ساری کمزوریوں کے باوجود (جن سے ہم بخوبی واقف ہیں) ملک کی سب سے منظم جماعت تسلیم کی جاتی ہے۔

کوئی بھی اجتماعی ادارہ، خواہ وہ کسی محلہ کی اصلاحی کمیٹی ہو یا ملک گیر سماجی سیاسی یا مذہبی تنظیم اور وہ خواہ کتنی ہی منظم ہو، سارے اجتماعی معاملات میں اس کے تمام ارکان کا متفق الخیال ہونا ضروری نہیں ہے جس طرح ہر آدمی کی شکل و صورت، فطری و اکتسابی قوتوں و صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے اسی طرح سوچنے کے انداز میں بھی اختلاف کا ہونا فطری ہے۔ چنانچہ ہر معقول اجتماعیت ایسے طریقے بھی متعین کر دیتی ہے جس کے تحت باہمی اختلافات ایک نقطہ پر آکر ختم ہو جاتے ہیں یا اگر کسی درجے میں (فکری و نظری حد تک) باقی بھی رہ جائیں تو عملی کام میں وہ رکاوٹ نہیں بنتے۔ کیونکہ خودسر لوگوں کی جماعت، جس میں ہر شخص اپنی من مانی کرے حقیقت میں کوئی جماعت نہیں ہوتی بلکہ ایک بھیڑ سی ہوتی ہے جس سے کسی تعمیری کام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اسلام بغیر جماعت کے ہا نہیں ہے۔ اسی تصور کے تحت ہم سب جماعت اسلامی سے منسلک ہوئے ہیں

ہماری جماعت میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں۔ لیکن اسلامی اجتماعیت نے اختلافات ختم کرنے کے لیے درج ذیل طریقے وضع کیے ہیں۔ جن کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

۱۔ جو امور صراحتہً کتاب و سنت کے نصوص سے ثابت ہوں۔ ان میں کسی کو بھی اختلاف کرنے کا حق نہیں ہے۔ ایسے تمام معاملات میں آمنّا و صدّقنا، سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا طریقہ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ منصوص معاملات و مسائل میں اگر راہیں جدا ہو جائیں یا ہر فرد جماعت حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا الگ الگ معیار بنالے تو کوئی اجتماعیت چل سکتی ہے نہ برقرار رہ سکتی ہے۔

۲۔ البتہ قرآن و سنت کے نصوص کی تعبیر اور ان کے انطباق نیز اجتہادی امور میں نقطہ نظر کا فرق ہو سکتا ہے۔ یہ فرق اہل علم حضرات، مفسرین، محدثین اور فقہاء کی تحقیقات کی مدد سے دلائل کے ساتھ واضح کر کے دور کر سکتے اور نقطہ اتفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ اجماع اور تعامل امت بھی اس میں فیصلہ کن ہو سکتا ہے۔

۳۔ اسلامی اجتماعیت کا دائرہ اختلاف اصلاً تدابیر و مصالح سے تعلق رکھتا ہے۔ کب کیا بات کہی جائے؟ کیا اقدام کرنا مناسب ہوگا؟ کس رویہ میں دین کی خیر خواہی، ملت کی بہبود اور انسانیت کی فلاح ہے؟ کس صورت میں تحریک اسلامی کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے؟ کس راستہ پر چل کر دعوت حق کی راہیں کھلتی ہیں؟ دشواریوں پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے؟ اپنی صفوں کو کیوں کر مستحکم کیا جائے؟ کسی شخص یا گروہ کے بارے میں کیا رائے رکھی یا بیان کی جائے وغیرہ؟ اختلافی امور کے اسی دائرہ میں نصوص کی تعبیر و تاویل اور ان کے انطباق کا ہر وہ معاملہ بھی داخل ہے جس کا حل اجماع یا تعامل امت وغیرہ سے نہ ہو سکے۔

اس ذیل کے اختلافی امور کو طے کرنے کے لیے اسلام نے اصول مشاورت مقرر کیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران۔ ۱۵۱)	اے نبی! اہم (انتظامی و سیاسی) امور میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔
وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ شوریٰ۔ ۴۲-۳۹	اہل ایمان اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں

چنانچہ جماعت اسلامی کا پورا نظام بھی مقامی اکائیوں سے لے کر ملک گیر سطح تک شورائی ہے۔ مقامی اکائیاں اپنے متوسلین کے مشورے سے، مقامی امراء اپنے ارکان کے مشورے سے اور اگر مقامی ارکان کی تعداد

۲۰ سے زائد ہو تو ان کے منتخب نمائندوں پر مشتمل مقامی شوریٰ کے مشورے سے، امیر حلقہ اپنے حلقہ کی شوریٰ اور امیر جماعت مرکزی مجلس شوریٰ کے مشورے سے اپنے اپنے دائرۂ کار میں جماعت کے کام انجام دیتے ہیں۔ جماعت اسلامی باہمی مشاورت کو جو اہمیت دیتی ہے شاید ہی کوئی دوسری جماعت اتنا اہتمام کرتی ہوگی۔ ساتھ ہی کوشش یہی کی جاتی ہے کہ فیصلے حتی الامکان اتفاق رائے سے ہوں۔ رائے شماری کی شاذ و نادر ہی نوبت آتی ہے

مشاورت سے نہ صرف باہمی اختلاف ختم ہوجاتے ہیں بلکہ اس سے اور بھی کئی فائدے ہیں:۔

(۱) بہت سے ذہن بحث و تمحیص سے ہر معاملے کے اچھے برے پہلوؤں کا جائزہ لیکر کسی بہتر نتیجے پر پہنچتے ہیں

(۲) پوری جماعت کا بلاواسطہ یا بالواسطہ مشورہ شامل ہو تو پوری جماعت اطمینان قلب سے فیصلہ پر عملدرآمد کی کوشش کرتی ہے۔ کسی فیصلہ کو اپنے اوپر کوئی تھوپی یا ٹھونسی گئی چیز نہیں سمجھتی۔

(۳) ارکان جماعت کی معاملہ فہمی کی تربیت ہوتی ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ مشاورت کے ساتھ اس کے آداب بھی ملحوظ رہیں۔ یعنی

(۱) ہر شخص ایمانداری کے ساتھ اپنی رائے پیش کرے۔ کوئی بات دل میں چھپا کر نہ رکھے۔ رائے دینے سے گریز یا کسی مصلحت کی وجہ سے اپنی صوابدید کے خلاف رائے دینا یا اپنی رائے چھپانا، اپنی ذات اور جماعت دونوں پر ظلم ہے۔

(۲) بحث میں ضد، ہٹ دھرمی اور کسی قسم کے تعصب کا دخل ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

(۳) کسی شخص کو اپنی رائے پر اتنا مصر نہ ہونا چاہیے کہ اسی کی بات مانی جائے ورنہ وہ جماعت سے تعاون نہ کرے گا۔ کیونکہ اس کا یہ عمل اجتماعیت کے خلاف ہوگا۔ بعض لوگ اپنی کم علمی کی بنا پر اس کو حق پرستی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ صریحاً اسلامی احکام اور صحابہ کرام کے متفقہ تعامل کے خلاف ہے۔

(۴) فیصلہ ہوجانے پر اس کو پوری خوش دلی کے ساتھ عمل میں لانے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ اپنی رائے کچھ بھی رہی ہو۔ اگر کوئی خلش رہ بھی جائے تو اسے اجتماعیت پر قربان کر دینا چاہیے۔

(۵) منشا کے خلاف کوئی بات طے ہوجانے پر جماعت میں بد دلی پھیلانا بدترین خیانت اور غداری ہے اجتماعی فیصلے کے بعد اپنی جداگانہ رائے کی برتری ثابت کرتے یا فیصلے کے خلاف تذبذب یا تردد و تکدر پیدا کرنا، نجوی (Canvassing) کی مہم چلانا، جتھہ بندی، کھسر پھسر وغیرہ بھی اجتماعیت کے لیے سم قاتل ہیں،

اُن سے سمجھنا چاہیے۔

(۶) کسی کو بھی اپنے کو عقلِ کل نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ اپنی ذہنی برتری کے زعم میں مبتلا ہونا چاہیے۔ دوسروں کو بھی حسنِ نیت کا مالک اور صاحبِ عقل و شعور تصور کر کے اس کے دلائل کو پوری توجہ سے سننا چاہیے۔

کوئی مسئلہ خواہ کتاب و سنت کی تعبیر و تاویل سے متعلق ہو یا نصوص سے، کسی حکم کے استنباط سے تعلق رکھتا ہو یا دنیوی تدابیر سے متعلق ہو، تینوں صورتوں میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب تک مسئلہ زیرِ بحث رہتا اس میں ہر شخص اپنے علم و صوابدید کے مطابق پوری صفائی سے اظہارِ خیال کرتا اور اپنی تائید میں دلائل پیش کرتا تھا، مگر جب کوئی فیصلہ ہو جاتا تو چاہے وہ کسی شخص کی رائے کے خلاف ہو، وہ یا تو اپنی رائے واپس لے لیتا یا اپنی رائے کو درست سمجھنے کے باوجود فراخ دلی کے ساتھ جماعت کا ساتھ دیتا تھا۔ جماعتی زندگی کے لیے یہ طریقہ ناگزیر ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں ہر شخص اپنی رائے پر اس قدر مصر ہو کہ جماعتی فیصلوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے وہاں آخر کار پورا نظامِ جماعت درہم برہم ہو کر رہے گا۔

مشاورت وغیرہ سے متعلق میں نے جو باتیں عرض کی ہیں وہ بربنائے مصلحت ہی نہیں ہیں بلکہ قرآن و سنت کا یہی تقاضا ہے۔ صحابۂ کرامؓ اور مخلص خادمانِ دین و ملت کی ہمیشہ یہی روش رہی ہے۔ اس ضمن میں بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے۔

عن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ قال: بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط و المکرہ وعلی اثرۃ علینا وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ تعالٰی فیہ برھان وعلی ان نقول بالحق اینما

حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی یعنی معاہدہ کیا کہ ہر حالت میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان لوگوں کی جن کو صاحبِ امر مقرر کیا گیا ہو، بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی، خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اس حالت میں بھی ہم صاحبِ امر کی بات مانیں گے جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلہ میں ترجیح دی جاتی ہو یا اس صورت میں کہ ہم دباؤ میں ہوں

كنا لا نخاف في الله لومة لائم (متفق علیہ)

اور اس بات پر ہم نے آپ سے معاہدہ کیا کہ جو لوگ ذمہ دار ہوں گے ان سے جھگڑنے یا ان کا منصب و اختیار چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ البتہ اس صورت میں کہ ذمہ دار صریح معصیت کا حکم دے یا اس سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ ایسا ایسا کفر جس کی کوئی تاویل ہی نہ ہو سکے اور جس کے متعلق ہمارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل ہو۔ اور اس بات پر ہم نے آپ سے معاہدہ کیا کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ :-

- اجتماعی فیصلوں اور ارباب امر کے احکام کی اطاعت آسانی و تنگی، خوش گواری و ناگواری ہر حال میں کی جائے۔ کسی کے رویہ، طرز عمل یا حرکات و سکنات میں کسی تکدر کا شائبہ بھی نظر نہ آئے۔
- اہل امر (امیر و شوریٰ) سے اختیار چھیننے، ان کے اختیار کو کمزور کرنے یا اسے بے اثر بنانے کی، نیز بحث بحثی اور شدت اختلاف یا اظہار ناپسندیدگی اور جتھہ بندی کی ہرگز کوشش نہ کی جائے۔
- اجتماعی فیصلہ کو نہ ماننا یا زبان سے مان کر عمل سے اس کا حق ادا نہ کرنا یا اس کے تقاضے میں مثبت کردار کے بجائے منفی رول ادا کرنا۔ ذہنی بیماری کا پتہ دیتی ہیں جن سے اجتماعیت کمزور پڑتی ہے۔ اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔
- اختلاف کی تو صرف ایک ہی حتمی بنیاد ہے وہ یہ کہ کھلم کھلا کفر کا صدور یا اس کا حکم، ارباب مشاورت یا اصحاب امر کی طرف سے ہو، ایسا کفر جس کی کوئی تاویل نہ ہو سکتی ہو یا جس کو کفر تسلیم کرنے کی بنیاد صرف ذوق یا جذبات نہ ہوں بلکہ کتاب و سنت کے صریح اور محکم دلائل ہوں۔

اگر نظام جماعت کی پابندی کی اس آخری حد کا لحاظ نہ کیا جائے تو کوئی اجتماعیت قائم نہیں رہ سکے گی اور نہ کسی فرد یا کسی شوریٰ کی سربراہی باقی رہ جائے گی۔

نظم و ضبط

چند لفظوں میں اس بارے میں نظم و ضبط کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہر تعمیری کام منظم سعی و کوشش چاہتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جماعت میں مضبوط ڈسپلن ہو، اور

۱۔ وہ ٹیم بنکر اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مل جل کر کام کرے ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جماعت میں باہم محبت و اخوت، ایک دوسرے کے لیے خیرخواہی ہمدردی اور دل سوزی کا جذبہ ہو۔

۲۔ جو ضابطہ طے کیا جائے پوری جماعت اس کی پابندی کرے ۔

۳۔ ہر فرد فرض شناس ہو اور اپنے ذمہ کا کام ٹھیک وقت پر مستعدی کے ساتھ انجام دے ۔

۴۔ جماعت میں جس کو جس درجے میں بھی صاحب امر بنایا گیا ہو اس کے احکام کی اطاعت کی جائے۔

۵۔ ایک فیصلہ ہوتے ہی اس کو عمل میں لانے کے لیے تمام پرزے حرکت میں آجائیں اور جس نقطہ پر جتنی قوت لگانے کی ضرورت ہو وہ بروقت مجتمع کر سکیں ۔

۶۔ ہر فرد جماعت کو چاہیے کہ وہ خود بھی بدنظمی سے بچے، پورے طور سے نظم جماعت کا پابند رہے اور پوری جماعت کو بھی انتشار و بدنظمی سے بچانے کی بھرپور کوشش کرے تاکہ اس ملک میں دین حق کی دعوت، اشاعت اور اقامت کی راہ میں اخلاص وللّٰہیت، استقلال و پامردی و تن دہی و مستعدی کے ساتھ مل کر جدوجہد کی توفیق نصیب ہو اور وہ اپنے ہاتھوں ناکامی اور رسوائی سے محفوظ رہیں ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو شریعت کے نظام سمع و طاعت، اس کے ضابطہ مشاورت اور اولی الامر کے حقوق کو اچھی طرح سمجھنے اور ان کو قدم قدم پر ملحوظ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ٥

۳۱ مارچ ۸۵ء کو حلقہ دہلی پنجاب اور مرکز کے ارکان کے اجتماع منعقدہ مرکز دہلی میں پیش کیا گیا

شورائے

"اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔" (الشوریٰ ۔ ۳۸)

اس چیز کو یہاں اہل ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے اور سورۂ آل عمران آیت ۱۵۹ میں اس کا حکم دیا گیا ہے اس بنا پر مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطہ کی صریح خلاف ورزی ہے ۔
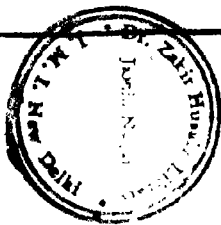
دعوتِ اسلامی کی فکری اور فلسفیانہ بنیاد

ڈاکٹر سید معین الدین قادری

دعوتِ اسلامی ایک ہمہ گیر اور عالمگیر دعوت ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃ (پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو) زندگی کا کوئی شعبہ، کوئی پہلو، کوئی گوشہ اس دعوت کے اصول و کلیات، ضوابط اور احکام، تقاضوں اور مطالبات کے لیے ممنوع (OUT OF BOUND) علاقہ نہیں ہے۔ یہ دعوت پبلک اور پرائیوٹ لائف دین و دنیا اور سیاست و مذہب کی تفریق کو کلیتاً اور واضح الفاظ میں رد کرتی ہے۔

اس دعوت کی ایک فکری اور فلسفیانہ بنیاد ہے جس کا نہ صرف یہ کہ آپ نے اعلان اپنی بعثت کے بعد اپنی دعوت کے آغاز ہی میں واشگاف اور واضح الفاظ میں کر دیا تھا بلکہ اس کے سلسلے میں کسی تخویف، ترغیب، تحریص اور بڑی سے بڑی پیش کش کے ذریعے بھی آپ کو کسی مفاہمت (COMPROMISE) پر راضی نہ کیا جا سکا — یہ فلسفیانہ بنیاد یا بنیادی عقیدہ کلمۂ توحید اور اقرارِ رسالتِ محمدی ہے

ارید منھم کلمۃ تدین لھم بھا العرب و یملکون بھا العجم۔

"میں ان سے صرف ایک مطالبہ ہے۔ ایک ایسے کلمہ کو ماننے کا مطالبہ جو جزیرہ عرب کو ان کا تابع فرمان بنا دے گا اور جس کے ذریعے وہ عجم کے حاکم و فرماں روا ہو جائیں گے" یہ کلمہ کیا تھا؟ یہ کلمہ تھا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ" میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔
اقرارِ توحید و رسالت میں منطقی تقاضے کے طور پر بھی ایمان بالآخرت شامل ہے اور قرآن و حدیث کی صراحت کی بنیاد پر بھی۔

بنیادی عقیدہ اس دعوت کی فکری اور فلسفیانہ بنیاد، اس کا عقلی جواز، اس کی توانائی کا سرچشمہ اور قوت محرکہ ہے۔ وہی اقدار کا تعین کرتا ہے۔ ان کو مستقل بالذات اور دائمی حیثیت عطا کرتا ہے۔ اخلاق کی مکرمت، اعمال کے صالح اور غیر صالح، باوزن اور بے وزن ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہی دعوت کے نتیجے میں اور تحریک اقامت دین کے باثمر اور بار آور ہونے کی صورت میں وجود میں آنے اور تشکیل پذیر ہونے والے معاشرے اور نظام کے مختلف اجزا کو مربوط رکھتا ہے۔ اپنے ماننے والوں میں حرکت و عمل کی صلاحیت پیدا کرتا، انہیں حوصلہ اور عزم و ہمت بخشتا ہے اور نہ ماننے والوں کی تنقید و تحقیق و تفحص کا جواب مہیا کرتا ہے۔

ایک پختہ عقیدہ ہی انسانی رویے کو رخ اور رفتار بہم پہنچاتا ہے۔ اس کے بغیر اصلاح اخلاق کی گفتگو بے سوز، صدا بہ صحرا اور سعی ناکام اور عمل کو نارو زبوں اور بے ثمر ہونا ہی چاہیے۔

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو   ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں   ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

(اقبالؔ)

یہ بنیادی عقیدہ، فلسفیانہ اور فکری بنیاد انسانی رویے اور اخلاق پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی انسانی رویے کو استقامت اور اخلاق کو رفعت عطا کرتا ہے۔ انسانی آرزوؤں کی تشکیل کرتا اور حرکت و عمل کے اہداف و مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ خیر و شر اور معروف و منکر کی باطنی حس اور تمیز پیدا کرتا ہے۔ ایسی کہ "اگر ماحول کے اثر اور بداعمالی پر اصرار کے نتیجے میں اصل فطرت ہی مسخ نہ ہو گئی ہو تو غیر ارادی طور پر نیکی سے قلب میں انشراح کی اور گناہ سے انقباض کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

وحدت الٰہ، وحدت آدم اور احترام انسانیت کی متقاضی ہے۔ اس لیے "مومن مخلص" سے بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک کا ظہور ایک فطری، لازمی اور ناگزیر عمل ہے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک، اخلاق پسندیدہ اور اعمال صالحہ کا صدور، ایمان کا نتیجہ بھی ہے اور شہادت بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وسعت اخلاق، فیاضی، علوئے ظرف اور حسن سلوک کی تعلیم بھی دی ہے اور تاکید بھی کی ہے۔

(۱) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ   حضرت حذیفہ رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگ دوسروں کی

وسلم: - لا تکونوا امعۃ تقولون ان احسن الناس احسنا وان ظلموا ظلمنا ولکن وطنوا انفسکم ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساؤوا ان لا تظلموا

(ترغیب و ترہیب بحوالہ ترمذی)

تقلید اور پیروی کرنے والے نہ بنو یعنی یوں نہ سوچو کہ لوگ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور اگر لوگ ہم پر ظلم کریں گے تو ہم بھی ان پر ظلم کریں گے۔ نہیں، بلکہ اس بات پر اپنے آپ کو جماؤ (پختہ عزم و طریقے سے اپنے آپ کو عادی بناؤ) کہ لوگ اچھا سلوک کریں تو تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اگر برا برتاؤ کریں تو تم ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کرو۔

(۲) عن ابی الاحوص الجشمی عن ابیہ قال قلت یا رسول اللہ ارایت ان مررت برجل فلم یقرنی ولم یضفنی ثم مر بی بعد ذالک اقریہ ام اجزیہ قال بل اقرہ

(مشکوٰۃ، باب الضیافۃ)

ابوالاحوص جشمی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا، اگر میں کسی شخص کے پاس سے گذروں اور وہ میری ضیافت و مہمانی کا حق ادا نہ کرے اور کچھ روز بعد اس کا گذر مجھ پر ہو تو کیا میں اس کی مہمانی کا حق ادا کروں یا اس کے روکھے پن اور بے اعتنائی کے جواب میں) جیسے کو تیسے کا معاملہ اس کے ساتھ کروں۔ آپ نے فرمایا نہیں تم اس کی مہمانی کا حق ادا کرو

یہ فلسفیانہ بنیاد خالق، انسان اور کائنات کے تعلق کی وضاحت بھی کرتی ہے اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ متوازن طور پر ہم آہنگ بھی رکھتی ہے۔ یہ انسانی صلاح و فلاح کے لیے ایک معقول، قابل عمل (FEASIBL) اور یقین آفریں (CONVINCING) بنیاد اور وسیلہ فراہم کرتی ہے اور

نتائج و ثمرات کے باب میں اپنی پشت پر ناقابل تردید تاریخی شہادت و ضمانت بھی رکھتی ہے اور سازگار حالات سے مقید و مشروط نہیں ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں محتاج بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

بنی نوعِ انسان کی صلاح و فلاح کی تنہا ضمانت اب یہی دعوت ہے۔

(۱) عن جابر قال قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفس محمد بیدہ لو بدا لکم موسیٰ فاتبعتموہ وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل ولو کان حیا وادرک نبوتی لاتبعنی وفی روایۃ ما وسعہ الا اتباعی

(مشکوٰۃ ص۳۲)

حضرت جابر سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے۔ اگر موسےٰ تمہارے سامنے آجائیں اور تم ان کی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤگے اگر موسےٰ زندہ ہوتے اور میرا زمانۂ نبوت پاتے تو میری پیروی کرتے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے لیے میری اتباع کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ ہوتا۔

(۲) لقد جئتکم بیضاءَ نقیۃ ولو کان موسیٰ حیًّا ما وسعہ الا اتباعی

(مسلم، جابرؓ)

میں تمہارے پاس وہ شریعت لایا ہوں جو سورج کی طرح روشن اور آئینہ کی طرح روشن اور آئینہ کی طرح صاف ہے اور اگر آج موسےٰ زندہ ہوتے تو انھیں میری پیروی کرنی پڑتی۔

(۳) بعثت انا والساعۃ کھاتین یعنی اصبعین

(بخاری و مسلم)

میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں۔ یہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں

مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے بیچ کوئی انگلی حائل نہیں ویسے ہی میرے اور قیامت کے درمیان

کوئی نبوت نہیں ہے۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے اور قیامت تک میں ہی نبی رہنے والا ہوں

(۵) ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخٰسرین ٥ (آل عمران: ۳/۸۵)	اسلام کے علاوہ جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے گا اس کا وہ طریقہ ہرگز نہ قبول کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

انبیاء نے شدید مخالفتوں کے درمیان اور لومۃ لائم کی پروا کیے بغیر اپنے مسلم ہونے کا اعلان کیا اور اسلام ہی کی طرف خلق خدا کو دعوت دی اور اسلام کی فکری اور فلسفیانہ بنیاد اللہ واحد کی خالص اور بے آمیز عبادت پر انگلی رکھ دی ہر چند کہ وہ ایک کی اقلیت میں تھے اور اکثریت منکرین و مشرکین کی تھی۔

(۱) فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَمَا سَاَلْتُکُمْ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یونس ۱۰/۷۱-۷۲)	(نوح نے کہا) تم نے میری نصیحت سے منھ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلبگار نہ تھا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں۔
(۲) یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ	اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

اب اسلام کا رشتہ اس کی فلسفیانہ بنیاد سے منقطع کرکے یا اس کی ہمہ گیریت، عمومیت اور جامعیت پر خط نسخ کھینچ کر اور تحفظات ذہنی (MENTAL RESERVATION) کے ساتھ، اس کی ماہیت حقیقت و نوعیت و حیثیت کو ہدف ابہام بنا کر اکثریت کے توحش کو رفع کرنے کے لیے یا ان کے پاس خاطر سے کوئی دل کش عنوان دے کر جو بداہۃً "الاسلام" کا قطعاً مترادف و متبادل نہیں ہو سکتا۔ اصلاح اخلاق کی محروم اساس عمومی تحریک چلانا اور یہ دعوے کرنا یا بشارت دینا کہ اس سے عالمی سطح کی بات تو دور رہی ملکی نہیں علاقائی سطح پر بھی کوئی صالح انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ خالص خوش فہمی یا ابلہ فریبی ہے تاریخ کی شہادت اس کے خلاف ہے عقل و منطق اس کی تردید کرتی ہے ــــ اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا مشرکین کی اکثریت کے درمیان اور معاندین کی ترغیب و تخویف کے باوجود کلمۂ توحید پر غیر متزلزل اصرار و اعلان

اس کی قطعی نفی کرتا ہے۔

اسلام کی حقیقی اور واقعی حیثیت یہ ہے کہ سلبی طور پر وہ رائج اور ڈھیلی ڈھالی (LOOSE) اصطلاح میں مذہب (صرف چند مراسم عبادت کا مجموعہ) نہیں ہے۔ وہ قومی، وطنی اور نسلی مذہب بھی نہیں ہے اور ایجابی طور پر وہ ساری انسانیت کی مشترک میراث ہے۔ انسانی تاریخ کی طویل مدت کے دوران اس کے "مسمی" پر آمیزش اور تحریف کا جو غبار بیٹھ گیا تھا، اس سے پاک اور صاف کر کے خالص قطعی، آخری اور تازہ ترین شکل میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اس کو ہدایت انسانی کے لیے آخری بار بھیجا گیا۔ اسلام اپنے مسمیٰ کا ایسا اسم ہے کہ کوئی بھی دوسرا عنوان اس کا متبادل ہو ہی نہیں سکتا اس کو قلم زد کر دیا جائے تو اس کا مسمیٰ معدوم ہو جاتا ہے۔ سارے روابط (ASSOCIATIONS) اور حوالے یک بارگی قطع ہو جاتے ہیں اور آدم صفی اللہ سے لیکر ختم رسل تک سارے انبیاء کا خطاب اپنا مغز، جوہر، منشاء و مفہوم کھو دیتا ہے کیونکہ بلا استثنا سب نے "اسلام" ہی کو اپنے خطاب کا عنوان بنایا ہے اور اسی کی اصطلاح میں گفتگو کی ہے۔

اسلام کی حقیقت اور اس کی روح

"جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور عملاً نیک ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ (لقمان - ۲۲)

اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ پوری طرح اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دے دے۔ اپنی کوئی چیز اس کی بندگی سے مستثنیٰ کر کے نہ رکھے۔ اپنے سارے معاملات اس کے سپرد کر دے اور اسی کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی پوری زندگی کا قانون بنائے۔

اور عملاً وہ نیک ہو" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ زبان سے تو وہ حوالگی و سپردگی کا اعلان کر دے مگر عملاً وہ رویہ اختیار نہ کرے جو خدا کے ایک مطیع فرمان بندے کا ہونا چاہیے۔

"قابل اعتماد سہارا تھام لینے کا مفہوم" یہ ہے کہ نہ اس بات کا کوئی خطرہ ہو کہ اسے غلط رہنمائی ملے گی نہ اس بات کا کوئی اندیشہ ہو کہ خدا کی بندگی کر کے اس کا انجام خراب ہوگا۔"

شیخ عبدالوہاب متقی

(محمد صغیر حسن معصومی)

دہلی کے مشہور محدث شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱) (م ۱۰۵۲ھ) کے شیخ طریقت اور جلیل القدر استاد کا نام نامی حضرت شیخ عبدالوہاب متقی تھا۔ یہ شیخ ولی اللہ کے بیٹے اور مالوہ کی پرانی راجدھانی منڈو (۲) کے ایک نہایت شریف خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ زمانہ کی بدسلوکی سے شیخ ولی اللہ اپنے فرزند اور اہل و عیال کو ساتھ لیکر منڈو (منڈوا) سے نقل مکانی کر کے برہان پور میں جا کر آباد ہوئے۔

شیخ عبدالوہاب کی طفولیت ہی کا زمانہ تھا کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جب سن شعور کو پہنچے تو سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور رضائے الٰہی سے گجرات، دکن اور سیلون میں سیاحت کرتے رہے۔ اکثر و بیشتر تین شبانہ یوم سے زیادہ کہیں قیام نہیں کرتے تھے اور اگر کسی جگہ زیادہ دنوں تک ٹھہرتے بھی تو کسی فنی علم بزرگ کی صحبت میں علم کے حصول میں کوشاں رہتے۔

مکہ معظمہ کی طرف ہجرت

عنفوان شباب ہی میں جب کہ ابھی تقریباً ۲۰ سال کے تھے کہ شیخ عبدالوہاب کو شوق سفر مکہ معظمہ لے گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عرب کے مشہور محدث و مورخ شیخ علی المتقی کی علمی شہرت عروج پر تھی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کے استاد کے خلف شیخ عبدالوہاب تشریف لائے ہوئے ہیں تو ان سے ملاقات کی۔ شیخ نے دیکھا کہ شیخ عبدالوہاب نہایت خوش نویس ہیں، بڑے احترام و محبت سے پیش آئے اور خواہش ظاہر کی کہ ان کی کتابوں کی نقلیں تیار کریں۔ شیخ عبدالوہاب بچپن میں اپنے والد سے ان کا ذکر سن چکے تھے۔ بلکہ ان کے والد نے ہدایت کی تھی کہ وہ شیخ علی اور ان کے جیسے اہل علم کی صحبت میں رہکر علم کی تحصیل کریں۔ چنانچہ شیخ عبدالوہاب نے شیخ علی کی پیشکش فوراً قبول کرلی اور ان کی تالیفات کی کتابت [illegible] تیار ہو گئے

شیخ عبدالوہاب کو خط نستعلیق میں مہارت تھی اور قرآن و حدیث کی کتابت اہل زہد و تصوف خط نسخ میں بالعموم کیا کرتے تھے۔ شیخ علی کو خواہش ہوئی کہ شیخ عبدالوہاب خط نسخ میں بھی مہارت حاصل کریں اور ان کی کتابیں نسخ ہی میں نقل کریں۔ (۳)

شیخ عبدالوہاب نے بہت جلد خط نسخ کی مشق میں کمال حاصل کر لیا اور شیخ علی کی مولفات نقل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ شیخ علی کی کتابوں کو نہ صرف جمع کیا اور نقل کیا بلکہ نقل شدہ نسخوں کا مقابلہ محنت سے کرتے اور تصحیح کا کام بھی انجام دینے لگے۔ خوشنویسی کے ساتھ اللہ نے ان کو زود نویس بھی بنایا تھا۔ چنانچہ ہزار ہزار سطروں کو ایک دن میں لکھ ڈالتے اور بارہ ہزار سطروں کی نقل بارہ دنوں میں مکمل کر دیتے۔ انھوں نے شیخ علی متقی کے اکثر علمی کارناموں کو نہ صرف نقل کیا، بلکہ ان کی ترتیب اور تصحیح کا کام بھی انجام دیا۔ (۴)

انہی ایام میں قضا کار، مکہ معظمہ میں سخت قحط پڑا۔ شیخ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پھر بھی اپنے شیخ کے علاوہ کسی دوسرے کی کتابوں کی کتابت قبول نہ کی اور بینگن کی چند قاشوں پر اپنی گذر اوقات کرنے لگے۔ بینگن کے ٹکڑوں کو نمک لگا کر محفوظ کر لیتے اور چند قاش کھا کر پورا دن گذار دیتے۔

شیخ علی کے ساتھ ان کی عقیدت

شیخ عبدالوہاب اپنے استاد شیخ علی کی متابعت میں سرگرم رہے اور ان کی رضا جوئی میں ہمیشہ سعی کرتے رہے۔ درحقیقت اس جدوجہد میں انھوں نے اپنے کو فنا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باطن و ظاہر کے تزکیہ میں کمال حاصل کیا اور تزکیہ نفس میں اس قدر ترقی حاصل کی کہ ان کو اپنے شیخ کی رفاقت نصیب ہوئی۔ ایک موقع پر شیخ نے کھلے الفاظ میں فرمایا:۔ "ایک موقع پر جب میں نے اللہ کی راہ میں ایک ساتھی پایا تو یہ یقین ہو گیا کہ عبدالوہاب ہیں۔ (۵)

شیخ کی نصیحت

شیخ عبدالوہاب بیان فرماتے ہیں: "شیخ کی خواہش ہوئی کہ میں غنا پر فقر کی فضیلت کا اقرار کروں۔ انھوں نے یہ نصیحت بھی کی کہ اس عقیدے پر سختی کے ساتھ قائم رہوں کیونکہ خود ان کو اس اعتقاد پر لذت محسوس ہوتی رہی تھی۔

شیخ کا بیان ہے کہ اس اقرار کے بعد مجھ ان کا تلمذ حاصل ہو گیا اور شیخ علی متقی نے ارادت کے لیے ایا

[illegible] اپنی صحبت میں ماہ جمادی الاولیٰ ۹۴۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۵۳۵ء [illegible] کو قبول کیا۔ اس وقت سے برابر ان کی صحبت میں رہا یہاں تک کہ شیخ نے دوسری تاریخ ماہ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ مطابق ۴ نومبر ۱۵۶۷ء میں رحلت فرمائی۔

شیخ عبدالوہاب شیخ علی کی خدمت میں ۱۲ سال وابستہ رہے اور ۴۶ سال کی عمر میں ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۲ء میں اس دارفانی سے عالم بقا کو کوچ کیا۔ مکہ معظمہ میں ۴۴ سال ان کا قیام رہا اور اسی تعداد کے مطابق حج کی سعادت سے مشرف ہوئے (۶)

شیخ کے اخلاق و فضائل

شیخ عبدالوہاب اپنے شاگردوں اور مریدوں پر بڑے مہربان تھے اور حاجت مندوں اور غریبوں کی امداد و اعانت کے لیے مشہور تھے۔ اپنے استاد شیخ کے نہایت لائق اور سچے جانشین تھے۔ اپنے استاد شیخ کے نہایت لائق اور سچے جانشین تھے۔ حرمین شریفین، یمن مصر، اور شام کے علماء و فضلاء ان کی عزت اور بے حد احترام کرتے تھے اور انہیں شیخ ابوالحسن شاذلی کے مرید شیخ ابوالعباس مرسی کا نہایت قریبی مرید سمجھتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی رقمطراز ہیں:۔

"یمن کے ایک بڑے مشہور عالم نے حرمین شریفین کے لوگوں کو ان کے متعلق لکھا:۔

علیکم یا اھل الحرمین بالشمعۃ	اے اہل مکہ و مدینہ اپنے درمیان اس روشن
المضیئۃ من اللہ فیکم	شمع کی صحبت لازم پکڑو اور ان کی روشنی
فاستضیئوا بہ	سے استفادہ کرو۔

یمن کے ایک مشہور و معروف عالم سید حاتم کو مکہ میں شیخ سے ملنے کی آرزو ہوئی۔ جب انھوں نے باریابی کی اجازت چاہی تو شیخ نے ان کو پیغام بھیجا "دلوں کا ملنا کافی ہے، جسمانی ملاقات مطلوب نہیں۔" اس پیغام سے سید مطمئن ہو گئے اور کوچ کر گئے۔ (۷)

شیخ عبدالحق بیان کرتے ہیں کہ جب وہ خود ہندوستان واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے تو یمن کے لوگوں سے انھوں نے سنا کہ سید حاتم نے دوبارہ ارادہ کیا کہ حج کے زمانے میں شیخ کو دیکھیں۔

شیخ عبدالحق رقمطراز ہیں کہ جب وہ حزب البحر نقل کر رہے تھے تو ایک بڑے مشہور [illegible] شیخ [illegible]

اول ملاقات کو تشریف لائے۔ ان فاضل بزرگ نے ان سے پوچھا "آپ کیا لکھ رہے ہیں؟" جواب دیا "یہ حزب البحر ہے۔ میں اس کو نقل کر رہا ہوں کہ اپنی واپسی سفر کی کشتی میں پڑھوں گا۔" شیخ علاؤالدین نے پھر پوچھا۔ کیا اس کے پڑھنے کی کسی سے اجازت لی ہے؟ شیخ نے جواب میں فرمایا۔ ہاں میں شیخ عبدالوہاب متقی سے اس کے پڑھنے کی اجازت حاصل کروں گا۔ پھر سوال کیا۔ کیا آپ شیخ عبدالوہاب کو جانتے ہیں۔ شیخ علاؤالدین کو جواب دیا۔ "جی ہاں" میں ان کی خدمت میں دو سال رہا ہوں۔ شیخ نے فرمایا "آپ کو خوشخبری ہو۔ آپ کا حج مقبول اور آپ کی محنت کا صلہ محفوظ۔ شیخ عبدالحق نے کہا۔ آپ یہ کیسے کہتے ہیں۔ شیخ علاؤالدین نے جواب دیا۔ میں یمن کے شہروں میں سفر کرتا رہا اور علماء و فضلاء اور وہاں کے لوگوں سے ملتا رہا سب بالاتفاق شیخ کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں اور ان کو اپنے وقت کا قطب کہ سمجھتے ہیں۔(۸)

شیخ کا طریقہ تصوف

شیخ صوفیانہ حقائق پر مشتمل کتابوں کو پڑھنا پسند نہ کرتے تھے اور شیخ ابن العربی کی کتاب فصوص الحکم جیسی کتابوں میں مشغول ہونے کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ اور نہ ان کتابوں پر فقہاء اور متکلمین کی عادت دیرینہ کے مطابق نقد و تبصرہ بھی فرماتے تھے۔ ان کی ہدایت ہمیشہ یہی رہی کہ اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق اپنا عقیدہ ظاہر و باطن طور پر درست رکھنا چاہیے۔ اپنے ایمان و عقیدے کی پختگی حاصل کرنے کے بعد اہل باطن کی تحریرات سے واقفیت حاصل کرنا چاہیے اور اہل باطن کے رموز و امثال و مباحث کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مشکوک و مشکل مقامات سے گذرتے ہوئے اپنے مطالعے کے دوران ہرگز شکوک و شبہات کو جو بیش آئیں اہمیت نہ دیں۔ وقتاً فوقتاً یہ شبہات خود بخود دفع ہو جاتے ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے اپنے کو صراط مستقیم پر قائم رکھیں۔ یہاں تک کہ مہمل اور باطل مباحث سے کبھی تعصب و ناپسندیدگی کا تصور ظاہر نہ ہونے دیں۔ اگر کوئی شخص غور و خوض کے بعد کسی بات کا رد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ ورنہ سنی سنائی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر اپنا مطالعہ جاری رکھے۔

شیخ عبدالوہاب عدن کے بزرگ صوفی شیخ عبدالکریم الجیلی کی کتاب "الانسان الکامل" کے بڑے مداح اور اس سے بہت متاثر تھے۔

اہل السنت والجماعت کے طریقے پر شیخ ریاضت باطنی میں مشغول رہنے کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اہل باطن کے لیے شرط سمجھتے تھے۔ وہ نظریہ وحدۃ الوجود کی معرفت کو صوفیاء کے طریقے پر گامزن ہونے کے لیے ضروری

[illegible] نظریہ وحدۃ الوجود کی معرفت کو صوفیاء کے طریقے پر کامزن ہونے کے لیے ضروری نہیں سمجھتے

فصوص میں [illegible] کے بیان کردہ نکتے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

اگرچہ شیخ محفل سماع میں حاضری پر مشائخ پر جرح و قدح نہیں کرتے تھے کہ یہ محفل اللہ تعالیٰ کی حمد اور پیغمبر اسلام کی نعت کے اشعار سننے کو ترتیب دی جاتی ہے، لیکن اپنے عقیدت مندوں کے لیے اس عمل کو پسند نہ فرماتے تھے۔ راہ چلتے گانے کی آواز سن کر دھیان نہ دیتے اور اس عمل کو ہرگز پسند نہ کرتے تھے ایک بار شیخ عبدالحق نے سماع کی محفلوں کے بارے میں جو ان دنوں ہندوستان میں بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد کی جاتی تھی شیخ کا فیصلہ جاننا چاہا۔ شیخ نے واضح طور پر کہا کہ اس عمل کی اجازت نہیں اور اس سے احتراز ضروری ہے۔ (۹)

ان کا خاندان

شیخ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تنہائی میں گذارا جن دنوں وہ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے وہ غیر شادی شدہ تھے۔ جب چالیس پچاس کے درمیان ان کی عمر تھی تو انھوں نے شادی کی۔ شادی سے پہلا انھوں نے جو کچھ کتابوں کی نقل سے لوگوں سے حاصل کیا تھا۔ سب کو غریبوں اور حاجتمندوں میں تقسیم کردیا۔ صرف اپنے لیے کتابوں کے لیے اور کپڑے اور خوراک کے لیے کچھ رقم اپنے پاس رکھی۔ شادی کے بعد اگرچہ اپنے خاندان کے لوگوں اور قرابت داروں کو ترجیح دیتے تھے مگر ناداروں اور محتاجوں سے غافل نہ رہتے تھے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے ناداروں کی وہ ہمیشہ مدد کرتے تھے اور ان کی خوراک، کپڑے اور کچھ رقم کا بندوبست کرتے۔ جو لوگ خاص طور پر پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کی خاص طور پر رعایت کرتے تھے۔ (۱۰)

شیخ کی تعلیمات

یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے معاصرین علماء و فضلاء پر شیخ کو سارے علوم شرعیہ میں سبقت حاصل تھی۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ عربی لغت کی مشہور کتاب قاموس کے سارے مضامین کے گویا وہ حافظ تھے۔ فقہ و حدیث میں بھی کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ عربی ادب اور دوسرے متعلقہ علوم میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ حرم شریف میں وہ یہ علوم ہمیشہ پڑھاتے رہے۔

شیخ عبدالحق بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں ان کی بینائی کمزور ہو گئی اس پر بھی تدریسی اوقات کے بعد

[illegible] کتابوں کے مقابلے کے بعد تصحیح کرنے اور مفید کتابوں اور نادر کتابوں کی نقل میں مشغول رہتے تھے [illegible]
ان کے نسخے طلباء کو فراہم کرتے تھے۔

شیخ علم کو غذا سمجھتے تھے جس کی ضرورت ہر وقت اور ہر موقع پر ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو مطالعہ کی ترغیب دیتے اور لوگوں میں علم فراہم کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کی رائے میں لگاتار مطالعہ کرنے سے علم کو ہر طرح کے نقص و مرض سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ وہ خاص طور پر رمضان کے مبارک مہینے کے آخری عشرے میں ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں میں اور دوسرے خاص فضیلت کے ایام میں مطالعہ میں مشغول رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

شیخ سے جب یہ بیان کیا گیا کہ اکثر روحانی پیشوا اپنے مریدوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ ہمیشہ ذکر یعنی اللہ کی یاد میں اپنے کو مشغول رکھیں، تو آپ نے وضاحت کی کہ جو لوگ کسی نیک کام میں مشغول رہتے ہیں تو وہ حقیقت میں برابر ذکر الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ نماز کی ادائیگی، قرآن کریم کی تلاوت، مذہبی علوم کی تعلیم اور نیکو کاری سب ذکر الٰہی کی صورتیں ہیں۔ سلف صالحین ہمیشہ علم کی اشاعت میں کوشاں رہتے تھے۔ لوگوں کے اخلاق و اطوار اور طریق و روش کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دیتے تھے تاکہ اخلاق حسنہ کے خوگر بنیں اور اعلیٰ کیرکٹر کے حامل بنیں۔

ایک خاص مرید نے دریافت کیا۔ ادائے صلوٰۃ اور ذکر کرنے میں کس کو ترجیح ہے؟ شیخ نے جواب دیا۔ نماز ادا کرنا بڑا کارنامہ ہے لیکن ذکر کی مواظبت سے ایک قسم کی مواصلت حاصل ہوتی ہے جس سے ذاکر اپنے کو وحدت کی راہ میں فنا کے مرتبے کو پہنچا لیتا ہے۔ اس تجربے کو شیخ نے نہایت خوشگوار لذت سے لطف اندوز ہونے سے تعبیر کیا ہے کہ جب کوئی شخص اس لذت سے ایک بار بھی آشنا ہوتا ہے تو بار بار ہمیشہ اسی لذت کے حصول کی خواہش کرتا ہے۔ (۱۱)

ایک بار تصفیہ قلب کے لیے دعوت کے طریقے (یعنی دعا کرنے اور خاص دعاؤں کے پڑھنے) کے استفسار کرنے پر کہ کچھ بزرگوں کا طریقہ خاص دعا پڑھنے سے وصول الی اللہ مقصود ہوتا ہے۔ آیا یہ حاصل ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ شیخ نے جواب دیا کہ خاص دعائیں ضرور نفع بخش ہوتی ہیں۔ البتہ ایسے طریقوں کے دعوے دار اخلاق حسنہ اور آداب و حسن سلوک سے عاری ہوتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ سخت گیری اور کڑے طور پر محاسبہ کرنے سے اپنی ذات کی اصلاح کرتے ہیں اور سرعت کے ساتھ ترقی منازل سے ہمکنار رہتے ہیں۔ شیخ ایسے دعویداروں کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھتے تھے اور اچھے عادات حاصل کرنے اور صبر سے کام لینے کی تلقین کرتے تھے۔ شیخ نے مزید صراحت کی کہ

[...] طریقت سے آشنا تھے اور ہمیشہ شریعت و طریقت کے متداول علوم کی تعلیم دیتے رہے۔
ایک مرتبہ جب شیخ نے شیخ عبدالحق کو شریعت اور طریقت کے علوم کی اجازت مرحمت فرمانا چاہی تو شیخ عبدالحق نے پہلے شیخ موصوف سے دعائے سیفی کی اجازت حاصل کی کیونکہ شیخ اس دعا کے نہایت معتبر سند کے حامل تھے۔ (۱۲) درحقیقت شیخ موصوف نے شیخ عبدالحق کو ان علوم کی عام اجازت سے نوازا تھا اور ان کو ہر طرح سے اپنا خلیفہ بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

شیخ نے اس بات کی صراحت بھی کی کہ ذکر کے مختلف طریقے اور مختلف وضع جن کو بزرگوں نے اپنایا اور جن کا ذکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ناپید ہے مفید ہو سکتے ہیں کہ ذکر کرنے میں ان سب سے عمدہ تاثر پیدا ہوتا ہے۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر خفی کے متعلق سوال کیا گیا کہ اللہ جل شانہ کا نام آہستہ آواز میں لینے اور ادا کرنے میں کیا فائدہ مقصود ہے۔ شیخ نے پہلے ذکر خفی کا مفہوم واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کا نام اس طرح لینا چاہیے کہ ساتھ کے لوگ نہ سن سکیں۔ لوگوں نے اس طریقہ ذکر کو جاننا چاہا کہ جس یاد الٰہی میں زبان کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے اور بعض صوفیاء کے خیال کے مطابق، ذکر خفی ایسا ہو کہ خود دل کو اس کا شعور نہ ہو سکے۔ شیخ نے بیان فرمایا کہ یہ ایک مختلف افسانہ ہے۔ البتہ انھوں نے یہ واضح کیا کہ ذکر خفی کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں سے الگ تنہائی میں ذکر الٰہی کریں اور اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ خود نفس کو یہ ذکر سنائی نہ دے۔

شیخ عبدالحق بیان فرماتے ہیں کہ شیخ نے ایک بار ذکر کیا کہ بچپن میں اپنے والد کی معیت میں جب کسی فتنے کے خوف سے اپنے ملک منڈو کو ترک کرنے کا عزم کیا اور راہ فرار اختیار کی تو اتفاق سے راستہ بھول گئے۔ جنگل میں دونوں رواں دواں تھے۔ کھانے پینے کو کوئی چیز دستیاب نہ تھی۔ چونکہ شیخ ابھی بچے تھے۔ بھوک سے بلبلا اٹھے اور رونے لگے۔ ان کے والد نے ہزار دلاسا دلایا، کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ کہتے جاتے تھے کہ کھانے کی چیز ابھی مل جائے گی۔ ڈوبتا دن آخر ہونے کو آیا تو دونوں ایک درخت پر چڑھ گئے کہ رات اسی پر گذاریں کیونکہ اس جنگل میں وحشی درندہ جانوروں کی کثرت تھی۔ صبح سویرے انھوں نے درخت کے قریب ہی میٹھے پانی کا ایک چشمہ بہتا دیکھا، ساتھ ہی ایک نہایت بوڑھے بزرگ نظر آئے جنھوں نے ان کو روٹیاں دیں اور ایک گاؤں کی طرف راہ نمائی کر دی۔ شیخ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم کھا پی چکے تو گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ بعد میں جب ہم لوگوں کو اطمینان نصیب ہوا تو دل چاہا کہ ان بزرگ سے چل کر ملاقات کریں۔ جنگل میں اسی جگہ پر جا پہنچے۔ درخت تو کھڑا تھا، لیکن وہاں کسی چشمے کا نام

[illegible] تھا اور ان بزرگ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تب مجھے یقین آگیا کہ یہ بوڑھے بزرگ درحقیقت خواجہ
خضر علیہ السلام تھے جو ہماری مدد کو اس جنگل میں نمودار ہوئے تھے۔ (۱۴)

ایک مرتبہ استدراج کے موضوع پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ بحث کا موضوع یہ تھا کہ آیا کسی غیر مسلم سے کوئی عجوبہ روزگار کرامت صادر بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ شیخ نے تصریح کی کہ باطنی تجربات اور ریاضت کے ذریعے ایک فاسق نیز ایک شعبدہ ایجاد کرنے کی مہارت کا حامل کچھ ایسی طاقت حاصل کر لیتا ہے جس سے ان لوگوں کو جن کے مذہبی ایمان و اعتقاد ابھی مضبوط و پختہ نہیں ہوئے ہیں اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ نے خود اپنا ایک واقعہ مثال کے طور پر بیان فرمایا کہ جب وہ شہر مالابار میں تھے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ شہر کے قاضی نے جن کا نام عبدالعزیز تھا اور شافعی مسلک کے تھے۔ ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور با احترام و ضیافت سے اپنا گرویدہ بنایا۔ شیخ نے ان سے دریافت کیا کہ شہر میں کوئی ایسے اہل باطن صوفی بھی ہیں جن کی زیارت کی جائے۔ قاضی نے ان سے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جس کی شہرت لوگوں میں تھی اور سب اس کے بے حد عقیدت مند تھے۔ لیکن چونکہ یہ شخص بعض ممنوع کردار کا عادی تھا۔ اس لیے خود قاضی صاحب اس کی صحبت سے اجتناب کرتے تھے۔ ہم لوگ اس کی زیارت کو گئے۔ یہ شخص ایک اونچی جگہ پر تھا جس کے گرد بہت مرد اور عورتیں تھیں جب ہم لوگ اس سے ملے تو ہمارا پرتپاک استقبال کیا اور نیک احساسات و خواہشات کا اظہار کیا پھر ممنوع شراب پیش کی۔ خود پی اور ہمیں بھی پینے کو کہا۔ اس نے جتنا زیادہ اصرار کیا ہم لوگوں نے اتنا ہی ممنوع شراب سے نفرت کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر اس نے ہمیں ضرر پہنچانے کی دھمکی دی۔ ہم لوگوں نے نہایت تعفر افسوس اور برہمی کے ساتھ اس جگہ کو چھوڑا اور اپنے دوستوں کے پاس مراجعت کی جنہوں نے بڑی خاطر تواضع کی طعام و مشروبات پیش کیے مگر ہمیں بھوک نہ تھی۔ اس لیے معذرت چاہی۔

انہی ایام میں خواب دیکھا کہ آنکھوں کے سامنے ایک نہایت خوبصورت باغ تھا جس میں میوے دار درخت لگے ہوئے تھے اور نہریں جاری تھیں لیکن اس کا راستہ نہایت پرخطر نظر آیا۔ ہر طرف خاردار جھاڑیاں تھیں اور طرح طرح کی مشکلات تھیں۔ اس لیے کوئی شخص باغ میں داخل نہ ہو سکتا تھا پھر کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شخص نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں وہی ممنوع شراب کا پیالہ تھا کہنے لگا کہ اس کو پی لیں تو میں اس باغ میں آپ کو لے جاؤں گا میں نے سختی سے انکار کیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں اس سے الگ ہونے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ اسی [illegible] میری نیند ٹوٹ گئی اور میں نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا۔ کروٹ بدلی اور سو گیا۔ پھر

[illegible] اور پھر جاگ اٹھا۔ اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر واپس جانا ہوا۔ پھر [illegible]
راستے میں خواب دیکھا تو اس بار پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما تھے اور ان کے دست مبارک میں
چھڑی تھی۔ وہ فریبی شخص بھی نظر آیا۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چھڑی لگی اور سارا دین سے کتا اس
گیا اور بھاگا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص اب بھاگ چکا ہے۔ اس شہر میں مزید نہیں
ٹھہرے گا۔ جب میں جاگا تو وضو کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شکرانے کے طور پر دوگانہ ادا کیا۔ پھر میں
اس جگہ کی طرف گیا جہاں اس کا مکان تھا مگر وہ مقام غیر آباد نظر آیا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ وہ
شخص چند گھنٹے پہلے آیا، ہر چیز کو ڈھاتا رہا اور یہ جگہ چھوڑ کر چلا گیا۔ (۱۵)

دشت نوردی

جیسا کہ اوپر اشارہ گزر چکا۔ ۱۵، ۱۶ سال کی عمر میں شیخ عبدالوہاب جنگلوں میں گھومتے پھرتے
رہے۔ زاہدوں اور جوگیوں سے ملتے رہے۔ غیر مسلم سنیاسیوں کی صحبت میں ریاضت و عبادت کرتے رہے
اور روحانی تجربے کے لیے مشقت و ریاضت کرتے رہے۔ ان کے اخلاق و ایمانی قوت سے متاثر ہو کر
بہت سے عابد و زاہد نے اسلام قبول کر لیا جس وقت شیخ مکہ مکرمہ پہنچے اس وقت ان کی عمر ۱۹، ۲۰ سال
کی تھی اور وہاں شیخ علی متقی صاحب کنز العمال کی خدمت سے وابستہ رہے۔ (۱۶)

ایک بار شیخ عبدالحق نے شیخ کی خدمت میں عرض کیا "اپنے شیخ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے ہی آپ
اپنی ریاضتوں، عبادتوں اور مجاہدوں سے بہت کچھ روحانی تجربات حاصل کر کے کمال کو پہنچ چکے تھے۔ پھر
آپ نے اپنے شیخ کی صحبت سے کیا حاصل کیا؟" شیخ نے جواب دیا جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ شیخ کی دعاؤں
توجہات اور ارشادات کی بدولت حاصل کیا۔" پھر آپ نے فرمایا "درحقیقت شریعت اور ایمان کی
استقامت شیخ کی خدمت میں میسر ہوئی۔ میں صحرا نوردی کرتا رہا مگر ایمانی قوت اس وقت حاصل ہوئی جب
میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا سب سے اعلیٰ مقام، جیسا کہ شیخ نے ارشاد فرمایا۔ شریعت کی متابعت
اور اس کی مضبوط استقامت ہے۔"

اتباعِ سنت

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے ذکر کے دوران شیخ نے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی محبت
اور ان کے اتباع کے جذبے سے بے حد سرشار تھے۔ ایک خواب کا ذکر کیا جس میں انہوں نے دیکھا کہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد مبارک کے اوپر پایا. فرمایا " گنبد میں ایک شگاف تھا. ناگہاں میں اس شگاف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ضریح مبارک پر گر پڑا. وہاں میں اس طرح ادھر ادھر حرکت کرنے لگا گویا میں کسی چیز کی تلاش کر رہا تھا. پھر میں نے اپنے اندر اتنی طاقت محسوس کی کہ میں وہاں سے مشرق و مغرب اور سارے عالم کے لیے نکل کھڑا ہوا.

شیخ نے بیان کیا کہ میں نے اس خواب کا تذکرہ اپنے شیخ سے جو اس وقت بقید حیات تھے کیا. شیخ نے یہ تعبیر بیان فرمائی کہ:

ان شاء اللہ اس خواب کا دیکھنے والا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں کمال کو پہنچے گا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنا غرق ہوگا کہ ان کی عقیدت میں اپنے کو فنا کر دے گا اور تعلق تام حاصل کرے گا. (۱۷)

مقام جعرانہ مکہ معظمہ سے ایک مرحلہ کی مسافت پر (یعنی ایک دن کے سفر کی دوری پر) ہے جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا اور غزوۂ حنین کے مال غنیمت کو تقسیم کیا تھا. نیز اسی مقام سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ ادا فرمایا تھا. اپنے شیخ کی ہدایت کے مطابق شیخ عبدالوہاب متقی اس مقام پر تشریف لے جاتے، سوتے اور چند گھنٹوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے سینکڑوں بار سے زیادہ خواب میں سعادت حاصل فرماتے. عمرہ ادا کرنے کی نیت سے شیخ اکثر و بیشتر اس مقام پر تشریف لے جاتے تھے. شیخ علی متقی اس مقام کی زیارت ننگے پاؤں چل کر کرتے. روزہ رکھتے اور کثرت سے عمرہ ادا کرتے تھے.

شیخ کی تالیفات

شیخ عبدالحق نے ان کے مولفات کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ ان کا بیان ہے کہ شیخ ہمیشہ اپنے شیخ علی المتقی کی کتابوں کی تحقیق میں مشغول رہتے. ان کی کتابوں کی تعداد سو سے کچھ اوپر ہے. وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ کتابوں کی نقلیں تیار کر کے روزی کماتے تھے. نیز اپنے شیخ کے علاوہ دوسروں کی کتابیں بہت کم نقل کرتے. شیخ اپنی نادر کتابوں کی تصحیح و نقل میں بھی مصروف رہتے تھے جو ان کے خیال میں طلبہ اور عوام کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہوتیں. (۱۸)

تعلیقات

۱۔ شیخ کی زندگی کے واقعات ان کے مرید و شاگرد شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور تالیف اخبار الاخیار اور ذیل کے مراجع سے ماخوذ ہیں۔ دیکھیے اخبار مطبوعہ ہاشمی پریس ۱۲۷۸ھ صفحات ۲۵۳-۲۶۲۔ ہاشمی مجتبائی ۱۲۸۰ھ صفحات ۲۵۷-۲۶۷۔ مجتبائی پریس ۱۳۳۲ھ ۲۶۹-۲۷۲۔ نزہۃ الخواطر صفحات ۳۹۲-۳۹۴۔ تاریخ برہان پور۔ کو ثر پریس۔ ص ۱۵۵-۱۵۶۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول صفحات ۱۳۸-۱۴۰۔ تذکرہ علماء ہند از رحمٰن علی ص ۱۳۹۔ شیخ عبدالحق دہلوی از ڈاکٹر خلیق احمد نظامی

۲۔ مالوہ کے حکمران مسلمانوں کا پایۂ تخت منڈو تھا۔ حسب بیان رحمان علی۔ اب یہ مقام منڈو گڑھ کے نام سے مشہور ہے اور ریاست دھر میں واقع ہے۔

الادریسی کی کتاب ہند اور اس کے جوار کے مقامات۔ ترجمہ سید مقبول احمد لیڈن ۱۹۶۰ء ص ۱۵۸ کے مطابق منڈو موجودہ مدھیہ پردیش کے مقام اجین یا مالوہ سے گویا نسبت رکھتا ہے۔

۳۔ اخبار الاخیار ص ۲۵۸۔ و نزہۃ الخواطر از سید عبدالحی بن فخر الدین الحسنی۔ الطبقۃ الاولیٰ جلد ۵۔ ص ۲۶۷

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً ہاشمی پریس شیخ می گفتند کہ یک یا دو بار در راہ خدا کہ یا فتم عبدالوہاب بود۔ ص ۲۵۸ (ہاشمی) مجتبائی پریس ص ۲۷۰ (مجتبائی)

۶۔ ایضاً ص ۲۵۸۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی

۷۔ ایضاً ۲۵۹

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً ص ۲۶۰۔ ایضاً تاریخ برہان پور ص ۱۵۶ و نزہۃ الخواطر ۵ ص ۲۶۷

۱۱۔ ایضاً ص ۲۶۱

۱۲۔ یہ ایک خاص دعا ہے جو دعائے سیف اللہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کی خاص اجازت شیخ عبدالحق نے اپنے شیخ سے اعلیٰ سند کی بنا پر حاصل کی۔ اس کی اجازت انھوں نے دوسرے مشائخ سے بھی لی اور

اس دعا کو وہ جمعہ کے دن پڑھا کرتے تھے۔ دیکھیے مخطوطہ کلکتہ ورق ۲۸۹ و: دعا رسیف اللہ یقرو یوم الجمعۃ اجازۃ للکاتب من بعض الصالحین بطریقۃ مکتوبۃ فی آخرہ

۱۳۔ مرجع مذکور ص ۲۶۱۔ نیز مخطوطہ کلکتہ ورقہ ۲۸۹

۱۴۔ مرجع مذکور ص ۲۶۴ ایضاً تاریخ برہان پور ص ۱۵۶

۱۵۔ مرجع مذکور ص ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ نیز نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۶۷

۱۶۔ مرجع مذکور ص ۲۶۶۔ ایضاً نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۲۶۶۔ و تذکرہ علماء ہند از رحمان علی ص ۱۴۹

۱۷۔ مرجع مذکور ص ۲۶۷

۱۸۔ ایضاً ۲۴۶ و ۲۵۸۔ نیز دیکھیے خیر الدین الزرکلی۔ الاعلام ج ۵ ص ۴۱۲۔ و نواب صدیق حسن خان۔ ابجد العلوم۔ ۸۹۵

موجودہ دور کی برائی

موجودہ دور میں انتہائی خطرناک برائی جس میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں وہ گانوں اور سازوں کا بلند آواز سے بازاروں، گلی کوچوں اور گھروں میں بجنا اور سننا ہے۔ بلاشک یہ دل کی بیماریوں کا بڑا سبب ہے ذکر اللہ، نماز، قرآن کی تلاوت اور اس کے استفادے سے روکتا ہے۔ سب سے بڑا عذاب گانا سننے والے پر یہ ہوتا ہے کہ وہ نفاق اور گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

"میری امت میں آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور گانے بجانے کو حلال سمجھیں گے۔ (بخاری)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

بے شک گانا دل میں یوں نفاق پیدا کرتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا

(جناب نعیم صدیقی)

رفقائے گرامی قدر!

میں آپ کے سامنے اپنے زمانے کی بات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا کی پکار پر جب جماعت کے ساتھ ہم منسلک ہوئے تو کیا پایا۔ مولانا تحریک کے لیے کس قسم کے کارکن تیار کرنا چاہتے تھے جو لوگ تحریک کے دورِ اول سے وابستہ ہوئے تھے وہ گذر گئے۔ اب نئی پود کا زمانہ ہے، ضرورت ہے کہ ان دونوں کے درمیان رابطہ رہے، خلا نہ پیدا ہو۔ عمارت بلند ہو رہی ہے تو اوپر لگنے والی اینٹیں پہلی اینٹوں کے مطابق رہیں۔ وہ جو کہا گیا کہ

خشتِ اول چوں نہد معمار کج ۔۔۔ تا ثریا می رود دیوار کج

تو معمار نے اگر پہلی اینٹ صحیح رکھی ہو لیکن دوسری اینٹ صحیح نہ ہو تو بھی دیوار کج ہو جاتی ہے۔ دیوار سیدھی ہوتی ہے جبھی دوسرا ردّے پہلے ردّے کے مطابق رہیں ورنہ ساری عمارت کج ہو جائے گی۔

اب میں پہلی اینٹ اور پہلے ردّے کی داستان سنانا چاہتا ہوں۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا دورِ اول کیسا تھا۔

سب سے پہلی رکنیت تھی۔ یہ قدم اول ہے کسی کا جماعت کے ساتھ وابستگی کا۔ اس زمانے میں جو بھی لوگ جماعت کے قریب آتے تھے وہ سب سے پہلے جماعت کی دعوت کو سمجھتے تھے۔ پھر ان کا ایمان ان کو جماعت میں شامل ہونے پر اکساتا تو وہ رکنیت کی درخواست دیتے تھے۔ جماعت کا طریقہ یہ تھا کہ جو آدمی رکنیت کا امیدوار ہوتا اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا جاتا۔ یہ انتظار ٹالنے کے لیے نہیں بلکہ جائزہ لینے کے لیے ہوتا تھا کہ وہ صاحب شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر تو نہیں آگئے، یا انھوں نے پورے ہوش و گوش کے ساتھ ٹھنڈے دل سے شرکتِ جماعت کے تقاضوں کو سمجھ لیا ہے؟ ان کے کردار کو دیکھا جاتا، ان کے مزاج کو جانچا جاتا اور یہ جائزہ مہینوں جاری

جاری رہتا۔ اس دوران میں ان سے جماعت کے ساتھ کام کرنے کے لیے کہا جاتا اور اس سے اندازہ کیا جاتا کہ جماعت کے نصب العین کے ساتھ ان کی شیفتگی کتنی ہے۔

اس کے بعد حلف لینے کا وقت آتا۔ میں موجودہ دور کی کیفیت کو نہیں جانتا لیکن ہمارے وقت میں حلف رکنیت ایک امیدوار رکنیت کے لیے گویا محشر کا وقت ہوتا تھا۔ وہ دیدہ و دانستہ دین کی ذمہ داریوں کو اٹھانے اور نبھانے کا عہد کرتا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس شخص نے ان ذمہ داریوں کی گرانی اور نزاکت کو سمجھ لیا ہو حلف لیتے وقت اس کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ ذمہ داری کے احساس سے اس پر پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ حلف لیتے ہوئے وہ کانپتا اور لرزتا تھا۔ بعض اوقات ہم نے دیکھا کہ ایک شخص کی آواز منھ سے نہیں نکل رہی۔ وہ چند الفاظ بولتا ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس کو یوں محسوس ہوتا کہ وہ اجتماع ارکان میں نہیں بلکہ عرصہ محشر میں کھڑا ہے اور اپنی کارکردگی کی جواب دہی کر رہا ہے۔ یہ ایک خاص کیفیت ایک مدت تک جماعت میں رہی اور جماعت کی پہلی صف انہی لوگوں سے بنی۔

تیسرا مرحلہ احتساب کا ہوتا تھا۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ جو صاحب جماعت میں آئے ہیں وہ معیار مقرر پر قائم ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ذرا بھی نیچے گرتے تو سب کی نگاہیں ان کی جانب اٹھ جاتیں اور ان کو سنبھالا دینے کے لیے ہاتھ بڑھ جاتے۔ ان کی اصلاح کے لیے سب فکرمند ہو جاتے لیکن اگر وہ تمام سہاروں اور تعاون کے باوجود سنبھل نہ پاتے تو پھر اس کی پرواہ نہ کی جاتی کہ ہماری تعداد کم ہو جائے گی۔ بلکہ صرف اصول پر نگاہ رہتی۔

اب اگر بگاڑ جاری رہے اور اگر کوئی پرسش نہ ہو تو یہ نظم جماعت کی بدخواہی ہے۔ نظم اسی مداہنت سے تباہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارے وقت میں جس کسی نے بھی نظم اور اصول کو توڑا اس کا فوری محاسبہ ہوا۔ ہماری اصل فکر جماعت کو بچانے کی ہوتی تھی۔

چوتھی چیز عہد اول میں یہ تھی کہ جو کوئی جماعت میں داخل ہوتا تھا اس کو سب سے پہلے حصول فہم دین کی فکر ہوتی تھی۔ ایک جذبہ ابھرتا تھا کہ دین کا صحیح علم حاصل کیا جائے۔ کیونکہ دین کے صحیح علم کے بغیر صحیح عمل ممکن نہیں۔ ہم لٹریچر کا خود بھی ذوق شوق سے مطالعہ کرتے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے۔ کسی مجلس میں بیٹھتے تو ہماری خواہش ہوتی کہ دوسری باتوں کے علاوہ دین کی بات بھی ہو جائے۔ ہمیں اہل علم کی صحبت کا شوق ہو گیا تاکہ دعوت دین ہمارے دل و دماغ میں راسخ ہو، فہم اور تفقہ میں اضافہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ دعوت دین کے کیا تقاضے ہیں۔ وہ کون سی چیزیں ہیں جو ہماری زندگی کو اسلامی بناتی ہیں اور کن چیزوں سے ہمیں اجتناب کرنا چاہیے کہ ان سے زندگی جاہلی بنتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں ہم لٹریچر کا اس شغف وانہماک سے مطالعہ کرتے اور دوسروں کو سناتے تھے کہ اس کے بعض حصے ازبر ہوگئے۔ لٹریچر ہماری تحریک کی روح ہے۔ اس کا دامن اگر چھوڑ دیا گیا تو ہم اپنی روح سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ پھر ماضی اور حال میں کوئی ربط باقی نہ رہے گا مجھے ڈر ہے کہ اگر ہم نے لٹریچر کے مطالعہ میں کوئی کوتاہی برتی تو وہ وقت آجائے گا کہ ہمارے ذمہ دارانہ مناصب پر ایسے لوگ آجائیں جو ہماری دعوت اور ہمارے لٹریچر سے بے بہرہ ہوں۔

پانچویں چیز میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں اپنی زندگی کا بار بار جائزہ لیا جاتا تھا۔ ہم کی فکرمندی ہوتی تھی کہ ہماری زندگی میں کوئی غلط اور ناجائز چیز تو داخل نہیں ہوگئی۔ اگر معلوم ہوتا کہ فلاں چیز ہماری زندگی میں غلط ہے تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اس کو اپنے اندر سے نکال نہ پھینکتے میاں صاحب (میاں طفیل محمد) نے وکالت ترک کی۔ چودھری علی احمد خاں مرحوم نے پولیس کی ملازمت چھوڑی۔ غرض جو بھی جماعت کے قریب آتا یا اس کی رکنیت اختیار کرتا وہ سب سے پہلے اپنی زندگی کا جائزہ لے کر غلط ناجائز اور اللہ کی ناپسند چیزوں کو اپنی زندگی سے خارج کرتا۔ میں نے خود اپنی زندگی کا جائزہ لیا اور اپنی ان چیزوں سے چھٹکارا حاصل کیا جو مجھے بے حد پسند تھیں لیکن دین میں ناپسندیدہ تھیں۔ ہم نے گنجائش کو کبھی نہیں ڈھونڈا تھا۔ جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہوگئی پھر اس کو قبول نہ کرنا ہمارے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔

یہ سلف کا جذبہ تھا جو اخلاف میں منتقل ہونا چاہیے۔ تحریک کا تسلسل اسی سے قائم رہے گا۔

چھٹی چیز رفقاء کے لیے گہری محبت اور خیرخواہی کا جذبہ تھا، دارالاسلام میں چند رفقاء ہوتے تھے لیکن ان کی حالت ایک درمند گروہ کی سی تھی جو اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے سوچتے تھے۔ ہم اللہ کے لیے ملتے اور اللہ کے لیے بیٹھتے اور کوئی غرض سوائے دین کے ہمارے درمیان نہ تھی۔ یہی چیز جماعتی استحکام کا باعث بنی۔ اس جذبہ باہمی محبت نے جماعت اسلامی کو سیسہ پلائی دیوار بنا دیا کسی کو تکلیف ہوتی تو سب تڑپ اٹھتے۔ جماعت اسی جذبے سے پروان چڑھی۔

ساتویں چیز میں آپ کے سامنے یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم میں بزرگوں کا احترام پیدا کیا گیا۔ آج نوجوان قیادت کے نعرے کہیں کہیں سے سنے جاتے ہیں لیکن جماعت میں جب ہم شامل ہوئے تھے تو ہمارا ابھی عہد شباب تھا لیکن ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ بزرگوں کے سامنے آواز کو بلند کیا جائے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمیں جو کچھ ملے گا بزرگوں کے ادب اور ان کے احترام سے ملے گا۔ چنانچہ ہم نے اس سے فیض پایا۔ بڑوں کے لیے احترام کا

جذبہ جماعت کو استحکام دیتا ہے۔ جن لوگوں نے جماعت کے لیے قربانیاں دی تھیں ان کے سامنے ہمارے سر ہی نہیں ہمارے دل بھی جھکتے تھے۔ اگر اگلوں نے پچھلوں کی قدر نہ کی تو زنجیر ٹوٹ جائے گی۔

آٹھویں چیز یہ ہے کہ ہمارے اندر توسیع دعوت کا خبط ہوتا تھا۔ یہ جذبہ تھا کہ جو حق ہمیں ملا ہے وہ دوسروں تک بھی پہنچ جائے۔ چلتے پھرتے دفتر، دکان ہر جگہ ہم کو دعوت پھیلانے کی لگن رہتی تھی۔ گھر میں بیٹھتے تو بچوں کو دین کی تعلیم دیتے، اس کی فکر کرتے کہ ہمارا کوئی فعل ایسا نہ ہو جس سے بچوں کو غلط سبق ملے۔ ایک مرتبہ میں نے اور میری بیوی نے عہد کیا کہ ہم گھر میں چھوٹ موٹ کا جھوٹ بھی نہیں بولیں گے تاکہ بچوں پر نقش ہو جائے کہ زندگی صرف سچ بولنے کا نام ہے۔ ہمارا وطیرہ ہوتا تھا کہ ہم اجتماع سے گھر آتے تو اجتماع کی روداد سب سے پہلے اپنے گھر میں بیان کرتے، اس طرح ہمارا گھریلو ماحول ہمارے لیے سدِّ راہ بننے کی بجائے سازگار ہوتا چلا گیا۔

پھر گھر سے باہر نکلتے تو دعوت کی کوئی نہ کوئی چیز ہمارے پاس ضرور ہوتی۔ ہم لوگوں کے پاس چل کر جاتے اور یہ توقع نہ رکھتے کہ وہ ہمارے پاس آئیں گے۔ جماعت کا ہر کام خود کرتے اس سے ہمارے تحریکی جذبے کو تقویت ملتی۔ ہاتھوں سے پوسٹر لگانے سے جو جذبہ ابھرتا ہے وہ کرائے پر لگوانے سے نہیں ابھرتا۔ دارالاسلام کے قریبی دیہات میں ہم دعوت لیکر گھومنے پھرے۔ خود میاں صاحب (میاں طفیل محمد) گشت کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح جب پاکستان پہنچے تو اچھرہ کی ایک ایک گلی چھان ماری۔ ہم کو اس کی پروا نہ تھی کہ کوئی ہماری دعوت قبول کرے گا یا نہیں۔ ہمارے ذہن میں فقط ایک بات بیٹھی ہوئی تھی کہ ہمیں اپنی بات دوسروں تک پہنچانا ہے۔

نویں چیز یہ تھی کہ ہمارے دلوں میں نظم کا بے حد احترام تھا، اوپر سے کوئی ہدایت آتی تو اس کی بجا آوری کے لیے ہر ممکن سعی کرتے۔ سمع و طاعت کی روح کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے۔ اجتماعات میں لازماً شریک ہوتے الاّ یہ کہ کوئی حقیقی اور واقعی عذر شرعی ہوتا۔ وقت مقررہ پر اجتماع گاہ میں پہنچتے۔ ہم نے عذر کبھی نہیں تراشا تھا۔ کوئی لیٹ ہو جاتا تو نہایت ندامت کے ساتھ وجہ بیان کرتا۔ اجتماع میں خاموشی اور احترام سے بیٹھتے۔

دسویں چیز یہ ہے کہ اس زمانے میں عہدوں کا کوئی تصور نہ تھا۔ کوئی ذمہ داری کسی پر ڈالی جاتی تو وہ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا۔ ہزار معذرتیں کرتا، کیونکہ نگاہ ذمہ داری پر ہوتی، جواب دہی پر ہوتی، منصب پر نہ ہوتی تھی۔ عہدوں کے معاملے میں بڑی احتیاط پائی جاتی تھی۔ عہدوں سے گریز کا رجحان تھا۔ ذمہ داری کا نام لیا جاتا تو ہر فرد کے سامنے اپنی کوتاہیاں اور خامیاں صف در صف کھڑی ہو جاتیں۔

گیارہویں یہ کہ بیت المال کے بارے میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ یہ احساس ہر وقت مسلط رہتا کہ بیت المال

کی کوئی ایک پائی بھی ہمارے ہاتھوں ضائع نہ ہونے پائے۔ حضرت عمرؓ کا یہ قول گویا مجسم سامنے رہتا کہ بیت المال یتیم کا مال ہے۔ انھوں کی وصولیابی میں مستعدی سے کام لیتے۔ اعانت لینے کا مطلب صرف اعانت لینا نہیں ہوتا تھا بلکہ اعانت دینے والے کو دعوت دین سے قریب تر کرنا ہوتا تھا۔ اعانت کی وصولی کو معمولی کام نہ سمجھا جائے۔ یہ افراد کو قریب لاتی ہے اس کے ساتھ دعوت پھیلتی ہے اور اس سے عدم توجہ گویا دعوت سے عدم توجہ ہے۔

بارھواں پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں غیبت و نجویٰ کی کوئی بات نہ ہوتی تھی کسی کے بارے میں حتیٰ کہ مخالفین کے بارے میں بھی نہ کوئی ناشائستہ بات نہیں نکالی جاتی تھی کنویسنگ سے یوں بچا جاتا تھا جیسے آگ سے بچا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ جس نظم میں کنویسنگ غیبت اور نجویٰ داخل ہو جائیں تو یہ اس کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ یہ گھن کی طرح ہوتے ہیں کہ بظاہر لکڑی صحیح سالم معلوم ہوتی ہے لیکن ایک دن اچانک دھڑام سے نیچے آرہتی ہے۔

تیرھویں چیز یہ ہے کہ وہ رضاکار کارکن کا زور تھا جو ہمہ وقتی کارکن کے مقابلہ میں زیادہ مؤثر تھا اب تو گویا تمام بار ہمہ وقتی کارکنوں پر ڈالنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ رجحان کام کے جذبے اور لگن کو ختم کر دیتا ہے۔

چودھویں چیز اس زمانے کی یہ تھی کہ ہر اہم مسئلے میں مشورہ کیا جاتا تھا۔ مشورہ گویا نظم کی جان تھی۔ مشورہ طلب کیا جاتا تھا تو پورے اخلاص اور دیانت سے اپنی رائے دی جاتی تھی۔ اس میں مداہنت نہیں ہوتی تھی لیکن شائستگی ضرور ہوتی تھی۔ پھر جب فیصلہ ہو جاتا تو وہ لوگ بھی اس کو بخوشی قبول کر لیتے جو بحث کے دوران اپنی رائے میں جوش کا اظہار کرتے تھے۔

یہی صورت تنقید و احتساب کی تھی۔ یہ پندرھواں نکتہ ہے۔ تنقید و احتساب میں کمی آجائے تو نظم اپنی خامیوں سے کبھی آگاہی نہیں پا سکتا۔ تنقید کرنے والے اخلاص سے تنقید کرتے تھے اور جن پر تنقید ہوتی وہ خندہ پیشانی سے سنتے تھے۔ مولانا نے اس سلسلے میں بہترین نمونہ پیش فرمایا تھا۔ انھوں نے اپنے اوپر سخت سے سخت تنقید برداشت کی لیکن کسی کو ٹوکا نہیں لیکن یہ یاد رکھیے کہ تنقید اخلاص سے ہوتی چاہیے اس میں کوئی ذاتی عنصر شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی حقیقی رائے کا صاف صاف اظہار اجتماع میں کیجیے۔ لیکن اسے ادھر ادھر بیان کیا جائے۔ پھر تنقید سننے والوں کو بھی وسیع الظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور تنقید کو وہ معنے نہیں پہنانا چاہئیں جو دور از مطلب ہوں۔

سولھویں چیز یہ ہے کہ ہماری رائے میں مکمل ہم آہنگی ہونی چاہیں۔ ہمارے زمانے میں ذہن اس طرح ڈھل چکے

چکے تھے کہ خیبر سے کراچی تک ہر کارکن کی سوچ الفاظ سمیت ایک ہوتی تھی۔ جماعتوں کی ذہنی ہم آہنگی ان کے درخشاں مستقبل کی نشانی ہوتی ہے۔

سترھویں چیز یہ ہے کہ ہمارے دور میں چھٹی کا کوئی تصور نہ تھا۔ ہم ہر وقت اور ہر لمحہ ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ کام کی کشش ہمیں باندھے رکھتی تھی۔ جہاں بھی جاتے تھے گویا ڈیوٹی پر جاتے تھے۔ داعی کے لیے حقیقت میں کوئی چھٹی نہیں ہوتی۔

ع اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔

آخری چیز یہ ہے کہ ہم دنیا کی چمک دمک سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ دنیا ہماری قوت ایمانی کے سامنے ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ یہ حقیقت ہر وقت مستحضر رہتی تھی کہ دنیا ایک بے حقیقت اور فانی چیز ہے اس لیے اس سے کبھی مرعوب نہ ہوتے تھے، نہ اس کے جلال سے اور نہ اس کے جمال سے دنیا کو ہیچ سمجھنے کا جذبہ توانا رہنا چاہیے۔ یہ چیز ہمیں موت کے لیے باہمت بناتی تھی کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے اور نہ کوئی پریشانی ہوتی تھی۔ یہ سوال بھی کبھی نہیں ستاتا تھا کہ مدت گذر گئی ہے۔ منزل ابھی تک قریب کیوں نہیں آئی۔ ہم نے سمجھ لیا تھا کہ شہداء علی الناس بن جانا خود ایک بلند مقام ہے۔

اس سارے بیان سے مقصود یہ ہے کہ:۔

"مولانا کے بنا کردہ کام اور تیار کردہ کارکن کا معیار ہمارے سامنے رہے۔ اس سے ایسا آئینہ تیار ہو جائے جس سے ہم اپنے داغ دھبے وقتاً فوقتاً دیکھ لیا کریں۔ ہمیں ہر وقت اپنا موازنہ پہلی اینٹ اور پہلے ردے سے کرتے رہنا چاہیے"۔

یاد رکھیے

انحطاط اور تنزل کبھی اعلان کر کے نہیں آتا۔ یہ دبے پاؤں آتا ہے۔ ایک ایک ذرہ سرکتا ہے پھر ٹیلا گرتی ہے۔ اس کی پہلے خبر نہیں ہوتی پھر اچانک وقت آتا ہے کہ عمل انحطاط اپنی خوفناک تصویر پیش کرتا ہے۔ ہم لوگ جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اور ان کے دامن تھامے ہوئے ہیں۔ ہمیں ہر وقت اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے۔ ہم میں جذبہ اصلاح ہو۔ اخلاص نیت ہو، اپنا اخلاقی معیار اور داعیانہ کردار ہر حال میں برقرار رکھنا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جس نیت سے میں نے یہ گذارشات کی ہیں اسی نیت سے دل انہیں قبول کریں۔ آمین۔ ثم آمین!

ایرانی انقلاب
امام خمینی اور شیعیت

مندرجہ بالا عنوان دراصل مولانا محمد منظور نعمانی کی کتاب کا نام ہے۔ حضرت مولانا نے یہ بیش قیمت کتاب ازراہ عنایت ناچیز کو بھی تحفتہً ارسال فرمائی۔ ذیل کا عریضہ مولانائے محترم کی اس ذرہ نوازی پر شکریہ کی غرض سے لکھا گیا تھا۔ ساتھ ہی مولانا کی خدمت میں دو درخواستیں کی گئی تھیں۔ اس عریضہ کا جواب مولانا کے لیے ضروری تو نہیں تھا اس میں دو باتیں اکابر ملت و علمائے کرام کی توجہ کے لائق آگئی ہیں۔ اس لیے مولانا کی علالت و ضعف کے پیش نظر مولانا موصوف سے جواب پر اصرار کے بجائے اسے اکابر علماء سے توجہ کی درخواست کے ساتھ اشاعت کے لیے دے رہا ہوں ——— انعام الرحمٰن۔ بھوپال

مولانائے محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آں محترم کی ارسال کردہ گراں قدر تصنیف "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" نے مسرور و مشکور کیا میں اس بات سے بے حد متاثر ہوا کہ آں محترم نے مجھ حقیر کو اپنے بیش قیمت تحفہ کے لائق سمجھا۔ اس پر میں سراپا سپاس ہوں۔ اللہ آپ کو اس ذرہ نوازی کا بھی اجر دے گا۔

میں شیعیت سے کچھ نہ کچھ تو واقف تھا مگر آپ نے اس عمر میں علالت کے باوجود اس قدر محنت کرکے ان کی اساسی کتابوں کے حوالوں سے جن حقائق یا اسرار پر سے پردہ اٹھایا ہے انھوں نے میں تو کیا چیز ہوں بڑے بڑے علماء کی آنکھیں کھول دی ہوں گی۔ اللہ آپ کی اس بیش بہا خدمت کو قبول فرمائے۔

اس کتاب سے جو باتیں واضح ہوئیں انھیں دیکھ کر یہ تعجب آمیز سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اثنا عشری شیعیت کے یہ عقائد ہیں تو انھیں اب تک دائرہ اسلام سے خارج کیوں نہیں کیا گیا اور وہ کیوں ملت اسلامیہ کا جز بنے ہوئے ہیں؟ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ علمائے امت کی نظر میں وہ باتیں نہ آئی ہوں لیکن اب اس کتاب نے روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے کہ اب آپ اور آپ جیسے ذمہ دارانہ مقام رکھنے والے اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

اسی کی طرح ایک اور چیز بھی علمائے حق کی توجہ چاہتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے تصوف میں سلسلہ مجددیہ چار بزرگوں کی قیومیت کا قائل ہے۔ قیوم اول حضرت مجدد الف ثانی، قیوم ثانی حضرت خواجہ محمد معصوم، قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبند اور قیوم رابع، خواجہ محمد زبیر۔ اور قیوم کون ہوتا ہے؟ کتاب "روضۃ القیومیۃ" کہتی ہے:۔

"قیوم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ماتحت اسماء، صفات، شیونات، اعتبارات اور اصول ہوں اور تمام گذشتہ آیندہ مخلوقات کے عالم موجودات انسان، حیوان، پرند، نبات، ہر ذی روح، پتھر، درخت، بحر و بر کی ہر شئے عرش، کرسی، لوح، قلم، سیارہ، ثوابت، سورج، چاند، آسمان، بروج سب اس کے سائے میں ہوں۔ افلاک و بروج کی حرکت و سکون، سمندروں کی لہروں کی حرکت، درختوں کے پتوں کا ہلنا، بارش کے قطروں کا گرنا، پھلوں کا پکنا، پرندوں کا چونچ پھیلانا، دن رات کا پیدا ہونا اور گردش کنندہ آسمان کی موافق یا ناموافق رفتار۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو۔ زمین پر حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں۔ جو آرام و خوشی اور بے چینی و رنج اہل زمین کو ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی گھڑی، کوئی دن، کوئی ہفتہ، کوئی مہینہ، کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی بدی کا تصرف کر سکے۔ ملک کی پیدائش، نباتات کا اگنا، غرض جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔

روئے زمین پر جس قدر زاہد، عابد، ابدال، اوتاد، مقرب، تسبیح، ذکر، فکر، تقدیس اور تنزیہ میں عبادت گاہوں، جھونپڑوں، کٹیوں، پہاڑ اور دریا کے کنارے زبان، قلب، روح، سر، خفی، اخفی اور نفس سے شاغل اور معتکف ہیں اور حق تعالیٰ کی راہ میں مشغول ہیں سب اس کی مرضی سے مشغول ہیں۔ گو انہیں اس بات کا علم نہ ہو اور جب تک ان کی عبادت قیوم کے ہاں قبول نہ ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوتی۔

(روضۃ القیومیۃ ج ۱ ص ۹۴)

"روضۃ القیومیۃ" کے اس بیان سے کچھ بزرگوں نے اختلاف ضرور کیا ہے۔ لیکن اس کے مصنف محمد احسان مجددی قیوم رابع کے خلیفہ تھے۔ اس لیے ان کے بیان کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے یہ کتاب اتنی مستند مانی جاتی ہے کہ اس سلسلے کے اکثر تذکروں کا ماخذ یہی ہے۔ پھر یہ کہ خود حضرت مجدد کے یہاں قیومیت کے اشارے ملتے ہیں۔ جیسا کہ دفتر دوم مکتوب ۹۴ میں سورہ احزاب کی آیت ۷۲ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "آں امانت بزعم ایں حقیر قیومیت جمیع اشیاء است"

پھر آگے فرماتے ہیں: — عارفے کہ بمنصب قیومیت اشیاء مشرف گشتہ است حکم وزیری دارد کہ مہمات مخلوقات را بہ او مرجوع داشتہ اند۔ ہر چند انعامات از سلطان است اما وصول آنہا بتوسط وزیر است۔ یہ

نظریہ قیومیت کے مفہوم میں یہ باتیں نہ مانی جائیں تب بھی اس کا ایسا مفہوم تو ماننا ہی پڑے گا جو معنے کے اعتبار سے لفظ قیوم سے میل کھاتا ہو۔ اور اگر "روضۃ القیومیۃ" کا مفہوم صحیح ہو تو ماننا چاہیے کہ ہمارا قیوم شیعوں کے امام معصوم سے بڑھ کر نہیں تو کمتر بھی نہیں۔ قیوم کے یہ اختیارات اور اس کا یہ مقام جاننے اور ماننے کے بعد ایک عام مسلمان یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا کہ قیوم کے سامنے اللہ میاں کی کیا حیثیت ہے۔ اور قیوم کے ہوتے ہوئے اللہ میاں کی ضرورت کیا ہے۔

یہ نظریہ قیومیت جیسی چیزیں شیعیت سے بھی زیادہ توجہ اس لیے بھی چاہتی ہیں کہ شیعہ تو علیحدہ ایک فرقہ ہیں ہی جن کے خیالات و عقائد کا خراب اثر اہل سنت والجماعت پر اگر ہو بھی تو محدود ہی ہو سکتا ہے لیکن قیومیت جیسی چیزیں تو خود اپنے گھر کی باتیں ہیں جن کے اور صحیح عقائد کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ کیا یہ چیزیں صحیح اسلامی انقلاب کا راستہ نہیں روکیں گی اور اگر خدا کی مدد سے ایسا انقلاب آگیا تو کیا وہ انقلاب آہستہ آہستہ ان باتوں کی اصلاح کرے گا یا یہ باتیں اس پر اثر انداز ہوں گی۔

یہ عریضہ لکھنے میں اس لیے دیر ہوگئی کہ شکریہ اور مزاج پرسی کے لیے خود حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن بھوپال کے گیس والے حادثے کے بعد کی مصروفیات نے میری یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی۔

میری یہ معروضات اگر لائق توجہ نہیں تو اصلاح کی مستحق ہوں گی۔ اس لیے اگر جواب سے سرفراز فرمائیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔ اللہ آپ کے سایہ کو تا دیر قائم رکھے۔ آمین! والسلام

خادم انعام الرحمٰن

زندہ دل کی روداد

میرا رخ اسلام کی جانب موڑنے میں میرے والد کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میرے والد ابتدائی زندگی میں زیادہ دیندار نہ تھے لیکن ان کے اندر بتدریج تبدیلی آئی اور اسلام میں ان کا شغف بڑھنے لگا۔ وہ ایک عام مسلمان کی طرح تھے اور دین کے بارے میں ان میں زیادہ جوش و خروش نہ تھا۔ وہ بڑے محنتی آدمی تھے اور شعبہ تعلیم میں ان کی کارکردگی نمایاں تھی۔ میرے والدین مغربی زندگی کے عادی تھے اس لیے ان کی خواہش تھی کہ میں فرانسیسی کلچرل مشن اسکول میں تعلیم پاؤں لیکن میرے والد مغربی تہذیب میں بالکل بہہ نہیں گئے تھے۔ ان کا اسلامی ضمیر زندہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مجھے اسکول چھوڑنے جاتے تو راستے میں مجھ سے قرآن کی آیات سنتے۔ پھر ان کے اندر تبدیلی ظاہر ہونے لگی۔ انھوں نے ملک کے طول و عرض کا سفر کیا اور قدرت کے ساتھ مطالعہ کرنا شروع کر دیا گویا کسی کی تلاش میں ہوں وہ رفتہ رفتہ صوفی ہوتے گئے اور سات برس تک ایک صوفی مسلک کے ساتھ منسلک رہے لیکن پھر ان کا اس مسلک پر اطمینان نہ رہا اور وہ اس سے الگ ہو گئے۔

میرے والد محکمہ تعلیم کے شعبہ تربیت کے انچارج تھے جب وہ صوفی ہو گئے تو اسلام کے خلاف ذرا سی بات بھی انھیں کھٹکنے لگی۔ ان کا یہ شدید رجحان دیکھ کر حکام نے ملازمت سے معطل کر دیا۔ جب انھوں نے شاہ مراکش کو ایک مکتوب بھیجا جس میں انھوں نے انتظامیہ میں پھیلی ہوئی بدعنوانی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شاہ سے کہا تھا کہ ملک کی اصلاح کا راستہ راستہ خود بھی شریعت پر کاربند ہونا اور ملک کو بھی اس پر کاربند کرنا ہے تو انھیں تین سال کے لیے پاگل خانے میں بند کر دیا گیا۔

میرے والد کی تبدیلی نے میری تعلیم کا رخ بھی موڑ دیا۔ میں جب کبھی ان سے ملاقات کے لیے پاگل خانے جاتی تو وہ مجھ سے دین کی باتیں کرتے اور پردے کی حکمتیں بیان کرتے۔ انھوں نے مجھے قائل کر لیا کہ عورت کے لیے پردہ خود اس کے مفاد میں ہے لیکن انھوں نے مجھے کبھی بھی لباس کی تبدیلی پر مجبور نہیں کیا۔ انھوں نے میرے اندر ایمان کی روح پھونک دی لیکن ظاہراً مجھے کبھی بھی دین کی پابندی کا حکم نہیں دیا۔ وہ میرے سامنے اپنی آراء دلائل کے ساتھ بیان کر دیتے اور فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیتے انھوں نے اپنا فیصلہ مجھ پر کبھی ٹھونسا نہیں تھا۔ جب وہ تین سال قید کاٹ کر آئے تو میں ابھی تک مغربی لباس ہی پہنتی تھی ایک دن میرے والد نے کہا۔ ہمارا رشتہ دو نوع کا ہے۔ ایک خونی رشتہ جس سے نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ

توڑ سکتا ہے۔ دوسرا رشتہ ایمانی ہے جو ہر مسلمان کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ رشتہ اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک ایمان قائم رہتا ہے۔ جب ایمان کی کوئی رمق باقی نہ رہے تو پھر یہ رشتہ بھی باقی نہیں رہتا۔ میں تم سے دوسرا رشتہ یعنی ایمانی رشتہ توڑ رہا ہوں۔ میں نے تعجب سے کہا۔ ابا آپ یہ کیسے کر سکتے ہیں؟

مجھے اپنے والد کی بات کا مفہوم اس وقت معلوم ہوا جب یونیورسٹی میں پڑھنے والی میری ایک سہیلی نے مجھے ایک مصری عورت کے بارے میں کتاب دی جسے ناصر کے زمانے میں قید کیا اور اس کو تعذیب دی گئی تھی۔ لیکن اس اللہ کی بندی نے ہر تشدد کو پامردی سے برداشت کیا لیکن اپنے دینی موقف سے رتی برابر نہ سرکی۔ اس کتاب سے میں بے حد متاثر ہوئی (یہ کتاب سید قطب شہید کی ہمشیرہ زینب الغزالی کی داستان اسیری تھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ میں حقیقت میں بزدل ہوں۔ جب میں اللہ پر ایمان رکھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ مسلمان عورت کے لیے پردے کا حکم ہے تو پھر میں اس پر عمل کیوں نہیں کرتی؟ یہ میری کمزوری اور بزدلی کی علامت تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایک وہ مومن عورتیں ہیں کہ جن کو عذاب دیا جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی اپنے ایمان سے نہیں ہٹتیں اور ایک میں ہوں کہ میں آزاد ہوں میرے سر پر کوئی ہتھوڑا لیے نہیں کھڑا ہے پھر بھی اسلام کے حکم کے مطابق پردہ نہیں کرتی ہوں۔

اسی سہ پہر کو میں نے برقع خرید لیا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان عورت پس ماندہ ہو کر رہ گئی ہے وہ جاہل اور بے علم ہیں۔ اسلام نے عورت کو اس کا تشخص بخشا ہے۔ عورت کو اقتصادی خود مختاری عطا کی ہے۔ عورت کو شریعت نے جو حصہ دیا ہے اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ نہ اس کا باپ، نہ خاوند اور نہ بھائی۔ جب کہ مغرب میں عورت تک اپنا الگ بنک اکاؤنٹ بھی نہیں کھلوا سکتی۔ پانچ برس ہوئے کہ فرانس میں عورت کو اپنا الگ اکاؤنٹ کھولنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سے قبل عورت صرف خاوند کی اجازت سے اپنا اکاؤنٹ کھول سکتی تھی۔

مجھے افسوس ہے کہ ہمارے علماء بھی کم نگاہی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتی ہوں مراکش کا ایک ٹیلی ویژن پروگرام خصوصی طور پر عورتوں کے لیے رکھا جاتا تھا۔ اس میں علماء کا ایک بورڈ خواتین کے سوالات کے جوابات دیتا تھا۔ ایک دفعہ میں یہ پروگرام سن رہی تھی کہ ایک عورت نے علماء کے بورڈ سے پوچھا۔ "میرا خاوند مر گیا ہے۔ میرے چھ بچے ہیں۔ لیکن میرا کوئی ذریعہ روزگار نہیں ہے۔ کیا میں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنا جسم فروخت کر سکتی ہوں؟"

بورڈ کے ایک عالم نے جواب دیا۔

"[illegible] اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔"

یہ فتویٰ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ کیا اس عالم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسلامی ریاست کے بھی بعض فرائض ہیں۔ اگر کوئی فرد بے سہارا ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کی دستگیری کرے۔ کیا حضرت عمرؓ راتوں کو گشت کر کے رعایا کی ضروریات کی تحقیق نہیں کیا کرتے تھے۔

لیکن جب ہم اسلام سے کٹ کر سوچتے ہیں تو ہمارے مسائل کی الجھنوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مرد نے خدا کو فراموش کیا ہے تو عورت بھی اس غفلت کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہو گئی ہے۔ عورت کے مسائل مرد کے مسائل سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔ اگر عورتوں میں آزادی نسواں کی تحریک جاری ہے تو مردوں میں بھی ہم جنسیت کی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ سارا عذاب خدا فراموشی کا نتیجہ ہے۔

یہ نادیہ یٰسین کا انٹرویو ہے جو ایک ہسپانوی جریدہ مناس سے لیا۔ نادیہ یٰسین تحریک اسلامی مراکش کے مشہور رہنما عبدالسلام یٰسین کی بیٹی ہے۔ عبدالسلام یٰسین آج کل جیل میں قید تنہائی میں ہیں۔ کمزور پھیپھڑوں کی وجہ سے انہیں ضیق نفس کی تکلیف ہے لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ان کی رہائی کے لیے ہر جمعرات کو جب قیدیوں سے ملاقات کی اجازت ہوتی ہے تو احتجاجی مظاہرہ ہوتا ہے لیکن حکومت اس کا بھی کوئی اثر نہیں لیتی۔ اب سننے میں آیا ہے کہ عبدالسلام یٰسین کو کسی دوسری جیل منتقل کیا جا رہا ہے تاکہ مظاہرے بند ہوں۔ عبدالسلام یٰسین کے تمام عزیزوں پر بھی کڑی نگرانی رہتی ہے پچھلے دنوں عبدالسلام یٰسین کے داماد عبداللہ شیبانی کو گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے گرفتاری سے قبل انہیں خوب مارا جس سے ان کا خون کافی مقدار میں بہہ گیا۔

حکومت مراکش تحریک اسلامی کو دبانے کے لیے اس قدر سختی کر رہی ہے کہ پولیس پردہ دار خواتین کو بھی تلاشی کے لیے روک لیتی ہے حکومت کے نزدیک ہر باپردہ خاتون تحریک اسلامی کی ہمدرد ہے۔ (ماخوذ از عربیا لندن۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

(بقیہ اشارات)

بھی استعمال ہوتا ہے۔ پرندے صبح ہی کو اپنے گھونسلوں سے نکل کر تلاش رزق میں جاتے ہیں اور انسان بھی عام طور پر صبح ہی کو اپنے کاموں کی ابتدا کرتا ہے اس لیے فرمایا گیا ہے کہ تم صبح کو جا کر سیکھو یا سکھاؤ۔ ورنہ تعلیم و تعلم کے لیے نہ گھر سے نکلنے کی قید ہے اور نہ صبح کے وقت کی کوئی قید ہے۔ اس حدیث شریف سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) کتاب اللہ کا علم حاصل کرنے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دینے کی فضیلت و اہمیت، امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ایک مختصر متفق علیہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (تم میں بہترین شخص وہ ہے جس نے قرآن کی تعلیم حاصل کی اور پھر

۱- [illegible] قرآن [illegible] کا علم حاصل کرنے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دینے کی یہ فضیلت واہمیت بالکل واضح ہے کیونکہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو زمین پر نازل ہوئی ہے۔ یہ زمین پر اللہ کی بھیجا ہوا نور ہے جس سے صراط مستقیم پر دلوں کی روشنی پڑتی ہے۔ یہ اس کی اتاری ہوئی روح ہے جس سے اس پر ایمان لانے والوں کی روحیں تر و تازہ ہوتی ہیں۔ یہ اس کی اتاری ہوئی شفا ہے جو مومنوں کے تمام امراض روحانی وجسمانی کو دفع کرتی اور انھیں بھلا چنگا بناتی ہے یہ زمین پر اللہ کی رحمت ہے جو انسانوں کو اس کی رضا کا مستحق بناتی ہے۔ یہ تمام انسانوں کے لیے آخری دستور حیات ہے اور ضابطۂ عمل ہے۔ یہی کتاب ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ قوموں کو بلند یا پست کرتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کا علم حاصل کیا، اس پر عمل کیا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی، اس کا پیغام عام کیا وہ سربلند ہوئے اور جن لوگوں نے اس سے غفلت برتی، اس کی تعلیمات اور اس کے اوامر ونواہی کو پس پشت ڈالا وہ ذلیل وخوار ہوئے، پست ہوئے۔

(۲) کتاب وسنت کا علم، عبادت سے افضل ہے۔ اس حدیث میں اس کو اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ ایک آیت کا علم حاصل کر لینا سو رکعت نفل نماز سے بہتر ہے۔ دوسری احادیث میں بھی اس کے ہم معنیٰ باتیں کہی گئی ہیں۔

(۳) نفع متعدی، نفع قاصر سے یا خیر متعدی خیر لازم سے افضل واعلیٰ اور بہتر ہے۔ نفع قاصر اور خیر لازم، اسی طرح نفع متعدی اور خیر متعدی ہم معنی الفاظ ہیں۔ خیر لازم اس نیکی کو کہتے ہیں جس کا اثر صرف نیکی کرنے والے پر پڑتا ہے۔ جیسے نماز اور روزہ، تسبیح وتہلیل۔ خیر متعدی اس نیکی کو کہتے ہیں جس کا اثر نیکی کرنے والے تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسروں تک پہنچتا ہے۔ جیسے قرآن کی تعلیم، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، مرحمت ومواسات، خدمت خلق

یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ خیر لازم سے خیر متعدی کے افضل ہونے کا مسئلہ نوافل میں پیدا ہوتا ہے۔ فرائض وواجبات میں پیدا نہیں ہوتا کیونکہ نیک کاموں میں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا سوال نوافل ہی میں پیدا ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ اس حدیث میں بابا من العلم (علم کا کوئی باب) سے مراد قرآن کی کسی آیت اور کسی حدیث نبوی کی تعلیم یا کوئی دینی مسئلہ بتا دینا ہے۔ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہزار رکعت نفل نماز سے بہتر قرار دیا ہے ——

حضرات! افسوس ہے کہ مسلمان جب علمی وفکری زوال سے دوچار ہوئے تو انھوں نے معاملہ الٹ دیا اب ان کے نزدیک خیر لازم، خیر متعدی سے افضل واعلیٰ بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مثال کے طور پر ہزار رکعت نفل نماز پڑھنے والے کو بزرگ، عابد، ولی اور معلوم نہیں کیا کیا سمجھتے ہیں اور جو شخص دن رات، مثال کے طور پر خدمت خلق میں مشغول ہے وہ ان کے نزدیک نہ بزرگ ہے نہ عابد اور نہ ولی ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔
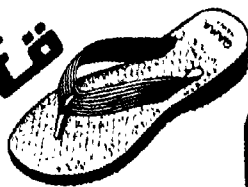
MONTHLY Regd No. D.NO. (DN)-348
ZINDGI-E-NAU
R.N. NO.: 42893/84
1525, SUIWALAN
NEW DELHI-110002
JULY 85

[illegible] دہلی آرٹ پریس میں چھپا۔

ماہنامہ
زندگی نو
نئی دہلی ۲

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

• اسلام کا فلسفۂ اخلاق • اسلام کیسے اخلاق پیدا کرنا چاہتا ہے • عام انسانی اخلاق اور اسلامی اخلاق کا فرق • دین کی بنیادی تعلیمات سمجھنے کے لیے ایک ناگزیر کتاب۔

بناؤ اور بگاڑ

• دنیا میں قوموں کے عروج وزوال کے اخلاقی ضابطے • انسانیت کی فلاح کے بنیادی اصول • زندگی کا حقیقی شعور پیدا کرنے کے لیے دلنشین دلائل

اسلام اور جاہلیت

• علم اور قیاس کا فرق اور ان کے زندگی پر اثرات • زندگی کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ • اسلام اور جاہلیت کا فرق • جاہلیتِ خالصہ اور اس کی اقسام • دین کا شعور اور یقین بخشنے والی کتاب۔

جلد ۳ ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ مطابق اگست ۱۹۸۵ء شمارہ ۲ - ۲

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے
جناب سید احمد عروج قادری، مدیر "زندگی نو" گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یو پی)

پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶۔۔۔۱۱۰۰ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون ۲۷۳۲۴۸۱ فون ۲۹۵۳۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

خدا اور خدا پرستی کی تعریف و توضیح جب انسان اپنی عقل، اپنے قیاس اور اپنی پسند سے کرنے لگے تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ طرح طرح کے تصورات خدا اور بھانت بھانت کی خدا پرستیاں وجود میں آجائیں گی اور فی الواقع آج موجود بھی ہیں۔ حد یہ ہے کہ بہت سے خود پرست بھی پیسے اور قلم کے زور سے اپنے آپ کو خدا پرست ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جس شخص کی "انا" بھینس کی طرح کالی اور موٹی ہے وہ "انا" کے پھیلنے کی ہانک رہا ہے۔ جو شخص انانیت کے اونچے تخت پر براجمان ہے وہ انانیت کو تخت سے اتارنے کی باتیں کر رہا ہے۔ من گھڑت خدا پرستی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو حق و باطل کی کشمکش سے ہٹا کر صرف اپنے اندر جھانکتے رہنے کی دعوت دیتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ خدا اور خدا کے دین کی خاطر ایک پھانس بھی اس کے جسم میں چبھے۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں جن چیزوں پر طنز کرتی ہے وہ اپنے مقابلہ میں انہیں نہ صرف جائز سمجھتی بلکہ انہیں اپنے ہی لیے خاص کر لینا چاہتی ہے۔ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کی جد و جہد کو، کلمۂ حق عند سلطان جائر کو اور باطل اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کرنے کو دین داری کے خلاف قرار دیتی ہے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کی راہ میں جتنے سنگ گراں پڑے ہوئے ہیں ان میں من گھڑت خدا پرستی سب سے سخت پتھر ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا وہ ہے جس نے اپنی تعریف اپنے انبیاء پر وحی کی ہے اور صحیح خدا پرستی وہ ہے جس کا طریقہ خود خدا نے بتایا ہے۔ وہ لوگ من گھڑت خدا پرستی کے ہدف اولیں ہیں۔ یہ ان پر قسم قسم کے الزامات لگاتی اور انہیں بدنام کرنے کی سعی بلیغ کرتی ہے۔ جن کو یہ ہدف بناتی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ دینداری صرف اپنے اندر جھانکنے کا نام نہیں ہے بلکہ باہر کی دنیا میں بھی خدا کے دین کو کامیاب و کامراں دیکھنے کا نام ہے اور اس کو کامیاب و فتحیاب کرنے کی جد و جہد وہ فریضہ ہے جو خدا نے اپنے بندوں پر عائد کیا ہے۔ قرآن نے جو دینداری

سکھائی ہے وہ جاء الحق وزھق الباطل (حق آگیا اور باطل مٹ گیا) کا نعرہ سنائی ہے۔ وہ دینداری یہ حقیقت دنیا کے سامنے لاتی ہے۔

ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے" اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے پاس ہی سے کرلیتے۔ مگر ہم تو حق کو باطل پر دے مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔ (الانبیاء ۱۶ تا ۱۸)

یہ آیتیں ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتی ہیں کہ سروں کے اوپر آسمان کی لاجوردی چھت اور قدموں کے نیچے زمین کا خاکی فرش، یہ پوری دنیا کھلونا نہیں ہے بلکہ بنانے والے نے اس کو میدان کارزار بنایا ہے جس میں حق و باطل کی کشمکش ہوتی ہے، باطل اپنے لاؤ لشکر کے گھمنڈ میں حق سے پنجہ کشی کرتا ہے اور حق اس کی کلائی توڑتا نکلتا ہے۔ حق کی آواز ابتدا میں دبی رہتی ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ صور نشور بن جاتی ہے۔ ہمارا ایمان اسی دینداری اور اسی خدا پرستی پر ہے۔

ع لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

ہم نے دینداری نہ یونانی فلسفیوں سے سیکھی ہے اور نہ ان کے شاگردوں سے جنھوں نے صرف اپنی عقل اور اپنے ذوق کو رہنما بنالیا تھا اور ان کے شاگرد آج بھی بنائے ہوئے ہیں۔ ہم عقل کو اللہ کی بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں لیکن صرف اسی کی رہنمائی پر اکتفا نہیں کرتے، نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ اس کی پرواز محدود ہے۔ طائر عقل حقائق کی اس دنیا تک نہیں پہنچ سکتا جو اس کی دسترس سے باہر ہے۔ ان حقائق تک ہمیں وحی الٰہی پہنچاتی ہے اور وحی الٰہی کی تعبیر و تشریح ہمیں ان برگزیدہ انسانوں سے ملتی ہے جن پر وحی نازل ہوتی تھی اور سب سے آخر میں محمد عربی فداہ ابی و امی پر نازل ہوئی۔ ہم اس کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے کے لیے بھی صرف زبان دانی اور اپنی عقل کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہماری روش دینداری پر حرف زنی کرتا ہے تو کرے۔ ہمیں اس کی پرواہ نہ کل تھی نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔

ذکرِ الٰہی

(سید احمد قادری)

(سید احمد قادری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا

(الاحزاب ۴۱-۴۲)

ترجمہ :- اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

تشریح :-

ذکر کے معانی "ذکر اللہ" میں ذکر کے تین معانی مستعمل ہیں۔ یاد کرنا۔ یاد رکھنا۔ یاد دلانا (یاد دہانی) — یاد کرنے کا تعلق اصلاً زبان سے ہوتا ہے۔ ذکر لسانی (زبان سے یاد کرنا) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ذکر جو صرف نوک زبان پر ہوتا ہے اور قلب اس سے غافل رہتا ہے۔ یہ حقیقی ذکر نہیں ہوتا اسی لیے اس کے فوائد یا تو حاصل نہیں ہوتے یا بہت کم ہوتے ہیں۔ دوسرا وہ ذکر جو زبان پر بھی ہو اور دل میں بھی۔ زبان اور دل دونوں ہم آہنگ ہوں یہی حقیقی ذکر مقصود و مطلوب ہے۔ اس ذکر کے فوائد بے حد و حساب ہیں۔

یاد رکھنے کا تعلق اصلاً قلب سے ہے اس کا اظہار اطاعتِ الٰہی سے ہوتا ہے اور ذکر کا یہی معنی اس کو ایک وسیع المعنی لفظ بنا دیتا ہے۔ اسی میں ایسا ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ کسی کی زبان خاموش ہو لیکن وہ شخص ذکر میں مشغول سمجھا جائے۔ قرآن کریم میں ہے :-

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (البقرۃ ۱۵۲)	لہٰذا تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا میری شکر گزاری کرتے رہنا میری ناشکری نہ کرنا

اس آیت کریمہ میں ذکر کے معنے یاد رکھنے کے ہیں اس میں یاد کرنا اصل معنے نہیں۔

قال الحسن البصری اذکرونی فیما افترضتہ   میں نے تم پر جو فرائض عائد کیے ہیں ان میں مجھے

علیکم اذکرکم فیما اوجبت لکم علی نفسی	یا تم مجھے ان چیزوں میں یاد رکھوں گا جو میں نے تمہارے لیے اپنے اوپر لازم کرلی ہیں
وعن سعید بن جبیر اذکرونی بطاعتی اذکرکم بمغفرتی وفی روایۃ برحمتی (مختصر تفسیر ابن کثیر)	سعید بن جبیر سے روایت ہے مجھے میری اطاعت کے ساتھ یاد رکھو۔ میں تمہیں اپنی مغفرت کے ساتھ یاد رکھوں گا اور ایک روایت میں ہے کہ اپنی رحمت کے ساتھ یاد رکھوں گا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے :۔

"جب ہماری طرف سے تم پر اتمام نعمت مکرر ہو چکا تو اب تم کو لازم ہے کہ ہم کو زبان سے، دل سے، ذکر سے، فکر سے، ہر طرح یاد کرو اور اطاعت کرو۔ ہم تم کو یاد کریں گے یعنی نئی نئی رحمتیں اور عنایتیں تم پر ہوتی رہیں گی اور ہماری نعمتوں کا شکر خوب ادا کرتے رہو اور ہماری ناشکری اور معصیت سے بچتے رہو"

مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں لکھا ہے :۔

"تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد یہ امت ایک بالکل ممتاز امت کی حیثیت سے سامنے آگئی۔ یہود امامت کے منصب سے معزول ہوئے اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اس امت کے سپرد ہوئی۔ اس اہم موقع پر یہ یاد دہانی کی گئی ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میری شکرگزاری کرتے رہنا، ناشکری نہ کرنا، اس یاددہانی کی نوعیت اللہ تعالیٰ اور اس امت کے درمیان ایک عظیم معاہدے کی ہے اور خدا کو یاد رکھنے سے مقصود ان تمام ذمہ داریوں اور فرائض کو یاد رکھنا اور ان کی بجاآوری ہے جو اس امت کے سپرد کیے جا رہے ہیں۔ ان ذمہ داریوں اور فرائض کی بجاآوری کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ میں تمہیں یاد رکھوں گا یعنی دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی، نصرت، فتح مندی اور سرخ روئی کے جو وعدے میں نے اس امت سے کیے ہیں، وہ پورے کروں گا۔ میری شکرگزاری کرتے رہنا" سے مراد ان تمام نعمتوں کا صحیح صحیح حق ادا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں اور آئندہ ملنے والی ہیں۔ ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت خود وہ شریعت تھی جو اب اپنی کامل شکل میں اس امت کو منتقل ہو رہی تھی۔ آخر کے الفاظ ولا تکفرون (اور میری ناشکری نہ کرنا) میں تنبیہ ہے کہ اگر تم نے ناشکری کی تو جس طرح یہود

...کر کے کیفر کردار کو پہنچے ۔ خدا کے اس قانون کی زد سے تم بھی نہ بچ سکو گے ۔

بعینہٖ اسی طرح کی یاد دہانی بنی اسرائیل کو بھی کی گئی تھی لیکن انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی ۔
قرآن مجید میں اس کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے ۔ اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (البقرہ ۔ ۴۰) (تدبر قرآن ج۱ ص۲۲۳)

علمائے صوفیہ

علمائے صوفیہ نے بھی ذکر کے وسیع معنے کو تسلیم کیا ہے ۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اپنے مکتوب ۵ میں ذکر و فکر پر مفصل گفتگو کی ہے ۔ اس میں ذکر کی تشریح کے بعد لکھا ہے :-

مشائخ نے کہا ہے کہ اشرف و افضل ذکر، حق تعالیٰ کو یاد رکھنا ہے ۔ اس کے اوامر کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب میں ۔ ہر ایسا کام کرنے والا ذاکر ہے جو وہ اللہ کے لیے اور اس کے تقرب کی نیت سے کرتا ہو اس لیے کہ ذکر کے معنے خدا کو یاد رکھنا ہے اور یاد کرنا بھی اسی کا حق ہے ۔

وہ مزید تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" پس متکلم ذاکر ہے، فقیہ ذاکر ہے ۔ مدرس ذاکر ہے ۔ مفتی ذاکر ہے ۔ واعظ ذاکر ہے ۔ جو شخص حق عز و جل کی عظمت و جلال اور اس کے جبروت اور آسمان و زمین میں اس کی نشانیوں پر غور و فکر کرتا ہے وہ ذاکر ہے اور اللہ کے اوامر کی تعمیل کرنے والا اور نفس کو اس کے نواہی سے بچانے والا ذاکر ہے ۔ حدیث میں ہے کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کو یاد کیا اگرچہ اس کی نفل نمازوں نفل روزوں اور تلاوت قرآن کی مقدار کم ہو اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس نے اس کو یاد نہیں رکھا ۔ اگرچہ اس کی نفل نمازوں نفل روزوں اور تلاوت قرآن کی مقدار بہت ہو ۔" یہ حدیث طبرانی نے واقد سے روایت کی ہے ۔"

شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات ج ۲ مکتوب ۲۵ میں لکھا ہے :-

" ہر عمل جو شریعت غرا کے موافق کیا جائے ذکر میں داخل ہے اگرچہ وہ خرید و فروخت کا معاملہ کیوں نہ ہو ۔"
ایک مسلمان جو غلہ فروخت کرتا ہے، پورا تولتا ہے اور تول میں کوئی کمی نہیں کرتا، محض اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا ہے ۔ ایک مسلمان کپڑا فروخت کرتا ہے، پورا ناپتا ہے اور ناپ میں کوئی کمی نہیں کرتا صرف اس وجہ سے کہ باری تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے ۔ اگر ان دونوں کی زبانیں ذکر اللہ سے ساکت ہوں ۔ پھر بھی وہ ذکر الٰہی میں مشغول

لگ جائیں گے۔

یاد دلانا اس کا تعلق زبان سے ہے۔ قرآن مجید میں ذکر کا لفظ یاد دہانی کے معنے میں بیسوں مقامات پر آیا ہے خود قرآن کو متعدد مقامات پر "ذکر" کہا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ وہاں "ذکر" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

"یہ یاددہانی ہم نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں" (الحجر ۹)

قرآن کے لیے "ذکر" کا لفظ اتنی بار استعمال ہوا ہے کہ کفار کہ یہ لفظ بول کر بھی نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر طنز کیا کرتے تھے۔ سورہ حجر ہی کی آیت ۶ میں ہے:۔

"اور یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یاددہانی اتاری گئی ہے تم تو ایک مجنون ہو"

یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن ذکر ہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (القلم) اور یہ قرآن تو بس یاددہانی ہے جہان والوں کے لیے

اسی یاد دہانی کے معنے کے لحاظ سے پند و نصیحت کے لیے ذکر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن چونکہ سراپا ذکر ہے۔ اس لیے تلاوت قرآن، تبلیغ قرآن، دعوت الی اللہ اور اعلائے دین حق کی جدوجہد ذکر، بلکہ ذکر کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ اس تشریح میں ذکر الٰہی کی مناسبت سے جو چیزیں مناسب معلوم ہوئیں وہ لکھی جا رہی ہیں۔ ذکر، تذکرہ، تذکیر ذکریٰ اور اس طرح کے تمام الفاظ پر کوئی سیر حاصل مقالہ لکھنا مقصود نہیں ہے۔

ذکر لسانی کی قسمیں

دعوت الی اللہ۔ نماز۔ تلاوت قرآن۔ تسبیح (سبحان اللہ کہنا) تحمید (الحمد للہ کہنا) تہلیل (لا الٰہ الا اللہ کہنا) تکبیر (اللہ اکبر کہنا) حوقلہ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہنا) درود۔ استغفار۔ دعا۔ یہ سب ذکر لسانی کی اقسام ہیں۔

ذکر الٰہی، تمام عبادتوں کی جان ہے

قرآن کریم میں منافقین کی نمازوں کا جو تذکرہ ہے اس میں یہ ہے کہ ان کی نمازیں محض دکھاوا ہوتی ہیں وہ اپنی نمازوں میں اللہ کو یاد نہیں کرتے۔ حالانکہ نماز اللہ کے ذکر ہی کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ سورۂ النساء آیت ۱۴۲ میں ہے

"یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھلانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو

کو ہی یاد کرتے ہیں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت ورسالت عطا کی گئی تو فرمایا گیا :-

میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کیلئے نماز قائم کر (طٰہٰ : ۱۴)

یہاں نماز کی اصل غرض پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آدمی خدا سے غافل نہ ہو جائے ۔ دنیا کے دھوکہ دینے والے مظاہر اس کو اس حقیقت سے بے فکر نہ کر دیں کہ میں کسی کا بندہ ہوں، آزاد و خود مختار نہیں ہوں اس فکر کو تازہ رکھنے اور خدا سے آدمی کا تعلق جوڑے رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے جو ہر روز کئی بار آدمی کو دنیا کے ہنگاموں سے ہٹا کر خدا کی طرف لے جاتی ہے ۔ (تفہیم القرآن ج ۳)

سورۃ العنکبوت آیت ۴۵ میں کہا گیا ہے ۔ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے)

ان چند آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبادات میں جان اللہ کے ذکر سے پڑتی ہے ۔ اس بات کو ایک حدیث میں واضح کر دیا گیا ہے :-

"ایک شخص آئے اور انھوں نے سوال کیا" یا رسول اللہ! مجاہدین میں اجر کے لحاظ سے سب سے عظیم کون ہے ؟ آپ نے فرمایا وہ جو سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہے ۔ انھوں نے سوال کیا ۔ روزہ داروں میں سب سے زیادہ اجر کس کا ہے ؟ آپ نے جواب دیا ۔ ان میں جو سب سے زیادہ اللہ کو یاد رکھنے والا ہے ۔ پھر انھوں نے نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ سب کے بارے میں یہی سوال کیا اور جواب میں آپ نے وہی بات دہرائی ۔ یہ سنکر ابو بکرؓ نے عمر (رضی اللہ عنہ) سے کہا اللہ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے والے تمام نیکیاں لے گئے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ہاں (یعنی بات یہی ہے جو تم نے کہی ۔

(مختصر تفسیر ابن کثیر بحوالہ مسند احمد)

ذکرِ کثیر کا مفہوم

اوپر سورۃ احزاب کی آیت ۴۱ میں ذکر کثیر اور آیت ۴۲ میں صبح وشام تسبیح کا حکم دیا گیا ہے ۔ تسبیح سے مراد نماز ہے ۔ پہلی آیت میں ذکر عام اور دوسری آیت میں ذکر خاص کا حکم ہے ۔ ذکر کثیر کا حکم سورۃ جمعہ کے دوسرے رکوع میں بھی ہے ۔ سورۃ احزاب آیت ۳۵ میں مسلمان مردوں اور عورتوں کی صفات بیان کی گئی ہیں اور سب کے آخر میں یہ صفت ہے :-

(باقی صفحہ پر دیکھیے)

مغرب، مساواتِ مرد و زن اور اسلام

(جناب نعیم صدیقی صاحب)

مغرب میں اصلاحِ مذہب (REFORMATION) اور احیائے علوم (RENAISSANCE) کی تحریکوں کے بعد لبرلزم کی تحریکیں معاشرے پر اس طرح اثر انداز ہوئیں کہ نظامِ مذہب و اخلاق کی جڑیں ہل گئیں۔ ناقص مرکب اور جامد مذہبیت نے عقلی بیداری کا مقابلہ کلیسا کی قائم کردہ انہی جبر کیش عدالتوں (INQUISITIONS) سے کیا جن میں دلیل، وکیل اور اپیل کے لیے کوئی راستہ نہ تھا۔ ان عدالتوں نے ہر اخلاقی آواز پر، خواہ کتنی ہی مبنی بر صداقت اور ثابت بہ مشاہدہ ہو، نہایت اہم لوگوں پر سنگین اور بھیانک سزائیں نافذ کیں اور ان سزاؤں کا نشانہ بڑی کثیر تعداد بنی۔ مگر جبریت کا ہتھیار بڑی جلدی کند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مذہبیت کے خلاف علمی اور عقلی دائروں میں ایسی بغاوت ابھری کہ جس نے اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے مذہب کو بے دخل کر دیا اور انفرادی معاملات میں ہر فرد کو آزادی دلوادی کہ جس کا جو جی چاہے، سوچے اور کرے۔

مذہب و اخلاق کی اس شکست کے دور میں خاندانی نظام ایک ایسی پناہ گاہ تھا۔ جہاں عقیدے اور اخلاقی روایات سر چھپائے ہوئے تھیں۔ مگر صنعتی انقلاب جب رونما ہوا تو اس خاندانی نظام کو بھی تہس نہس کر دیا۔

ایسی فضا تھی کہ مشین ایجاد ہوئی اور کارخانے کھلنے لگے اور شہروں کی نئی مارکیٹ کھل گئی۔ اس مارکیٹ میں جہاں مشین کی وجہ سے بے روزگار رہنے والے محنت کش آنے لگے، وہاں دیہات سے بھی لوگ نقد آمدنی کے لالچ میں لپکے۔ آمدنی تو تھی، مگر شہر کے اخراجات بھی زیادہ تھے۔ اس لیے لوگ عورتوں کو بھی مزدوری کے لیے ساتھ لانے لگے۔ یہ سیلاب جب بڑھا تو کارخانوں میں مردوں اور عورتوں کے اکٹھے کام کرنے سے اختلاط کی صورتیں نکل کر سامنے آئیں۔ علیحدگی، ممتنعین اور شرم و حیا اور عورتوں کی مخصوص فطری ذمہ داریوں کے تصورات کچلے جانے لگے۔ یہ سلسلہ چل پڑا تو بڑھا، نسوانیت، جنسی رابطے اور عصمت و عفت کے نئے تصورات وجود میں آنے لگے۔ انہی دنوں ایک نظریہ

"مساوات مرد وزن" کا نظریہ بھی تھا جس کے معنے یہ تھے کہ عورت فطرت کی عائد کردہ اختصاصی ذمہ داریاں بھی ادا کرے اور اس کے ساتھ ان سخت کاموں میں بھی زیادہ سے زیادہ حصہ لے جو فطری لحاظ سے مرد کے لیے خاص تھے۔ ساتھ کے ساتھ تیسری ذمہ داری عورت کے سر یہ بھی آ پڑی کہ وہ ہر ادارے اور شعبے میں بن سنور کر مرد کی تفریح کا سامان بھی بنے اور عیش و طرب کے اڈوں میں اپنی خدمات پیش کرے۔ اس نظریہ مساوات نے چونکہ عورت کو خاندانی قوامیت سے بالکل آزاد قرار دیا اور اس کا کوئی ولی اور نگہبان نہ رہا۔ اس لیے وہ نظریہ مساوات کے نشے میں بہک کر وقت کی لہروں میں بہہ نکلی۔

مغرب کے نظریہ مساوات مرد وزن کے غلط پہلو یہ ہیں :۔

۱۔ مساوات حقوق کے بجائے فرائض نسوانیت کی زیادتی اس میں مضمر ہے۔ یعنی عورت کو عورت کے فرائض بھی انجام دینے چاہییں اور جو کام مرد کرتا ہو وہ سب بھی عورت کو کرنے چاہییں۔

۲۔ عورت مرد کی قوامیت (لیڈرشپ) سے آزاد ہے۔ نہ اس کا کوئی ولی ہے اور نہ قوام۔ اس کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ خاندانی نظام کالعدم ہوا۔

۳۔ عورت کی کفالت یا اس کے تحفظ کی ذمہ داری مرد پر اصولاً نہیں ہے۔ (بس رعایتہً کچھ چیزیں باقی ہیں) وہ اپنی کمائی خود کرے اور اپنا تحفظ آپ کرے یعنی وہ اب معاشرے میں ایک سستا شکار ہے تمام مردوں کے لیے[۵] جو بھی حسن و خوبی سے اسے دام میں لے سکے لے لے۔ کوئی تیسرا دخل دینے والا نہیں ہے۔

۴۔ اس نظریہ مساوات نے حقیقی مساوات کو اس لیے درہم برہم کر دیا کہ عورت پر پرورش نسل کی جو ذمہ داری فطرت نے ڈالی تھی وہ تو اپنی جگہ برقرار رہے اور اسے کوئی مرد انجام نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مرد کے تمدنی فرائض کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے اور وہ اپنی جنس نسائیت کو بیچے ایک مرد کے لیے

---

[۵] عیش و طرب کے تمام ادارے، بدکاری کے تمام اڈے، فحشیات کے کاروبار کے مراکز بھی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں، وہ سنہ پیسے کر عورت کو جیسے چاہیں استعمال کرتے ہیں۔ وہ روپیے کی خاطر اسٹیجوں پر عریاں ہو سکتی ہے بلیو فلموں میں انتہائی شنیع و مکروہ کردار ادا کر سکتی ہے۔ سہلیے بار جو کچھ چاہیں وہ اسے [illegible] پڑتا ہے۔ بعض حکومتوں کے جاسوسی ادارے اور مجرموں کی تنظیمیں عورتوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیتی ہیں۔ [illegible] کاروبار [illegible] کے لیے اور بدقسمتی کی بدولت [illegible] بننے کے لیے عورت کو کام میں لایا جاتا ہے جس کا [illegible] کے ذریعے [illegible]

[illegible]

سرمایہ تشکیل پاتی تھی، اب اسی کو وہ دولت کی خاطر صد ہزار مردوں کے لیے استعمال کرتی ہے یعنی مرد کے ایک بچہ کے مقابلہ میں عورت پہ تہرا بوجھ پڑ گیا ہے۔

۵۔ اس نظریہ مساوات کی وجہ سے بیشتر صورتوں میں ازدواجی تعلق کا حال ایسا ہو گیا ہے جیسے ایک نیام میں دو تلواریں ہوں۔ نتیجہ یہ کہ جدید مغربی عورتوں کی ایک بڑی تعداد ماری ماری پھرتی اور طرح طرح سے ذلیل ہوتی مگر کوئی اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ ۳۵۔۴۰ سال تک انتظار کرنے کے بعد آخر وہ مایوس شروع ہوتا ہے اور اس دوران میں زیستزد شدہ عورتیں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی پھرتی ہیں۔ عورت کے ہاتھوں میں جب سے نظریہ مساوات نے تلوار تھمائی ہے اس کے بعد مغربی معاشروں میں آہستہ آہستہ ہم جنسی اختلاط کی وبا پھیلتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اب تو ہم جنسی شادیاں علی الاعلان ہونے لگی ہیں اور قانون نے ان کو جائز قرار دے دیا ہے۔ ازدواجی تعلق میں نظریہ مساوات نے جو رخنے ڈالے ہیں ان کی وجہ سے کنواری ماؤں اور حرام اولادوں کا تناسب مسلسل بڑھ رہا ہے۔ یہ صورت احوال خود گواہ ہے کہ یہ سب نتائج کی بنیاد اسی غلط نظریہ پر ہے۔

(۲)

اسلام میں بحیثیت انسان بھی مرد اور عورت برابر ہیں اور بحیثیت مسلمان بھی اور اعتقادی لحاظ سے بھی ان میں مساوات ہے یعنی دونوں کے لیے ایک ہی نظام عقائد ہے۔ دونوں کے جنت میں مقیم رہنے، دونوں کے اکٹھے لغزش کھانے اور دونوں کے زمین پر بھیجے جانے اور دونوں کی طرف سے توبہ کرنے اور توبہ قبول کیے جانے کے احوال یکساں ہیں۔ اخلاقی لحاظ سے دونوں میں مساوات ہے یعنی دونوں کے لیے فضائل اخلاق اور رذائل اخلاق کی راہیں ایک جیسی ہیں۔ دونوں کے نیکی اور بدی کرنے کا بدلہ یکساں ہے۔ دونوں میں سے تقویٰ میں جو بڑھ جائے اتنا ہی مرتبہ وہ پا سکتا ہے۔ دونوں کے لیے حلال و حرام کی حدود مقرر ہیں۔ دونوں میں سے جس کو تکلیف پہنچے وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے اور دونوں میں سے جو مجرم ہو وہ اپنی مقررہ سزا پائے گا۔ ایک کے جرم کی سزا دوسرے کو نہیں دی جا سکتی۔ علمی لحاظ سے دونوں پر علم دین حاصل کرنا فرض اور بعض دوسرے علوم حاصل کرنا مسنون اور مندوب ہے۔ دونوں پر دعوت حق کے پھیلانے کی ذمہ داری برابر ہے۔ دونوں کو رائے دہی اور تنقید و محاسبہ کا حق بھی ایک ہی جیسا ملا ہے دونوں معاشی ملکیت کے لحاظ سے بھی ایک ہی سطح پر ہیں۔ جس کی جو ملکیت ہو اس میں وہ ہر جائز تصرف کر سکتا ہے۔

دونوں میں دو بڑے بنیادی فرق ان کی فطری صلاحیتوں اور جسمانی ساخت اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے ہیں پہلا فرق یہ ہے کہ تمدن کے تمام سخت اور بھاری اور بیرون خانہ کے کام مرد کے ذمہ ڈالے گئے ہیں اور عورت پر

[illegible] ہماری نسلوں کی پرورش اور گھر کی فضا کو سنوار کر اس میں اعلیٰ تربیت کرنے کی ہے اس کے ساتھ ساتھ [illegible] آسان مشاغل بھی وہ اختیار کر سکتی ہے۔ اور بعض ناگزیر تمدنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر بھی استثنائی [illegible] کام کر سکتی ہے جیسے عورتوں کی تعلیم، عورتوں میں دعوت و تبلیغ کا کام، عورتوں کا علاج معالجہ۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ چونکہ نسائیت میں ایک جنسی کشش اصلاً کسا ہے فطرت نے رکھی ہے اور مرد میں اشتعال پذیری اور جارحیت اور اگر مشتعل جذبوں کی راہ میں عملی رکاوٹیں ہوں تو ذہنوں کے اندر مسلسل آتش فشانی کی وجہ سے تعمیری قوتوں کی تباہی، اس لیے عین فطری بنیادوں پر ضروری ہوا کہ معاشرے کو غلط ہیجانات اور بدکاری سے بچانے کے لیے علیحدگیٔ صنفین کا اصول اختیار کیا جائے۔ اسی لیے عورت کو حکم ہوا کہ وہ اپنا اصل دائرۂ کار گھر کو بنائے۔ گھر سے باہر نکلے تو حجاب کے قانون پر عمل کرے اور مخلوط مجالس اور تقاریب میں بے محابا شرکت نہ کرے۔

یہ دونوں فرق ایسے ہیں جو عورت سے کچھ چھینتے نہیں بلکہ اسے تحفظ اور امن و سلامتی دلواتے ہیں۔

باقی چند فروق ایسے ہیں، جو انہی دو اصولی باتوں کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:۔

۱۔ گھر اور خاندان کے نظام کار کی تشکیل یوں کی گئی ہے کہ عورت گھر کا داخلی نظم و نسق چلائے گی مگر پورے نظام کی لیڈرشپ مرد کے ہاتھ میں ہوگی جس کے ساتھ اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ عورت کی مکمل حفاظت و کفالت کا ذمہ دار ہو۔

۲۔ عورت کو تاکید کی گئی کہ مرد کی اطاعت فی المعروف کرے اور نشوز نہ کرے۔ دوسری طرف مردوں کو تلقین کی گئی کہ عورتوں سے حسن سلوک کریں اور ان سے ملاطفت سے پیش آئیں۔ حضورؐ نے فرمایا تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا رویہ رکھتا ہے۔ مرد کو بتایا گیا کہ یہ خدا کی طرف سے تمہارے پاس امانت ہے۔ تم نے اللہ کے نام پر ان کے جسموں کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ لہٰذا ان سے حسن و خوبی کا برتاؤ کرو۔

۳۔ مرد کو جو لیڈرشپ دی گئی ہے اس کی وجہ سے وہ باپ بھائی یا دادا یا کوئی اور قریبی رشتہ رکھتے ہوئے عورت کو کسی کے نکاح میں دینے کے لیے "ولی" بنتا ہے۔ ولی کے ہوتے ہوئے عورت کا از خود نکاح کر لینا اچھی صورت نہیں الا آنکہ اس کا ولی ایمانی یا اخلاقی رویے کے لحاظ سے اپنا فرض بھلائی اور انصاف کے ساتھ ادا نہ کر سکتا ہو، یا اسے کسی وجہ سے عورت سے بغض ہو اور وہ اسے نقصان پہنچانا چاہے۔

۴۔ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوہر کے گھر میں رہے۔ نکلے تو اس کی اجازت سے نکلے اور جس کسی کا گھر میں آنا اس کو پسند نہ ہو اسے نہ آنے دے۔

۵۔ عورت کی کفالت پہلے صغر سنی میں ماں باپ کے گھر کی ذمہ داری ہوتی ہے اور بعد میں شوہر کی۔ پھر اسے جو جہیز، مہر یا میراث کا حصہ کسی کی طرف سے ملتا ہے تو وہ اس کی بالکلیہ مالک ہوتی ہے۔ اور کسی کی کفالت کی قانونی ذمہ داری نہیں ہے۔

ان وجوہ سے دو چیزوں میں فرق آجاتا ہے:۔

ا۔ ایک یہ کہ وہ میراث میں مرد کے مقابلہ میں ہر قسم کی صورت میں نصف حصہ پاتی ہے

ب۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اس پر کسی کی کفالت کا انحصار نہیں ہے۔ اس لیے قتل خطا میں (اور صرف قتل خطا میں) وہ اگر مقتول ہو جائے تو قاتل کے عاقلہ (خاندان یا دوسری مؤثر گروہ بندیوں) کی طرف سے بطور کفارہ اس کے پس ماندگان کو نصف دیت ملے گی۔ یہ صرف معاشی و معاشرتی حالات کی بنا پر ہے اس میں عورت مرد کی مساوات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ [1]

۶۔ جہاد، تجارت، صنعت، مزدوری اور بیرون خانہ کے تمام مشکل کاموں سے اس کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے حتیٰ کہ مسجد میں اس کا نماز پڑھنا اگرچہ کچھ پابندیوں کے ساتھ جائز ہے مگر گھر کی تنہائی میں پڑھی جانے والی نماز افضل ہے

اس کے بدل میں شوہر کی دل جوئی، بچوں کی پرورش و تربیت اور دیگر گھریلو کاموں میں عورت کے لیے اتنا ہی اجر رکھا گیا ہے جتنا جہاد اور دوسری بیرونی سرگرمیوں میں مردوں کے لیے ہے۔

۷۔ عورت کو جب گھر کی سلطنت چلانے کے لیے (المراۃ راعیۃ علیٰ بیت زوجھا) ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت دی گئی ہے تو اسے دو چیزوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے

اوّل سیاسی قیادت و امارت سے جس کے لیے وسیع معاشرتی رابطہ اور چل پھر کر اچھے اور برے احوال کا شعور حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح سپہ سالاری اور دوسرے اعلیٰ عہدوں کا معاملہ ہے۔

دوم: عہدۂ قضا سے کیونکہ اس کے لیے قانون کو کتابی طور پر پڑھنے کے لیے انسانی معاملات کی وسیع سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔

---

[1] اس وقت بھی بعض محکموں کے پنشن خواروں کی موت کے بعد نصف پنشن کے حقدار جو لوگ ٹھہرتے ہیں اس میں مرد و عورت میں فرق کیا گیا ہے۔ اس پر تو مساوات مرد و زن کے علمبرداروں کی کبھی توجہ نہ ہوئی۔ لے دے کے سارا کرم شریعت اسلامی پر ہے۔

یہ دونوں کام پارٹ ٹائم کامیوں کی حیثیت سے نہیں ہو سکتے۔

البتہ رائے دہی، تنقید یا احتساب کا یہ حق اس کو حاصل ہے اور یہ حق قرونِ اولیٰ میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔

۸۔ عورت کی گواہی کو بعض کے نزدیک تمام معاملات میں اور بعض کے نزدیک دیوانی معاملات میں نصف قرار دیا گیا ہے۔ یعنی دو عورتیں اگر مل کر شہادت دیں تو وہ ایک شہادت شمار ہوگی۔ فوجداری معاملات میں تو عورت کا استثنا ہی معقول نظر آتا ہے۔ کیونکہ قتل مقاتلے، لڑائی دنگے، چوری ڈاکے وغیرہ جرائم میں گھریلو عورت کہاں براہ راست گواہ بن سکتی ہے اور بنے بھی تو وہ جزئیات و تفاصیل کو کیسے ذہن میں محفوظ رکھ سکتی ہے اور پھر عدالت میں وہ جرح کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے؟ وہ تو جرائم کی دنیا سے بہت دور رہتی ہے اور اسے اپنے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے دور رہنا چاہیے۔

لیکن اس میں بھی استثناء ہیں۔ ایک یہ کہ اگر گھر میں مجرم داخل ہو کر قتل یا چوری کرتے ہیں اور وہ تنہا ہی اس کی گواہ بن سکتی ہے تو اس کی گواہی قابلِ قبول ہوگی۔ اگر عورتوں کے کسی مجمع میں کوئی جرم ہو جاتا ہے تو عورتیں ہی اس کی گواہی دینے والی ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح نسوانی معاملات، مثلاً حمل، رضاعت اور اسی قسم کے دوسرے معاملات میں عورتوں ہی سے گواہی لی جائے گی۔

عام فوجداری مقدمات میں قانون یہ ہے کہ محض کسی عورت کی شہادت پر حد جاری نہیں کی جا سکتی[1] اس کے ساتھ اور بھی گواہیاں اور قرائن ہونے چاہئیں۔ پھر حد جاری نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اگر جرم قرائن کی مدد سے ثابت ہو جائے تو کوئی تعزیر بھی نہیں دی جا سکتی۔

عورت کے لیے یہ ممانعت نہیں ہے کہ وہ کسی فوجداری جرم کے سلسلے میں عدالت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ وہ جا سکتی ہے اپنی گواہی ریکارڈ کرا سکتی ہے جسے دوسری شہادتوں اور قرائن کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے گا۔ بہ حیثیت مدعی بھی وہ استغاثہ لیکر جا سکتی ہے (اور اس صورت میں بھی وہ گواہ ہی ہوتی ہے)

اس طرح کے چند جزئی فرق جو بعض اہم حقائق پر مبنی ہیں۔ اصولِ مساوات کو نہیں توڑتے۔ جدید نظریہ مساوات

---

[1] لوگ نہیں سوچتے کہ اکثر مقدمات میں محض ایک مرد کی شہادت پر بھی فیصلہ نہیں ہوتا۔ پھر بدکاری کے مقدموں میں ایک نہیں تین تین مردوں کی گواہی بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ چار ہوں تو ان کی شہادت کے ہم آہنگ ہونے پر فیصلہ ہوتا ہے۔ یہاں اگر ایک دو یا تین مردوں کی توہین نہیں ہوتی اور مرد اور مرد کے درمیان مساوات پر اثر نہیں پڑتا تو قانونی شہادت کے بعض دوسرے اجزا سے مساواتِ مرد و زن پر کیوں اثر پڑتا ہے۔

کے معنے تو یہ ہیں کہ میز اور کرسی کو برابر قرار دے کر آدمی کرسی کو میز کی جگہ اور میز کو کرسی کی جگہ استعمال کرے ورنہ ان میں عدم مساوات پیدا ہو جائے گی۔

— ۳ —

مغربی تہذیب یوں تو الحاد کی تہذیب ہے مگر اس کے پیچھے روایت پرست عیسائی ذہن بھی پورے تعصب سے کام کرتا ہے۔ اس تہذیب کے علمبرداروں کو چونکہ پہلے مسلمانوں کی فتوحات نے دہلا دیا تھا۔ پھر دور زوال کے آغاز میں صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو یروشلم سے کھدیڑا تھا۔ پھر جب مغربی استعمار کا اقدام شروع ہوا تو مسلمانوں نے ملک بہ ملک شدید مزاحمت دکھائی۔ اس وجہ سے مغربی دنیا میں ایک شدید مستقل انتقامی جذبہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑھتا گیا۔ اب مغرب کی دو صدیوں سے کوشش یہ ہے کہ مسلمان معاشروں کو اسلام کی اعتقادی اور اخلاقی بنیادوں سے اکھیڑ دے اور پھر ان کو تر نوالہ بنائے اور اپنی تہذیب کے لیے جو خطرہ مسلمانوں کی طرف سے اسے دکھائی دے رہا ہے اس کو جلد کچل دے۔

اس مقصد سے فکری کام ہو رہا ہے۔ علمی و تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں۔ "ایڈ" کے جال ڈالے جا رہے ہیں وفود کے تبادلے ہو رہے ہیں، ماہرین مامور کیے جا رہے ہیں۔ جاسوسی کا عمل جاری ہے۔ مستشرقین نوجوانوں کو بہکانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ پادری عیسائیت پھیلانے میں سرگرم ہیں۔ گندی تصویریں اور فحش فلمیں بھجوائی جا رہی ہیں۔ بے مقصد اور مخالف اسلام ادبی نظریات ہم پر ٹھونسے جا رہے ہیں۔ ثقافت کے عریاں مظاہرے ہیں۔ بے حیائی پھیلانے کی کوششیں ہیں۔ اور اب مدت کے تجربے کے بعد مغرب نے ہمارے گھروں میں نقب لگا کر عورت کو اپنے طلسم میں جکڑنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ تاکہ گھر کی وہ پناہ گاہ اجڑ جائے جہاں اسلامی اقدار و روایات کو عورت سنبھالے بیٹھی ہے اور وہ نئی نسلوں میں ان کو منتقل کرتی چلی آ رہی ہے اور ادھر ہمارے ہاں کی تعلیم یافتہ عورت اَن پڑھ عورتوں سے زیادہ بھولی بھالی نظر آ رہی ہے یعنی بجائے اس کے کہ وہ اس فکری اور ثقافتی استعمار کی یلغار کو تعلیم کے ذریعے سمجھ کر اپنے طور طریقوں پر ڈٹ جاتی اور زمانے کی یورش کا مقابلہ کرتی اور اس کام کے لیے نیم خواندہ اور ان پڑھ عورتوں کو بھی منظم کرتی اس نے اپنی ماڈرن تنظیموں کے ذریعے ثقافتی استعمار کی ایجنسی سنبھال لی ہے۔ وہ پرائے جال ہاتھ میں لیے پھرتی ہے اور عورتوں اور لڑکیوں کو مائل کرتی ہے کہ اس کے حلقوں میں گردنیں ڈال دو بڑی ترقی کر جاؤ گی۔ وہ دوسری عورتوں کو گھروں سے نکلوانے کے درپے ہے۔ وہ برقعہ اتروا رہی ہے، وہ دوپٹے چاک کرا رہی ہے، وہ سینوں اور بانہوں اور پنڈلیوں کو عریاں کرا رہی ہے۔ وہ رقص و سرود کے چسکے پھیلا رہی ہے۔ وہ مخلوط مجالس و تقاریب کی وبا کو عام کرکے

اس میں زینتوں اور فیشنوں کا مظاہرہ کرانے کا درس دے رہی ہے۔

اور اس ماڈرن طلسم زدہ مغرب کے پیچھے یہاں کے الحادی، سیکولر، کمیونسٹ اور دوسرے مخالف اسلام حلقے اور ان کے اخبارات بھرپور کام کر رہے ہیں اور اس سارے "نیک کام" کی پشت پناہی الحادی تہذیب کے سامراجی پاسبان کر رہے ہیں۔

اس بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے حسب ذیل تدابیر ضروری ہیں۔

۱۔ عورتوں اور طالبات اور دیگر نوجوان لڑکیوں کے ایسے حلقے قائم ہوں جو قرآن و سنت کے اصولوں کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھالنے اور قانون حجاب کی سچے دل سے مکمل پابندی کرنے، نیز مخلوط اداروں اور مجالس سے پرہیز کرنے کا تہیہ کریں۔ پھر اسی مسلک کی دعوت دوسری خواتین اور طالبات میں پھیلا کر ان کو منظم کریں۔

۲۔ اس مقصد کے لیے جو مفید لٹریچر موجود ہے اس کو پھیلایا جائے اور ساتھ کے ساتھ جیسے لٹریچر کی ضرورت پڑے تیار کیا یا کرایا جائے۔

۳۔ خواتین اور طالبات کے اجلاسوں اور ادبی نشستوں اور تربیت گاہوں میں مغرب کے فتنہ ہائے ناپاک کی قلعی کھولنے کے علاوہ ماڈرن خواتین اور ان کے حمایتیوں کی حرکات کا کڑا احتساب کرایا جائے۔

۴۔ اس وقت "نظریہ مساوات مرد و زن" کے علمبردار مغرب کے معاشروں میں جو گندگیاں پیدا ہو چکی ہیں اور عورت جس حال زار سے دوچار ہے ان موضوعات پر تحقیقی کام کر کے صحیح تصویر سامنے لائی جائے۔

۵۔ مخلوط مجالس کا بر سر عام (پبلک) انعقاد ممنوع قرار دلوایا جائے اور بطور خاص سرکاری ملازمین اور ان کی بیگمات کے لیے ایسے کسی اجتماع میں شرکت ناجائز قرار دی جائے۔

۶۔ مخلوط تعلیم کا نظام ختم کر دیا جائے اور کوئی مرد کسی زنانہ درس گاہ میں مہمان خصوصی بن کر یا انعامات اور اسناد تقسیم کنندہ بن کر داخل نہ ہو۔ سب سے پہلے حکومت سے متعلق لوگوں کو سختی سے روک دیا جائے۔

۷۔ جن دفاتر، ہسپتالوں یا کارخانوں میں عورتیں کام کر رہی ہیں ان کو تاکید کی جائے کہ عورتوں کے لیے الگ کمرے یا الگ جگہ بیٹھنے کا انتظام کریں۔ نیز عورتوں کو کم سے کم ہلکے درجے کے پردے (یعنی بڑی چادر کا استعمال) کا پابند کیا جائے۔

۸۔ ذی شعور خواتین ہسپتالوں میں کام کرتے ہوئے یا دوسری جگہوں میں برقعے کی پابندی کریں۔ چادر کا استعمال بدرجہ اقل گوارا کیا جا سکتا ہے[1]

---

[1] قرآنی جلباب کا استعمال بالکل اور طرح تھا۔ ایک لمبی چوڑی چادر لی جاتی تھی۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۹۔ طلب یا تعلیم یا کسی اور شعبے میں عورتوں کی بھرتی کرنے کے لیے انٹرویو لینے والے بورڈ عورتوں ہی پر مشتمل ہونے چاہئیں۔

۱۰۔ خواتین مریضوں کو ہسپتالوں میں لیڈی ڈاکٹر یا لیڈی ہیلتھ وزیٹر ہی اٹینڈ کریں۔ خصوصاً زچگی کے دائرے میں کسی مرد کی دخل اندازی ممنوع ہونی چاہیے اور اس قاعدے کو نافذ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ زنانہ ہیلتھ سنٹر قصبوں اور بڑے بڑے دیہات تک میں قائم کیے جائیں اور تمام ہسپتالوں میں خواتین مریضوں کے لیے لازماً لیڈی ڈاکٹر موجود ہوں۔

۱۱۔ خواتین اور طالبات کے لیے ہر بڑے شہر اور قصبہ میں کھیل کے ایسے با پردہ میدان بنائے جائیں جن کے گرد چاردیواری ہو اور جن میں کسی مرد کو جانے کی اجازت نہ ہو۔

۱۲۔ نصابیات کی چھان بین کر کے دیکھا جائے کہ سنجیدہ سطح سے گرا ہوا فحش مواد اگر ان کے اندر پایا جائے تو اسے نکال دیا جائے۔

۱۳۔ خواتین کی کوئی تصویر چھوٹے سے مقررہ سائز سے زیادہ سائز کی، اخبارات و جرائد میں چھاپنا ممنوع قرار دیا جائے اور وہ صرف ایسی اہم خبروں کے ساتھ استعمال ہوں جن کے ساتھ تصویر کے ہونے کی اہمیت واضح ہو عموماً خواتین کی تصاویر بناؤ سنگھار اور فیشنوں کے ساتھ شائع نہ کی جائیں اور نہ آراستہ کیے ہوئے کھلے سروں میں دکھائی اور چھاپی جائیں۔

۱۴۔ قرون اولیٰ کی خواتین کے اعلیٰ اسلامی کردار کو نصابی مواد میں پیش کیا جائے۔

۱۵۔ سیاست بازی اور جاہ طلبی سے بچ کر اگر کچھ خواتین، عورتوں کے مسائل حل کرانے کیلئے ان کی نمائندگی کسی حکومتی ایوان میں کریں تو ان پر پابندی ہونی چاہیے کہ وہ پردے میں بیٹھیں اور ان کے لیے بنچ ایک طرف لگایا جائے تا کہ لوگ انہیں زیادہ گھور نہیں۔

(بقیہ حاشیہ) تمام جسم اور پورا لباس ڈھنپ جاتا اور جس کے پلو چہرے پر اس طرح پکڑ کے رکھے جاتے کہ آنکھیں یا پیشانی اور ناک تو سامنے ہوں باقی چہرہ چھپا رہے، مگر آج کل چادر اول تو ایسی ڈیزائن دار استعمال کی جاتی ہے جو بجائے خود زینت کی تعریف میں داخل ہے۔ مزید یہ کہ جلباب سے چھوٹی ہوتی ہے۔ پھر اسے اس طرح اوڑھا جاتا ہے کہ پردہ پوشی کا حق ادا نہیں ہوتا۔ جلباب تمدنی ترقی کے ساتھ برقعے میں اس لیے بدلی تھی کہ چادر تیز ہوا میں اڑتی ہو تو اس کا تھامنا مشکل ہو جاتا۔ اس چادر کی اس طرح سلائی کر دی گئی کہ وہ جسم سے الگ نہ ہو اور زینتوں کے اخفا میں ناکام نہ ہو۔

معیاری صورت یہ ہوگی کہ ایک الگ ایوان "ایوان خواتین" کے نام سے قائم ہو جس کی نشستوں کی تعداد کم رکھی جائے اور خواتین مندوب خواتین ہی کے ووٹوں سے منتخب ہوں۔ اس طرح خواتین ووٹروں کو اس مصیبت سے آزاد کرایا جا سکتا ہے کہ وہ مردوں کے بیچ ووٹ دیتے ہوئے پولنگ اسٹیشنوں پر خراب ہوتی پھریں اور عیار مردوں کا پیسہ انہیں جعلی ووٹنگ کے ڈرامے کا گھٹیا کردار بنا دے۔

۱۶۔ فوج اور پولیس کے سلسلے میں بھی خواتین کی جس قدر خدمات ضروری ہوں (خصوصاً شہری دفاع کے لیے) ان کو ٹریننگ بھی عورتوں کے ذریعے دلوائی جائے اور ان سے کام بھی کسی خاتون افسر کی نگرانی میں لیا جائے۔ اس افسر یا کسی دوسری خاتون کو اگر مردوں کے دفتروں میں جانا پڑے یا کسی مرد افسر سے رابطہ قائم کرنا پڑے تو وہ پردے کی پابندی میں رہیں۔

۱۷۔ فلموں اور ٹیلی ویژن کی نگرانی کی جائے اور ان کے لیے ہدایات جاری کی جائیں کہ وہ عورتوں کے وقار کے خلاف کوئی چیز نہ لائیں اور نہ کسی منظر اور پروگرام میں فحش پن پیدا ہونے دیں اور نہ غلط رجحانات کے لیے کوئی اکساہٹ شامل کریں۔

ان تدبیروں سے مسلم خاتون کو اس سیلاب سے بچایا جا سکتا ہے جو مدت سے ہمارے اوپر ٹوٹ پڑا ہے اور جن قوتوں کو سیلاب کے آگے رکاوٹ پیدا کرنی تھی وہ خود اس سیلاب کا شکار بننے کی دعوت قوم اور اس کی خواتین کو دے رہے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا۔

(بقیہ صفحہ ۳۳)

کی شخصیت دکھائی جاتی ہے تو دوسری طرف نبی کا مقام بادشاہ سے بھی فروتر دکھایا گیا ہے۔ ان حالات میں عیسیٰ علیہ السلام کو نبی کی بجائے یہودیوں کے بادشاہ اور خدا کے اکلوتے بیٹے کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تحریفات کے باوجود عہد نامہ قدیم و جدید میں صحیح اور برحق باتیں بھی موجود ہیں نبی کے بارے میں صحیح باتیں اس مضمون میں پیش کر کے کچھ غلط باتیں بھی نمونہ کے طور پر لکھ دی گئی ہیں۔

پرانے عہدنامے میں نبی کا تصوّر

(جناب عثمان محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی)

زیرنظر مضمون میں کتاب مقدس سے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں سب کے سب اس نسخے سے لیے گئے جو ۱۹۲۲ء میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور نے شائع کی تھی نئے عہدنامے کے اقتباسات وضاحت کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔

کتاب مقدس یعنی بائبل میں چند باتیں ایسی ہیں جن میں تطبیق پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ مثال کے طور پر کتاب پیدائش کے انیسویں باب میں آتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے دو فرشتوں کی مہمانی کی اور فطیری روٹی ان کے لیے پکائی اور انھوں نے کھائی۔ مگر قاضیوں کے کتاب کے تیرہویں باب میں مندرجہ ذیل باتیں پائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے انسان کی بنائی ہوئی غذا نہیں کھاتے ہیں۔

"اور منوحہ نے خداوند کے فرشتے کو کہا کہ تجھ سے اجازت ہو تو ہم تجھ کو روک رکھیں جب تک کہ ہم تیرے لیے ایک بکری کا بچہ تیار کریں۔ تب خداوند کے فرشتے نے منوحہ کو جواب دیا۔ اگرچہ تو مجھے روک رکھے تو بھی میں تیری روٹی نہیں کھانے کا۔ (15،16)

ان دو اقتباسات میں فرشتوں کے بارے میں دو متضاد باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ اس اختلاف بیانی کے باوجود پرانے عہدنامے میں نبی کے بارے میں کچھ مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

نبی کے بارے میں جب کوئی ذکر آتا ہے تو ایک خاص اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر نبیوں کو علم و حکمت دیے جانے کا ذکر ہے۔ اس کے برعکس بائبل میں خدا کے ساتھ چلنے کا ذکر ہے۔

آدم علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہے۔

اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر (پیدائش، باب ۲: آیت ۱۶)

اور انھوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی۔۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے۔ (پیدائش 3 : 8,9)

نوح علیہ السلام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ

نوح اپنے قرنوں میں صادق اور کامل تھا اور نوح خدا کے ساتھ چلتا تھا۔ (پیدائش 6 : 9)

ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں لکھا گیا ہے:۔

تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو

(پیدائش باب ۷ ا: آیت ۱)

ان کا نوکر ان کے الفاظ کو اس طرح پیش کرتا ہے "تب اس نے مجھے کہا کہ خداوند جس کے حضور میں چلتا ہوں اپنا فرشتہ تیرے ساتھ بھیجے گا۔ (پیدائش ۲۴ : ۴۰)

یعقوب علیہ السلام گواہی دیتے ہیں۔ "خدا جس کے سامنے میرے باپ ابراہام اور اضحاق چلے۔"

(پیدائش ۴۸ : ۱۵)

ایک نبی کے علم و حکمت سے نوازے جانے کا ذکر بائبل میں پیدائش کے اکتالیسویں باب میں آیت ۳۹ میں ملتا ہے

کامیابی کا راز

بائبل کی یہ آیت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں نجات کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

خداوند اپنے خدا پر ایمان لاؤ تم قیام پکڑو گے اس کے نبیوں پر ایمان لاؤ تو تم کامیاب ہو گے۔

(۲- تواریخ ۲۰ : ۲۰)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کے انبیاء کئی ہیں اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خدائی اور نبوت ایک ہی شخصیت میں مجتمع نہیں ہو سکتیں عیسےٰ علیہ السلام کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے" جو نبی کے نام سے نبی کو قبول کرتا ہے وہ نبی کا اجر پائے گا۔ متی کی انجیل ۱۰ : ۴۱)

خدا اور اس کے نبیوں پر ایمان لانے کے علاوہ خدا کے کسی بیٹے پر ایمان لانے کی ضرورت کا کوئی اشارہ تواریخ کے مندرجہ بالا اقتباس سے نہیں ملتا۔

تمسخر انبیاء کا نتیجہ

نبیوں پر ایمان لانے کی بجائے اگر ان کا استہزاء کیا جائے تو خدا غضبناک ہوتا ہے بائبل میں نصیحت کی

گئی ہے :۔

میرے ممسوحوں کو مت چھوؤ اور میرے نبیوں سے بدی نہ کرو۔ (زبور۔ ۱۰۵:۱۵)

اور جب اس نصیحت پر عمل نہ کیا گیا تو کیا ہوا ؟

لیکن انہوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں سے بدسلوکی کی۔ یہاں تک کہ خداوند کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا (۲۔ تواریخ ۳۶:۱۶)

نبی اور رسول

بائبل میں نبی کا لفظ پہلی مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں استعمال کیا گیا ہے۔ جرار کے بادشاہ ابی ملک کے خواب میں خدا گواہی دیتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں۔ (پیدائش ۲۰ : ۷) بائبل میں نبی کے لیے دوسرے الفاظ جو استعمال کیے گئے ہیں ان میں یہ شامل ہیں۔

مرد خدا، غیب بیں، پیغمبر

اگلے زمانے میں بنی اسرائیل کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص خدا سے مصلحت کرنے جاتا تھا تو کہتا تھا کہ آؤ ہم غیب بیں کے پاس جائیں۔ اس لیے کہ وہ جو اب نبی کہلاتا ہے آگے غیب بیں کہلاتا تھا۔

(۱۔ سموئیل۔ ۹:۹)

چاکر نے اس سے کہا۔ دیکھ اس شہر میں مرد خدا ہے۔ (۱۔ سموئیل۔ ۹:۶)

کیا ساؤل بھی نبیوں میں شامل ہو گیا ؟ (۱۔ سموئیل۔ ۱۰:۱۲)

پھر خداوند نے موسےٰ سے کہا۔ دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لیے خدا سا بنایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا۔ (خروج ۷:۱)

تو پھر کیوں گئے تھے ؟ کیا ایک نبی کو دیکھنے کو ؟ ہاں میں تم سے کہتا ہوں۔ بلکہ نبی سے بڑے کو۔ یہ وہی ہے جس کی بابت لکھا ہے کہ

دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیرے آگے تیار کرے گا۔ (متی کی انجیل ۱۱ : ۱۰،۹)

نبیوں میں فضیلت کے درجے

مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل کی رو سے نبی اور پیغمبر میں درجات کا فرق ہے۔ نئے عہد نامے میں عیسےٰ علیہ السلام کی طرف منسوب دو باتیں ذیل میں دی جاتی ہیں۔

یہاں وہ ہے جو یونس سے بھی بڑا ہے۔		(متی ۱۲: ۴۱)
یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے۔		(متی ۱۲ ایضاً ۴۲)
عیسیٰ علیہ السلام اپنا موازنہ یونس اور سلیمان علیہما السلام سے کرتے ہیں۔ موازنہ کے لیے یہ تینوں بزرگوں میں قدر مشترک نبوت ہی ہو سکتی ہے۔

نبی مطاع ہوتا ہے۔

بائبل میں درج ہے:۔ "اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو ابراہیم کے سے کام کرتے۔ (یوحنا کی انجیل ۸: ۳۹)
اپنے باپ ابراہام پر اور سارہ پر جو تمہیں جننی نگاہ کرو۔		(یسعیاہ ۵۱: ۲)
چنانچہ حزقی ایل تمہارے لیے نشان ہے سب کچھ جو اس نے کیا تم ویسا کروگے۔ (حزقی ایل ۲۴: ۲۴)
ان اقتباسات سے یہ باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں۔
(۱) آل ابراہیم کے لیے ابراہیم علیہ السلام اسوہ ہیں
(۲) انبیاء اپنے اپنے دور میں اطاعت اور اتباع کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں

نبی کے اخلاق

ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بائبل میں وضاحت سے لکھا گیا ہے کہ وہ نبی تھے۔
ان کے اخلاق کے بارے میں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ وہ خدا کے آگے کس طرح تسلیم و رضا کے پیکر تھے۔
ابراہام نے میری آواز کو سنا اور میری تاکید کو میرے حکموں اور میرے قانونوں اور میری شرعوں کو حفظ کیا ہے۔		(پیدائش ۲۶: ۵)
سموئیل کی نبوت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ ان کے اخلاق کا معیار مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

اور میں لڑکپن سے آج تک تمہارے آگے آگے چل رہا ہوں اور دیکھو میں حاضر ہوں سو آؤ خداوند کے اور اس کے مسیح کے سامنے مجھ پر گواہی دو کہ کس کا بیل میں نے لیا؟ اور کس کا گدھا میں نے پکڑ رکھا؟ اور میں نے کس سے دغابازی کی؟ اور کس پر میں نے ظلم کیا؟ اور کس کے ہاتھ سے میں نے رشوت لی تاکہ میں اس سے چشم پوشی کروں؟ اب میں اسے پھیر دینے کو حاضر ہوں۔ وہ بولے تو نے ہم سے دغابازی نہیں کی اور نہ ہم پر ظلم کیا اور نہ تو نے کسی کے ہاتھ سے کچھ لیا۔ تب اس نے انہیں

کہا کہ خداوند تم پر گواہ اور اس کا مسیح آج کے دن گواہ ہے کہ تم نے میرے ہاتھ میں کچھ نہیں پایا۔
(۱ سموئیل ۱۲ : ۲ تا ۵)

اسی بائبل میں چند نبیوں کی طرف اخلاق سوز حرکتیں بھی منسوب کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر داؤد علیہ السلام کو زنا جیسی بدکاری میں ملوث دکھایا گیا ہے۔

نبی جسمانی طور پر بھی جاذب نظر ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل اقتباسات اس بات پر شاہد ہیں کہ انبیاء جسمانی طور پر خوبصورت ہوتے ہیں

اس کا بیٹا ساؤل نام جو بہت خوب صورت جوان تھا اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زیادہ خوب صورت کوئی شخص نہ تھا۔ (۱ سموئیل ۹ : ۲)

داؤد علیہ السلام کے بارے میں ہے :۔ "وہ سرخ رنگ اور خوش چشم اور دیکھنے میں اچھا تھا۔
(۱ سموئیل۔ ۱۶-۱۲)

نبی کو تحفہ دینا

ساؤل نے اپنے چاکر سے کہا لیکن دیکھ اگر ہم وہاں جائیں تو ہم اس شخص کے لیے کیا لیتے جائیں؟ روٹیاں تو ہمارے توشہ دان میں باقی نہیں رہیں اور اس مرد خدا کے لیے کوئی ہدیہ ہمارے پاس نہیں۔ (۱ سموئیل ۹ : ۷)
مرد خدا سے یہاں سموئیل نبی مراد ہیں۔

نبی کے ذریعے معرفت الٰہی

معرفت الٰہی کا مستند ذریعہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ بائبل میں اس نکتہ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے :۔

پھر خدا نے موسےٰ کو فرمایا اور کہا میں خداوند ہوں اور میں نے ابراہام اور اسحاق اور یعقوب پر قادر مطلق کے نام سے اپنے تئیں ظاہر کیا اور یہوواہ کے نام سے ان پر ظاہر نہ ہوا۔ (خروج ۶ : ۲۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور موسےٰ علیہم السلام انبیا رہیں اور انھیں خدا نے اپنی معرفت سے نوازا ہے۔

یہی بات عیسےٰ علیہ السلام سے منسوب یہ جملے ظاہر کرتے ہیں۔

"اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہے۔"
(متی کی انجیل ۱۱ : ۲۷)

"کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا۔" (یوحنا ۱۴:۶)

نبی کے لیے بیٹے کا لفظ

نبی، مرد خدا، غیب بین اور پیغمبر کے علاوہ بیٹے کا لفظ بھی نبی کے لیے پرانے عہدنامے میں مروج ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے سلیمان علیہ السلام کے بارے میں یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے

اور میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہوگا۔ (۱۔تواریخ ۱۷:۱۳)

میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہوگا۔ (۱۔تواریخ ۱۷:۱۳)

وہی میرے نام کے لیے ایک گھر بنائے گا۔ وہ میرا بیٹا ہوگا اور میں اس کا باپ ہوں گا (۱۔تواریخ ۲۲:۱۰)

میں نے اسے چن لیا کہ میرا بیٹا ہو اور میں اس کا باپ ہوں گا۔ (۱۔تواریخ ۲۸:۶)

مگر سلیمان علیہ السلام خود اپنے آپ کو خدا کے بیٹے کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے ایک بندے کی حیثیت سے پیش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ خدا سے دعا مانگتے ہوئے وہ کہتے ہیں:۔

"اے خداوند میرے خدا اپنے بندے کی دعا اور زاری پر کان دھریئے (۲۔تواریخ ۶:۱۹)

انبیاء خدا کے بندے ہوتے ہیں

بنی اسرائیل سے کہا جاتا ہے۔ "آج کے دن تک میں نے تمہارے پاس اپنے سارے خدمت گزار نبیوں کو بھیجا۔" (یرمیاہ ۷:۲۵)

"خداوند نے اپنے بندوں نبیوں کی معرفت سے فرمایا تھا۔" (۲۔سلاطین ۲۴:۲)

موسےٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ صراحت ہے کہ وہ نبی تھے "اب تک بنی اسرائیل میں موسےٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا۔" (استثناء ۳۴:۱۰)

ان کو خدا کا بندہ بھی کہا گیا ہے۔ "سو خداوند کا بندہ موسےٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مرگیا۔" (استثناء ۳۴:۵) یوشع ۹:۲۴ اور ۱۲:۶ میں بھی انہیں خدا کے بندے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

داؤد علیہ السلام کو بھی خدا کا بندہ کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو (۲۔تواریخ ۶:۱۶)

نبوت وہبی ہے۔

یوں تو سارے لوگ خدا کے بندے ہیں۔ مگر انبیاء کی بندگی خصوصیت کی حامل تھی۔ کیونکہ وہ نبوت وہبی پر فائز تھے۔ سموئیل کو نبوت سے کس طرح سرفراز کیا گیا۔ اس کا سارا حال ۱۔سموئیل کے تیسرے باب میں موجود ہے۔

ایک زمانہ تھا "سموئیل نے ہنوز خداوند کو پہچانا نہ تھا اور نہ خداوند کا کلام اس پر ظاہر ہوا" (۱ سموئیل ۳: ۷)
اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ "سارے بنی اسرائیل نے دان سے لے کے بیرسبع تک جانا کہ سموئیل خداوند کا نبی مقرر ہوا۔ (۱ سموئیل ۳: ۲۰)

حزقی ایل بھی غیر متوقع طور پر نبی بن جانے کا ذکر یوں فرماتے ہیں "اور اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کہ میں تجھ سے کچھ کہوں گا۔ اس نے مجھے یوں کہا روح مجھ میں داخل ہوئی اور مجھے پاؤں پر کھڑا کیا تب میں نے اس کی سنی جو مجھ سے باتیں کرتا تھا سو اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد میں تجھے بنی اسرائیل ان باغی گروہوں کے پاس جو مجھ سے پھر گئی ہیں بھیجتا ہوں" (حزقی ایل ۲: ۱-۳)

اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء سارے کے سارے بنی اسرائیل ہی کی اصلاح پر مامور تھے۔

انبیاء پر فضل خداوندی

انبیاء پر خدا کا خاص فضل ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور خدا نے نوح اور اس کے بیٹوں کو برکت دی اور انہیں کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور کرو۔ (پیدائش ۹: ۱) اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا۔ (پیدائش ۱۲: ۲)

اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا۔ (پیدائش ۱۷: ۲۰)

اور ابراہام کے مرنے کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے اس کے بیٹے اضحاق کو برکت بخشی۔ (پیدائش ۲۵: ۱۱)

خداوند کی مہربانی اس (یعنی لوط ؑ) پر ہوئی۔ (پیدائش ۱۹: ۱۶)

اسی رات خدا سلیمان کو دکھائی دیا اور اسے کہا جو تو چاہتا ہے کہ میں تجھے دوں سو مانگ لے۔ (۲۔ تواریخ ۱: ۷)

انبیاء کے لیے نصرت خداوندی

خدا کی نصرت انبیاء کے لیے خاص طور پر شامل حال ہوتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

اور خداوند نے نوح سے کہا کہ تو اپنے سب خاندان سمیت کشتی میں آ۔ کیونکہ میں نے تجھ ہی کو اپنے حضور میں اس زمانے کے درمیان صادق دیکھا۔ (پیدائش ۷: ۱)

اور داؤد جہاں کہیں جاتا تھا وہاں خداوند اس کی نگہبانی کرتا تھا۔ (۲۔ سموئیل ۸: ۶)

اور بادشاہ نے شاہزادہ یرحمئیل اور شرایاہ بن عزری ایل اور سلمیاہ بن عبدی ایل کو حکم دیا کہ باروک ساتھ اور یرمیاہ نبی کو پکڑو۔ پر خداوند نے انہیں چھپایا ۔ (یرمیاہ ۳۶: ۲۶)

انبیاء کی دعا مقبول ہوتی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بارے میں درج ہے ۔

"تب ابراہام نے خدا سے دعا مانگی اور خدا نے ابی ملک اور اس کی جورو اور اس کی لونڈیوں کو چنگا کیا کہ وہ جننے لگیں ۔ (پیدائش ۲۰: ۱۷)

موسٰے علیہ السلام کی دعا کا حال سنیے ۔

تب موسٰے فرعون پاس سے باہر گیا اور خداوند سے شفاعت کی خداوند نے موسٰے کی عرض کے موافق کیا ۔ (خروج ۸: ۳۰ و ۳۱)

سموئیل بارش کے لیے دعا کرتے ہیں اور دعا قبول ہوتی ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا کے حضور دعا سے اجتناب برتنا ایک گناہ ہے ۔

اور میں جو ہوں ہرگز نہ ہو کہ تمہارے لیے دعا مانگنے سے باز رکے خداوند کا گنہگار ہوؤں (۱ سموئیل ۱۲: ۲۳)

داؤد علیہ السلام کی ایک موثر دعا ۲۔ سموئیل کے بائیسویں باب میں درج ہے ۔

انبیاء جنتی ہوتے ہیں

عیسٰے علیہ السلام کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا ۔ "تم ابراہیم اور اضحاق اور یعقوب اور سب نبیوں کو خدا کی بادشاہت میں شامل .... دیکھو گے ۔ (لوقا کی انجیل ۱۳: ۲۸)

انبیاء کو علم غیب عطا کیا جاتا ہے ۔

سموئیل کی پہلی کتاب کے دسویں باب میں سموئیل کے علم غیب کے کچھ نمونے ملتے ہیں ۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں ۔

سموئیل نے ساؤل کو جواب دیا کہ وہ غیب بین میں ہی ہوں ۔ میرے آگے اونچے مکان پر چڑھو کہ تم آج کے دن میرے ساتھ کھاؤ اور کل میں تجھے رخصت کروں گا اور سب کچھ جو تیرے دل میں ہے تجھے بتا دوں گا اور تیرے گدھے جو تین دن سے کھوئے گئے ہیں ان کا خیال مت کر کہ وہ مل گئے ۔ (۱ سموئیل ۹: ۱۹، ۲۰)

ان نبیوں نے جو مجھ سے اور تجھ سے آگے اگلے زمانے میں تھے بہت سے ملکوں اور بڑی بادشاہتوں کی

کی بابت جنگ اور بلا اور بدبلک کے حق میں نبوت کی ہے (یرمیاہ ۲۸ : ۸)

یعقوب علیہ السلام کی پیشین گوئی پیدائش باب ۴۹ میں ملتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام خوابوں کی تعبیر کے ذریعے پیش گوئی کرتے ہیں۔

انبیاء کے ذریعے معجزات دکھائی دیتے ہیں

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بائبل کے اس حصے میں ملتے ہیں جس کا نام خروج ہے۔ یشوع کا معجزہ درج ذیل ہے :-

"اور جس دن خداوند نے اموریوں کو بنی اسرائیل کے آگے لا کے ان کے قابو میں کر دیا اس دن یشوع نے خداوند کے حضور بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے یوں کہا کہ اے آفتاب جبعون پر ٹھہرا رہ اور اے مہتاب تو بھی وادی ایلون کے درمیان تب آفتاب ٹھہرا رہا اور مہتاب تھم گیا (یشوع ۱۰ : ۱۲، ۱۳)

الیسع کا معجزہ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے ملتا جلتا ہے اور ایسا ہوا کہ جس وقت وہ ایک مردے کو گاڑ رہے تھے تب دیکھا ایک فوج نظر آئی اور انھوں نے اس شخص کو الیسع کی قبر میں ڈال دیا اور جب وہ شخص گر ایا گیا تو الیسع کی ہڈیوں سے لگا تو وہ جی اٹھا اور پاؤں پر کھڑا ہوا (۲۔ سلاطین ۱۳ : ۲۱)

دوسرے انبیاء کی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معجزات عطا کیے گئے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ گونگے بولتے۔ ٹنڈے درست ہوتے اور لنگڑے چلتے پھرتے اور دیکھتے ہیں تو تعجب کیا اور اسرائیل کے خدا کی بڑائی کی (متی کی انجیل ۱۵ : ۳۱)

لوگ اسرائیل کے خدا کی بڑائی اس لیے کرتے ہیں کہ انبیاء معجزات کے ذریعے اپنی طاقت کا نہیں خدا کی قدرت کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ "میں بدروحوں کو خدا کی قدرت سے نکالتا ہوں۔ (لوقا کی انجیل ۱۱ : ۲۰) "جو کام میں اپنے باپ کے نام سے کرتا ہوں وہی میرے گواہ ہیں"
(یوحنا کی انجیل ۱۰ : ۲۵)

نبی اللہ نہیں ہوتا۔

بائبل کی رو سے خدا اور انسان میں حدِ فاصل ہے۔ خدا خدا ہے اور انسان انسان ہے۔ "میں خدا ہوں اور انسان نہیں" (ہوسیع ۱۱ : ۹) وحی کے ذریعہ حزقی ایل کو حکم دیا جاتا ہے کہ والیِ صور کو تباہ کر دیا جائے

خدا اس سے کہا جائے " تو انسان نہیں بلکہ انسان ہے ۔ (حزقی ایل ۲:۲۸)
یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں " مت ڈرو ، کیا میں خدا کی جگہ پر ہوں ؟" (پیدائش ۱۹:۵۰)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی بھی خدا کی جگہ نہیں لے سکتا ۔
خدا اور انسان قدرت میں مساوی نہیں ہیں ۔ بائبل میں یہ آیت ملتی ہے ۔
" اے خداوند تو نے مجھے ترغیب دی اور میں نے ترغیب پائی ۔ تو مجھ سے توانا تر ہے ۔" (یرمیاہ ۷:۲۰)
عیسیٰ علیہ السلام بھی فرماتے ہیں " باپ مجھ سے بڑا ہے ۔" (یوحنا کی انجیل ۲۸:۱۴)
انبیاء کرام شادیاں کرتے تھے اور صاحب اولاد ہوتے تھے اور انھیں موت کے تجربے سے دوچار ہونا پڑتا تھا ۔" تمہارے باپ دادے جو تھے سو کہاں ؟ اور انبیاء کیا وہ سدا جیتے ہیں ؟" (زکریا نبی کی کتاب ۵)

نبوت اور وحی

ہر نبی کو اس کی مادری زبان میں وحی عطا کی جاتی ہے اور بنی اسرائیل کے انبیاء بنی اسرائیل ہی کو مخاطب کرتے ہیں ۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد تو اہل اسرائیل پاس جا اور میری باتیں انہیں کہہ کیونکہ تو ایسے گروہ میں جو گہرے لب کی اور بھاری زبان کی ہے نہیں بھیجا جاتا ہے بلکہ اہل اسرائیل کے درمیان اور نہ کہ بہت سی قوموں کے پاس جن کے لب گہرے ہیں اور ان کی زبان بھاری مشکل ہے ۔ (حزقی ایل ۳: ۴ تا ۶)
داؤد علیہ السلام صرف صاحب سلطنت ہی نہ تھے بلکہ نبی بھی تھے ان پر وحی کی جاتی تھی ۔ خداوند کی روح مجھ میں بولی اور اس کا سخن میری زبان پر تھا ۔ (۲ سموئیل ۲:۲۳)
خداوند کی روح اس دن سے ہمیشہ داؤد پر اترتی رہی ۔ (۱ سموئیل ۱۶: ۱۳)
کبھی خواب کے ذریعے بھی انبیاء کو مطلع کیا جاتا تھا ۔
جس نبی کے پاس خواب ہے سو خواب بیان کرے اور جس کے پاس میرا کلام ہے سو میرے کلام کو دیانتداری سے کہے ۔ (یرمیاہ ۲۳ : ۲۸)
اور میں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ اولائی کے درمیان پکار کے کہا کہ اے جبرئیل اس شخص کو اس رویت کے معنے سمجھا ۔ (دانی ایل ۸ :۱۶)
وحی کی کتابت کا انتظام بھی تھا ۔
خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے ساری باتیں جو میں نے تجھ سے کہیں ۔ تو کتاب میں لکھ (یرمیاہ ۲:۳۰)

عیسٰی علیہ السلام پر بھی وحی کی جاتی تھی۔ (ملاحظہ ہو۔ یوحنا کی انجیل ۸ : ۴)

نبی داعی الی اللہ ہوتا ہے

ہر نبی لوگوں کو خدا کی طرف بلاتا ہے اور شرک سے روکتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات اس بات کو واضح کرتے ہیں۔ موسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہیں۔

پس تو جان رکھ کہ خداوند تیرا خدا وہی خدا ہے۔ وہ وفادار خدا ہے جو عہد کا پاس کرتا ہے اور ہزار پشت تک، ان پر جو اس کے دوست ہیں اور اس کے حکموں کو مانتے ہیں رحم کرتا ہے۔ (استثنا ۷ : ۹)

سو اگر تم ان حکموں کو سنو گے اور یاد رکھو گے اور ان پر عمل کرو گے تو خداوند تیرا خدا اس عہد اور رحمت کو جس کی بابت اس نے تیرے باپ دادوں سے قسم کھائی ہے۔ تیرے لئے یاد رکھے گا اور تجھے پیار کرے گا اور تجھے برکت بخشے گا اور تجھے زیادہ کرے گا۔ (استثنا ۷ : ۱۲ تا ۱۳)

تب اس (یشوع) نے کہا پس اب تم اجنبی معبودوں کو جو تمہارے درمیان ہیں نکال پھینکو اور اپنے دلوں کو خداوند اسرائیل کے خدا کی طرف مائل کرو۔ یشوع ۲۴ تا ۲۳

اور داؤد نے ساری جماعت سے کہا کہ اب اپنے خداوند خدا کی حمد کرو۔ (۱۔ تواریخ ۲۹ : ۲۰)

اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے کو خطاب کر کے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دلوں سے خداوند کی طرف پھرو تو ان اجنبی معبودوں کو اور عستارات کو اپنے درمیان سے نکال پھینکو اور خداوند کی طرف اپنے دلوں کو مستعد رکھو اور اسی اکیلے کی بندگی کرو کہ وہ فلسطین کے ہاتھ سے تمہیں رہائی دے گا۔ (۱۔ سموئیل ۷ : ۳)

میں وہ راہ جو اچھی اور سیدھی ہے تمہیں بتلاؤں گا۔ سو تم فقط اتنا کرو کہ خداوند سے ڈرنا اور اپنے سارے دل سے اس کی سچی عبادت کرو۔ (۱۔ سموئیل ۱۲ : ۲۳ تا ۲۴)

اب اے اسرائیل خداوند تیرا خدا تجھ سے کیا چاہتا ہے۔ مگر یہ کہ تو خداوند اپنے خدا سے ڈرتا رہے اور سب اس کی راہوں پر چلے اور اس سے محبت رکھے اور اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان سے خداوند اپنے خدا کی بندگی کرے۔ (استثناء ۱۰ : ۱۲)

اس نے اس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھو۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ (متی کی انجیل ۲۲ : ۳۷ تا ۳۸)

استثناء کے چھٹے باب میں آیت ۵ بھی نگاہ میں رکھیں۔

انبیاء اپنی قوم ہی کو مخاطب نہیں کرتے تھے۔ اپنے اہل و عیال کو بھی توحید کی طرف بلاتے تھے اور نیک عمل کرنے پر ابھارتے تھے۔ داؤد علیہ السلام اپنے مشہور بیٹے کو اس طرح نصیحت کرتے ہیں۔

اور خداوند اپنے خدا کی تاکید کی اس کے راہوں پر چلنے کی اور اس کے قانونوں اور اس کے حکموں اور اس کے فرمانوں اور اس کی شہادتوں پر عمل کرنے کی بابت جیسا کہ موسیٰ کی کتاب میں لکھا ہے محافظت کرتا کہ تو اپنے سب کاموں میں جہاں کہیں تو رخ کرے کامیاب ہو۔ (۱۔ سلاطین ۲:۳)

یہوسفط کے بارے میں لکھا ہے کہ لوگوں کو خداوند ان کے باپ داودوں کے خدا کی طرف پھر پھیرا (۲۔ تواریخ ۱۹:۴)

نبی عدل کرتا ہے

لوگوں کو خدا کی طرف بلانے کے علاوہ عدالت کا کام بھی نبی کے سپرد ہوتا تھا۔

اور سموئیل مصفاہ میں بنی اسرائیل کی عدالت کرتا تھا۔ (۱۔ سموئیل ۷:۶)

اور سموئیل جب تک جیا اسرائیل پر حکمران رہا۔ (۱۔ سموئیل ۷:۱۵)

اور داؤد نے سارے اسرائیل پر سلطنت کی اور داؤد اپنی ساری رعیت سے عدل و انصاف کرتا تھا۔ (۲۔ سموئیل ۸:۱۵)

وہ نبی جو بائبل کی رو سے صاحب سلطنت نہیں تھے سلاطین کو مشورہ دیا کرتے تھے۔

اور یرمیاہ نے صدقیاہ سے کہا کہ خداوند رب الافواج اسرائیل کا خدا یوں کہتا ہے۔ یقیناً اگر تو نکل کر بابل کے بادشاہ کے سرداروں کے پاس چلا جائے گا تو تیری جان بچے گی۔ اور یہ شہر آگ سے جلایا نہ جائے گا اور تو اور تیرا گھرانا بچے گا۔ (یرمیاہ ۳۸:۱۷)

نبی جہاد بھی کرتا ہے۔

یشوع علیہ السلام موسےٰ علیہ السلام کی طرح نبی تھے۔ تب خداوند نے یشوع کو فرمایا۔ آج کے دن سے میں سارے اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے تجھے عزت بخشنا شروع کروں گا تاکہ وہ جانیں کہ جس طرح میں موسےٰ کے ساتھ تھا۔ تیرے بھی ساتھ ہوں گا۔ (یشوع ۳ - ۷)

یشوع علیہ السلام کو زندگی بھر جہاد کرنا پڑا اور وہ بنی اسرائیل سے کہتے ہیں یہ خداوند تمہارے خدا نے آپ

تمہارے لیے جنگ کی ۔ (یشوع ۲۳ : ۳)
اپنے مخلص پیروؤں کو جہاد پر ابھارتے ہوئے کہتے ہیں :۔
تم میں سے ایک مرد ایک ہزار کو بھگائے گا کہ خداوند تمہارا خدا ہے جو تمہارے لیے لڑتا ہے ۔
(یشوع ۲۳ : ۱۰)

ساؤل کا انتخاب بھی صرف جہاد کے لیے کیا جاتا ہے ۔
اور خداوند نے ساؤل کے آنے سے ایک دن پیشتر سموئیل کے کان میں کہہ دیا تھا کہ کل اسی وقت میں ایک شخص کو بنیمین کی سرزمین سے تجھ پاس بھیجوں گا تو تو اس پر تیل ملیو کہ وہ میری قوم اسرائیل کا حاکم ہو تاکہ میرے لوگوں کو فلسطینیوں کے ہاتھ سے چھڑائے ۔ (۱ سموئیل ۹ : ۱۶)
میکایاہ نے سلطان جابر کے سامنے سچ بات کہہ کر جہاد کیا ۔ (۲ تواریخ باب ۱۸)

جھوٹے نبیوں کے بارے میں انتباہ

چونکہ نبی کا منصب بلند اور ارفع ہے اور اس کی شخصیت عقیدتوں کا مرکز ہے ۔ بوالہوس حضرات کے لیے نبی ہونے کا دعویٰ کر بیٹھنا ایک آسان فعل اور مرغوب مشغلہ ہے ۔ اس لیے اکثر انبیاء نے لوگوں کو جھوٹے نبیوں کے بارے میں انتباہ دیا ہے ۔ جھوٹے نبی شرک کی دعوت دیتے ہیں ۔ غلط بینی کو نمایاں کرتے ہیں اور ان کے کردار میں نفاق کی بیماری ہوتی ہے ۔ ان کی تعلیمات کے نتیجے میں برے اثرات پھیلتے ہیں ۔ اپنے غلط دعوے کے ثبوت میں معجزے پیش کرتے ہیں اور ان کے دعووں کا سارا دارومدار انہی معجزات پر ہوتا ہے ۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے یہی باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں :۔

اگر تمہارے درمیان کوئی نبی یا خواب دیکھنے والا ظاہر ہو اور تمہیں کوئی نشانی یا معجزہ دکھلائے اور اس نشانی یا معجزے کے مطابق جو اس نے تمہیں دکھایا بات واقع ہو اور وہ تمہیں کہتا کہ آؤ ہم غیر معبودوں کی جنہیں تم نے نہیں جانا پیروی کریں اور ان کی بندگی کریں تو ہرگز اس نبی یا خواب دیکھنے والی کی بات پر کان مت دھریو ۔ (استثناء ۱۳ : ۱ تا ۳)
وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکر جانوں کہ میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے ۔ اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ

میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں؟ تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈر (استثنا ۱۸: ۲۰ تا ۲۲)

رب الافواج یوں کہتا ہے کہ ان نبیوں کی باتیں مت سنو جو تم سے نبوت کرتے ہیں وہ تم کو بطالت کی طرف مائل کرتے۔ وہ اپنے دلوں کے خواب و خیالوں کو بیان کرتے ہیں اور نہ کہ وہ باتیں جو کہ خداوند کے منہ سے نکلیں۔ (یرمیاہ ۲۳: ۱۶)

تب خداوند نے مجھے کہا کہ انبیاء میرا نام لے کے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ میں نے انہیں نہیں بھیجا اور حکم نہیں دیا نہ انہیں کہا۔ وہ جھوٹی رویا اور جھوٹا علم غیب اور بے اصل باتیں اور اپنے دلوں کی مکاریاں نبوت کی طرح تم پر ظاہر کرتے ہیں۔ یہ نبی تلوار اور کال سے ہلاک کیے جائیں گے۔

(یرمیاہ ۱۴: ۱۴ تا ۱۵)

اور وہ نبی جو ہے کہ دغا کھا کے کچھ کہے تو مجھ خداوند نے اس نبی کو دغا دی ہے اور میں اپنا ہاتھ اس پر چلاؤں گا اور اسے اپنے اسرائیلی لوگوں میں اسے نابود کروں گا۔ (حزقی ایل ۱۴: ۹)

عیسیٰ علیہ السلام بھی ان کے پیش رو اسرائیلی نبیوں کی طرح اپنے متبعین کو جھوٹے نبیوں سے ہوشیار رہنے کے لیے کہتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں۔ ان کے پھلوں سے تم انہیں پہچان لو گے۔ کیا جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ (متی کی انجیل ۷: ۱۵ تا ۱۶)

پرانے عہد نامے میں نبی کے تصور کے بارے میں جو بہت واضح اور اہم باتیں نظر آئیں وہ اس مضمون میں پیش کی گئی ہیں۔ پرانے عہدنامے میں کسی ایسے نبی کا جو عورت بھی ہو ذکر نہیں ملتا۔ البتہ لوقا کی انجیل (۲: ۳۶) میں ایک عورت کا ذکر ہے جس کے بارے میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ وہ نبیہ تھی۔

یہودیوں میں ایک عقیدہ تھا کہ انبیاء مرنے کے بعد بھی دوبارہ جی اٹھ سکتے ہیں۔ اس عقیدے کی مقبولیت کی وجہ شاید یہ ہو کہ جب ان کے انبیاء معجزے کے طور پر مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ تو خود ان کے لیے موت کی حالت سے دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنا دشوار امر نہیں ہوگا۔ بعض کہتے تھے کہ یوحنا مردوں میں سے جی اٹھا ہے اور بعض

یہ کہ ایلیاہ ظاہر ہوا ہے اور بعض یہ کہ قدیم نبیوں میں سے کوئی جی اٹھا ہے۔" (لوقا ۹: ۸)
سموئیل کی ان کی موت کے بعد دوبارہ ایک جادوگرنی کے ذریعے سے بلایا جاتا ہے۔ اور ان
سے مکالمہ بھی ہوتا ہے (دیکھیے سموئیل کا پہلا حصہ باب ۲۸)

یوں تو بیک وقت ایک ہی علاقے یا قوم کے لیے دو نبیوں کی بعثت غیر معمولی نہیں جیسا کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو مبعوث کیا گیا تھا مگر بائبل میں ایک ہی وقت پر چار سو نبیوں کے اجتماع کا ذکر ملتا ہے۔ (۲۔ تواریخ باب ۱۸ اور آیت ۵) مگر سب کے سب جھوٹے ثابت ہوئے اس وقت یا تو نبوت کو ایک مقبول پیشہ سمجھ لیا گیا تھا یا بائبل میں جو تشیوں کے لیے بھی یہ لفظ "نبی" استعمال کیا گیا ہے اور ہر غیب کی بات بتانے والے کو نبی سمجھا جانے لگا تھا۔ ان لوگوں کے ہم عصر صرف میکایاہ ہی سچے نبی ثابت ہوئے۔ نبوت کے دعویداروں میں چپقلش بھی ہوا کرتی تھی جیسا کہ یرمیاہ نبی کی زندگی کے واقعات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے نبی کا اخلاقی رعب جو لوگوں پر تھا ان اختلافات کی وجہ سے بری طرح مجروح ہو گیا۔

بائبل میں ناتن کو نبی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ داؤد علیہ السلام کے روبرو آئے تو اس نے بادشاہ کے حضور اپنے منہ کے بل سجدہ کیا۔ (۱۔ سلاطین۔ باب ۱۔ آیت ۲۳)

بائبل میں اس مقام پر نبی کو بادشاہ کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے تو دوسرے مقام پر صدقیاہ بادشاہ کو مورد الزام اس بات پر قرار دیا گیا ہے کہ اس نے یرمیاہ نبی کی عزت نہیں کی۔ اور اس نے یرمیاہ نبی کے حضور جس نے خداوند کے منہ کی باتیں اس سے کہی تھیں عاجزی نہیں کی۔" (۲۔ تواریخ ۳۶: ۱۲)

ان دو اقتباسات سے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی بادشاہ کی تعظیم کرے یا بادشاہ نبی کی اور ان دونوں میں کون عظیم تر ہے۔

ناتن نبی داؤد علیہ السلام کو نصیحت کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں۔ (۲۔ سموئیل ۷: ۳) اور اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہوئے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ (۲۔ سلاطین ۱: ۲۳) جاد کو داؤد علیہ السلام کا غیب میں بتایا جاتا ہے اور داؤد علیہ السلام کو ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو داؤد علیہ السلام کو نبوت سے متصف دکھایا جاتا ہے تو دوسری طرف وہ اس سے عاری اور جاد نبی کے تابع نظر آتے ہیں۔

(۲۔ سموئیل ۲۴: ۱۱)

ایک طرف تو خداوند قدوس کے بعد سب سے زیادہ عظمت و اکرام والی شخصیت ایک نبی (باقی بر صفحہ)

اسلام زندگی کا فطری نظام

(جناب اکرام الدین احمد مرحوم)

انسان کائنات کا ایک جزو ہے۔ بلکہ اہم ترین جزو اس کا احاطہ عمل اسی نظام قانون کے تحت ہے جو ساری کائنات میں بھی جاری ہے۔ اور کائنات کے ایک ایک ذرے پر کارفرما ہے۔ اسلام اس نظام قانون کا دوسرا نام ہے۔ اس مقالے میں اس حیثیت کی وضاحت کی گئی ہے۔

فطرت کا نظام قانون

اجزائے کائنات پر غور وفکر اور سائنٹفک تحقیقات سے یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ کائنات کی تخلیق ایک نظام قانون کے تحت عمل میں آئی ہے اور یہی نظام قانون ایک ایک ذرے کو کچھ اس طرح مربوط کیے ہوئے ہے کہ حقیر ذرہ اپنی انتہائی خفیف اور غیر محسوس حرکت سے کائنات میں بڑے سے بڑا تعمیری یا تخریبی کام انجام دے سکتا ہے۔ ایٹم جو کسی عنصر کا مختصر ترین حصہ ہے اور جو اپنا آزاد وجود تک برقرار نہیں رکھ سکتا برقی طاقتوں کا ایک ایسا مرکب ہے جس کے نظام ترکیب میں معمولی سا خلل زبردست تباہیوں کا سبب بن جاتا ہے۔ مادے کا مختلف شکلوں اور کیفیتوں میں مختلف قسم کی توانائیوں اور اثرات کے ساتھ رونما ہوتے رہنا جو ایک مسلسل تغیر وانتشار کا منظر پیش کرتا رہتا ہے دراصل اسی قانون کا مظہر ہے

ایک شے جو ابھی منجمد شکل میں ہے رقیق حالت میں بدل گئی لیکن اس حالت میں زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ تمازت کی تیزی نے اسے گیس بنا کر اڑا دیا اور ناقابل دید بنا کر نظروں سے غائب کر دیا تو لوگوں نے سمجھا کہ وہ مختلف حالات سے گزر کر فنا کے گھاٹ اتر گئی لیکن جب وہی گیس لوٹ کر رقیق حالت میں آئی تو تجدید وجود کا تصور ساتھ لائی۔ برف کا پگھل کر پانی بن جانا۔ پانی کا بھاپ میں تبدیل ہو جانا بھاپ کا فضا میں بکھر یا بادل بن جانا پھر بارش یا اولا ہو جانا وغیرہ کائنات کے لا محدود تغیرات میں سے ایک ایسا سلسلہ تغیر ہے جو عام نگاہ سے

پوشیدہ نہیں ورنہ اس عالم کی تو خصوصیت ہی تغیر ہے لیکن انسان کا شعور تمام تغیرات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

دنیا عالم اسباب ہے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سارے تغیرات بلا کسی نظم کے الل ٹپ اور محض اتفاق کے طور پر ہوتے ہیں یا ان کے پیچھے کوئی حکمت اور ضابطہ کام کر رہا ہے۔ سائنسی تجربات بتلاتے ہیں کہ سارے تغیرات ایک نظام قانون اور حکمت کے تحت واقع ہوتے رہتے ہیں اور ہر تغیر ایک طویل اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے جو خود بھی متعدد تغیرات کو جنم دیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی ایک واقعہ بھی بلا کسی سبب واقع ہو جائے اور آئندہ کے لیے کوئی اثر نہ چھوڑے۔ اس طرح سارا عالم عالم اسباب ہے۔ ہر سبب مسبب بھی ہے اور لامحدود اسباب کا نتیجہ بھی۔

اس سلسلہ اسباب کا ازلی سبب مسبب الاسباب ہوگا اور جس کا ہونا منطقی اعتبار سے ناگزیر ہے اگر ہم کسی واقعہ کو لیکر اس کے اسباب کا سراغ لگانا شروع کر دیں تو ایسے ایسے اسباب کا پتہ پائیں گے جن کے بارے میں کبھی یہ بات دماغ میں نہیں آسکتی کہ اس واقعہ کے یہ سارے ہی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک امریکن سائنس دان فلسفی کی تصنیف ہیومن ڈسٹنی کے اندر صفحہ ، پر اسباب کی سراغ رسانی کے سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ امریکہ کے ایک شہر شکاگو کی ایک نمائش میں سنہ ۱۹۳۳ء میں منعقد کی گئی تھی۔ روشنی کا نظام ایک بڑے سوئچ پر مرکوز تھا ایک ستارے سے چالیس سال قبل کی نکلی ہوئی ایک معمولی اور کمزور شعاع کے سوئچ پر پڑنے سے سوئچ حرکت میں آگیا اور پوری نمائش روشن ہو گئی

نمائش میں روشنی ہو جانے کے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں ان میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ سوئچ کی اثر پذیری کو اتنا لطیف بنا دیا گیا کہ ایک کمزور شعاع اس پر اثر انداز ہو کر نمائش کے روشن ہو جانے کا سبب بن گئی یا منتظمین نمائش نے ایسی ترکیب رکھی تھی کہ اس شعاع کے سوئچ پر پڑنے سے تمام نمائش یک بیک روشن ہو جائے یا اس ستارے کی شعاع اتفاقاً اس پر پڑ گئی جو تمام نمائش کو روشن کرنے کا باعث ہوئی۔ واقعہ میں ذکر ہے کہ وہ شعاع . ہم قبل ایک ستارے سے خارج ہوئی تھی۔ یعنی اس ستارے کی ایک ضعیف سی کرن نے سوئچ کو دبا کر روشنی کر دی جو زمین سے اتنے فاصلے پر ہے کہ وہاں سے روشنی کی کرنیں زمین تک آنے میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل (نئی تحقیقات سے دو لاکھ میل) فی سکنڈ کی رفتار سے چالیس سال کا وقت لیتی ہے۔ اگر سائنسی تحقیقات سے اس کرن کی خصوصیت کا پتہ نہ لگا ہوتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ سوئچ کسی نامعلوم سبب کی بنا

خفیف حرکت میں آگئی تھی۔ اس بگاڑ کی طرف کسی کا خیال ہرگز نہیں جا سکتا تھا۔

سائنٹفک دماغ کا دعویٰ کرنے والے کہتے ہیں کہ سورج اپنے آپ انتشار میں مبتلا ہو گیا اور غیر سائنٹیفک دماغ رکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ شیطانی کارروائی ہے۔ کسی خبیث روح نے سورج کو دبا کر لوگوں کو فکر میں ڈال دیا۔ بہرحال وہم و گمان میں دونوں ہی مبتلا ہو جاتے۔

یہ واقعہ اور اس کی سائنسی تحقیقات کے نتائج اس حقیقت پر صاف روشنی ڈالتے ہیں کہ قانون فطرت کا نظام اس قدر ہمہ گیر و سخت گیر ہے کہ کوئی ذرا سی حرکت بھی چاہے وہ انسان کے لیے غیر محسوس کیوں نہ ہو اس نظام قانون کے مطابق ایسے بڑے بڑے واقعات کا سبب ہوتی ہے کہ انسان ان کا ادراک نہیں کر سکتا وہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ بڑے بڑے واقعات اس خفیف حرکت کی وجہ سے پیدا ہوئے اور اس نے خود کئی چھوٹے چھوٹے واقعات کے لیے ایک علت کا کام کیا اس طرح علت و معلول کا سلسلہ جاری ہے۔

فطرت کا نظام قانون علت و معلول اور عمل و ردعمل پر مشتمل ہے۔ اس کائنات کے اندر کوئی عمل کسی نہ کسی جگہ اپنا ایک ردعمل ضرور پیدا کرتا ہے۔ ہر عمل اپنے ماسبق عمل کا ردعمل ہوتا ہے اور اپنا بھی ردعمل رکھتا ہے۔ اس واقعے سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ایک ہی عمل سے بہت سے اور مختلف قسم کے ردعمل پیدا ہوتے ہیں اور مختلف موقعوں پر مختلف زمانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اس ستارے سے نکلی ہوئی شعاع کا چالیس سال کی مدت میں ایک ردعمل ظاہر ہوا۔ جو انسان کے ادراک میں آگیا۔ اسی طرح کتنی ہی حرکتوں کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں لیکن انسان سمجھ نہیں پاتا یہ کس علت سے ظاہر ہوئے۔

کائنات کا نظام قانون اور عقل انسانی

مظاہر فطرت اگر یونہی واقع ہوتے رہتے اور جن کے واقع ہونے میں کوئی قانون کام نہ کرتا ہوتا تو انسانی دماغ میں کسی مظہر فطرت کو دیکھ کر کوئی تجسس پیدا نہ ہوتا انسان کا دیکھنا، جانوروں کا دیکھنا ہوتا انسان کا سننا، جانوروں کی طرح ہوتا۔ جانوروں میں یہ استعداد نہیں جس سے وہ ایک مظہر فطرت کو دیکھ کر مظاہر مابعد کا اندازہ کر سکیں جانور نہیں سمجھ سکتا کہ بیج سے پودے نکلتے ہیں اور پھر ان پودوں سے پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے مظاہر جو کہ واقع ہونے سے پہلے جانور کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ان مظاہر کے مابین کسی نظم اور توازن کا لگاؤ نہ ہوتا تو انسان کو بھی قبل از وقوع خبر نہ ہوتی۔ یہ نظام قانون ہی ہے جو کسی مظہر فطرت کے بارے میں اس کے واقع ہونے سے پہلے انسان کے دماغ میں شعور پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ فطرت کا نظام قانون ہے جو تعقل و تفکر کی راہیں کھولتا ہے۔

اگر کائنات ایک مخصوص اور قابل ادراک نظام قانون کے ذریعے مربوط نہ رکھی گئی ہوتی تو انسان نے جو آج تک مادی و تمدنی ترقیاں کی ہیں نصیب ہی نہیں آسکتی تھیں اجزائے کائنات سے انسان متنفیض نہیں ہو سکتا تھا۔

انسان کے حواس خمسہ اور جانوروں کے حواس خمسہ کی طرح رہ جاتے اور چھٹی حس جو عقل کی ہے اس کا وجود نہ ہوتا کیونکہ ہم اجزائے کائنات کی تمام ظاہری خصوصیات معلوم نہ کرسکتے اور نہ ان سے کما حقہ اپنی ضروریات پوری کرسکتے۔ اجزائے کائنات کی ظاہری خصوصیات بھی ہمارے حواس خمسہ کی مناسبت سے عملاً پانچ ہی قسم کی ہیں۔ (۱) رنگ اور شکل وصورت (۲) کثافت و لطافت (۳) خوشبو و بدبو۔ (۴) ذائقہ (۵) سامعہ اور ان پانچوں خواص کا علم انسانوں اور جانوروں کو پانچ مختلف قوتوں کی کارفرمائیوں سے عمل میں آتا ہے۔ قوت باصرہ سے رنگ و شکل، قوت لامسہ سے کثافت و لطافت۔ قوت شامہ سے خوشبو و بدبو، قوت ذائقہ سے کڑوے کھٹے اور میٹھے کی تمیز اور قوت سامعہ سے ہر قسم کی آواز کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ان خواص کو پیدا کرکے جانوروں اور انسانوں میں انہیں معلوم کرنے کے لیے پانچ قسم کی قوتیں پیدا کیں تاکہ کائنات کی ہر تخلیق سے فائدہ اٹھایا جائے گو کہ یہ خواص تغیر پذیر ہیں اور ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتے لیکن ایک ہی نظام قانون کے تحت یہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جو تعلق حواس خمسہ اور محسوسات خمسہ میں ہے وہی تعلق قدرت کے نظام قانون اور انسانی عقل میں ہے۔ فلاسفہ کہہ سکتے ہیں کہ اسی نظام قانون نے انسان کے اندر عقل پیدا کی لیکن دراصل عقل وہ چھٹی قوت ہے جو حواس خمسہ کے ذریعے معلوم شدہ کائنات کے ظاہری خواص کے ان فطری قوانین کا تدریجاً پتہ لگاتی چلی جاتی ہے جس کے تحت خواص بدلتے رہتے ہیں علت و معلول اور عمل و ردعمل دراصل انہیں قوانین کے تحت بدلتے رہتے ہیں کسی شے کی ایک خاصیت دوسری خاصیت میں بدلتی ہے تو گویا پہلی خاصیت علت ہوتی ہے اور دوسری معلول۔ پہلی خاصیت جس وجہ سے دوسری خاصیت میں بدلتی ہے وہ عمل اور دوسری ردعمل ہے۔ اس تشریح سے غالباً یہ بات ضرور واضح ہوگئی ہوگی کہ فطرت کے نظام قانون کا وہ جزو جو اشیاء کے خواص میں تغیرات کے مادی عوامل سے متعلق ہے۔ انسان کے حواس خمسہ اور عقل کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے اور جتنی گہرائی تک پتہ لگایا جاتا رہے گا معلوم ہوتا رہے گا۔

حواس خمسہ کائنات کے خواص کا جو اپنی نوعیت میں سراسر مادی ہیں عکس حاصل کرکے عقل کو دیتے رہیں گے۔ اور عقل انہیں زینہ بنا کر مادی ترقی کے مدارج طے کرتی رہے گی۔ گویا عقل کی ترقی کے معنے قانون فطرت کا انکشاف ہے۔

اگر کہا جائے کہ ان دونوں عقل نے خوب ترقی کرلی ہے تو اس کا حقیقی مطلب یہ ہوگا کہ ان دونوں قانون فطرت کا ایک بڑی حد تک انکشاف ہوگیا ہے ۔

انسانی نفسیات

اوپر کی تشریح میں نظام قانون کی صرف طبعی وکیمیاوی دفعات کا ایک اجمالی ذکر آسکا ہے اب ان دفعات کا ذکر ضروری ہے جو خصوصیت سے انسانی اعمال سے متعلق ہیں ۔

وہ تمام واقعات جن کے واقع ہونے میں انسان خود کسی نہ کسی نوعیت سے ایک عامل کی حیثیت رکھتا ہے اپنے سلسلۂ اسباب میں اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کی حقیقت کا انکشاف عقل انسانی نہیں کرپاتی ۔

کوئی متعجب کی بات نہیں کہ جو عقل فضائی وخلائی معلومات حاصل کرکے چاند و سیاروں کی خبر لاکر رکھ دے وہ ان معاملات کی جو سطح انجمن پر اور خود انسان کے ذریعے ہوتے ہیں توجیہ نہیں کرسکتی ۔ کیونکہ انسان کے معاملات میں فطری قانون کے نہ صرف طبعی دفعات کام کرتے ہیں بلکہ اس کی نفسیات کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے جن کا تعلق نہ مادے سے ہے اور نہ مادی قوانین سے ۔

ایک نوزائیدہ بچے کا رونا ہنسنا اور دوسری حرکتیں علم نفسیات کے نقطہ نظر سے جبلی و وجدانی حرکتیں ہیں لیکن یہی حرکتیں بڑوں اور باشعور لوگوں سے سرزد ہوں تو وہ جذباتی کہلائیں گی ۔ اسی طرح بہت سے کام اعتقاد کے زیر اثر ہوتے ہیں یہ سبھی حرکات فطری ہیں اور قانون فطرت کے مطابق ہی ہوتے ہیں ۔

انسانی شخصیت

انسانی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ چار حیثیتوں پر مشتمل ہے ۔

(جسمانی یا طبعی) عقلی، اخلاقی، روحانی) انسان کی اخلاقی و روحانی شخصیت قانون فطرت کے طبعی دفعات سے بری ہے اس پر یہ دفعات کام نہیں کرتے بلکہ اخلاقی و روحانی دفعات کام کرتے ہیں جن کا انکشاف انسان تجربہ و مشاہدہ اور عقل سے نہیں کرسکتا ۔ حالانکہ انسانی شخصیت کے مکمل انکشاف اور انسانیت کی ترقی کے لیے ان فطری قوانین کا جاننا اور ان پر عمل کرنا ناگزیر ہے ۔ انسان طبعی اور عقلی حیثیت سے ترقی کے چاہے کتنے مدارج طے کرلے لیکن اس کی شخصیت ہمیشہ ناقص رہے گی ۔ اگر وہ فطرت کے اخلاقی و روحانی قوانین پر عمل نہیں کرے گا، ناقص انسانوں پر مشتمل معاشرہ اور زیادہ ناقص اور خطرناک ہوگا ۔ انسانی شخصیت کی ان چاروں حیثیتوں پر ایک اجمالی نظر ڈال لینا اپنے مقصد کی وضاحت کے لیے ضروری ہے ۔

انسان کی جسمانی یا طبعی حیثیت

جسم کے تعلق سے انسان کے کچھ احساسات ہیں گرمی و سردی، آرام و تکلیف کا احساس، بھوک و پیاس کا احساس اندھیرے اجالے کا احساس، خوشبو اور بدبو کا احساس، ترش و شیریں کا احساس، بیماری و تندرستی کا احساس، خوشگوار و ناخوشگوار آواز کا احساس وغیرہ۔ یہ سارے احساسات نظام فطرت کے مخصوص طبعی و کیمیاوی اسباب کے نتائج ہیں۔ جو ہر جاندار جسم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان احساسات کا رد عمل ہر جاندار جسم سے تقریباً یکساں حرکات و افعال کے ذریعے ظہور میں آتا ہے جن کا مشاہدہ کر کے ہم بتا سکتے ہیں کہ فلاں حرکت فلاں احساس کا رد عمل ہے۔ کسی کو پانی پیتے ہوئے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے پیاس کا احساس کیا۔ کسی کو کراہتے ہوئے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے درد کا احساس کیا۔

جہاں تک جسمانی حیثیت کا تعلق ہے انسان اور دوسرے جانوروں میں کوئی فرق نہیں۔ جن عناصر سے مرکب انسان کا جسم ہے وہ وہی ہیں جو ہر جاندار میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ عناصر جو طبعی و کیمیاوی قوانین کے تحت کام کرتے ہیں۔ جب انسان کے طبعی احساسات کے سلسلۂ اسباب کا سراغ لگایا جا سکتا ہے تو ماہرین طبیعیات ان سارے مسائل کا حل بھی نکال سکتے ہیں جو انسان کے طبعی احساس کی بنیاد پر پیدا ہوں چونکہ یہ احساسات طبعی قوانین کے تحت ہی پیدا ہوتے ہیں اس لیے دماغ ان کو بنیاد بنا کر اور ایک دوسرے پر تطبیق کے ذریعے کائنات کے ان اجزاء اور انہیں مربوط رکھنے کی قوتوں تک کا ادراک کرتا چلا جاتا ہے جو باوجود ہمہ گیر وجود رکھنے کے عام دماغوں سے مستور رہتی ہیں مثلاً ایٹمی طاقت ہر ایٹم کے اندر موجود ہے لیکن اس طاقت کا ادراک انہیں دماغوں نے کیا جنھوں نے مظاہر کائنات پر غور و فکر کرنا۔ تجربات و مشاہدات کے ذریعے نئے نئے احساسات حاصل کرنا اپنا شیوہ بنا رکھا تھا۔

جو شخص اپنے دماغ کو ہر فکر سے الگ کر کے کائنات کے کسی ایک جزو پر مسلسل غور و فکر کرتا رہے گا اور نئے نئے تجربات و مشاہدات بھی کرتا رہے گا اور نئے نئے تجربات و مشاہدات بھی کرتا رہے گا تاکہ اس جزو کے پوشیدہ ترکیبی قوتوں اور قوانین تک رسائی حاصل کرے وہ ممکن ہے کہ اپنی زندگی میں کامیاب ہو جائے اور اسے پا جائے۔ ورنہ اس کے بعد کے آنے والے تو ضرور ہی پالیں گے۔ یہی طریقہ ہے نئے نئے انکشافات و ایجادات کا دماغ کی طاقت انسان کے لیے مخصوص ہے اس طاقت کا نام عقل ہے۔

انسانی معاشرے کے لیے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ معاشرہ کونسا راستہ اختیار کرے کہ وہ اپنے افراد کی صحیح

کی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا چلا جائے جس معاشرے میں انسانی شخصیت کے اس جزو کو نشوونما کا موقع نہیں ملتا۔ وہ معاشرہ پس ماندہ اور غیر متمدن معاشرہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس معاشرے کی زندگی کم و بیش جانوروں کی سی زندگی ہوتی ہے۔ دنیا کے جس حصہ میں یہ معاشرہ رہتا ہے وہاں کے قدرتی وسائل و ذرائع سب ہی بیکار پڑے رہ جاتے ہیں۔ ایسا معاشرہ ہمیشہ دوسروں کا غلام بن کر رہے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ طریقہ زندگی اختیار کیا جائے جو انسان کی حسی قوتوں کو صحیح طور پر اور سلامتی کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع دے اور عقل کو ان قوتوں سے کام لیکر کائنات کے طبعی قوانین اور قوتوں کا پتہ لگا کر انسانی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ انسان کے معاشی و تعلیمی مسائل انسان کی حسی قوتوں اور عقل کی ترقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوسائٹی کے ہر فرد کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنی طبعی و عقلی قوتوں کو آزادی کے ساتھ نشوونما دے سکے۔ جس سوسائٹی میں ہر فرد کو یہ مواقع حاصل نہیں وہ سوسائٹی یقیناً غیر فطری طرز زندگی پر گامزن ہے۔

انسان کی اخلاقی حیثیت

انسان صرف چند حسی قوتیں اور اخلاقی و عقلی صلاحیتیں ہی نہیں رکھتا بلکہ اچھے برے کی تمیز بھی رکھتا ہے۔ جمالیاتی حس بھی رکھتا ہے، تعمیری و تخریبی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ محبت و نفرت اور رنج و خوشی کے جذبات بھی رکھتا ہے ایثار و قربانی کے عزائم بھی رکھتا ہے۔ خود غرضی کے رجحانات بھی رکھتا ہے۔ خواہشات کا ہجوم بھی رکھتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری قوتیں اور صلاحیتیں جو انسان کے لیے مخصوص ہیں انسان کی اخلاقی حیثیت بناتی ہیں۔ یہی اخلاقی قدریں ہیں جو اپنے اثرات و نتائج کی بنا پر دو قسموں پر منقسم ہیں اول وہ جو انسانیت کی ترقی کی راہ میں معاون ثابت ہوں، دوسری وہ جو اس راہ میں رکاوٹ بنیں۔

انسان اپنی حسی قوتوں کے ذریعہ خارجی اثرات قبول کر کے جن حرکات کا مظاہرہ کرتا ہے وہ سب جانور بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر اس نے ٹھنڈک کا احساس کیا تو وہ جسم کو گرم رکھنے کی ترکیب کرے گا جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش کرے جہاں اسے گرمی محسوس ہو۔ یہ حرکت وجدانی حرکت ہے جو ہر قسم کے جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اپنے تجربات و مشاہدات سے جو معلومات حاصل کرے یا کر چکا ہو اس پر غور و فکر کرے۔ طرح طرح کے کپڑے غذائیں اور مکانات وغیرہ بنائے اور ان سے کام لیکر جسم کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھنے کی نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرے۔

یہ انسان کا عقلی عمل ہے جو صرف انسان کے لیے مخصوص ہے اسی طرح سبھی احساسات اپنے وجدانی اور عقلی رد عمل رکھتے ہیں۔ عقلی رد عمل کے ذریعے انسان اپنی طاقت بڑھاتا چلا جاتا ہے لیکن طبعی اور عقلی ترقی کے ساتھ خود غرضی کے رجحانات بڑھتے چلے جاتے ہیں انسان اپنی اس طرح کی خواہشات پوری کرنے میں لگ جاتا ہے اور اپنی حسی و عقلی قوتوں کو اپنی خواہشات کا بندہ بنا ڈالتا ہے اس کی عقل اسی سمت کام کرنے لگتی ہے جس طرف اس کی خواہشات لے جانا چاہتی ہیں۔

پہلے سائنسی ایجادات انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہوا کرتی تھیں چونکہ سائنس داں اپنے تجربات میں ایسا منہمک رہتا ہے اور فطرت کے مشاہدات کے ذریعے نتائج اخذ کرتے ہیں اتنا لطف اندوز ہوتا رہتا ہے کہ اسے کسی دوسری بات کی فکر ہی نہیں رہتی اور نہ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے جن کے پورا کرنے کے لیے اپنی ایجادات استعمال کرے اس لیے وہ اپنی حسی اور عقلی قوتوں کو اپنی خواہشات کا غلام نہیں بناتا اس کی یہ خواہش کہ وہ قدرت کی پوشیدہ طاقتوں اور قوانین کا انکشاف کرنے میں آگے بڑھتا چلا جائے اس کی دوسری خواہشات پر غالب رہتی ہیں لیکن اب سائنسی ایجادات اور موجدین کا شمار قومی سرمایے میں ہونے لگا ہے۔ قوم پرست حضرات اپنی قومی ایجادات کی قوتوں سے سرشار ہو کر کمزور قوموں کو اپنا سیاسی اور ذہنی غلام بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ افراد یا قومیں اخلاقی قدروں کے احتساب کرنے میں یا نہ کرنے میں مختار کل ہیں۔ وہ چاہیں تو اپنی صلاحیتوں کو اپنے اغراض خواہشات کے پورا کرنے میں لگا سکتی ہیں اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی کریں۔ چاہیں تو آپس کے تعلقات کو برقرار رکھیں چاہیں تو اپنے سے کمتر کو غلام بنائیں جس سے بغض و عناد اور نفرت کے جذبات پرورش پانے لگیں اور چاہیں تو انہیں ہمسر اور ہم جلیس بنالیں تاکہ محبت و الفت کے جذبات ابھریں۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ صالح اور تعمیر پذیر انسانیت نیز معاشرہ وہی ہو سکتا ہے جو اخلاقی قدروں کو اپناتا ہے۔

اخلاقی قدریں کسی خارجی چشمے سے پھوٹ کر نہیں آتیں بلکہ خود انسان کی جبلی محرکات سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً غصہ کرنا انسان کی جبلت ہی میں داخل ہے جسے علم النفسیات کی اصطلاح میں جبلت غرضی کہتے ہیں۔ اسی طرح جبلت اشتہاء، جبلت اجتماع، جبلت شہوانی وغیرہ جبلتیں ہیں جو جانوروں اور انسانوں میں مشترک ہیں جب کوئی عمل کسی جبلت کی تحریک سے براہ راست بغیر کسی دوسری طاقت کا اثر قبول کیے ہوئے سرزد ہوتا ہے تو یہ عمل سراسر حیوانی یعنی حیوان کے عمل کی طرح ہوتا ہے۔ انسانی محرکات بھی جبلت ہی کے زیر اثر ہیں جس سے مختلف افعال سرزد ہوتے ہیں لیکن کچھ دوسری قوتیں ان پر اثر انداز ہوتی ہیں ان میں تبدیلی پیدا کر کے محتاط بنا دیتی ہیں۔

ان دوسری قوتوں میں انسان کا اپنا ضمیر سب سے اہم ہے جو ہر وقت ہر جبلی تحریک پر نگراں رہتا ہے انسان کا ضمیر اس کا انسانی جوہر ہے اگر یہ کمزور یا مردہ ہو جائے تو انسان کے اندر حیوانیت عود کر آتی ہے اور اچھا خاصا انسان بد ستگی ہوش و حواس حیوانوں کی طرح کام کرنے لگتا ہے۔ انسان کا ضمیر چند الٰہی صفات کا مجموعہ ہے جو اسے خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے ودیعت کی گئی ہیں۔

جبلت غضبی سے پیدا ہونے والی حرکات پر اگر ضمیر کا قابو ہوگا تو شجاعت کی مختلف اخلاقی صورتوں، دلیری آزادی، خودداری، وقار، حق گوئی، استقلال، ثبات، صبر و سکون، مطالعہ حق، جد وجہد، سعی و محنت، جہاد وغیرہ میں ظاہر ہوں گی۔ لیکن اگر ضمیر قابو سے باہر ہوگا تو غرور، تخریبات، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم وغیرہ پر منتج ہوں گی۔ اسی طرح تمام اخلاقی خوبیاں اور برائیاں پیدا ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

عفت، صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک، بیوہ کی مدد، حاجت مندوں کی خبر گیری، شیریں کلامی خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، عفو و درگذر، نفس انسانی کا احترام حسب و نسب پر فخر کرنے کی مذمت، عدل و انصاف وغیرہ۔

انسان کے ضمیر اور جبلی محرکات کے درمیان وہی نسبت ہے جو انسان کے خون میں سفید جسیمہ leucocyte اور جراثیم (Bacteria) کے درمیان۔ جراثیم انسان کے جسم کے اندر مختلف قسم کی جسمانی بیماریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ کھانسی، زکام، بخار وغیرہ تقریباً ساری ہی بیماریاں مختلف قسم کے (Bacteria) یعنی جراثیم سے پیدا ہوتی ہیں۔

ان جراثیم کا انسانی جسم پر برابر حملہ ہوتا رہتا ہے جنکی مدافعت خون کے سفید جسیمیے کرتے رہتے ہیں۔ اس مدافعانہ جنگ میں اگر سفید جسیمیے کامیاب ہوتے ہیں تو کوئی بیماری نہیں ہوتی لیکن اگر یہ کمزور ہوئے اور حملہ آور جراثیم سے شکست کھا گئے تو طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بیماریوں کا ایک علاج تو یہ ہوتا ہے کہ ایسی دوائیں استعمال کی جائیں جو جسم کے اندر داخل ہو جانے والے جراثیم کو مار ڈالیں اور ان کی افزائش نسل کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ ایسی دوائیں غذائیں استعمال کی جائیں جن سے خون کے یہ سفید جسیمیات طاقتور ہوں اور خارجی جراثیم سے کامیاب مدافعانہ جنگ کر سکیں اسی طرح انسان کا ضمیر گویا (leucocyte) یعنی خون کے سفید جسیمیات کا کام کرتا ہے اور جبلت عقلی و شہوانی سے پیدا ہونے والے اخلاقی عیوب خارجی جراثیم کا کام کرتے ہیں۔

اخلاقی بیماریوں کا بھی علاج دو قسم کا ہے۔ اول یہ کہ جبلی حرکت سے پیدا ہونے والے افعال پر خارجی پابندی عائد کی جائے اور دوئم یہ کہ ضمیر کو طاقتور بنایا جائے۔ دوسرا علاج یعنی ضمیر کی قوت کا مضبوط کرنا اخلاقی بیماریوں سے بچنے کے لیے ناگزیر ہے۔ بغیر اس کے خارجی پابندی لاحاصل ہے۔ خارجی پابندیوں سے آج تک اخلاقی بیماریاں دور نہیں کی جاسکتیں اور یہی خرابیاں انسانی معاشرے کو تباہ و برباد کرڈالتی ہیں۔ انسانی ضمیر کو طاقتور بنانے والی غذا روحانیت ہے۔ اس لیے انسان کی روحانی حیثیت پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

انسان کی روحانی حیثیت

کسی شخص کے اندر بداخلاقیوں سے نفرت اور حسن اخلاق سے محبت و لگاؤ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ اس کی روحانی حیثیت بھی برسر عمل ہو۔ انسان کی اس چوتھی حیثیت سے متعلق بھی فطرت کے قوانین ہیں جن کی پابندی سے ہی انسان کو وہ قوت حاصل ہوسکتی ہے جو اسے بداخلاقی سے روک دے اور اس کی طبعی و عقلی قوتوں کو تعمیری رستوں پر لگادے۔

روحانی قوت وہ ہے جو بغیر مادی علائق کے پیدا ہوتی ہے اور عقل سمجھ نہیں پاتی کہ یہ قوت کہاں سے آتی ہے اور کس طرح آتی ہے۔ یہ ایک رازدارانہ قوت ہے جس کے پیدا کرنے کے بھی قوانین انہیں فطری قوانین کے اجزا ہیں جن پر ساری کائنات قائم ہے اور چل رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس جزو کا انکشاف عقل نہیں کر سکتی یہ قوانین ہمیں براہ راست اس ذات پاک سے حاصل ہوتے ہیں جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے اور آخر میں انسان اول کو پیدا کر کے کائنات کے سارے اجزاء اور ان کے قوانین کی بہ نفس نفیس تعلیم دی انسان کی عقلی حیثیت انہیں اجزاء اور ان کے قوانین کا مجموعہ ہے اور اس کا دماغ کائناتی و مادی معلومات کا خزانہ ہے۔ اس ذات حقیقی نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا — ہم نے آدمؑ کو تمام ناموں کی تعلیم دیدی (جن سے دنیا میں سابقہ پڑنے والا تھا۔)

چنانچہ کائنات سے متعلق ساری معلومات انسانی دماغ کے تحت الشعور میں موجود ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔

جیسا کہ اوپر کے ایک ذیلی عنوان "کائناتی نظام قانون اور عقل انسانی کے تحت یہ بات کہی گئی ہے کہ

نظام قانون ہی ہے جو کسی مظہر فطرت کے بارے میں اس کے واقع ہونے سے پہلے انسان کے دماغ میں شعور پیدا کرتا ہے۔ شعور کا پیدا ہونا گویا تحت الشعور کے علمی خزانے میں سے ابھر کر منصۂ شہود میں آجانا ہے تحت الشعور سے ان اجزاء کا ابھر کر منصۂ شہود میں آنے کا نام ہی شعور کا پیدا ہونا ہے

اگر ہم سائنسی اختراعات وایجادات کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور غور کریں کہ یہ اختراعات کس طرح ہوئیں تو ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کسی سائنسی ایجاد کی توجیہ اس کے علاوہ کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ سائنس داں کو کوئی دوسری ذات آکر اس ایجاد کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتی اور نہ اسے الہام ہوتا ہے۔ وہ خود جب غور وفکر کرتا ہے اور اپنے دماغ پر زور دیتا ہے تو عقل کی راہ کھلتی ہے اور زینہ بہ زینہ یا اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں اسے تحت الشعور میں پوشیدہ وہ نئی چیز حاصل ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے اندر مظاہر فطرت پر غور وفکر کرنے کا حکم دیا ہے کہ مومنین اس راہ سے قدرت کے قوانین کا انکشاف کر کے معرفت الٰہی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور قدرتی وسائل وذرائع پر قابو پا کر مادی سطح زندگی کی ایجاد بھی کر سکتے ہیں تاکہ غیروں کے دست نگر نہ ہوں اور علم کی طاقت سے دوسرے ذہنوں پر اسلام کو غالب بھی کر سکیں۔

علم کائنات کی تعلیم دینے کے بعد اولاد آدم کو مختصر سوال وجواب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قوت روحانی کے سرچشمہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ کلام پاک میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بعد انہیں کائنات کا علم سکھایا گیا ان کے علم کی برتری ثابت کرنے کے لیے انھیں فرشتوں کے سامنے لاکر ان کے علم کا امتحان لیا گیا پھر ان کے جواب کی بلندی اور علم دنیا کی بڑائی کا رعب ڈال کر فرشتوں کو ان کے سامنے سجدے میں جھکنے کا حکم دیا گیا کچھ مدت تک جنت میں رہنے کا حکم ملا اور ہر قسم کی آزادی دی گئی بس ایک درخت کے پاس جانے کی ممانعت کی گئی لیکن ابلیس کے بہکانے سے حضرت آدمؑ سے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی نافرمانی ہوگئی لیکن جلد ہی معافی مل گئی اور دنیا میں اترنے کا حکم ہوا۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے تمام مراحل سے گذر کر حضرت آدمؑ کی شخصیت کی تکمیل ہوئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام ذریات آدم کو جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھیں بیک وقت حاضر کر کے ان سے سوال کیا۔ الست بربکم کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ قالوا بلیٰ۔ جواب ملا۔ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو رب تسلیم کر لینا ہی قوت روحانی کا سرچشمہ ہے جس سے جتنی قوت حاصل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں لیکن روحانی قوت حاصل کرنے کے بھی باقاعدہ قوانین ہیں۔ ان قوانین پر عمل پیرا ہو کر ہی روحانی

قوت حاصل ہو سکتی ہے۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ قوانین کیا ہیں؟ اولادِ آدم کو اس دنیا میں عملی زندگی ادر سلوک و بر تاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایتیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ دنیا میں آتی رہیں اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچیں۔ اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے روز نازل ہی میں فرما دیا تھا کہ فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ جب جب میری طرف سے ہدایتیں آئیں گی تو جو لوگ ان پر عمل کریں گے انھیں نہ کوئی خوف ہوگا، نہ غم۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے ان کی قوت روحانی پیدا ہوگی اور ان کو دنیا کی کسی چیز کا نہ تو خوف ہوگا نہ ان پر دنیا کی کوئی طاقت غالب ہو سکے گی کہ ان کی غلامی میں رہ کر طرح طرح کی مصیبتوں تکلیفوں اور ذہنی پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام نے اور ان کے پیرو کاروں نے یعنی صلحاء شہداء نے ہمارے لیے تاریخ بنائی ہے اسے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ بلند پایہ ہستیاں وہ تھیں جو اپنے وقت کے بڑے بڑے بادشاہو اور طاقتوروں کے سامنے کبھی نہ جھکیں ان سے بے خوف رہیں جس کے بدلے میں ان پاک نفوس کو سزائیں بھگتنی پڑیں لیکن وہ بے پرواہ ہو کر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی اور اپنی انقلابی زندگی کا نمونہ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ متذکرہ تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ:-

(۱) پوری کائنات ایک نظام قانون میں جکڑی ہوئی ہے اس میں جو کچھ ہو رہا ہے اسی قانون کے تحت ہو رہا ہے اسی کو فطرت کا قانون کہتے ہیں چاہے قدرت کہیے چاہے اللہ تعالیٰ کا حکم کہیے۔

(۲) اس نظام قانون کی دو بڑی دفعات ہیں۔

(الف) اول وہ قوانین جو اجزائے کائنات کی مادی ساخت و ترکیب اور خواص سے متعلق ہیں اور طبعی قوانین کہلاتے ہیں۔ ان کا ادراک انسان اپنے حسی و عقلی قویٰ یعنی غور و فکر سے کر سکتا ہے انہیں مادی قوانین کو موجودہ اصطلاح میں سائنس کہتے ہیں۔

(ب) دوسرے وہ قوانین جو غیر مادی اجزا کے بارے میں ہیں اور جن کا تعلق صرف انسان و جن سے ہے جنھیں اخلاقی و روحانی قوانین کہتے ہیں۔ ان کا ادراک انسان اپنے حسی و عقلی قویٰ سے نہیں کر سکتا۔ یہ قوانین خالق کائنات سے براہ راست بذریعہ وحی حاصل ہوتے ہیں جو اس کے خاص بندوں انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی رہی ہیں۔

نکاح میں کفو کا مسئلہ

(سید احمد قادری)

سوال

فقہ حنفی کی مبسوط کتابوں میں کفاءت یعنی کفو ہونے کے مسئلے کے لیے مستقل ایک باب مرتب کر دیا گیا ہے اور شاخ در شاخ مسائل کا ایک جنگل پھیلا دیا گیا ہے۔ اس جنگل میں (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (اللہ کے نزدیک تم میں کا سب سے مکرم اور باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے) کی حقیقت گم ہو کر رہ گئی ہے۔ فقہ حنفی کا یہ باب اس فقہ پر ایک دھبہ معلوم ہوتا ہے۔ مہربانی کر کے آپ بتائیں کہ کفو کا مسئلہ کیا ہے اور فقہ حنفی میں اس کو یہ حیثیت کیوں دی گئی ہے کہ سادات کے خاندان کی کوئی لڑکی غیر سید سے نکاح کرے تو اس کے ولی کو نکاح فسخ کرانے کا اختیار ہے۔

جواب

آپ کے سوال سے جو ذہن سامنے آیا ہے اس کے پیش نظر میں چند باتیں پہلے عرض کرنا چاہتا ہوں:۔

(۱) عربی لغت میں کفاءت کے معنی برابری اور مساوات کے ہیں۔ اس لیے کفو کے معنی برابر، مماثل اور مساوی کے ہوئے۔

(۲) بہت سی چیزوں میں ایک انسان دوسرے انسان کے برابر اور اس کا ہمسر ہوتا ہے اور بہت سی چیزوں میں دو انسانوں کے درمیان مساوات نہیں ہوتی۔ یہ بات جس طرح زندگی کے دوسرے معاملات میں صحیح ہے اسی طرح نکاح کے معاملے میں بھی صحیح ہے۔ کفاءت کے مسئلے میں صرف نسب کو سان پر چڑھا لینا صحیح طرز فکر نہیں ہے۔

(۳) پوری کائنات میں صرف ایک ذات ایسی ہے جس کا کوئی کفو نہیں اور وہ خالق کائنات کی ذات ستودہ صفات ہے۔ ولم یکن لہ کفوا احد (اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے) ذات برادری کے ہر شائبے سے پاک

اور منشرہ صرف وہی ہے جس نے ذات، برادری بنائی ہے۔ ان باتوں پر اچھی طرح غور کیجیے۔

آپ نے جو سوال کیا ہے اور جس انداز میں کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں زیادہ تر لوگ فقہ حنفی پر عمل کرتے ہیں۔ اسی فقہ کی کتابیں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں ورنہ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے مسالک فقہ کی کتابوں میں بھی نکاح میں کفو کے مسئلے پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

بعض چیزوں میں کفاءت تو تمام ائمہ کے نزدیک معتبر ہے۔ مثلاً دیانت یعنی دین داری اور اخلاق۔ فاسق، فاجر اور بداخلاق بدکردار مرد کسی دیندار اور بااخلاق عورت کا کفو نہیں ہے۔ اگر ایسی کوئی عورت کسی وجہ سے کسی آوارہ گرد مرد سے نکاح کرلے تو اس کے اولیاء (سرپرستوں) کو اختیار ہے کہ وہ اس نکاح کو فسخ کرا دیں۔ اس چیز پر اتفاق کے بعد دوسری چیزوں میں ان کے درمیان اختلاف ہے اور اختلاف بھی اس درجہ کا کہ ایک ہی امام سے دو متضاد قول منقول ہیں۔ مثال کے طور پر مال (اس حد تک کہ بیوی کا مہر اور نان نفقہ ادا کیا جاسکے) امام مالکؒ کے مسلک میں بھی کفو ہونے میں معتبر ہے۔ بدایۃ المجتہد میں ہے:۔

ولم یختلف المذھب ان الفقر	مذہب مالکی کا یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ فقر و احتیاج
مما یوجب فسخ النکاح الاب	ان چیزوں میں ہے کہ باپ نے اگر اپنی باکرہ
ابنتہ البکر اعنی اذا کان فقیرا	بیٹی کا نکاح کسی فقیر سے کردیا تو اسے فسخ کیا
غیر قادر علی النفقۃ علیہا	جاسکتا ہے یعنی جبکہ شوہر فقیر ہو، بیوی کا نان
فالمال عندہ من الکفاءۃ	نفقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو لہٰذا مال امام مالک
(بدایۃ المجتہد کتاب النکاح)	کے نزدیک کفاءت میں داخل ہے۔

اسی طرح حریت (آزادی) بھی مالکی مسلک میں کفاءت میں داخل ہے۔ کوئی عبد (غلام) اگر کسی آزاد عورت سے نکاح کرلے تو سرپرستوں کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اس کو فسخ کرا دیں۔ یہ جو مشہور ہے کہ امام مالک کے نزدیک صرف دین و دیانت کی کفاءت معتبر ہے، صحیح نہیں ہے۔ بدایۃ المجتہد سے معلوم ہوتا ہے کہ تین چیزیں ان کے یہاں کفاءت میں معتبر ہیں۔ دیانت۔ مال۔ حریت۔ یہاں آزادی اور غلامی کے الفاظ فقہی اصطلاح کے لحاظ سے استعمال کیے گئے ہیں۔

صناعت و حرفت یعنی پیشہ کفاءت میں معتبر ہے یا نہیں؟ اس میں امام احمد بن حنبل کے دو قول ہیں۔ قوی قول یہ ہے کہ کفو کے مسئلے میں پیشہ معتبر ہے۔ ابن قدامہ کی المغنی میں ہے کہ جو شخص پست اور حقیر پیشہ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً

وہ جولاہا یا حجام ہے تو ایسا شخص اس شخص کا کفو نہیں ہے جس نے با وقار اور بلند پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ مثلاً تجارت یعنی جولاہا، تاجر کا کفو نہیں ہے۔ آپ آئیے نسب کے مسئلے پر جو آپ کی الجھن کا سبب ہے اور فقہ حنفی کے باب الاکفاء پر آپ کو غصہ ہے۔ فقہ حنبلی میں نسب کا اس درجہ اعتبار ہے کہ اگر کوئی عربی النسل عورت کسی غیر عربی سے نکاح کرے تو اس کا نکاح ہی باطل ہے۔ ابو القاسم خرقی کی مختصر میں ہے :۔

واذا زوجت من غیر کفو فالنکاح باطل (المغنی کتاب النکاح)　　اور جب وہ غیر کفو سے نکاح کرے تو نکاح باطل ہے

اس کی شرح میں ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی غیر عرب نے کسی عربی عورت سے نکاح کر لیا تو دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور یہی قول سفیان ثوری کا ہے۔ اسی طرح اگر عربی عورت سے نکاح کرنے والا اجلاہا ہے تو دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ نسب کی کفاءت صحت نکاح کے لیے شرط نہیں ہے یعنی نکاح منعقد ہو جائے گا لیکن عورت کے سرپرستوں کو اختیار ہو گا کہ وہ قاضی کے ذریعہ نکاح فسخ کرا دیں۔ یہ تفصیلات یہ دکھانے کے لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ صرف فقہ حنفی مجرم نہیں ہے۔ دوسرے مسالک فقہ بھی مجرم ہیں امام ابو حنیفہ پر تو یہ الزام ہے کہ وہ حدیث کم جانتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور امام سفیان ثوریؒ کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ امام شافعی کے بھی اس مسئلے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ نسب نکاح میں معتبر ہے اور دوسرا یہ کہ غیر معتبر ہے۔ نکاح میں کفو کا جو مسئلہ ہے اس میں فقہ حنفی، فقہ شافعی و حنبلی سے مختلف نہیں ہے۔ جس طرح امام شافعی اور امام احمد بن حنبل سے متضاد اقوال منقول ہیں، اسی طرح امام ابو حنیفہ سے بھی متضاد اقوال منقول ہیں۔ احناف میں بھی بعض اونچے درجہ کے ائمہ نکاح میں نسب کو معتبر نہیں مانتے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے حاشیہ رد المحتار کے حوالے سے لکھا ہے :۔

ان الامام ابا الحسن کرخی و الامام ابا بکر الجصاص وھما من کبار علماء العراق ومن تبعھما من مشائخ العراق لم یعتبروا الکفاءۃ فی النکاح ولو لم یثبت عندھم ھذہ الروایۃ عن ابی حنیفۃ لما اختارھا و ذھب جمہور	امام ابو الحسن الکرخی اور امام ابو بکر جصاص جو بہت بڑے علمائے عراق میں ہیں اور ان دونوں کی پیروی کرنے والے دوسرے مشائخ عراق نے نکاح میں نسبی کفاءت کا اعتبار نہیں کیا ہے اور اگر ان کے نزدیک امام ابو حنیفہ سے یہ روایت ثابت نہ ہوتی تو وہ کبھی اس کو اختیار نہ کرتے اور ہمارے جمہور مشائخ

اس طرف گئے ہیں کہ نسبی کفاءت نکاح میں معتبر ہے۔

اسی طرح اس مسئلے میں کہ کیا عجمی فقیہ اور عالم حضرت علیؓ کے خاندان کا کفو ہو سکتا ہے؟ ائمۂ احناف کی آرا مختلف ہیں۔ علامہ ابن ہمام صاحب فتح القدیر نے (جو مذہب حنفی کے بیرسٹر سمجھے جاتے ہیں) عجمی عالم کو خاندانِ علی کا کفو تسلیم کیا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ شرف العلم فوق شرف النسب یعنی علم کا شرف نسب کے شرف سے بلند ہے۔ میں نے فقہاء کے اقوال نقل کر دیے ہیں۔ دلائل سے تعرض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ایک لمبا کام ہے۔

اس حقیر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نسبی فخر کی جہت سے نکاح میں نسب کا اعتبار بالکل غلط ہے۔ اسلام نے نسلی غرور اور نسبی اونچ نیچ کا خاتمہ کر دیا ہے البتہ تہذیب و تمدن اور معاشرتی رہن سہن کے اعتبار سے خاندانوں کے درمیان تفاوت موجود ہے جس طرح اللہ نے انسانوں کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح انسانوں کو شعوب و قبائل میں بھی تقسیم کیا ہے۔ تفاخر کے لیے نہیں بلکہ تعارف کے لیے۔ تعارف کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے قبیلہ اور خاندان ہی کی نسبت سے جانا پہچانا جاتا ہے اور مختلف قبیلوں اور خاندانوں کے درمیان رہن سہن، معاشرت، علم و فضل، ذوق اور عادات و خصائل کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہے۔ اس لیے قبیلہ اور خاندان کی نسبت سے تعارف میں یہ تمام چیزیں داخل ہیں۔ دوسری طرف زوجین کے تعلقات خوش گوار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان باتوں میں وہ "برابر کی جوڑ" ہوں۔ اس حیثیت سے اگر نکاح میں قبیلہ اور خاندان کا اعتبار کیا جائے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسلام نے تمام قبیلوں اور خاندانوں کو توڑ کر ایک کر دینے کی تعلیم نہیں دی ہے۔

اخیر میں یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ نسب پر فخر کرنے کی جو برائی مسلم معاشرے میں بھی پیدا ہو گئی تھی اور اب بھی اس کے اثرات باقی ہیں حالات زمانہ نے اس برائی کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق　　　　که یاراں فراموش کردند عشق

اس کے علاوہ اسلام کی طرف از سر نو رجوع کی تحریک نے بھی نسبی غرور کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے اس لیے نکاح کے معاملے میں سادات اور غیر سادات کا فرق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب آپ کے لیے غیظ و غضب کا موقع باقی نہیں ہے نسبی فخر اور نسلی غرور کو ختم کرنے کے لیے غیظ و غضب مفید بھی نہیں ہے۔

تقسیم میراث کا مسئلہ

خط "میں نے میراث کی تقسیم کے بارے میں ایک سوال مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی کو بھیجا تھا ان کا جواب آیا ہے کہ وہ سوال آپ کو بھیج دیا گیا ہے۔ میں اس سوال کی ایک نقل بھیج رہا ہوں، مہربانی کر کے جلد جواب دیجیے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کی وفات کو ۵۰ سال ہو گئے لیکن اب تک ان کی جائداد کا بٹوارہ نہیں ہوا ہے۔ ان کی وفات کے وقت ان کے دو لڑکے دونوں کنوارے تھے اور چار لڑکیاں شادی شدہ اور دو غیر شادی شدہ۔ اس کے بعد ایک لڑکے کا شادی کے بغیر ہی انتقال ہو گیا۔ دوسرا لڑکا زندہ اور صاحب اولاد ہے۔ دو شادی شدہ لڑکیوں میں سے ایک زندہ ہے دوسری لڑکی کا انتقال ہو چکا ہے لیکن اس کا ایک لڑکا زندہ ہے۔ دو کنواری لڑکیوں کی شادی ایک ہی شخص سے یکے بعد دیگرے ہوئی تھی۔ ایک کا انتقال ہو گیا تو اسی شخص سے دوسری کا نکاح بھی ہوا۔ ان دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کا ایک لڑکا زندہ ہے۔ کیا اس نواسے کو نانا کی جائداد میں کوئی حصہ ملے گا؟ اگر اس کا حق ہے تو کتنا؟ مہربانی کر کے جائداد کی تقسیم کا طریقہ بتایئے"

جواب

جواب دینے سے پہلے میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ فقہی مسائل کا جواب حاصل کرنے کے لیے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی کو سوالات نہ بھیجا کریں اس لیے کہ ان کے یہاں دارالافتاء قائم نہیں ہے۔ مستفتی لوگوں کو یہ جواب دیتے ہوئے شاید مرکزی مکتبہ والوں کو شرم محسوس ہوتی ہے۔ وہ لوگ سوال میرے پاس بھیج دیتے ہیں جیسے میں اس کام کے لیے یہاں فارغ بیٹھا ہوں۔ ادارہ زندگی نو میں الگ سے کوئی مفتی مقرر نہیں ہے۔ اس کا مدیر ہی وقت ملتا ہے تو جواب دے دیتا ہے۔ ہندوستان کے بڑے مدرسوں میں باضابطہ دارالافتاء قائم ہیں اور مفتی حضرات اسی کام پر مقرر ہیں اس لیے فقہی سوالات مدرسوں کے دارالافتاء کو بھیجنے چاہئیں۔

آپ اپنے سوال کا جواب پانے سے پہلے دو باتیں ذہن نشین کر لیں ان سے جواب سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

پہلی بات یہ کہ میراث کے مسئلے میں وارث کے کنوارے یا شادی شدہ ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا دوسری بات یہ کہ مورث کے انتقال کے بعد اس کے مال میں وارثوں کے حقوق ثابت ہو جاتے ہیں خواہ مال

تقسیم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، ہر وارث کی حیثیت خود ایک مورث کی ہو جاتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی کی وفات ہو جائے تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس مورث کے وارث کون لوگ ہیں۔ اس کا ورثہ انہیں وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ آپ نے جو سوال کیا ہے اس میں مورث کی وفات کے وقت اس کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں ان میں مورث کا ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ ہر لڑکے کو دو حصہ اور ہر لڑکی کو ایک حصہ ملے گا۔ جائداد تقسیم ہونے سے پہلے ایک لڑکی کی شادی کے بغیر ہی وفات ہو گئی تو اس کا باپ کی جائداد میں جو حصہ تھا وہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ اس کے حقیقی بھائی کو دو حصہ اور اس کی حقیقی بہنوں کو ایک ایک حصہ ملے گا۔ ایک لڑکی جو اپنا ایک لڑکا چھوڑ کر وفات پا گئی ہے، اگر شوہر زندہ ہو تو باپ کی جائداد میں اس لڑکی کا جو حصہ تھا اس کا چوتھائی شوہر کو اور باقی اس کے لڑکے کو ملے گا اور اگر شوہر کا انتقال بیوی کی زندگی ہی میں ہو گیا ہو تو پورا مال اس کے لڑکے کو ملے گا۔ ان دو لڑکیوں کے حصہ کی تقسیم جن کا یکے بعد دیگرے ایک ہی شخص سے نکاح ہوا ہے ان میں کس لڑکی کا ایک لڑکا زندہ ہے یہ آپ نے نہیں لکھا۔ بہرحال اس نواسے کو نانا کی جائداد میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ میں نے اصولی طور پر طریقہ تقسیم بتا دیا ہے۔ آنے پائی کا حساب آپ خود کر لیں یا کسی حساب داں کی طرف رجوع کریں۔ آپ نے جائداد کی تفصیل بھی نہیں لکھی ہے۔

ترکے کی تقسیم کا ایک سوال

سوال

ایک شخص کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت اس کے خاندان کے یہ لوگ موجود ہیں (۱) ماں (۲) تین بیٹیاں (۳) تین پوتیاں (۴) بیوی (۵) حقیقی بہنیں (۶) بیٹے تین (۷) پوتے چھ (۸) حقیقی بھائی (۹) بھتیجے بھتیجیاں (۱۰) حقیقی بھائی کی اولاد کے پوتیاں (۱۱) دوسرے حقیقی بھائی کی بیوہ۔

جواب

آپ کا سوال پڑھ کر احساس ہوا کہ وراثت کے مسئلے سے مسلمان کتنے ناواقف ہیں۔ پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ مورث کی وفات کے وقت اس کے شرعی وارث صرف یہ لوگ تھے۔ ماں۔ بیوی۔ بیٹے۔ بیٹیاں۔ ان کی موجودگی میں دوسرا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ ترکے کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ ماں کو چھٹا حصہ اور بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ یہ دونوں حصے نکالنے کے بعد جو کچھ بچے گا اس میں بیٹوں میں سے ہر ایک کو دو حصے اور بیٹیوں میں سے ہر ایک کو ایک حصہ ملے گا۔ مورث کی جائداد اس طرح تقسیم ہوگا

تنقید و تبصرہ

مولانا شاہ نصر احمد قادری ندوی
(حالات و تاثرات کے آئینہ میں)

بدر احمد مجیبی صفحات ۱۵۴ کاغذ عمدہ، کتابت، طباعت بہتر قیمت پانچ روپیہ ملنے کا پتہ: بدر احمد، دانش کدہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ۔ بہار

خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف (جو اس حقیر تبصرہ نگار کے لیے جسمانی پرورش گاہ اور روحانی تربیت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے) ادھر مسلسل تین بڑے حادثات سے دوچار رہی۔ اس کا سب سے بڑا حادثہ تو خود زیب سجادہ مجیبی مولانا شاہ امان اللہ قادری مجیبی کی وفات کا حادثہ فاجعہ ہے۔ اس حادثے سے پہلے دو اور بڑے حادثے ہوئے۔ پہلا حادثہ حکیم حماد ندوی قادری کی وفات کا تھا اور دوسرا حادثہ مولوی نصر احمد قادری ندوی کے انتقال کا۔ یہ دونوں مولانا شاہ امان اللہ قادری کے حقیقی بھانجے تھے۔ انہیں دو مسلسل حادثے برداشت کرنے پڑے تھے۔ حکیم حماد ندوی میرے حقیقی بھتیجے تھے اور مولوی نصر احمد ندوی میرے حقیقی پھوپی زاد بھانجے تھے۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا شاہ عون احمد قادری اطال اللہ بقاءہ کے منجھلے صاحبزادہ نے سلیقے سے مرتب کی ہے اور جناب ظفر حسنین صاحب عیسے پور پھلواری شریف نے اس کو شائع کیا ہے۔ پیش لفظ میں انھوں نے اس کتاب کا تعارف کرایا ہے۔ یہ کتاب لوگوں کے تاثرات، مکاتیب تعزیت اور قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے۔ مکاتیب میں مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی امیر جماعت اسلامی ہند کا مکتوب تعزیت بھی ہے۔ حالات و تاثرات میں مرتب کتاب عزیزی بدر احمد مجیبی سلمہ کا ایک مقالہ "آغوش مادر سے فرش لحد تک" ۴۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور جامع ہے۔ اسی میں وہ مکتوب تعزیت بھی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کے بیٹے کی وفات پر بھیجا تھا۔ اس کتاب میں چند باکمال شخصیتوں کا ذکر بھی ہے جو کم عمری میں وفات پا گئے۔ عزیزی نصر احمد اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بڑے سنجیدہ نوجوان تھے۔ ان کی

سنجیدگی پیدائشی تھی اور علم کا ذوق فطری تھا۔ پھلواری شریف سے بہت دور رہنے کی وجہ سے میں ان سے بہت کم مل سکا لیکن جب ملا انھوں نے ذہن پر ایک خاص اثر ڈالا۔ آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں حماد مرحوم کی وفات کے بعد پھلواری شریف گیا تھا۔ وہ اس وقت علیل تھے۔ افسوس ہے کہ مجھے ان کے دہلی پہنچنے اور ہسپتال میں داخل ہونے کی کوئی خبر نہیں مل سکی۔ وہ جب علمی لحاظ سے کیل کانٹے سے لیس ہو کر پھلواری شریف پہنچے تھے اور وقت آیا تھا کہ وہ علمی دنیا میں آفتاب بن کر چمکیں۔ اللہ رحیم و کریم نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ مومن رضا بالقدر و القضاء کا پابند ہے۔ اللہ کا ہر فیصلہ مبنی بر حکمت ہوتا ہے۔ قلبی تعلق ہی کی وجہ سے میں نے یہ کتاب بالاستیعاب پڑھی ہے یہ ان کی سعادت مندی ہی تھی کہ ان کی وفات پر ملک اور بیرون ملک کے ایک وسیع حلقے میں ان کے لیے قرآن خوانی کی مجلسیں آراستہ ہوئیں اور نہ جانے کتنے لوگوں نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی اور کر رہے ہیں۔ اللّٰھم اغفر لہٗ۔

وبرّد مضجعہٗ۔

دعوۃ القرآن

شمس پیرزادہ۔ سائز بڑا۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ سادہ و پرکار گرد پوش۔ ہدیہ۔ دس روپے۔

مولانا شمس پیرزادہ دعوۃ القرآن کے نام سے جو قرآن کریم کی مختصر عام فہم تفسیر مرتب کر رہے ہیں۔ یہ اسی کی ایک جلد ہے جو سورۂ مائدہ، انعام، اعراف کی تین طویل سورتوں پر مشتمل ہے۔ یہ بہت دنوں سے تبصرہ کے لیے آئی ہوئی تھی لیکن اس کے مطالعہ کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ اب بھی اس کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ دعوۃ القرآن کی ایک جلد پر پہلے بھی تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ باشندگان ملک میں عقیدہ و عمل کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں اس تفسیر میں صراحتاً ان کی طرف بھی اشارے کیے جاتے ہیں۔ اس تفسیر کے تعارف میں محترم شمس صاحب نے ایک شق یہ بھی لکھی ہے کہ "کسی بھی مکتب فکر کی پابندی سے آزاد" واقعہ یہ ہے کہ کسی ایسی فکر کے تحت تفسیر جسے مفسر قرآن نے پہلے سے اپنے ذہن میں پال رکھا ہو قرآن کی تفسیر نہیں ہوتی بلکہ اس فکر کی ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قرآن خود کوئی مکتب فکر پیدا نہیں کرتا؟ اگر کرتا ہے تو تفسیر قرآن، اس مکتب فکر کی پابندی سے کس طرح آزاد ہو سکتی ہے۔ ہم ذیل میں اس تفسیر کے دو ایک اقتباسات دے رہے ہیں ان سے اس تفسیر کا ایک اندازہ سامنے آ سکتا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۳ کا ترجمہ یہ ہے: "اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی" اس فقرے کی تفسیر یہ کی ہے "اس کا سیدھا سادہ مطلب وہی ہے جو عام قاری کے ذہن میں آ سکتا ہے اور جس کی تائید بعد کے فقرے سے بھی ہوتی ہے یعنی اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور اس کا اقتدار آسمان اور زمین کے چپہ چپہ پر قائم ہے۔ رہا حلول کا فلسفہ یعنی یہ خیال کہ خدا کی روح ہر چیز میں سرایت کر گئی

رکھتی ہے "یا ہمہ اوست کا تصور یعنی یہ خیال کہ جو کچھ بھی ہے خدا ہی خدا ہے تو یہ مشرکانہ تصور ہے اور خالق کو مخلوق پر قیاس کرنے کا نتیجہ ہے" ص ۲۹۴۔ سورۂ مائدہ آیت ۶۰ کے ایک فقرہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور وہ جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی" اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "طاغوت سے مراد شریر اور سرکش لوگ ہیں اور پرستش (عبادت) سے مراد ان کی اندھی تقلید اور معصیت کے کاموں میں ان کی اطاعت ہے، یہاں پرستش (عبادت) کا لفظ اطاعت میں غلو کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ امام رازی طاغوت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ایک قول یہ ہے کہ طاغوت سے مراد وہ بچھڑا ہے جس کی پرستش کی گئی۔ آیت میں جو ارشاد ہوا ہے اس کا مدعا یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرنے کے بجائے اس کے سرکش بندوں کی اطاعت کرنا ان کو پوجنے کے ہم معنے ہے اور یہ بہت بڑی ذلت ہے جو کسی کے حصہ میں آئے۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ یہ ذلت ان کے حصہ میں آئی" ص ۲۹۵۔ سورۂ مائدہ آیت ۱ کے ایک فقرے کا ترجمہ یہ ہے: "بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے" اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "حکم دینے کا مطلق اختیار صرف اللہ ہی کو ہے لہذا جو شخص بھی اس کے ٹھہرائے ہوئے حلال و حرام سے بے نیاز ہو کر اپنے یا کسی شخصیت کو یا جمہور کو مطلق طور پر حکم دینے کا مجاز سمجھتا ہے وہ درحقیقت اس بات کی نفی کرتا ہے کہ یہ اختیار اللہ کے لیے مخصوص ہے اور اس کا یہ طرز عمل سراسر مشرکانہ اور کافرانہ ہے" (ص ۳۵۲) اس تفسیر کی جلدوں کے صفحات مسلسل رکھے گئے ہیں۔ یہ جلد ص ۳۴۷ سے ۵۸۱ تک پر محیط ہے۔ اخیر میں ۹ صفحات کا مفصل اشاریہ بھی ہے اور ۶ عدد تصاویر اور نقشہ جات بھی ہیں۔

تحریک اسلامی مشکلات، مسائل، آزمائش استاذ فتحی یکن ترجمہ عبید اللہ فہد صفحات ۲۸۰ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، جاذب نظر گرد پوش کے ساتھ قیمت ۱۴ روپیہ۔ ناشر: ہندوستان پبلیکیشنز ۲۵۔۲۰۲۴ گلی قاسم جان۔ دہلی۔

اگرچہ یہ کتاب اسلامی ملکوں بالخصوص عرب ممالک کی تحریکات اسلامی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے لیکن اس میں بہت سی اصولی باتیں ایسی ہیں جو ہر ملک، ہر ماحول اور ہر معاشرے میں یکساں مفید ہیں۔ اس لیے اس کتاب سے وہ اسلامی تحریکیں بھی استفادہ کر سکتی ہیں جو غیر اسلامی ملکوں میں کام کر رہی ہیں۔ اسلامی تحریکوں کا بیرونی و اندرونی جائزہ جو اس کتاب میں لیا گیا ہے ہر اسلامی تحریک کے لیے قابل غور ہے۔ اسلامی تحریک اتنی مدت سے کام کر رہی ہے کہ اب لوگوں کے سامنے یہ سوال آنے لگا ہے کہ آخر اب تک اس کے وہ اثرات کیوں مرتب نہیں ہوئے جن کی توقع کی جا رہی تھی؟ اس کتاب میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے تمام جائزوں اور تمام مندرجات سے اتفاق ضروری نہیں لیکن اس طرح کی چیزیں کم ہیں۔ فاضل مصنف کی اصل کتاب

چونکہ سامنے نہیں اس لیے ترجمہ کے بارے میں حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ صحیح ہوگا۔
سرعرض ناشر سے معلوم ہوا کہ جس کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے اس کا نام "مشکلات الدعوۃ والداعیۃ" ہے
"داعیان اسلام خطرے میں" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے:-

یہاں میری مراد یہ نہیں ہے کہ انہیں دشمنوں کا خطرہ درپیش ہے مخالفین کی چالوں اور اسلام اور اہل اسلام کی سازشوں کا سامنا ہے۔ یہ خطرات نفس کے خطرات وانحرافات کے مقابلہ میں کم نقصان دہ اور کم سنگین ہیں داعی دین اگر اپنے نفس کے عیوب و امراض سے محفوظ ہو تو دشمنوں کی قوت چاہے کتنی بڑھ جائے اور مخالفین کی تعداد میں کتنا ہی اضافہ ہو جائے۔ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔

۔۔۔۔۔ اس زمانے میں داعیان اسلام کے سامنے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ خود ان کے اپنے نفس کے اندر کئی محاذوں پر کش کش ہو رہی ہے اور بسا اوقات وہ اسے امر واقعہ کہکر تسلیم کر لیتے ہیں اور اسلام کی یومیہ کاری پر راضی ہو جاتے اور اصولوں اور اقدار کی سودے بازی پر خاموش ہو جاتے ہیں اور بیشتر اوقات تساہل اور تغافل کی یہ سیاست بعض لوگوں کو بنیادی مسلمات کی مخالفت اور اسلامی سلوک، تصور اور فکر کے دائرے سے خروج تک کھینچ لے جاتی ہے

بحیثیت مجموعی یہ کتاب لائق مطالعہ و استفادہ ہے۔

(بقیہ ذکر الٰہی صفحہ ۸)

"اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والی عورتیں"
سب سے آخر میں اس صفت کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ درحقیقت اللہ کی یاد ہی تمام صفات میں جان ڈالتی ہے۔ ذکر کثیر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کو یاد رکھنا اور دوسروں کو یاد دلانے کا عمل ایک مسلمان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہو جائے۔ زبان اللہ کے ذکر سے تر، دل اس کی یاد سے معمور اور لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دینے، معروف کی تلقین کرنے اور منکر سے روکنے کا عمل مسلسل جاری رہے، اس کی زندگی کا کوئی لمحہ خدا کی یاد سے خالی نہ رہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر جائز کام کے لیے مختلف اذکار کی جو تعلیم دی ہے اس پر عمل کرنے سے ایک مسلمان کی زندگی ذکر الٰہی سے معمور ہو جاتی ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر حدیث سے بھی ذکر کثیر کا مفہوم واضح ہوتا ہے
اکثروا ذکر اللہ حتی یقولوا — اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ یہاں تک لوگ کہنے

مجنون (تفسیر ابن کثیر بحوالہ مسند احمد) لگیں۔ یہ دیوانہ ہے۔

حتی یقولوا مجنون" اس جملے کا مفہوم انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں جلوہ گر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو حکمت کا خزانہ اور رحمت عالم تھے ان کو بھی ان کے مخالفین نے مجنون کہا ہے۔

"جب یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے۔ (القلم: ۵)

ذکر الٰہی کا ایک بڑا فائدہ

ذکر الٰہی کا ایک بہت بڑا فائدہ اطمینان قلب کی دولت ہے جو اس جہان پرشور میں کبریت احمر سے کم نہیں ہے۔
"جو ایمان لاتے ہیں اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سن لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔" (الرعد۔ ۲۸)

مال و دولت، جاہ و منصب، حکومت و اقتدار، دنیا کی کوئی چیز انسان کو حقیقی سکون و اطمینان سے ہم کنار نہیں کر سکتی۔ صرف اللہ کی یاد، دلوں کو حقیقی سکون، اطمینان اور طمانیت سے ہم آغوش کرتی اور کر سکتی ہے۔

دوسرا بڑا فائدہ

اگر شعور کے ساتھ کسی کی زبان اللہ کے ذکر سے تر ہے تو وہ نہ صرف زبان کے گناہوں سے بلکہ دوسرے اعضاء و جوارح کے گناہوں سے بچ جائے گا۔ کیا خدا کے ذکر سے تر زبان، کسی کی غیبت کر سکتی ہے؟ کسی پر بہتان جوڑ سکتی ہے؟ کسی کو گالی دے سکتی ہے؟ جھوٹ بول سکتی ہے؟ جھوٹی گواہی دے سکتی ہے؟ فحش گوئی کر سکتی ہے؟

ذکر الٰہی کا سب سے بڑا صلہ

ذکر الٰہی کا سب سے بڑا صلہ یہ ہے کہ بندہ جب اپنے مالک کو یاد کرتا ہے تو مہربان مالک بھی اسے یاد کرتا ہے۔ اگر وہ تنہائی میں اپنے محبوب حقیقی کو یاد کرے تو وہ تنہائی میں اس کو یاد کرتا ہے اور اگر بندہ اس کو کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو وہ اس سے بہتر مجمع میں اپنے بندے کو یاد کرتا ہے۔

ع ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

ایک حدیث قدسی میں اللہ رب العزت کی طرف سے اس صلے کا اعلان اس کے ذکر کی اتنی بڑی ترغیب ہے کہ اس سے بڑی کسی ترغیب کا کوئی مومن تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آخرت میں جو صلہ ملے گا وہ تو ملے گا ہی، دنیا میں اس صلے کے تصور سے روح مومن جھوم اٹھتی ہے، وجد کرتی ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔ سبحان اللہ العظیم۔

MONTHLY Regd. No. D.NO. (DN)-348

ZINDGI-E-NAU

1525, SUIWALAN R.N. NO. 42893/84

NEW DELHI-110002 AUGUST 85
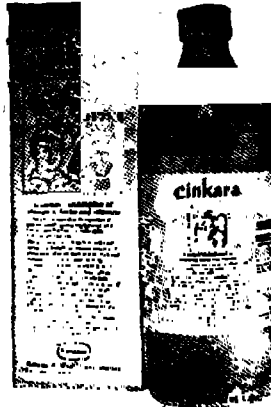
دہلی آرٹ پریس میں چھپا۔

ماہنامہ

زندگیٔ نو

نئی دہلی

قیمت:۔
تین روپے پچاس پیسے

تفہیمات حصہ اول

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(مولانا مودودی کے چند مقالات و مضامین کا مجموعہ)

توحید و رسالت پر دلوں کو مطمئن کرنے والے دلائل • اتباع و اطاعت رسولؐ پر سیر حاصل بحث • امت مسلمہ کا مقصد وجود اور اسلام کے تقاضے • منکرین حدیث و سنت کے حقیقی خدوخال • آزادی و رواداری کا صحیح مفہوم • اسلامی لٹریچر میں ایک بیش قیمت کتاب • آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت۔

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

افادات شاہ ولی اللہ دہلویؒ
ترجمہ: مولانا صدرالدین اصلاحی

فقہی مسائل میں اختلاف کیوں؟ • اختلافات کی نوعیت اور ان کا حل • اتحاد بین المسلمین کے لیے ایک عظیم پیش کش • آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت۔

شہادتِ حق

• امت مسلمہ کا مقصد وجود کیا ہے • اسلام کو مقصد زندگی بنانے کے تقاضے • امت مسلمہ کی انقلابی حیثیت • اصلاح امت کے لیے ایک انقلاب انگیز کتاب

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی
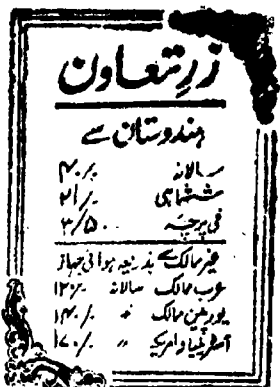
ماہنامہ نئی دہلی

زندگی نو

مدیر: سید احمد قادری

جلد - ۳	ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۵ء	شمارہ - ۳

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے

جناب سید احمد عروج قادری، ادارہ "زندگی نو"، گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یو۔پی)

پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت فرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۶۳۷۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

کتنی رحمت ـــــ کتنی زحمت

انڈونیشیا سے تیونیشیا تک کوئی اسلامی یا مسلمان ملک ایسا نہیں جس میں اعلاءِ کلمۃ اللہ اور تنفیذ شریعت کی جدوجہد نہ ہو رہی ہو۔ یہ اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ یہ وہ رحمت ہے جو آج سے پچاس پہلے نہ دیکھنے میں آتی تھی، نہ سننے میں۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے بعض نیک بندوں کے دلوں میں زندہ احساس پیدا کیا، وہ اٹھ کھڑے ہوئے، منزل کی طرف چل پڑے۔ لوگ ساتھ آتے گئے، کارواں بنتا گیا۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ رحمت ایمان کے ساتھ زحمت امتحان بھی لگی رہتی ہے۔ یہ زحمت بھی اتنی بڑی ہے کہ انڈونیشیا سے تیونیشیا تک کوئی حکمراں ٹولہ ایسا نہیں ہے جو داعیان حق پر مصائب کے پہاڑ نہ توڑ رہا ہو اور جو نفاذ شریعت کی راہ میں سنگ گراں کی طرح حائل نہ ہو۔ اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ ان ممالک میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں علماء و مشائخ کا ایک موثر طبقہ، حکمراں ٹولے کا ساتھ نہ دے رہا ہو۔ داعیان حق چکی کے دو پاٹ کے درمیان پس رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جو رحمٰن و رحیم ہے دوسری بڑی رحمت یہ ہے کہ اس نے داعیان حق کو توفیق استقامت دے رکھی ہے۔ ظلم و ستم کی آندھی انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی اور مصائب و آلام کا سیلاب ان کے قدم اکھاڑ نہیں سکتا۔ وہ آندھی کے رخ پر اپنے چراغ جلائے ہوئے ہیں اور تھپیڑے کھا کھا کر اپنے قدم آگے بڑھا رہے ہیں۔ کھلے ہوئے منکرین حق سے مقابلہ آسان ہے لیکن چھپے ہوئے دشمنان حق سے مقابلہ مشکل ہے اور داعیان حق اسی مشکل میں گھرے ہوئے ہیں۔

ان مسلمان ملکوں میں گمراہی کی ہر آواز بلند ہو سکتی ہے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے، بلکہ حکمرانوں کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے لیکن ہدایت اور دعوت حق کی آواز بلند نہیں کی جا سکتی اس کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ ان مسلمان ملکوں میں ہر طرح کی برائی۔ خواہ اس کا تعلق عقیدے سے ہو یا عمل سے، فروغ پا رہی ہے اور فروغ پا سکتی ہے لیکن عقیدہ و عمل کی اصلاح کا راستہ روکنے کی سعی بلیغ جاری ہے۔ اس صورت حال پر حیرت کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ہر ملک کا حکمران ٹولہ سکولر اسلام کا قائل ہے وہ مغربی تہذیب و تمدن کا پروردہ اور دلدادہ ہے۔ وہ اسلام کو عیسائیت کی طرح ایک مذہب سمجھتا ہے یا بنا دینا چاہتا ہے جس طرح اس وقت عیسائیت چرچ میں بند ہے اسی طرح وہ اسلام کو مسجد میں بند رکھنا چاہتا ہے۔ ان ممالک میں حکمران ٹولہ کی پشت پناہی وہاں کی فوجیں کرتی ہیں سپاہیوں کے نام مسلمانوں جیسے ہیں لیکن وہ پوری طرح مغرب زدہ ہیں۔ فوج کا کام ملک اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہے لیکن مسلمان ملکوں میں اس کا اصل کام اس نظام کی حفاظت ہے جو حکمران ٹولے نے نافذ کر رکھا ہے۔ اس کی عبرت انگیز مثال ترکی ہے۔ وہاں جب اسلامی تحریک اپنے قدم جمانے لگی اور ایسی پارٹیاں برسر اقتدار آنے لگیں جو اسلام پسند تھیں اور توقع یہ پیدا ہونے لگی کہ شاید ترکی ہی وہ پہلا ملک ہو جہاں اسلام غلبہ حاصل کرے تو وہاں کی فوج کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے خطرے کو بھانپ لیا اور اس نظام حکومت کی حفاظت کے لیے فوج بیرکوں سے نکل آئی جسے اتاترک جیسے ملحد نے نافذ کیا تھا اس نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اب فوج نے خود ایک دستور بنا کر اپنی زیر نگرانی ایک سول حکومت قائم کر دی ہے یہی حال پاکستان کا ہے، بنگلہ دیش کا ہے، مصر کا ہے۔ ان ملکوں کا ذکر بے کار ہے جن میں ملوکیت اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے یا جہاں ملحد اور بے دین پارٹیاں برسر اقتدار ہیں۔

بظاہر مسلمان ملکوں کی یہ ایک تاریک تصویر ہے لیکن فی الواقع یہ اتنی تاریک نہیں ہے جتنی نظر آتی ہے اس تاریکی میں جگہ جگہ چراغ جل رہے ہیں اور پوری توقع ہے کہ یہی چراغ، آفتاب بن جائیں گے۔ یہ زحمتیں اور مزاحمتیں، آزمائشیں ہیں جس دن داعیان حق اس آزمائش میں کھرے ثابت ہو جائیں گے اور آزمائش کی مدت پوری ہو جائے گی۔ اللہ کی مدد آجائے گی۔ متیٰ نصر اللہ کے جواب میں اَلا اِنَّ نصر اللہ قریب کا کلمہ جاں نواز داعیان حق کے کانوں میں رس گھول رہا ہوگا۔

(سید احمد قادری)

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ ۝

ترجمہ:۔ اے آل داؤد شکر گزاری کے ساتھ عمل کرو۔ اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں ———— (السبا۔۱۳)

تشریح:۔ سورۂ السبا میں حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام پر اپنی نعمتوں اور احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے آل داؤد کو شکر گزاری کے ساتھ عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ شکر کی مختصر توضیح کے لیے اس آیت کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ قرآن میں لفظ "شکر" اسی آیت میں استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے مشتقات اور صیغے تو بیسیوں آیتوں میں آئے ہیں لیکن لفظ شکر اسی آیت میں ہے۔ شکر کے معنے میں دوسرا لفظ "شُکور" (پیش کے ساتھ) سورۂ الفرقان اور الدہر میں آیا ہے۔

"وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا، ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے چاہے یا شکرگزار ہونا چاہے۔" (الفرقان۔۶۲)

"ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ"

(الدھر۔ ۹)

"شکر" قرآن کریم کا ایک وسیع المعنے اور وسیع الاطراف لفظ ہے۔ اس تشریح میں میرا مقصد تمام معانی اور تمام اطراف پر سیر حاصل گفتگو کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ذیل کے چند نکات کی مختصر توضیح مقصود ہے:۔

(۱) شکر کے معنی (۲) شکر کی ضد (۳) شکر کی قسمیں (۴) اللہ کا شکر (۵) بندوں کا شکر۔ (۶) شکر کی نسبت اللہ کی طرف (۷) شکر کی نسبت بندوں کی طرف (۸) صبر اور شکر کا اجتماع

(۹) امتحان شکر (۱۰) شکر کا دنیوی صلہ۔

شکر کے معنے

"ایک معنے یہ ہیں تصور النعمۃ واظہارھا" (نعمت کا تصور اور اس کا اظہار) اس جانور کو جو فربہ ہو۔ دابۃ شکور کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی فربہی سے اپنے مالک کی مہربانی اور اس کے احسان کا اظہار کرتا ہے یعنی یہ کہ وہ اس کو اچھا کھلاتا پلاتا اور اس کی اچھی دیکھ ریکھ کرتا ہے۔ دوسرا معنے "الامتلاء من ذکر المنعم علیہ" محسن کے ذکر سے زبان کا تر ہونا اور دل کا مملو ہونا) عین شکری (وہ آنکھ جو آنسوؤں سے بھری ہوئی ہو) (مفردات راغب) ان دونوں معنوں کے لحاظ سے اللہ کا شکر کا یہ مفہوم مستنبط ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ کی نعمت کا احساس ہو اور وہ اس کا اظہار بھی کرے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔) نیز یہ کہ انسان کی زبان اللہ کے ذکر سے تر اور اس کا دل اس کی نعمت کا معترف رہے۔

شکر کی ضد

اس کی ضد کفر ہے۔ کفران نعمت کے معنے ہیں۔ مفردات میں ہے۔ ویضادہ الکفر وھو نسیان النعمۃ وسترھا" یعنی شکر کی ضد کفر ہے اور یہاں اس کے معنے ہیں نعمت کو بھول جانا اور اس کو چھپانا۔ سورۂ زمر آیت ۷ میں ہے:۔

"اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کا رویہ پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس کے شکر گزار رہو گے تو اس کو پسند کرے گا۔"

اس آیت میں کفر، کفران نعمت اور ناشکری کے معنے میں استعمال ہوا ہے کیونکہ اس کے بعد ہی شکر کا ذکر ہے۔ اس طرح کی متعدد آیتیں قرآن کریم میں ہیں۔

شکر کی قسمیں

شکر کی تین قسمیں ہیں۔ زبان کا شکر۔ دل کا شکر۔ اعضاء و جوارح کا شکر۔ مفردات امام راغب میں ہے:۔

والشکر ثلثۃ اضرب۔ شکر القلب وھو تصور النعمۃ وشکر اللسان وھو الثناء علی	اور شکر کی تین قسمیں ہیں۔ دل کا شکر یہ نعمت کا احساس ہو اور زبان کا شکر یہ محسن کی مدح و ثنا ہے اور باقی تمام اعضاء کا شکر یہ نعمت کی مکافا

المنعم وشکر سائر الجوارح وھو ہے بقدر استحقاق منعم

مکافاۃ النعم بقدر استحقاقہ

مکافات نعمت کا مطلب یہ ہے کہ محسن کے احسان کا حق ادا کیا جائے۔ جس درجہ کا محسن ہوگا اسی درجہ کا حق احسان ہوگا۔

اللہ کا شکر

تمام نعمتوں کا حقیقی منعم و محسن اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس کا شکر ہر انسان پر واجب ہے۔ اللہ کا سب سے بڑا شکر اس پر ایمان لانا ہے اور یہ وہ شکر ہے کہ اس کے بغیر کوئی شخص اللہ کے غضب اور اس کی دوزخ سے نجات نہیں پا سکتا۔ شکر کی ضد کفرانِ نعمت ہے اور سب سے بڑی ناشکری اس پر ایمان نہ لانا ہے اور یہ ناشکری وہ حقیقی کفر ہے جو انسان کو ابدی لعنت میں گرفتار کر دیتا ہے۔

جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں پھر کوئی مہلت دی جائے گی۔ (البقرہ: ۱۶۱-۱۶۲)

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ نے کفار و مشرکین کو اپنی نعمتیں یاد دلائی ہیں اور پھر ان سے سوال کیا ہے۔ أَفَلَا يَشْكُرُونَ (پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے؟) سورۂ یٰس میں دوبار یہ سوال کیا ہے (آیۃ ۳۵-۷۳) کہیں لعلکم تشکرون کا صیغہ ہے کہیں لعلھم یشکرون کا، کہیں قلیلاً ما تشکرون کہیں فلولا تشکرون اور کہیں ولکن اکثر الناس لا یشکرون۔ ان تمام مقامات میں جو دعوت ان کو دی گئی ہے وہ دعوتِ توحید ہے۔ اللہ پر ایمان لانا اور اسی کو الٰہ واحد تسلیم کرنا۔ یہ ہے اللہ رب العزت کا وہ شکر جس کے بغیر نہ کوئی انسان دائرۂ کفر و شرک سے باہر نکل سکتا اور نہ اللہ کی رحمت و جنت کا مستحق ہو سکتا ہے۔

انبیاء کرام کی دعوت کا ایک جز

انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی قوموں کو توحید اور بندگیِ رب کی جو دعوت دی ہے اس کا ایک جز دعوتِ شکر گزاری بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:-

"اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو"
(العنکبوت - ۱۷)

عبادت کا لازمی تقاضا

اللہ کے شکر کو اس کی عبادت کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے:۔

بس اے لوگو! اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو۔ اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ (النحل-۱۱۴)

یہی مطالبہ مسلمانوں سے بھی کیا گیا ہے:۔

اے ایمان والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ (البقرہ:۔۱۷۲)

شکر کو حکمت کا اولیں ثمرہ قرار دیا گیا ہے

اللہ نے حضرت لقمان کو حکمت عطا کی اور ساتھ ہی اپنا شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔

ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار رہو۔ جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو ناشکری کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز ہے اور آپ سے آپ محمود ہے۔ (لقمان ۱۲)

حضرت سلیمانؑ نے توفیق شکر کی دعا مانگی

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو محیر العقول نعمتیں عطا فرمائی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ حشرات الارض کی زبان سمجھتے تھے۔ چیونٹیوں کے سردار کی گفتگو سنکر انھوں نے یہ دعا مانگی۔

اے میرے رب مجھے سنبھالے رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تونے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔ (النمل-۱۹)

اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں

قرآن کریم نے یہ حقیقت بھی انسانوں کے سامنے رکھ دی ہے کہ اللہ کی نعمتیں اور اس کے احسانات بے شمار ہیں:۔

"اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے"۔ (ابراہیم-۳۴)

"اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا ہے اور رحیم ہے۔ (النحل:۱۸)

اس آیت میں غفور اور رحیم کی دو صفتیں قابل غور ہیں۔ کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ناشکروں کی

تنبیہ کے لیے بھی ہیں اور شکر گزاروں کی تسکین کے لیے بھی۔ تنبیہ یہ ہے کہ جس مالک کے اپنے بندوں پر اتنے احسانات ہیں کہ وہ ان کا احاطہ نہیں کر سکتے، جن کی زندگیاں گود سے گور تک اس کے احسانات میں ڈھکی ہوئی ہیں اور جس نے ان کے بقا و ارتقاء کے تمام سامان مہیا کر رکھے ہیں کیا ان کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ ایسے مہربان مالک کی بغاوت پر آمادہ ہوں، اس کے حقوق میں دوسروں کو شریک کریں اور ناشکری کے رویے پر اڑے رہیں۔ ان کو متنبہ رہنا چاہیے کہ وہ غفور الرحیم ہے اس لیے وہ ان کو توبہ و اصلاح کی مہلت دے رہا ہے ـــــ شکر گزاروں کی تسکین یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس کی بے شمار نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے لیکن وہ غفور اور رحیم ہے اس لیے ان کی کوتاہیوں سے درگذر کرے گا اور انہیں اپنے دامن رحمت میں چھپا لے گا۔

نعمتیں اللہ کی ہیں بے شمار کوئی گن سکتا نہیں ان کو کبھی

ہر نیکی شکر ہے

پہلے گزر چکا کہ شکر کی تین قسمیں ہیں اور نیکی کا ہر کام اللہ کی نعمت ہے خواہ اس کا تعلق قلب سے ہو یا زبان سے یا دوسرے اعضاء و جوارح سے۔ اس نعمت کا شکریہ اس کو انجام دینا ہی ہے۔ اس لیے تمام عبادتیں شکر ہیں اور ہر نیکی جو مسلمان خالصاً لوجہ اللہ کرتا ہے، شکر ہے۔ رمضان کے روزوں کو نعمت قرآن کا شکریہ، خود اللہ تعالیٰ نے قرار دیا ہے ولعلکم تشکرون (اور تاکہ تم شکر گذار ہو) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں قرآن کی جو عظیم الشان نعمت عطا کی ہے۔ رمضان کے روزے اس کا شکریہ بن جائیں۔ عبدالرحمٰن سلمی نے کہا:۔

"نماز شکر ہے، روزے شکر ہیں اور ہر نیک کام جو تم اللہ کے لیے کرتے ہو، شکر ہے اور افضل شکر اللہ کی حمد ہے۔" (مختصر تفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن جریر)

بندوں کا شکر

اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ایسی ہیں جو بندوں کو دوسرے بندوں کے واسطے اور ذریعے سے ملتی ہیں اس لیے ان واسطوں اور ذریعوں کا بھی علیٰ قدر مراتب (جس کا جو درجہ و مرتبہ ہو) شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بندوں میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ کیونکہ ہر انسان کو اس کے وجود اور ہستی کی نعمت، والدین ہی کے واسطے سے ملتی ہے۔ والدین ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ ان ہی دونوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے:۔

اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا۔ میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ (لقمٰن-۱۴)

والدین کے حقوق اور ان کا شکریہ ایک مستقل موضوع ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل ہم یہاں پیش نہیں کرتے اس کے لیے سورۂ لقمان اور سورۂ بنی اسرائیل کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ احادیث نبوی میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔

بندوں کا شکرادا کرنے کی اہمیت

ایک انسان جب دوسرے انسان پر کوئی احسان کرتا ہے تو شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ محسن کا شکریہ ادا کیا جائے اور دین میں اس کی اہمیت یہ ہے کہ جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا اللہ اس سے اپنے شکریے کو بھی قبول نہیں کرتا۔ امام ترمذی نے ابواب البر والصلۃ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا شکر گذار بھی نہیں۔

ھذا حدیث صحیح (یہ صحیح حدیث ہے)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابی سعید الخدری قال قال	ابوسعید نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	وسلم نے فرمایا جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہیں
من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ	کیا اس نے اللہ کا شکریہ ادا نہیں کیا

اس باب میں اشعث بن قیس اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی ہے۔ ان حدیثوں سے لوگوں کے شکریے کی اہمیت پوری طرح واضح ہوگئی۔ قرآن کریم میں ایک کلیہ کے طور پر کہا گیا ہے۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان (نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے) جانور بھی اپنے محسن کا احسان مانتے ہیں اب اگر انسان اپنے محسن کا احسان نہ مانے تو وہ جانور سے بھی بدتر ہوا۔

شکریہ ادا کرنے کے طریقے

کسی کے احسان کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ احسان کیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ہدیۃً کوئی چیز بھیجے تو جواب میں ہدیۃً اس کے یہاں کوئی چیز بھیجی جائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول

فرماتے تھے اور ہدیہ دینے والے کو اس کا صلہ بھی دیا کرتے تھے۔ اگر آدمی احسان کا بدلا اسی طرح کا احسان سے نہ دے سکے تو زبان سے اپنے محسن کی تعریف کرے اور لوگوں میں اس کے احسان کا تذکرہ کرے۔ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شکریے کی ایک مختصر دعا بھی سکھائی ہے۔

حضرت اسامہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

جس کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے اور وہ نیکی کرنے والے سے کہے جزاک اللہ خیرا (اللہ تمہیں اس کا اچھا بدلہ دے) تو اس نے مبالغے کے ساتھ اپنے محسن کی ثنا کی۔ (جمع الفوائد بحوالہ ترمذی)

دوسری احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محسن کی مدح و ثنا کو اس کا شکریہ قرار دیا ہے۔ جزاک اللہ خیرا کی مختصر سی دعا کو اگر کوئی سمجھے تو یہ اتنا بڑا بدلہ ہے کہ قیمتی سے قیمتی دنیوی ہدیہ بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرمائے اور اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے تو اس کی قیمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

شکر کی نسبت اللہ کی طرف

شاکر اور شکور اللہ تعالیٰ کی صفت بھی ہے۔ شکر کی نسبت جب اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مطلب "قدر دانی اور ثواب رسانی" ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماں برداری اور نیک کام کی قدر کرتا اور اس کا انمول صلہ دیتا ہے۔ سورہ البقرہ میں ہے:۔

"یقیناً صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں لہذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کر لے اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔" (آیۃ ۱۵۸)

سورۂ نساء آیت، ۱۴۷ میں انسان کے شکر اور اللہ کے شکر کو ایک ہی جگہ بیان کیا گیا ہے۔

"آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے۔ اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو، اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔" (نساء)

اللہ کے لیے شکور کا لفظ بھی متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝ (فاطر:۳۴) — یقیناً ہمارا رب بہت بخشنے والا اور بہت قدر فرمانے والا ہے۔

شکر کی نسبت بندوں کی طرف

بندوں کو شاکر اور شکور کہنے کا مطلب "اعتراف نعمت اور احسان مندی" ہوتا ہے۔ یعنی بندہ اپنے مالک کی نعمتوں اور اس کے احسانات کا معترف اور جذبۂ شکر و سپاس سے سرشار ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:۔

واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا' اللہ کا مطیع فرمان اور یکسو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ (النحل۔ ۱۲۰-۱۲۱)

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:۔

"اور نوح ایک شکر گزار بندہ تھا۔" (بنی اسرائیل-۳)

بیک وقت صبر و شکر کا اجتماع

صبر کا تعلق عام طور پر بلا و مصیبت سے ہوتا ہے اور شکر کا عافیت و آرام سے۔ لیکن ایک چیز دو مختلف اعتبارات سے بیک وقت مصیبت بھی ہوتی ہے اور نعمت بھی۔ مثلاً مومن مسلم پر اللہ کی طرف سے جو مصیبت آتی ہے وہ دنیا کے لحاظ سے مصیبت ہوتی ہے اور اجر آخرت کے اعتبار سے نعمت ـــــ ایسے موقع پر صبر اور شکر کا اجتماع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے بعض ایسے بندے بھی ہوتے ہیں جو غلبۂ محبت الٰہی میں مصیبت سے لذت حاصل کرنے لگتے ہیں۔ اسی کیفیت کا اظہار ایک شاعر نے کیا ہے۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تری تیغ سے ہلاکت' نہ بنے نصیب دشمن ۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائے

اور یہی موقع ہے جس کے لیے کہا گیا ہے: "ہر چہ از دوست می رسد نیکو است" دوست کی طرف سے جو چیز بھی پہنچے وہ اچھی ہے۔ قرآن کریم میں صبار اور شکور کا اجتماع شاید اسی کی طرف اشارہ ہے:۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (ابراہیم-۵) ۔۔۔ ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔

یہ بات ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں' ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ روایت کی ہے کہ سخت ترین مصیبتیں انبیاء

پر آتی ہیں۔ اس کے بعد اللہ کے نیک بندوں (صالحین) پر، اس حدیث کا یہ ٹکڑا قابل غور ہے۔

ولقد کان احدھم اشد فرحا بالبلاء	تم میں کا کوئی فرد عطاء و نعمت سے جتنا خوش
من احدکم بالعطاء	ہوتا ہے ان میں کا ایک فرد اس سے زیادہ
(مسند امام اعظم مع شرح ملا علی قاری)	بلا و مصیبت سے خوش ہوتا تھا

بلا و مصیبت انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے رفع درجات کا موجب اور اولیاء کے لیے کفارۂ سیئات کا وسیلہ ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم باب الشکر میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے

"حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ہر مصیبت جو مجھ پر آئی اللہ تعالیٰ کے چار انعامات اپنے ساتھ لائی۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق میری دنیا سے تھا دین سے نہ تھا، دوسرا یہ کہ اس مصیبت سے کوئی بڑی مصیبت بھی آسکتی تھی مگر اللہ کے کرم سے چھوٹی آئی، تیسرا یہ کہ میں قضا و قدر پر راضی رہا اور چوتھا یہ کہ میں اس پر اجر و ثواب کا امیدوار رہوں"

امتحان شکر

شکر کی آزمائش، صبر کی آزمائش سے زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔ اس تشریح کی ابتدا میں سورہ سبا کی جو آیت پیش کی گئی ہے اس کا دوسرا فقرہ یہ ہے وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (اور میرے بندوں میں شکر گذار تھوڑے ہی ہیں۔)

اس فقرے کے بارے میں امام راغب نے لکھا ہے:۔

"اس میں تنبیہ ہے اس بات کی کہ شکر الٰہی کا پورا حق کرنا بہت مشکل ہے اس لیے قرآن میں صرف دو نبیوں کو اس صفت سے متصف قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح کی ہے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام"

حضرت نوحؑ کو جیسا کہ اوپر گذرا سورۂ بنی اسرائیل میں عبداً شکوراً (شکر گزار بندہ) اور حضرت ابراہیم کو سورۂ النحل میں شاکراً لانعمہ (اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار) کہا گیا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ دوسرے انبیاء کرام کی شکر گزاری کم تھی بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ ان دونوں نبیوں کی اس صفت کا ذکر کر کے انہیں ایک "امتیاز" عطا کیا گیا ہے۔ قوم لوط پر جب عذاب آیا تو اللہ نے آل لوط کو عذاب سے بچا لیا۔ اس کو اللہ نے اپنا فضل قرار دیا اور اس کے بعد کہا۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ　　　ایسا ہی صلہ ہم دیا کرتے ہیں ان کو جو شکر گزار رہتے ہیں　(القمر۔ ۳۵)

اس فقرے کی تشریح میں مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے :-

كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ میں حضرت لوطؑ کی غیر معمولی صفت شکر کی داد بھی ہے اور اس کا اعلان عام بھی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عنایت صرف حضرت لوط ہی کے لیے خاص نہ تھی بلکہ آج بھی جو لوگ اس کے شکر کرنے والے ہوں گے وہ اس کی عنایت خاص کے حق دار ہوں گے ؟ اس کا دامن رحمت بہت وسیع ہے

(تدبر قرآن ج ۷ ص ۱۰۸)

شکر کا دنیوی صلہ

اللہ تعالیٰ آخرت میں اپنے شکر گزار بندوں کو جو اجر عطا فرمائے گا اور جن انعامات سے نوازے گا وہ تو اپنی جگہ ہیں، دنیا میں اس کا صلہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا حقیقی شکر یہ ادا کرنے سے اس کی نعمتوں اور الطاف و عنایات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نعمتوں کا حقیقی شکر یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں صرف کیا جائے اس کی معصیتوں اور نافرمانیوں میں صرف نہ کیا جائے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے :-

اور یاد رکھو تمہارے رب نے خبر کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار رہوگے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور کفران نعمت کروگے تو میری سزا بہت سخت ہے اور موسےٰ نے کہا اگر تم اور وہ سارے لوگ جو روئے زمین پر ہیں، ناشکری کروگے تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑوگے اور وہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔　　(۷-۸)

شکر گزاری پر انعامات میں اضافے کا یہ وعدہ قیامت تک تمام شکر گزاروں کے لیے ہے اور ناشکری پر سخت عذاب کی یہ دھمکی بھی قیامت تک تمام ناشکر گزاروں کے لیے ہے۔

اللہ کی سب سے بڑی نعمت اس کی دی ہوئی شریعت ہے۔ اس کا شکر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اس کی حفاظت کی جائے اور اس کے نفاذ کی جان توڑ کوشش کی جائے۔ اس وقت دنیا میں پھیلا ہوا گھنگور اندھیرا اس کے بغیر چھٹ نہیں سکتا۔

گھنگور اندھیرا چھایا ہے　　یہ دھندلی شمعیں تیز کرو
منزل ہے کٹھن اور دور بھی ہے　　گھوڑوں کو ذرا مہمیز کرو

قصّۂ یوسفؑ

ہے

داستانِ رسول

جناب ڈاکٹر محمد ذکی، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حضرت یوسفؑ کی سرگذشت، ان کے بچپن اور جوانی کے حالات، ان کی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے جن صبر آزما حالات سے گذرے اور پھر ان پر جو انعامات ہوئے ہیں وہ نہایت حسین پیرایہ میں سورۂ یوسف میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ان کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ قصۂ یوسف دراصل داستان رسول ہے۔ اور یہ بھی گویا آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اقدس کا ایک نہایت ہی درخشاں باب ہے۔

آئیے اس نقطہ نظر سے سورۂ یوسف کا مطالعہ کریں۔

قصۂ یوسف کے اہم اجزاء

حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوبؑ کے مختلف بیویوں سے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں حضرت یوسفؑ اور ان کے ایک بھائی (بن یمین) ایک بیوی سے اور باقی دوسری بیویوں سے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد کو بہت زیادہ محبوب تھے اور سب سے چھوٹے تھے اور ان پر خاص شفقت تھی۔ اسی بنا پر دوسرے بھائی ان پر حسد کرتے اور ان سے جلتے تھے۔

ایک دن حضرت یوسف نے اپنے والد کو اپنا ایک خواب سنایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ اس کی تعبیر واضح تھی (کیونکہ گیارہ ستاروں سے مراد ان کے گیارہ بھائی ہی تھے) اس لیے حضرت یعقوبؑ نے تاکید کر دی کہ یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ او رجل جائیں گے

اور تمہارے دن آرام سے گزر جائیں گے۔

ادھر ان کے بھائیوں نے طے کیا کہ کسی نہ کسی طرح یوسف کو اپنے راستے سے ہٹا دیں تاکہ والد صاحب کی نظرِ التفات ان ہی پر مرکوز ہو جائے۔ ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ قتل کرنے کی بجائے یوسفؑ کو کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو، کوئی آتا جاتا قافلہ سے لے جائے گا اور پھر توبہ تِلّا کر لینا۔

چنانچہ انھوں نے والد صاحب سے کہا کہ ہمارے ساتھ یوسف کو بھیج دیجیے۔ کچھ کھیل کود لے گا اور اس بہانے جا کر انھوں نے ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا اور والد صاحب کے سامنے روتے ہوئے آئے کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ حضرت یعقوب سمجھ گئے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ مگر انھوں نے صبر و ضبط سے کام لیا۔

ادھر ایک قافلہ کا گذر ہوا، کسی نے پانی کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ اس کے سہارے یوسفؑ باہر نکل آئے۔ قافلہ والوں نے انہیں "بازارِ مصر" میں غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ خریدا عزیزِ مصر نے، لیکن ان کی قدر کی

حضرت یوسفؑ جوان ہوئے، بے حد حسین تھے۔ عزیزِ مصر کی بیوی نے ان پر ڈورے ڈالے مگر انھوں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ بالآخر اس عورت نے ایک موقع پر کمرہ بند کر کے اصرار کیا لیکن حضرت یوسف اس کی دعوتِ معصیت ٹھکرا کر دروازے کی طرف بھاگے۔ عزیزِ مصر کی بیوی نے پیچھے سے دامن کھینچا جو پھٹ گیا عین اسی وقت عزیزِ مصر سامنے آ گیا۔ عورت نے الزام حضرت یوسف پر لگایا، لیکن شہادت اس کے خلاف تھی چنانچہ حضرت یوسف کی پاکدامنی ثابت ہو گئی۔

اس کے بعد مصر کی دوسری عورتوں نے بھی حضرت یوسف کو متوجہ کرنا چاہا مگر بالآخر انھوں نے بھی ان کی عظمت اور پاکدامنی کا اعتراف کیا لیکن عزیزِ مصر کی بیوی نے ناکامی کا بدلہ اس طرح لیا کہ حضرت یوسف کو قید خانہ میں ڈلوا دیا۔ جہاں وہ کئی سال رہے اور موقع ملنے پر اسلام کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔ اسی دوران بادشاہِ مصر نے ایک خواب دیکھا اور اس کی تعبیر جاننا چاہی۔ ماہرین نہ بتا سکے۔ حضرت یوسف کی طرف رجوع کیا گیا۔ انھوں نے صحیح تعبیر بتا دی جس میں اشارہ تھا کہ آئندہ ملک میں قحط پڑنے والا ہے۔ بادشاہ نے حضرت یوسف کو قید سے باعزت رہا کیا، اپنا مقرب خاص بنایا اور حکومت حضرت یوسف کے سپرد کر دی۔ ملک میں قحط پڑا مگر حضرت یوسف نے بڑی مقدار میں غلہ جمع کر رکھا تھا جس کی وجہ سے قحط کا مقابلہ کیا گیا۔ غلہ کی کمی کی وجہ سے حضرت یعقوب کے بیٹے بھی مصر میں غلہ لینے آئے۔ حضرت یوسف نے انہیں پہچان لیا لیکن ظاہر

نہیں کیا۔ تیسری بار جب آئے تو باتوں باتوں میں بھائیوں کو معلوم ہو گیا کہ جو صاحب اختیار و اقتدار ان کو غلہ دیتا رہا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہا ہے وہ کوئی اور نہیں وہی بھائی ہے جسے کبھی انھوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ انھوں نے اظہار ندامت کیا لیکن حضرت یوسف نے یہ بھی گوارا نہ کیا اور ان کی انتہائی دل جوئی کی۔ اس کے بعد حضرت یوسف نے اپنے والدین کو بھی مصر بلا لیا اور وہیں ان کے خاندان کے تمام افراد بس گئے۔ پھر جب حضرت یوسف تخت پر بیٹھے تو ان کے بھائی اور والدین نے بھی تعظیم میں سر جھکا دیے اور اس طرح ان کا خواب سچا ہو گیا جو انھوں نے بچپن میں دیکھا تھا۔

اس بارے میں قرآن کا چیلنج — یہ قصہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا؟ اس قصہ کا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اقدس سے کیا تعلق ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آپ کو یہ تفصیلی معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں؟ اس کا جواب خود قرآن اسی سورہ کی ابتدائی آیتوں میں یہ دے رہا ہے۔

"یہ آیتیں ہیں روشن و واضح کتاب کی۔ ہم نے اسے اس شکل میں اتارا کہ عربی زبان کا قرآن ہے، تاکہ تم سمجھو بوجھو۔

(اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی) سرگذشتیں سناتے ہیں اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو انہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگذشتوں سے) بے خبر تھے"

اور اس قصے کے اختتام پر اسی حقیقت پر پھر زور دیا گیا ہے کہ:۔

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی تجھ پر ہم وحی کر رہے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ) جس وقت یوسف کے بھائی سازش میں مصمم ہو گئے تھے اور پوشیدہ تدبیریں کر رہے تھے تو تم اس وقت کچھ ان کے پاس کھڑے نہ تھے (کہ سب کچھ دیکھ سن لیا ہو۔

دراصل اس قصہ کا معاملہ اس لیے اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ یہودیوں نے مشرکین مکہ کی معرفت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تو شام کے علاقہ میں آباد تھی پھر بنی اسرائیل مصر کس طرح پہنچ گئے۔[1]

یہ سوال کیا گیا تھا اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اسی سورہ (آیت ۷) میں ارشاد ہے:۔

---

[1] حواشی مولانا عثمانی

جو لوگ (حقیقت حال) پوچھنے والے ہیں (اگر وہ سمجھیں تو) ان کے لیے یوسف اور اس کے بھائیوں کے معاملہ میں (موعظت و عبرت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

یہ سوال کیوں کیا گیا تھا؟ ظاہر ہے آپؐ کا امتحان لینے کے لیے کیا گیا تھا۔ چونکہ اہل عرب اس قصہ سے ناواقف تھے۔ اس کا نام و نشان تک ان کے ہاں کی روایات میں نہ پایا جاتا تھا، اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی اس سے پہلے کبھی ان کا (یعنی حضرت یوسف کا) ذکر نہ سنا گیا تھا اس لیے انہیں (یعنی یہود کو) توقع تھی کہ آپ یا تو اس کا مفصل جواب نہ دے سکیں گے، یا اس وقت ٹال مٹول کر کے بعد میں کسی یہودی سے پوچھنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح آپ کا بھرم کھل جائے گا۔"

سوال کی نوعیت اور اس کے پس منظر سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سوال یہودیوں ہی کی طرف سے ہوا تھا، کیونکہ نزول قرآن سے پہلے تورات ہی واحد کتاب تھی جس میں اس سوال کا جواب مل سکتا تھا۔ اور یہ بات بھی بالکل ظاہر ہے کہ یہودیوں کو مختلف قرائن کی بنا پر یقین ہوگا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سوال کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ اس لیے اگر آپ خاموش رہے تو انہیں یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ اگر آپ پر وحی آتی ہے تو اس کا جواب کیوں نہیں دیتے اور اگر (جیسا کہ ان کا خیال تھا) کوئی اور سبب بتایا تو خود یہود اصل واقعہ بتا کر گویا آپ کی غلطی واضح کر دیں گے اور اس طرح آپ کی رسالت کے انکار کا ایک بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔

اگر انہیں اس امر کا یقین نہ ہوتا تو وہ ایسا سوال کر کے خطرہ مول نہ لیتے۔ اگر انہیں اس کا ذرا بھی گمان ہوتا کہ آپ اس کا جواب دے دیں گے تو وہ ہرگز ایسا سوال نہ کرتے کیونکہ اس صورت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ثبوت بہم پہنچ جاتا اور پھر لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ جب آپ نے اس سوال کا جواب دے دیا تو پھر رسالت کا انکار کیوں کرتے ہو۔

بہرحال اس دور کے مشرکین اور اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نے دیکھ لیا کہ آپ نے واقعی صحیح اور مفصل جواب دے دیا۔ پھر مخالفین نے اس کی کیا تاویل کی؟ انھوں نے خواہ کچھ بھی کہا ہو لیکن سیکڑوں سال سے مخالفین اسلام (بالخصوص یہود اور عیسائی — یعنی مستشرقین) آنکھیں بند کیے، کانوں میں انگلیاں ڈالے یہی ایک رٹ لگا رہے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ اہل کتاب ہی سے معلوم ہوا تھا اور اسی کو کچھ رد و بدل کے ساتھ وحی کے نام سے لوگوں کو سنا دیا۔

اس فیصلے، رائے یا گمان کے لیے کوئی قرینہ، وجہ یا ثبوت موجود ہے؟

قرآن کے یہ الفاظ:۔

وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ؀	اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو انہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگذشتوں سے) بے خبر تھے۔

مشرکین عرب نے بھی سنے اور یہود و نصاریٰ نے بھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی بڑھ کر یہ نہیں کہا کہ "قرآن کی وحی" سے پہلے تو یہ سارا قصہ آپ کو معلوم تھا۔

اگر معلوم ہوتا بھی تو کس طرح؟ یہ تو مخالفین بھی تسلیم کرتے تھے (اور کرتے ہیں) کہ آپؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے جو براہ راست تورات سے استفادہ کر سکتے۔

کیا کسی یہودی، عیسائی یا تورات کا علم رکھنے والے سے سنا تھا؟

اس کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں:۔

(۱) مجمع عام میں کسی نے یہ قصہ سنایا ہوتا اور آپ نے سنکر محفوظ کر لیا ہوتا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو کم از کم دس بیس یہودی، عیسائی یا مشرکین مکہ کھڑے ہو کر کہہ سکتے کہ ہم نے تو بارہا یہ قصہ سنا اور سنایا ہے۔ آپؐ نے بھی سنا ہے، پھر کیسے کہہ رہے ہیں کہ آپ اس سے بے خبر تھے لیکن کسی ایک فرد نے بھی یہ شہادت نہیں دی، جبکہ برسوں تک مکہ اور مدینہ میں قرآن کے یہ الفاظ گونجتے رہے ہیں۔[1]

دوسری صورت یہ ممکن تھی کہ خفیہ طور پر کسی شخص نے آپ کو یہ قصہ سنا دیا ہو۔ لیکن ایسی بھی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ آپ کسی بھی یہودی یا عیسائی (یا کسی دوسرے) عالم کے ساتھ چند لمحے بھی تنہا رہے ہوں اور کچھ سنا یا سیکھا ہو۔ بلکہ اندرونی شہادت صریحاً اس کے خلاف ہے۔

جو لوگ ایسا گمان رکھتے ہیں وہ بتائیں آخر وہ ایسی کون سی غرض یا مصلحت تھی کہ کسی نے نہایت رازدارانہ طور پر یہ قصہ آپ کو سنا دیا۔

اور پھر جب بار بار یہ اعلان کیا گیا کہ نزول قرآن سے پہلے آپؐ اس قصے سے بے خبر تھے تو اس شخص

---

[1] وہ مستشرقین بھی جو پُرفریب الفاظ اور اصطلاحوں سے مسلم اسکالروں کو بھی مرعوب کیے ہوئے ہیں اور دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں وہ بھی اسی گمان کا یقین کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہے ان کی "علمیت اور تبحر علمی" کی حقیقت، کہ جو جی میں آیا لکھ دیا، نہ ثبوت نہ شہادت نہ دلیل۔

نے تردید کیوں نہیں کی میں تو سارا قصہ بہت پہلے آپ کو سنا چکا ہوں۔ کیا مستشرقین کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟ اگر ہے تو دیں۔

اب آئیے اصل قصہ کی طرف — بربنائے حسد یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے دشمنی اور قتل و
حضرت یوسفؑ پر جو خصوصی توجہ اور | جلاوطنی کی سازش کی۔ یہی معاملہ آپؐ کے ساتھ ہوا۔
شفقت تھی اور جو مرتبہ انہیں حاصل تھا اس کی بنا پر ان کے بھائیوں نے ان کے خلاف سازش کی، قتل کر دیں یا اس بستی سے نکال دیں قتل تو نہیں کیا البتہ حضرت یوسفؑ کو جلاوطن ضرور کر دیا۔ بظاہر وہ کامیاب ہو گئے لیکن حالات نے بہت جلد دکھا دیا کہ وہ نکال کر خوش نہ رہ سکے، اور جب غلہ کی تنگی ہوئی تو انہیں اپنے اسی بھائی کا سہارا لینا پڑا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ آپ کے کٹر مخالفین بھی دل میں آپؐ کی صداقت کے قائل تھے اور محض حسد کی بنا پر آپؐ کی رسالت کا انکار کر رہے تھے۔ آپ کے جانی دشمن ابوجہل نے متعدد مواقع پر اس کا اعتراف کیا کہ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ دوسرے امتیازات کے ساتھ نبوت بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان (بنی ہاشم) میں آ جائے اور وہ سر تسلیم خم کر دے۔ اسی بنا پر وہ برابر مخالفت کرتا رہا۔[1] خود قرآن نے بھی اسی جذبۂ حسد کو مخالفت کا ایک بنیادی سبب قرار دیا ہے۔ بنی اسرائیل کے اس رویے کے بارے میں ارشاد ہے :-

انھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی سچائی سے (دیدہ و دانستہ) انکار کیا اور صرف اس لیے انکار کیا کہ وہ جسے چاہتا ہے اپنا فضل نازل کر دیتا ہے۔　(البقرہ ۲/۹۰)

اہل کتاب کی اسی روش پر گرفت فرماتے ہوئے ارشاد ہے :

پھر (یہ لوگ پیروانِ حق کی دشمنی میں اس قدر بڑھ گئے ہیں تو) کیا یہ بات ہے کہ ان کے قبضہ میں پادشاہت کا کوئی حصہ ہے اور اس لیے نہیں چاہتے کہ لوگوں کو رائی برابر بھی (اس میں سے) کچھ مل جائے؟ یا پھر خدا نے اپنے فضل سے لوگوں کو جو کچھ عطا فرمایا ہے، اس کا انہیں حسد ہے
(النساء ۴/۵۴)

نیز فرمایا :-

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ سیرت سرور عالم (مولانا مودودی) ۵۰۹ - ۵۱۱

اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ اور مشرکین مکہ، دونوں نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحی الٰہی) نازل ہو (اور اس لیے وہ طرح طرح کے شکوک پیدا کرکے تمہیں اتباع حق سے باز رکھنا چاہتے ہیں) لیکن اللہ (کا قانون اس بارے میں انسانی خواہشوں کا پابند نہیں ہو سکتا، وہ) جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے اور وہ بہت بڑا فضل رکھنے والا ہے۔

(البقرۃ ۲/۵)

حاسد اور مخالف کون تھے؟ بنی اسمٰعیل (نسبی بھائی) اور بنی اسرائیل، جن سے بھی برادرانہ تعلق تھا۔

آئینۂ سورۂ یوسف میں مخالفین اپنے خدوخال دیکھ سکتے تھے

اس قصہ میں بتایا گیا ہے کہ برادران یوسف نے حسد کی بنا پر ان کے خلاف جتنی تدبیریں اختیار کیں وہ سب بالآخر ناکام ہوئیں بلکہ ان کا ہر مخالفانہ اقدام حضرت یوسف کے عروج اور ان کی ترقی کا ذریعہ بن گیا اور وہ عزت و اقتدار میں سب سے ممتاز ہو کر رہے۔

یہ قصہ زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ برادران یوسف کی طرح اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں (قریش وغیرہ) نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تو ان کا انجام بھی یہی ہوگا اور یہ واقعی ہوا۔ اس کا ایک نمونہ وہ قحط تھا جس کی طرف سورۂ الدخان وغیرہ میں اشارہ ہے یعنی یہ کہ جب کفار مکہ کی مخالفانہ روش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ خدایا یوسف کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ حضور کا خیال یہ تھا کہ جب ان لوگوں پر مصیبت پڑے گی تو انہیں خدا یاد آئے گا اور ان کے دل نصیحت قبول کرنے کے لیے نرم پڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور سارے علاقے میں ایسے زور کا قحط پڑا کہ لوگ بلبلا اٹھے۔ آخر کار بعض سرداران قریش (جن میں ابوسفیان جیسا کٹر مخالف بھی تھا) آپ کے پاس آئے اور اس قحط سے نجات دلانے کے لیے دعا کی درخواست کی۔ [1]

اس قصہ کے ذریعہ مخالفین کو یہ تنبیہہ بھی کی جا رہی تھی کہ اگر انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے نکالنے کی کوشش کی یا قتل کا منصوبہ بنایا تو بالآخر اس کے وہی نتائج برآمد ہوں گے جو حضرت یوسف[2] کے معاملے میں ہوئے تھے۔

---

[1] یہ روایت امام احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابن جریر اور ابن حاتم نے متعدد سندوں کے ساتھ نقل کی ہے۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ تفہیم القرآن ج ۴، ص ۵۶، ۶۲

"جلا وطنی" کے بعد جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام بام عروج پر پہنچے تھے اسی طرح ہجرت نے آپؐ کی کامیابی کی راہیں کھول دیں

لیکن مخالفین اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

بالآخر انھوں نے بھی برادران یوسفؑ کی طرح قتل کی سازش کی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

جس طرح حضرت یوسفؑ کنوئیں میں کچھ وقت رہے اسی طرح آپ بھی غار ثور میں رہے۔ لیکن اس سے نکلنے کے بعد بلندیوں پر چڑھتے گئے۔

فرق اتنا تھا کہ حضرت یوسفؑ مصر (جس کے لفظی معنے شہر ہیں) میں غلام کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے مگر پھر آقائی کرنے لگے لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حاکم کی حیثیت سے مدینہ (جس کے لفظی معنے شہر کے ہیں) میں داخل ہوئے اور آپؐ کی حکومت و اقتدار کا دائرہ ہر روز بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ نہ صرف قریش و یہود اور عرب نے بلکہ سارے قبیلے نے آپؐ کو ایک مثالی فرماں روا بھی تسلیم کر لیا۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ

تقریباً دس سال تک قریش مکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف طرح طرح کے حربے استعمال کرتے رہے۔ بالآخر وہ وقت بھی آ گیا کہ مکہ فتح ہوا۔ وہی اہل مکہ جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تھی۔ آپ کے ساتھ طرح طرح کی گستاخیاں کی تھیں، اہل ایمان پر طرح طرح کے خوفناک مظالم کیے تھے۔ آپ کو قتل کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی، آپ کو اور اہل ایمان کو وطن عزیز چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور بعد میں بھی لڑتے رہے تھے وہ سب ہتھیار ڈال چکے تھے، شرمسار و سرنگوں کھڑے آپؐ کے فیصلے کے منتظر تھے۔ آپؐ ان سے انتقام لے سکتے تھے، لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا بلکہ تقریباً دو ہزار سال پہلے کی تاریخ دہراتے ہوئے اپنے بھائیوں سے وہی فرمایا جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا یعنی یہ کہ

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ — آج تم پر کوئی گرفت نہیں [1]

اس قصے میں نشانیاں

حضرت یوسفؑ کا یہ واقعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے کا تھا تورات میں محفوظاً چلا آ رہا تھا اور پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں

---

[1] دیکھیے تفہیم القرآن ج ۲ - ۴۲۹

یہ دہرا دیا گیا۔ کیا تاریخ کا یہ عمل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملہ میں مشابہت محض اتفاقی ہے؟
ایسا نہیں بلکہ خالق کائنات کے پہلے سے طے شدہ پلان کے تحت سب کچھ ظہور میں آتا رہا۔ حضرت یوسف نے جو خواب دیکھا تھا، وہ ایک حقیقت بھی، عالم غیب کی طرف سے ایک اشارہ تھا اور یہ بھی دکھانا مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو پھر ساری کائنات کی طاقتیں مل کر بھی ذرہ برابر اس میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں اسی لیے فرمایا:۔

"اور اللہ کو جو معاملہ کرنا ہوتا ہے، وہ کر کے رہتا ہے۔ لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔"
(سورہ یوسف ۱۲/۲۱)

اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا۔ (ایضاً، ۵۲)

اور ٹھیک یہی معاملہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ہوا، جو بشارتیں آپ کو دی گئی تھیں وہ سب پوری ہو کر رہیں اور جو نقشہ سورہ یوسف کے پردے میں دکھایا گیا تھا وہ ظہور میں آ کر رہا۔

گلستان نبوت جس میں ہر گل کی مہک ہے اب آخر میں ہم پھر اسی مضمون کی طرف اشارہ کر دیں جس سے ہم نے ان مقالوں کی ابتدا کی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں گزشتہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کی جھلک ہے۔

یہاں حسن یوسف[1] بھی ہے، "دم عیسیٰ" بھی اور "ید بیضاء" بھی۔ مختصر یہ کہ: "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"
یا یوں کہیے کہ دست قدرت نے ہر شاخ نبوت کا گل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے گلدستہ میں سجا دیا ہے اس لیے اس میں ہر گل کا رنگ بھی اور اس کی مہک بھی۔

---

[1] غور کرنے سے معلوم ہوگا اور بہت سی باتوں میں مشابہت نظر آتی ہے۔ مثلاً مصر کے ایک اعلیٰ خاندان کی خاتون کی نظر حضرت یوسف پر پڑی۔ آپ پر حضرت خدیجہ کی نظر پڑی لیکن یہاں انداز بہت مختلف تھا۔ حضرت یوسف کچھ سال قید میں رہے۔ آپ بھی شعب ابو طالب میں برسوں محصور رہے، جو تعلیم حضرت یوسف نے دی وہی آپ نے دی۔ خواب کی تعبیر میں حضرت یوسف مشہور و معروف تھے اور آپ بھی۔ حضرت یوسف اگر حسین تھے تو آپ کا حسن بھی لاجواب تھا۔

[2] مختلف صحابہ سے جو احادیث مروی ہیں ان میں بالاتفاق سب نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے آپ جیسا کوئی حسین نہیں دیکھا۔ جس نے تشبیہ دی وہ بس یہی کہہ سکا کہ آپ کا روئے انور آفتاب و ماہتاب تھا۔
(ملاحظہ ہو ترجمان السنۃ، ج ۴، ۶۰۴-۶۱۳)

پھلواری شریف کی اہم شخصیتوں کی آخری کڑی

حضرت مولانا شاہ محمد امان اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ

(مولانا شاہ عون احمد قادری)

مولانا شاہ امان اللہ قادری رحمۃ اللہ میرے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے۔ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ میں تقریباً تیس سال سے رامپور میں مقیم ہوں اس لیے مجھے اپنے وطن امجھر شریف بہت کم جانا ہوتا ہے اور پھلواری شریف اس سے بھی کم۔ برادر مغفور سے ملاقات پر کئی کئی سال گزر جاتے تھے لیکن ادھر ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک کئی بار ان سے ملاقات کے مواقع مل گئے تھے۔ وہ جب علاج کے لیے امریکہ جا رہے تھے اس وقت میں دہلی میں تھا۔ ۸ اکتوبر ۸۳ء کو میں ان سے ملنے گیا اور وہ ملاقات عرصہ دراز کے بعد ہوئی تھی۔ دوسرے دن وہ امریکہ تشریف لے گئے تھے۔ پھر میں مارچ ۱۹۸۴ء میں آل بہار اجتماع جماعت اسلامی ہند میں شرکت کے لیے شہر گیا پہنچا تھا اور چند دنوں میں دو بار پھلواری شریف جانے کا موقع نکل آیا تھا اور کئی بار برادر مغفور سے ملاقات ہوئی تھی۔ گیا سے واپسی میں محترم مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند پٹنہ گئے تو ۲۸ مارچ ۱۹۸۴ء کو وہ برادر مغفور سے ملاقات کے لیے خانقاہ مجیبیہ تشریف لے گئے تھے ان کے ساتھ حسنین سید صاحب اور ڈاکٹر محب صاحب تھے۔ میں اس وقت خانقاہ میں موجود تھا۔ میری ان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں اپنے حقیقی بھتیجے حکیم حماد ندوی مرحوم کے انتقال کے بعد تعزیت کے لیے پھلواری شریف گیا تھا۔ ۲ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے کہ ان کی وفات کی خبر مجھے رام پور میں محترم امیر جماعت اسلامی ہند کے اس تعزیتی بیان سے ملی جو اخبار دعوت میں شائع ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ میرے بھائی، میرے مرشد زادے کے درجات بلند

فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین! ایک ذی علم متقی اور متواضع شخصیت رخصت ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی وفات ۱۶ مئی کا دن گذار کر رات کو اس وقت ہوئی جب ۱۷ مئی کی تاریخ شروع ہوچکی تھی وہ جمعہ کی رات تھی میرے لئے خانقاہ مجیبیہ کا ایک عہد ختم ہوگیا۔ خانقاہ مجیبیہ میں جس اعلی درجہ کی رواداری پائی جاتی ہے کم از کم صوبہ بہار میں اس کی کوئی مثال مجھے نہیں معلوم۔ برادر مغفور اخبار دعوت اور ماہنامہ زندگی دل چسپی سے پڑھتے تھے۔ ایک بار اخبار دعوت کسی وجہ سے ان کے پاس نہیں پہنچ رہا تھا۔ میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے شکایت کی کہ اخبار دعوت اب میرے پاس نہیں آرہا ہے۔ مولانا شاہ عون احمد قادری جن کا یہ مختصر مضمون شائع کیا جارہا ہے، برادر مغفور کے حقیقی عم زاد بھائی ہیں۔ انہیں کے ساتھ پلے بڑھے، انہیں کے ساتھ تعلیم پائی اور انہیں کے ساتھ سن فراغت حاصل کی اور اب خانقاہ مجیبیہ کے اعیان واساطین میں وہی سب سے بڑے اور بزرگ ہیں، اللہ تعالی انہیں تادیر سلامت باکرامت رکھے آمین۔

سید احمد قادری

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب　　لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

صدق و اخلاص و درستی باید و عمر دراز　　تا قرین حق شود صاحبقرانے در قرن

پھلواری شریف اور خانقاہ مجیبیہ کی روشن تاریخ کا ایک تابناک دور حضرت مولانا شاہ محمد امان اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ شریعت وطریقت کے آسمان پر ایک درخشاں آفتاب اور ضوفشاں ماہتاب کی حیثیت رکھتے تھے جو علم ودین، زہد واتقاء اور عرفان حق کے منصب کو سونا چھوڑ کر آج ہم لوگوں سے جدا ہوگئے۔ آپ کی حیات طیبہ کے چند تاریخی واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

محرم ۱۳۴۰ھ (مئی ۱۹۲۱ء) میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کی پیدائش کا سال ہندوستان کی تاریخ کا وہ اہم سال ہے جبکہ پورے ہندوستان میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا تھا اور پورا ہندوستان جوش آزادی کے جام سے سرشار تھا۔ اسی سال بہار میں امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی تابناک دور میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اس فال نیک کا اظہار آپ کے والد بزرگوار جب بچپن میں آپ کو گود میں لیتے تو اس طرح فرماتے تھے "یہ غازی امان اللہ ہے"۔ یہ مجاہد و غازی ہونگے

چنانچہ آپ کے خیالات اور مزاج پر اس کا گہرا اثر تھا اور باوجود اپنے اہم مشاغل اور مصروفیات کے دین و ملت پر جب کوئی خطرات و مصائب آتے تو آپ سینہ سپر ہو جاتے اور اپنے عزیزوں کو ملت کے کاموں میں شرکت کی تلقین کرتے تھے۔

حضرت امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محمد محی الدین قادری قدس اللہ سرہ کے آپ اکلوتے صاحبزادے تھے پیدائش کے وقت آپ کے جد بزرگوار امیر شریعت اول حضرت مولانا شاہ محمد بدر الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے۔ انھوں نے آپ کا نام نامی "محمد امان اللہ" تجویز فرمایا۔ آپ کی مکتب ۱۳۴۲ھ میں آپ کے والد گرامی نے پڑھائی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوتی رہی ابتدائی تعلیم کا زیادہ حصہ اپنے منجھلے چچا مولانا شاہ محمد نظام الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا اور فارسی کی مکمل تعلیم مولانا حکیم محمد شعیب پھلواریؒ سے حاصل کی۔ ۱۳۔۱۴ کے بعد کی تعلیم کے لیے کچھ عرصہ اعظم گڈھ پھر ایک دو سال فرنگی محل لکھنؤ میں قیام کیا اور آخر میں تعلیم کے لیے اجمیر تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت مولانا معین الدین (اجمیری) اور حضرت مولانا محمد شریف اعظم گڈھی سے تکمیل کرکے فراغت حاصل کی۔

۱۳۵۵ھ میں اپنے والد بزرگوار سے بیعت طریقت حاصل کی اور ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں اپنے پیر و مرشد کی جگہ پر ان کے جانشین کیے گئے۔ اس وقت سے لیکر اب تک خانقاہ مجیبی کے منصب سجادگی سے قوم و ملت کے لیے رشد و ہدایت کا سامان بہم پہنچاتے رہے۔ طریقت کے مشاغل کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا اور بہت سے لوگوں نے آپ سے علمی فیض حاصل کیا۔ آپ کا علمی و ادبی ذوق بھی بہت اعلیٰ تھا۔ تصوف کے اہم مشاغل میں مصروف رہنے کی وجہ سے آپ کو کسی مستقل تصنیف کی فرصت تو نہیں ملی مگر پھر بھی وقتاً فوقتاً متعدد علمی و تاریخی مضامین آپ کے قلم گہربار سے نکلے جو رسالہ "المجیب" پھلواری شریف میں شائع ہو کر اس کی زینت کا باعث بنے۔ اہل حلقہ کے علاوہ بہار اور ہندوستان کے عوام بھی آپ سے علمی و روحانی فیض خطوط کے ذریعہ حاصل کرتے تھے۔ اکثر لوگوں کو ان کے سوالات کے سلسلے میں علمی و عرفانی جوابات بھی آپ نے اپنے مکاتیب کے ذریعے دیے۔ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ انور کی سعادت بھی آپ کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چار بار حاصل ہوئی۔ حرمین شریفین کی نعمتوں سے مالا مال ہو کر تشریف لاتے اور یہاں کے لوگوں کو اس سے سرفراز فرماتے تھے۔

اس طرح کامل ۳۸ سال تک یہ درخشاں آفتاب ایک طرف اپنی زرتاب کرنوں سے علم و دین، سنت سنیہ

اور اخلاق فاضلہ کے ایوانوں کو روشنی بخشتا رہا تو دوسری طرف زہد وتقوا، تزکیہ وتصفیہ اور عرفان حق کے چمنستانوں کو منور کرتا رہا۔ آپ میں شریعت وطریقت اخلاق وعظمت کی ایسی جامعیت تھی جس کی کوئی دوسری مثال اس وقت پیش نہیں کی جا سکتی۔ آپ کی قیمتی زندگی عرفانی ودینی مسلسل جدوجہد کا ایک نمونہ تھی۔ ملت کی تعمیر اور اس کی اصلاح آپ کا عظیم مقصد تھا اس کی ترویج واشاعت میں آپ نے اپنی زندگی گذار دی۔

آپ کو اندھر ۸۔۱۰ سال سے قلبی شکایت ہو گئی تھی جس کا علاج ہوتا رہا اور ڈاکٹروں کے مشورے سے ڈیڑھ سال قبل اسی کے علاج کے لیے امریکہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے واپسی کے بعد مرض میں کمی ضرور ہوئی مگر زائل نہیں ہوا۔ کچھ نہ کچھ سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر ۳۔۴ دن کی علالت کے بعد آپ کی رحلت کا جانگداز حادثہ پیش آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دیگر کمالات ومحاسن کے ساتھ ایک خاص وصف آپ کے اندر یہ بھی تھا کہ مزاج نہایت معتدل اور متحمل تھا۔ اپنے وابستگان اور حلقہ کے لوگوں کے علاوہ اور بھی تمام لوگوں سے نہایت اخلاق ومحبت سے ملاقات کرتے تھے اور سب کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ یوں صرف نام ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنی ذات اور اپنے مزاج سے تمام لوگوں اور ساری قوم کے لیے امن وامان تھے۔ غفر لہٗ

آج ان کے فضل وکمال کا ہر جگہ چرچا ہے اور تمام لوگ تاثر وعقیدت کے ساتھ ذکر خیر کر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ اس سنگین حادثے سے ہم پر حیرت کا عالم طاری ہے۔ خدائے پاک اپنا فضل فرمائے۔ ؎

آفاق ہمہ بر گفتگویت ما ہیم وتحیر وخموشی

آپ کی شادی حضرت مولانا شاہ محمد نظام الدین قادریؒ (جو آپ کے سنجھلے چچا اور استاذ بھی تھے) کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی اور آپ نے اہلیہ محترمہ کے علاوہ پانچ صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی اپنی اولادوں میں چھوڑی۔ آپ کے خلف اکبر مولانا شاہ محمد رضوان اللہ قادری فاتحہ چہارم کے بعد آپ کے جانشین بنائے گئے۔ موصوف نے مدرسہ حمیدیہ دربھنگہ میں رہ کر درسیات کی تکمیل کی اور والد محترم سے آپ کو بیعت واجازت وخلافت حاصل ہے۔ میدان علم وعمل سے مناسبت رکھتے ہیں۔ ہم سب دست بدعا ہیں کہ اپنے والد بزرگوار کے سچے جانشین ثابت ہوں اور اپنے اسلاف کے کمالات وخوبیوں کا نمونہ ہوں۔

زخوبی رشئہ خوبت خوبتر باد جمالت آفتاب ہر نظر باد

إِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ

اقبال کی نظم "سیرِ فلک"

قرآن کے آئینے میں

محمد بدیع الزماں، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پٹنہ

اقبال کی درج ذیل نظم "سیرِ فلک" کا مرکزی خیال "إِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ" ہے۔ انھوں نے اس نظم میں قیامت کے برحق ہونے اور انسان کو اپنے نیک و بد اعمال کی جزا و سزا دیے جانے پر قرآن مجید کے سارے ارشادات کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

تھا تخیل جو ہم سفر میرا — آسماں پر ہوا گزر میرا

اڑتا جاتا تھا اور نہ تھا کوئی — جاننے والا چرخ پر میرا

تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے — رازِ سربستہ تھا سفر میرا

حلقۂ صبح و شام سے نکلا

اس پرانے نظام سے نکلا

کیا سناؤں تمھیں ارم کیا ہے — خاتمِ آرزوئے دیدہ و گوش

شاخِ طوبیٰ پہ نغمہ ریز طیور — بے حجابانہ حور جلوہ فروش

ساقیانِ جمیل جام بدست — پینے والوں میں شورِ نوشا نوش

دور جنت سے آنکھ نے دیکھا — ایک تاریک خانہ، سرد و خموش

طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ — اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش

خنک ایسا کہ جس سے شرما کر — کرۂ زمہریر ہو روپوش

میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی
حیرت انگیز تھا جواب سروش
یہ مقام خنک جہنم ہے
نار سے نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے
جن سے لرزاں ہیں مرد عبرت کوش
اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

اس نظم کا آغاز اقبال نے ان مصرعوں سے کیا ہے ۔"تھا تخیل جو ہم سفر میرا" اور "اڑتا جاتا تھا اور نہ تھا کوئی" جن سے ان کی مراد انسان کو گہری سوچ میں ڈالنا اور وہ سب باتیں یاد دلانی ہیں جو خدا نے تخلیق آدم، تخلیق کائنات، نیک و بد اعمال اور ان کی جزا و سزا اور قیامت کے برحق ہونے کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد فرمائی ہیں ۔ انہی ساری باتوں کے پس منظر میں وہ نظم میں آگے چل کر جنت اور دوزخ کے نقشے پیش کرتے ہیں اور یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ سب ہی باتوں کا علم قرآن مجید کے ذریعے عطا کیے جانے کے باوجود انسان صراط مستقیم کے بدلے گمراہی کے راستے پر چل کر اپنے کو قیامت کے دن سزا کا مستحق بنا دیتا ہے ۔

خدا نے انسان کو جام شعور عطا کیا، اس سے الست بربکم کا عہد لیا اور بار بار اسے اپنے وعدہ کے سچے ہونے کی تلقین کی ۔ اقبال اس نظم کے پہلے بند میں انہی ساری باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے نتیجے کے طور پر ہی جنت یا دوزخ کا تصور کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ تخلیق آدم کے انجام کی زنجیر کی یہ سب سے آخری کڑیاں ہیں۔

جام شعور کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے :۔

"اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے ۔ اسی نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے اس لیے کہ تم شکر گزار رہو" (النحل ۱۶/۱۱)

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے والے دل دیے ۔ مگر تم لوگ کم ہی شکر گذار ہوتے ہو" (سورۃ المومنون ۲۳ ۔ رکوع ۵)

"علم سے بہرہ ور لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل جھک جائیں ۔ یقیناً اللہ ایمان والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے ۔"

(سورۃ الحج ۲۲ ۔ رکوع ۷)

جام شعور عطا کرنے کے ساتھ ساتھ خدا نے انسان سے "پیمان اولیں" لیا جس کے متعلق قرآن میں کہا ہے

"اور اے نبی! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انھیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ) انھوں نے کہا "ضرور" آپ ہی ہمارے رب ہیں (قالوا بلیٰ) ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ (شَهِدْنَا) یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو۔ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے (انا کنا عن هذا غافلین) یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا۔" دیکھو! اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں" (الاعراف ۷ رکوع ۲۲)

جب بھی کوئی قوم گمراہی میں مبتلا ہو گئی یا ہونے لگی تو خدا نے اسے اسی "پیمان اولیں" کو یاد دلایا۔ رسول اللہ کے وقت میں کئی مواقع پر اس کی یاددہانی کرائی گئی ہے:۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ (خدا) تم سے عہد لے چکا ہے۔ اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ (ان کنتم مؤمنین) وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندوں پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے" (سورۃ الحدید ۵۷ رکوع ۱)

"اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کا خیال رکھو اور اس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اس نے تم سے لیا ہے یعنی تمہارا یہ قول کہ "ہم نے سنا اور اطاعت قبول کرلی (سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ) اللہ سے ڈرو۔ اللہ دلوں کے راز جانتا ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو"

(سورہ المائدہ ۵ رکوع ۲)

سمجھ بوجھ عطا کر چکنے اور اس سے عہد و پیمان لے چکنے کے بعد خدا نے انسان کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا تو ظاہر ہے کہ اس کے ذمہ داریوں کا حساب بھی کیا جاتا ہے جس کے متعلق خدا نے بار بار ارشاد فرمایا:۔

"اس وقت (یعنی روز حشر) تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامۂ اعمال دیکھے۔ ان سے کہا جائے گا۔ آج تم لوگوں کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا

جو تم کر رہے تھے۔ یہ ہمارا تیار کرایا ہوا اعمال نامہ ہے جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے۔ جو کچھ بھی تم کرتے تھے۔ اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے۔ پھر جو لوگ ایمان لائے تھے اور نیک عمل (اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت) کرتے رہے تھے۔ انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کریگا۔ اور یہی صریح کامیابی ہے۔ (ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ) اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا ان سے کہا جائے گا "کیا میری آیات تم کو سنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبر کیا اور مجرم بن کر رہے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے (ان وعد اللہ حق) تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے۔ ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں یقین ہم کو نہیں ہے (وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ) اس وقت ان پر ان کے اعمال کی برائیاں کھل جائیں گی اور وہ اسی چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔"

(سورۃ الجاثیہ۔ ۴۵ رکوع ۴)

لوگو! بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہوگا۔ فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ (اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ) پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے۔ (سورۃ لقمان ۳۱۔ رکوع ۴)

ماں اور باپ اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں "اے بدنصیب مان جا۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے (اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ) مگر وہ کہتا ہے۔ "یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں" یہ وہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے" (سورہ الاحقاف ۴۶ رکوع ۲)

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ اس طرح ٹھپہ لگا دیتا ہے۔ اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو جاہل ہیں۔ پس (اے نبی!) صبر کرو۔ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ (اِنَّ وعد اللہ حق) اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے" (سورۃ الروم ۳۰ رکوع ۶)

"اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اس نے انہیں سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کان بہرے ہیں۔ اچھا مژدہ سنا دو اسے ایک

دردناک عذاب کا۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جس کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے (وعد اللہ حقًا) اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔ (سورۂ لقمان۔ ۳۱۔ رکوع ۱)

"اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنالیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امید دلاتا ہے۔ مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے خلاصی کی صورت یہ نہ پائیں گے رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں تو انہیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ (وعد اللہ حقًا) اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا۔ (سورۂ النساء ۴۔ رکوع ۱۸)

اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ (وعد اللہ حقًا) بے شک پیدائش کی ابتداء وہی کرتا ہے۔ پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے اور جنھوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں اور دردناک سزا بھگتیں، اس انکارِ حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے۔" (سورۂ یونس۔ ۱۰۔ رکوع ۱)

"اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے، روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں گے۔ مگر ان کے درمیان پورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا۔ کوئی ظلم ان پر نہ ہوگا۔ سنو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ سن رکھو۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ (اَلَآ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ) مگر اکثر انسان جانتے نہیں ہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔" یونس ۱۰۔ رکوع ۶)

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ (کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ) پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو

معلوم ہو جائے گا۔ (ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ) ہرگز نہیں۔ اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے
(اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا) كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ
الیقین) تم دوزخ دیکھ کر رہوگے (لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ) پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین)
کے ساتھ اسے دیکھ لوگے۔ (ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الیقین) پھر ضرور اس روز تم سے ان
نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔ (ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ)
سورۃ التکاثر ۱۰۲۔ رکوع ۱)

یہ تھیں وہ ساری باتیں جو اقبال کے تخیل کی ہم سفر تھیں اور جیسا میں نے کہا بغیر ان ساری باتوں کو ذہن نشین رکھے جنت یا دوزخ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور اسی پس منظر میں اقبال ہمیں نامۂ اعمال کے نتائج سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

کیا خودکشی کو قانونی جواز ملنا چاہیے؟

جناب سید معین الدین قادری سلطان پور

ایک مقالہ نگار مسٹر امی۔ آر۔ رام کمار کے بیان کے مطابق (ٹائمز آف انڈیا لکھنؤ ۲۴ر جولائی ۱۹۸۶ء PROS and cons of RIGHT TO DIE) بمبئی کے ایک سابق انجینئر جن کی عمر ۷۰ سال ہے تمام اعضاء و جوارح صحیح و سالم ہیں اور پورے طور پر کام کر رہے ہیں باستثنا آنکھ۔ انھیں موتیا بند ہو گیا تھا۔ آپریشن ناکام ہوا اور وہ کلیتہً بینائی سے محروم ہو گئے۔ ابھی تک وہ دوسروں کے سہارے سے بے نیاز، صحت مند زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب کہ وہ معذور ہیں، انھیں دوسروں پر انحصار گوارا نہیں وہ مرنا چاہتے ہیں۔ ان کا اپنے معالج سے اصرار ہے کہ "قید حیات" اور "بند غم" سے ایک ساتھ نجات حاصل کرنے میں وہ ان کی مدد کرے۔ اس مشکل صورت حال سے نکلنے کے لیے معالج نے انھیں ایک ماہر نفسیات سے رجوع کرنے کی ہدایت کر دی ہے۔

مقالہ نگار نے ڈاکٹروں کے حوالے سے ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جو کسی شخص کے اندر موت کی خواہش پیدا کرتے اور اس کو اتلاف جان پر ابھارتے ہیں :-

"جب تک آدمی زندہ ہے اس کا دماغ کام کرتا رہتا ہے۔ پھر جو لوگ ایک طویل مدت تک امراض و اسقام کا شکار رہتے ہیں اور اپنی تکالیف کے بارے میں مسلسل اور پیہم سوچتے رہتے ہیں ان کے اندر زندگی سے بیزاری اور موت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش دراصل نتیجہ ہوتی ہے۔ جذباتی انتشار اور بے ربطی کا۔ ایسے لوگ زندگی کی تلخی کا مداوا موت سے کرنا چاہتے ہیں وہ معالج کو مسیحا نہیں جلاد کے روپ میں دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں

کوفت اور کلفت کا شکار مایوسی کی تاریکی میں صحیح راہ نہ پانے والے ایسے مریضوں کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہورہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مہاراشٹر اسمبلی نے ۲ جولائی ۱۹۸۵ء کو ایک بل کی شہری کی تحریک منظور کی ہے تاکہ خودکشی کے قانونی جواز کے بارے میں عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ مجلس قانون ساز نے اگر یہ جواز بہم پہنچادیا تو اقدام خودکشی کوئی جرم نہ رہے گا۔ امریکہ کی طرح جو چاہے گا بمبئی کی فلک بوس عمارات کی بالائی منزل سے چھلانگ لگا کر جان دے دیگا۔ مفاد پرست انجینیر اپنے معالج کو مزید خلجان میں مبتلا نہ کریں گے اور نشیتمنے موت کا فیصلہ نہ کیا تو مستلزم سزا تو نہ قرار پائیں گے۔ لیکن ایک معتدبہ کی یہ ہزار معذوریوں کا اضافہ کریں گے۔

اس تحریک کے تعلق سے مقالہ نگار نے ڈاکٹر دَوے (DR. DAVE) کے خیالات کا ذکر کیا ہے ڈاکٹر موصوف کا موقف یہ ہے کہ جو شخص شدید جسمانی کرب واذیت میں مبتلا ہو معالج کے لیے اس کی شمع حیات گل کر دینا (TERMINATION OF LIFE) جائز ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"مذہب پر عقیدہ رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ مرنا جینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہ فیصلہ اسی پر چھوڑنا چاہیے۔ کوفت اور کلفت کا احساس انسانی فطرت ہے مگر اس طرز استدلال کو وسعت دے کر کہا جا سکتا ہے کہ پھر بیماری کو بڑھنے سے کیوں روکا جائے۔ موت کو ہم کیوں مؤخر کریں ایک ایسے مرض کی شدت اور ترقی میں مخل انداز ہو کر جو بالآخر موت پر منتج ہونے والا ہے۔ آپریشن کے وقت بے ہوش کرنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ ہم آپریشن ہی کیوں کریں؟"

ڈاکٹر صاحب سوال کرتے ہیں۔ "اسقاط کو آخر قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے۔ وہ بھی ماں اور سماج کے وسیع تر مفاد میں زندگی ختم کرنا ہی ہے پھر اسقاط کرانے میں "جاں ستانی" کا جو ہدف ہوتا ہے اس غریب (جنین) کی تو رضامندی بھی حاصل نہیں کی جاتی۔ جہاں مایوس کن شدید جسمانی کلفت و کرب بھی موجود ہو۔ وہاں زندگی ختم کر دینا جائز نہ تصور کیا جائے۔ یہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو کسی نفسیاتی الجھن میں گرفتار ہونے کے سبب شدید کرب سے دوچار ہوں۔ ان کے لیے زندگی دوزخ بن گئی ہو اور کسی بھی تدبیر سے افاقہ نہ ہو رہا ہو۔

مقالہ نگار نے ڈاکٹروں کے حوالے سے تو یہ صراحت کی ہے کہ ناسازگار حالات میں موت کی خواہش جذباتی انتشار اور بے ربطی کی پیداوار ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی خواہش کی تائید اور اس کی تکمیل میں

ادنیٰ تعاون بھی قرین عقل نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ ان امراض TERMINAL (DISEASES) جن کے بارے میں معالج کی رائے اندازہ یا تشخیص یہ ہو کہ وہ بالآخر موت پر منتج ہونے والے ہیں، علاج کو طول دینے، مریض کو کرب و اذیت میں مبتلا رکھنے اور تیمارداروں کو حیران، زیر بار اور سرگرداں رکھنے کے بجائے معقول بات یہ ہے کہ مریض کی زندگی ختم کر دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب مریض کے لیے مرنے کے حق سے آگے بڑھ کر معالج کے لیے مارنے کے اختیار کو قانونی جواز دلانے کے حق میں ہیں۔

مقالہ نگار نے ان لوگوں کے دلائل بھی بیان کیے ہیں جن کا موقف ان کی ایجاد کردہ اصطلاح (MERCY DEATH) سے واضح ہے وہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی جاندار — انسان یا جانور — شدید کرب و اذیت میں مبتلا ہو، علاج کارگر ثابت نہ ہو رہا ہو اور الم و اذیت حد سے زیادہ ہو، ایسی کہ مشاہدہ اس کا متحمل نہ ہو تو اس کو مار دینا اس پر ترس کھانا اور جذبہ ترحم کا مظاہرہ ہے۔ ان کے نزدیک ایسا علاج ہو جو بس زندگی کا تسلسل قائم رکھے یا ایسا بندوبست جو موت کی تعجیل میں ممد و معاون ہو، دونوں جائز ہیں۔ دو شرطوں کے ساتھ، مرض بالآخر موت پر منتج ہونے والا ہو، مریض اور اس کے خاندان کے متعلق افراد کی رضامندی حاصل کر لی گئی ہو۔ اپنے موقف کی تائید میں ان کے دلائل یہ ہیں:-

"وسیع تر مفاد میں کسی ایک شخص یا بہت سے لوگوں کی موت کا فیصلہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ یہ عام بات ہے، جیسے بعض مخصوص اعمال جراحی (موت کے قوی احتمال کے باوجود مریض اور اس کے متعلقین تحریری طور پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں) اقدام خودکشی کے اثرات مابعد کے ازالے کی تدابیر جن میں پچاس فی صد موت کا احتمال ہوتا ہے۔ یہی نہیں سزائے موت کے فیصلے اور اعلان جنگ بھی تو "وسیع تر" مفاد میں موت کے فیصلے ہی ہیں۔

ڈاکٹر ڈوے کا استدلال مناظرانہ اور الزامی نوعیت کا ہے۔ اس میں طنز و تعریض زیادہ اور وزن کم ہے جھنجھلاہٹ نمایاں ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا ڈاکٹر کسی مریض کے قطعی شفایاب ہو جانے کی ضمانت نہیں دے سکتا نہ اس کے مر جانے کے بارے میں ڈاکٹر کی خبر حتمی اور آخری ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر جو کچھ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے فنی معلومات سے مدد لے کر آثار و علائم کو سامنے رکھتے ہوئے گمان غالب کا اظہار کرتا ہے اور

اپنی فنی مہارت کے ذریعے ازالۂ مرض کی سعی و کوشش کرتا ہے۔ مریض شفایاب بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ وہ تک جن کو شہرۂ آفاق ڈاکٹروں کی خدمات حاصل ہوتی ہیں۔ رہی TERMINAL DISEASE کی بات تو ابھی کل تک دق کو ایسا مرض سمجھا جاتا تھا جس کا مریض بالآخر مرتا ہی ہے۔ جس کو دق ہو وہ بچتا نہیں اور جو بچ جائے وہ دق کا مریض نہیں مگر اب خود ڈاکٹر اس کو مہلک (FATAL) مرض نہیں قرار دیتے۔ قابل علاج تصور کرتے ہیں۔ امراض کی لمبی فہرست میں اب کینسر ایسا مرض ہے جس پر اس اصطلاح کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بالکل ابتداء میں اس پر قابو پایا جا سکے تو پایا جا سکے بعد میں یہ ناقابل علاج ہوتا ہے۔ صدر ریگن مرض کینسر میں مبتلا ہیں۔ ان کے معالج کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں کہ مرض کا اعادہ ہوگا یا نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو کتنی مدت میں ہوگا۔ قیاس آرائی ہو رہی ہے کہ وہ اپنی صدارت کی مدت پوری کر سکیں گے یا نہ کر سکیں گے۔ ڈاکٹر (دوے) کا مشورہ اگر امریکہ کے صدارتی حلقوں میں درخور اعتناء ہوتا تو عالمی سیاست دنیا کے ایک بڑے ملک میں نئے صدارتی بحران سے دوچار ہوتی۔

یہ دلیل کہ اسقاط حمل کی قانونی اجازت ہے۔ لہٰذا نام نہاد ٹرمنل ڈیزیز میں بھی مریض کو مار دینے کی قانونی اجازت ہونی چاہیے بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ دراصل ضبط ولادت کی تحریک اور شدید کرب و اذیت میں مبتلا اور طبی اصطلاح میں مہلک بیماریوں کے مریض کے مار دینے کی تحریک ایک ہی ذہن اور نظام فکر کی پیداوار ہیں۔

(MERCY DEATH) کے حامی دو شرطیں عائد کرتے ہیں۔ ایک تو وہی ہے جس کی قید کے ساتھ ڈاکٹر دوے مریضوں کے کشت و خون کو جائز تصور کرتے ہیں یعنی ٹرمنل ڈیزیز اور دوسری شرط خاندان کے متعلق افراد کی رضامندی ہے یعنی انتہائی کرب و اذیت کے عالم میں کوئی مریض موت کی تمنا کرنے لگے جو ایک غیر معمولی حالت ہے۔ کیونکہ زندگی کی محبت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ کوئی ڈاکٹر اپنی فنی معلومات کی بناء پر (جو آخری اور قطعی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ آئے دن جدید اکتشافات سے قدیم مسلمات کی تردید ہوتی رہتی ہے) اور آثار و علائم کی بنیاد پر گمان غالب کا اظہار کر دے کہ مرض انجام کار موت پر منتج ہوگا اور اس عرصے میں اعزہ و متعلقین کو کوئی اعتراض نہیں۔ (NO OBJECTION) کا سرٹیفکیٹ دے دیں تو معالج و مسیح ترمفاد (؟) میں مسیحا کے بجائے جلاد کا رول اختیار کرنے کا مجاز ہو جائے گا۔

موت اور زندگی کے فیصلے آسمانوں ہی میں ہوتے ہیں۔ زمین پر نہیں۔ حادثات کے دوران مقصود بند

قتل کی سازش کے سلسلے میں اور شدید امراض کے ضمن میں بیسیوں مشاہدات وتجربات اس حقیقت کی توثیق کرتے ہیں. نحن قدرنا بینکم الموت. ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے " مرنے والے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کی آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں بلکہ ڈاکٹر خود اپنے وقت پر مر جاتے ہیں کبھی کوئی نہ موت کے وقت کو جان سکا ہے. ذاتی ہوئی موت کو روک سکا ہے نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ کس کی موت کس ذریعے سے، کس طرح واقع ہونے والی ہے۔ (تفہیم ج ۵ ص ۲۸۶)

یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کی جانی چاہیے کہ عام معیار تعلیم ہی انحطاط پذیر نہیں میڈیکل کالج بھی ابتری کا شکار ہیں۔ رضاکارانہ اعانت (۹۹) (DONATION) کی رسم طلبہ میں محنت وعرق ریزی اور حصول علم کی خاطر شب زندہ داری سے گریز کا رجحان امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے مختصر راستوں کی دریافت مجموعی صورت حال ایسی ہے کہ آج کے معالج کی رائے پر زندگی اور موت کے فیصلے کو موقوف منحصر کرنا بداہتہً قرین دانش نہیں ہو سکتا ـــــ اور کوئی مجلس قانون ساز اگر جذباتی انتشار اور بے ربطی کے شکار اور مبتلائے آزار ذہن کے مریضوں کے بیان پر اور معالج کے گمان غالب پر ہر شخص کے اپنی جان کے آلات کا حق تسلیم کرنے کا اور وسیع تر مفاد کا نام لیکر معالج کو مجاز گردانتی ہے کہ وہ مریض کو موت کی نیند سلا دے تو اس کا مطلب ہوگا کہ قانون سازوں نے آبادی گھٹانے کا ایک اور نسخہ تلاش کر لیا۔ ؎ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

(MERCY DEATH) کے "قائلین" ترحم ہیتہ" حضرات کی یہ دلیل مغالطہ آمیز ہے کہ مخصوص آپریشن کے سلسلے میں آئے دن خود مریض اور اس کے متعلقین موت کا فیصلہ کرتے رہتے ہیں یا اقدام خودکشی کے اثرات مابعد کے ازالے کی تدابیر کے دوران پچاس فیصدی اشخاص "جاں بحق" ہو جاتے ہیں۔ یا قاتل کے حق میں عدالت فیصلہ صادر کرتی ہے یا ایک بڑی تعداد کو محاذ جنگ پر بھیج دیا جاتا ہے اور وہاں وہ لقمہ اجل ہو جاتے ہیں. پہلی دو مثالیں موت کے فیصلے کی ہیں ہی نہیں۔ جان بچانے کی کوشش میں اگر موت واقع ہو جائے تو معالج کو تحفظ دینے کی مثالیں ہیں کہ وہ مستلزم سزا نہ قرار پائے۔ یہ ایک معمول کی پیش بندی ہوتی ہے۔ موت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ پھانسی کی سزا پانے والوں اور محاذ جنگ پر بھیج دیے جانے والوں کی مثال بر سبیل ترحم ہلاک کر دینے والوں کی جانب سے بے محل اور مضحکہ انگیز ہے۔ قاتل جو پھانسی کی سزا پاتا ہے اور سپاہی جو میدان جنگ میں نقد جان ہارتا ہے۔ دونوں کی موت پر (MERCY DEATH) کا اطلاق کون کرے گا۔ در اصل

ان مثالوں کے ذریعے زور اس بات پہ ہے کہ دونوں مثالوں میں مرنے والے نہیں بلکہ دوسری ایجنسیاں یعنی عدالت اور اعلیٰ حکام موت کا فیصلہ کرنے والی ہیں ـــــ پھر اگر کوئی شدید کرب میں مبتلا ہو تو کوئی ترس کھانے والا اس کو مار کر تکلیف سے چھٹکارا کیوں نہ دلادے۔ یہ تو ایک معصوم اور مقدس جذبے کے تقاضے کی تکمیل ہوگی۔

جو کام تیغ و تفنگ سے نہیں لیا جا سکتا وہ کام عہد حاضر میں وضع اصطلاحات سے لے لیا جاتا ہے۔ "وسیع تر مفاد" (LARGER INTEREST) بھی ایسی ہی اصطلاح اور فریب دہ عنوانات کے قبیل کی شے ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا ہے۔ ہوم منسٹر کسی ناخوشگوار حقیقت سے پردہ نہیں اٹھانا چاہتا ہے تو وسیع تر مفاد کا حوالہ دیتا ہے۔ کوئی سفارت کار یا صاحب اقتدار پریس کانفرنس میں نامہ نگاروں کے "منقاب کش" سوالوں کے جواب سے بچنا چاہتا ہے تو اسی اصطلاح کی پناہ لیتا ہے۔ محافظین امن و قانون کی ستم رانیوں کو سند جواز دینی ہو تو یہی اصطلاح کام آتی ہے۔ اس اصطلاح کے استعمال کرنے والے کے معہود ذہنی کے مطابق اس کا مفہوم بدلتا رہتا ہے ـــــ مریضوں، معذوروں اور کسب معاش کی اہلیت نہ رکھنے والوں (کچھ عرصہ قبل اخبارات کے صفحات میں آخر الذکر قسم کے اشخاص کے بارے میں بھی وسیع تر مفاد کے حوالے سے بحث چلتی رہی ہے) کو آبادی سے منہا کر دینے میں جن لوگوں کو وسیع تر مفاد مضمر نظر آتا ہے دراصل ان کے ذہن پر معاشی ابتری کا اندیشہ کابوس بن کر مسلط ہے۔

ترحم (MERCY) کی حقیقت بھی کیا ہے مبتلائے آلام کسی شخص کو کرب و اذیت سے نجات دلانے کی خواہش آخری تجزیہ و تحلیل میں فی الحقیقت خود غرضی اور سکون طلبی ہے۔ یہ دراصل صبر و تحمل کے ساتھ تشفی اور علاج کی تدبیر سے فرار اور ایک کرب ناک منظر کے مشاہدے کے ردعمل سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کو اچھا سا نام دینا ہے۔

مقالے میں آگے چل کر تحریر کیا گیا ہے:۔

"جنگ کو چھوڑ کر بالارادہ خود زندگی کو ختم کرنے کی خواہش کے کیس ان لوگوں کے ہوتے ہیں جو جسمانی یا دماغی طور پر مریض ہوتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے چند باتوں کا اطمینان کر لینا ضروری ہے۔ مریض اس کے قریبی رشتہ داروں، اہل خاندان، معالج اور دوسرے متعلقین کی مرضی۔

بہت حزم و احتیاط کے ساتھ اس امر کا یقین کہ تشخیص صحیح ہے۔ علاج اور دوسرے متعلق امور کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اندازہ، ان امور کے علاوہ بعض دوسرے اہم عوامل کو بھی نگاہ میں رکھنا، مثلاً مریض کی عمر اس کی عام نفسیات، جذباتی سطح دماغی اور جسمانی اذیت کا کم و کیف، (مستقبل کے امکانات ماضی اور حال کی روشنی میں) اہلیت اور ذمہ داری، زندگی اور موت کے بارے میں اس کا نقطہ نظر، ان امور کے بارے میں خود مریض اور خاندان کے کلیدی ارکان سے گفتگو کر کے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے ایک انتہائی محتاط ذہن کا اندازہ ہوتا ہے مگر حیرت ہے کہ ایک ایسے ذہن کے آدمی کو بھی زیر بحث موقف کی عقلی بنیاد کمزور نہیں نظر آتی اپنے اس اعتراف کے باوجود کہ موت کے خواہشمند جسمانی یا دماغی طور پر مریض ہوتے ہیں اور یہ کہ وہ شرائط جو انھوں نے عائد کی ہیں ان کی تکمیل ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل یقیناً ہے۔

اور آگے مقالے کو ختم کرتے ہوئے :۔

"ایک غیر یقینی عامل معجزانہ طور پر بعض مریضوں کا صحتمند ہو جانا ہے لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ معجزانہ طور پر صحت کا بحال ہو جانا ایک بعید از امکان امر ہے اس کو اغلب احتمال کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ معجزہ ظہور پذیر ہی نہ ہوا اور بیماری خراب تر شکل اختیار کرلے۔"

ایک فیصدی بھی اگر معجزے کا ظہور تسلیم ہے تو کسی بھی مریض کو موت کے گھاٹ اتار دینا غلط ہے معجزے کے ظہور پذیر نہ ہونے کی صورت میں اگر بیماری خراب تر شکل بھی اختیار کر لیتی ہے تو کیا فرق پڑے گا اگر خاتمۂ زندگی کا فیصلہ ہی کر لیا گیا ہے۔

مزید:۔ اب جو کچھ ہوتا ہے وہ فی الحقیقت زندگی کی تطویل نہیں بلکہ موت کی تاخیر ہے خود مریض کی منشا کے خلاف جو اپنی موت کے طریقے اور وقت کا فیصلہ کرنے کے بارے میں آزاد نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر لوگ اطمینان سے گھر پر "جاں بحق" ہونے کے بجائے ہسپتال میں مرتے ہیں۔"

"گھر پر مرنے کی بات" لغو اور مضحکہ خیز ہے۔ بعض ستم ظریف اشخاص کو دیکھا گیا کہ انھوں نے پہلے خاصی کشادہ، شاندار پختہ قبر بنوا رکھی تھی اس منصوبے کے ساتھ کہ وہ ان کا ابدی مرقد اور آرامگاہ ہوگی اور دفن ہوئے ایسی سرزمین میں جو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ رہی ہوگی۔ لا تدری نفس ماذا تکسب غداً ولا تدری نفس بای ارض تموت۔ کسی کو نہیں معلوم کل کیا ہونا ہے۔ کوئی متنفس

نہیں جانتا کس سرزمین میں اس کو موت آئے گی۔ موت انسانی عزائم اور آمال کی پابند نہیں ہے۔ لوگ گھر میں بھی مرتے ہیں اور ہسپتال میں بھی، سفر میں بھی اور حضر میں بھی۔ ویسے آج کل کی اباحیت پسندی نے خاندانی نظام کا شیرازہ ایسا بکھیر کر رکھ دیا ہے کہ "گھر" کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہ گیا ہے۔ ایک خاتون ڈاکٹر نے جو امریکہ میں مقیم ہیں بتلایا کہ وہ ایک ایسے "دار الضعفاء" (OLD PEOPLES HOME) کی انچارج ہیں جس میں ۸۰ سال سے کم عمر کا کوئی مریض نہیں۔ یہاں ان کے قیام اور عمومی نگہداشت کا انتظام ہے جس کے لیے وہ یا ان کے متعلقین ماہوار ایک متعین رقم ادا کرتے ہیں۔ ضعیفی کی حالت میں یہ لوگ گھر (اگر فی الواقع کوئی ہو) کے مانوس درو دیوار سے دور دار الضعفاء میں ڈال دیے گئے ہیں کہ زندگی کے دن پورے کریں اور اولاد و اقرباء کی عافیت میں مخل نہ ہوں، ان کے عیش کو مکدر نہ کریں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ○

موضوع زیر بحث سے متعلق اسلامی تعلیمات اور زاویۂ نگاہ آئندہ قسط میں۔

نصب العین اور اُس کے تقاضے

(ڈاکٹر محمد عمران لاری)

اپنی ملت کا قیاس اقوام مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

نصب العین یا مشن کا نام لیتے ہی ایک مومن کے ذہن میں ایک انقلابی لہر ابھر آتی ہے دلوں میں اس کی حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔ نگاہوں کے سامنے ایک بامقصد تنظیم کی تصویر آجاتی ہے جو اللہ کی اس وسیع و عریض زمین پر مقدس اور ہمہ گیر انقلاب چاہتی ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں اللہ کا رنگ بھر دینا چاہتی ہے سارا حق خدا کا تسلیم کرتی ہے جو قیصریت کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ ایک بنیان مرصوص۔ ایک تحریک۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔

صحیح معنوں میں ایک اسلامی تحریک جو آج سے تیرہ سو سال پہلے وادی بطحا میں چند نفوس قدسیہ کے جلو میں نمودار ہوئی تھی اور دیکھتے دیکھتے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں پورے جزیرۃ العرب پر چھا گئی تھی اور آگے چل کر اس نے روم و ایران کے آہنی قلعوں کو توڑ کر انسانیت کو نئی زندگی سے ہمکنار کیا تھا

ان چند تمہیدی کلمات کے بعد نصب العین اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہمارا بہترین رہبر تو یا قرآن نبیؐ کی سیرت اور صحابہ کرام کی سرگرمیاں پیش کر دیتا ہے۔ اسلامی تاریخ پڑھیے۔ مکہ کی تپتی ہوئی گلیوں میں بدر و احد کی وادیوں میں، خندق اور تبوک کے مرحلوں میں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ میں نصب العین کے تقاضے نظر آئیں گے۔

تقاضے

(۱) سب سے پہلی چیز جو کسی نصب العین کو برپا کرنے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کی پشت پر ایک تنظیم کا ہونا انتہائی ناگزیر ہے اگر آج کسی نصب العین کا اعلان دو ہاتھوں اور دو پیروں نے کیا ہے تو وہ تقاضا کرتا ہے کہ کچھ اور ہاتھ بھی آگے بڑھیں اور کچھ اور پیر بھی اس راہ کے کانٹوں سے آشنا ہوں کچھ اور دلوں میں اس کی دھڑکن محسوس کی جائے۔ اگر یہ نہیں ہے تو اس کی تاریخ میں سورج کے طلوع ہونے کا تصور ایک خواب کے سوا کچھ نہیں۔ فتح مکہ تو بہت دور کی بات ہے، واقعہ بدر بھی پیش نہیں آسکتا۔ نصب العین اور جماعت دونوں کا تعلق روح اور جسم کا ہے۔

(۲) دوسری چیز نظم اور ڈسپلن ہے۔ دنیا کی کوئی بھی تحریک ہو وہ ماسکو سے سرخ جنت کا خواب دیکھتے ہوئے اٹھی ہو یا بیت اللہ سے خدا کی حاکمیت کا اعلان کرتے ہوئے آئی ہو۔ بہرحال نظم اور ڈسپلن چاہتی ہے۔ نظم اور ڈسپلن میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ پوری کائنات میں ہمارے لیے نظم اور ڈسپلن کا سبق موجود ہے سورج کا ایک معلوم وقت پر نکلنا اور ڈوب جانا رات دن کا الٹ پھیر صبح و شام کی آمد و رفت ستاروں کی گردش، غرض سارا نظام اس پر گواہی دے رہا ہے کہ کسی طرف بگاڑ نہیں کسی گوشے میں انتشار نہیں

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور
وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ	رات اور دن کے باری باری سے آنے میں
لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؀	ہوشمند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں

کائنات کی ہر چیز جہاں وہ مامور ہے اپنا کام کر رہی ہے۔ اسی طرح تحریک اسلامی کے افراد کی ڈیوٹیاں جہاں لگا دی جائیں اور وہ ان کو کمال دلچسپی سے پوری کرتے رہیں تو وہ تحریک مکہ کی تپتی ہوئی گلیوں سے گزر کر فتح مکہ سے ہمکنار ہو جائے گی اور انسانی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کرے گی۔

چوتھی چیز جس کا نصب العین اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے وہ سمع و طاعت کا زندہ تصور ہے۔ سمع و طاعت کی تھوڑی سی خلاف ورزی پوری اسلامی جماعت کو آزمائش میں ڈال سکتی ہے۔ کامیابی کے ساحل تک پہنچتے پہنچتے تحریکیں ہمیشہ کے لیے ساحل کے قریب ڈوب جایا کرتی ہیں، چند افراد کی غلطی پوری جماعت کو امتحان میں ڈال دیتی ہے۔

اسلامی تاریخ کا عظیم سانحہ احد کی وادی میں رونما ہوا اس کو تاریخ سے نکالا نہیں جا سکتا

جب کوئی سپاہی سمع وطاعت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے تو وہ خود بھی ڈوب جاتا ہے اور پوری جماعت کو چند لمحہ کے لیے امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ جنگ احد پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن کریم گواہی دے رہا ہے کہ:۔

"اللہ نے تائید ونصرت کا) جو وعدہ تم سے اس نے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے" (آل عمران ۱۵۲)

جس قدر خدا کا پختہ اور مستحکم یقین ہو گا اسی قدر اطاعت امر کو جلا ملتی جلائے گی۔ احد کی وادی میں چند لوگوں نے اطاعت امر کا قلادہ چند لمحہ کے لیے اتار دیا تو وہی فتح شکست میں تبدیل ہونے لگی۔ خدا کی گرفت بے لاگ ہوتی ہے۔ حالانکہ اس جنگ میں پیارے نبی ؐ کی ذات مقدس موجود تھی جن کے اشارہ ابرو پر صحابہ کرام جان دینا اپنی زندگی کی معراج سمجھتے تھے آپ نے جس مقام پر پچاس افراد کو قائم رہنے کی تاکید فرمائی تھی تھوڑی سی دنیا کی محبت میں گرفتار ہو کر ان میں سے اکثر افراد نے اطاعت امر کی زنجیر ہاتھوں سے چھوڑ دی جس کے نتیجہ میں پوری اسلامی فوج ہزیمت سے دوچار ہو گئی حالانکہ اس میں وہ لوگ شریک تھے جو امتحان کی بھٹی سے گذر چکے تھے اس میں بدر کے غازی بھی تھے اور شعب ابی طالب کے مکین بھی۔ اس واقعہ میں آئندہ آنے والی اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کے لیے ایک اچھا سبق ہے۔ اس کوچہ میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کا گذر نہیں۔ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لیجیے۔ یہاں تو سمع وطاعت کی قربان گاہ پر اپنی پوری زندگی کا سودا کرنا ہو گا۔

جنگ کا میدان ہو یا اجتماع کی ذمہ داریاں، زبان وقلم کی قوت ہو یا تقریر کا اسٹیج، خدمت خلق کے مرحلے ہوں یا سفر کی تکلیفیں، ساری صلاحیتوں کو سمع وطاعت کی قربان گاہ پر نچھاور کر دینے ہی میں فتح مکہ کا راز پوشیدہ ہے۔

جب جماعت نے پکارا کہ من انصاری الی اللہ تو فارم پر کرتے وقت ہم نے اپنے زبان حال سے کہا تھا کہ نحن انصار اللہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ ہمارا اپنا کچھ نہیں ہے۔ ہماری صلاحیتیں، ہمارا سرمایہ، ہمارے مشاغل، ہماری تفریحیں۔ سب کچھ دین کی خاطر ہیں۔

پانچویں چیز رحماءُ بینھم ہے جس کا نصب العین اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے۔ افراد آپس میں رحیم ہوتے ہیں۔ ایک کی تکلیف سب کی تکلیف بن جاتی ہے۔ ایک کا درد سب کا درد بنکر دلوں میں ٹیس پیدا کرتا ہے ان کے سوچنے کے انداز ایک ہیں۔ اللہ کی زمین پر ایک ایسی جماعت جس میں خاندانی برتری کا کوئی سوال نہیں، نسلی غرور کا شائبہ نہیں کالے اور گورے کا کوئی مسئلہ نہیں، سرمایہ دار اور مزدور کا کوئی امتیاز نہیں یہاں نہ کوئی عظیم ہے اور نہ کوئی حقیر۔ دنیا کے تمام رشتوں سے یہ رشتہ مضبوط۔ یہاں دلوں میں جذبہ ایثار کا دریا امنڈ رہا ہے۔ یہاں محبتوں کے چشمے ابل رہے ہیں۔ یہاں اگر ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں تو بغل میں حبش کے بلال بھی ہیں، روم کے صہیب ہیں اور فارس کے سلمان بھی نظر آرہے ہیں، عمار بن یاسرؓ بھی ایک طرف کھڑے ہیں حقیقتاً ایک اسلامی جماعت، ایک اسلامی اتحاد، ایک بنیان مرصوص۔ اللہ کی محبت سے سرشار جماعت، ایک انقلابی تنظیم۔

آیئے دلوں کا جائزہ لیں۔ ہم میں نسلی غرور تو نہیں۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کو ہمارے کسی فعل سے ہوا تو نہیں مل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو رحماء بینھم کی خوبیوں سے لبریز کردے۔ آمین!

چھٹی چیز جس کا نصب العین اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے وہ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّار کی خوبی ہے۔ یہ جماعت داخلی طور پر جس قدر منضبط ہوگی خارجی طور پر باطل کے لیے اسی قدر سخت ہوگی۔ اس کو چہ میں مداہنت کا گذر نہیں، اصول کی سوداگری نہیں۔ یہاں دل بدلی کا کوئی سوال نہیں۔ ان کی دوستی اور دشمنی کا معیار خدا کی ذات ہے۔ یہاں ابوطالب دور ہوتے نظر آئیں گے اور بلال قریب سے قریب نظر آئیں گے۔ اس کارواں میں نوحؑ بھی نظر آئیں گے جنھوں نے توحید کی راہ میں بیٹے کو ڈوب جانے دیا اور اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ کا سبق لیکر آگے بڑھ گئے۔ حضرت لوطؑ بھی نظر آرہے ہیں جو تحریک حیات سے بیزار ہیں لیکن مداہنت کو قریب نہیں آنے دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نظر آرہے ہیں جنھوں نے باپ کو سلام علیکم کہہ کر غریب الوطنی کی زندگی کو گوارا کرلیا۔ آسیہ کی مقدس روح بھی مسکرا رہی ہے جنھوں نے فرعون کی سختیاں بخوشی گوارا کرلیں لیکن حق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

یہ چند سطریں لکھتے وقت جب اپنے دل کا جائزہ لیتا ہوں تو قلم خود ہی گواہی دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ تیری لفاظی ہے تونے تو دنیا سے مصالحت کرلی ہے۔ سب سے آخری اور اہم چیز جس کا ایک نصب العین اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے وہ ہے آخرت کا زندہ یقین، اس دن ہمارا کیا حال ہوگا جب کہ

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاھِھِمْ وَتُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْھِمْ وَتَشْھَدُ اَرْجُلُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝
(یٰسٓ۔ ۶۵)

آج ہم ان کے منھ بند کیے ہوئے ہیں ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔

ہمارے اعمال کی فلم تیار ہورہی ہے۔ قدرت کا ٹیپ ریکارڈ ہماری حرکتوں کا ریکارڈ محفوظ کر رہا ہے۔ آخرت کا زندہ تصور ہی تو تھا جس نے ابو بکرؓ و عمرؓ کو بے چین رکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت مل چکی تھی لیکن خشیت الٰہی کی مکمل تفسیر تھے۔ کہا کرتے کہ کاش ابو بکر چڑیا ہوتا کہ جنگل اور شام کو گھونسلے میں آجاتا اور اس سے حساب نہ لیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کہا کرتے کہ کاش عمر مٹی ہوتا کہ لوگ پیروں سے روندتے اور حساب نہ لیا جاتا۔

اللہ سے دعا ہے کہ یہی نصب العین ہماری زندگی کا حاصل بن جائے۔ ہزاروں دلوں کی دھڑکن ہوگی اسی کی خاطر ہم جینا اور مرنا سیکھیں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

کہو میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے

کفرانِ نعمت

نعمت کو مُنعم کے سوا کسی اور کا عطیہ سمجھنا اس پر کسی اور کا احسان مند ہونا اور مُنعم کے سوا کسی اور سے نعمت پانے کی امید رکھنا یا نعمت طلب کرنا یہ سب کفرانِ نعمت ہے۔ اسی طرح یہ بھی کفرانِ نعمت ہے کہ آدمی منعم کی دی ہوئی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے۔ لہٰذا ایک مشرک اور کافر، اور منافق اور فاسق انسان محض زبان سے شکر کے الفاظ ادا کرکے خدا کا شاکر بندہ قرار نہیں پاسکتا۔

قوموں کی زندگی

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

یہ مضمون تمام مسلمانوں کیلیے مفید ہے۔ خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں بستے ہوں۔

عالم اسلام سے مراد اس کی سرزمین نہیں ہے، اس کے پہاڑوں اور دریاؤں کا نام نہیں ہے۔ ان انسانوں کا نام ہے جو اس سرزمین پر بستے ہیں۔ یہ انسان فانی ہیں ہر ایک کو اپنی ایک عمر گذار کر رخصت ہو جانا ہے۔ اس سرزمین میں ہماری تہذیب، ہماری ثقافت، ہمارا تمدن اور ہمارا نظام زندگی اگر باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح رہ سکتا ہے کہ جو میراث ہم نے اپنے اسلاف سے پائی ہے وہ آگے کی نسل کو ٹھیک ٹھیک سونپ دیں اور اس کو اس قابل بنا کر جائیں کہ وہ اس میراث کو صحیح طریقے سے آئندہ نسلوں کے حوالے کر سکے۔

دنیا میں جو قومیں مٹی ہیں وہ اس معنے میں نہیں مٹیں کہ ان کی نسل ختم ہو گئی۔ وہ اگر مٹی ہیں تو اس لیے کہ ان کا قومی تشخص ختم ہو گیا۔ ہم جب کہتے ہیں کہ مثلاً بابل کی قوم مٹ گئی تو وہ اس معنے میں ہوتا ہے کہ اہل بابل اور جس تہذیب کے علمبردار تھے اس کی خصوصیات مٹ گئیں اور اس کے امتیازی اوصاف ختم ہو گئے۔ اہل بابل کی نسل آج بھی موجود ہے، مگر ان کا تشخص ختم ہو گیا۔ قدیم مصریوں کی نسل بھی موجود ہے مگر فرعونی اور قبطی تہذیب و ثقافت ختم ہو گئی کیونکہ ان کی نسلیں اس قابل نہ رہیں کہ بعد کی نسلوں تک اپنی قومی میراث کو ٹھیک ٹھیک منتقل کر سکتیں۔ کسی قوم کی نئی نسلیں اگر اپنا قومی تشخص کھو دیں اور کوئی دوسرا تشخص اختیار کر لیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قوم ختم ہو گئی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل کے دس قبیلے غائب ہو گئے، جن کا آج کہیں پتہ نہیں چلتا۔ یہ اس معنے میں نہیں ہے کہ ان کا قتل عام ہوا تھا اور ان کا

بیج ہی دنیا سے مٹ گیا، بلکہ اس معنی میں ہے کہ ان کے اندر سے اسرائیلیت کا احساس ختم ہو گیا اور ان کی نسلوں میں اسرائیلی شعور نہ رہا۔ اسرائیلی خصوصیات اور اسرائیلی تہذیب و تمدن کے امتیازی اوصاف کھو دینے کے بعد وہ دنیا کی دوسری قوموں میں جذب ہو کر رل مل گئے اور آج خود ان کی اولاد بھی یہ نہیں جانتی کہ ہم اسرائیلی ہیں۔ اس لیے ایک قوم کے زندہ رہنے کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی آئندہ نسل کو اس طرح تیار کرے جس سے وہ اس کے قومی تشخص کو برقرار رکھ سکے۔ اسی چیز کی اہمیت میں اس وقت آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں۔

یہ زمین جسے آج عالم اسلام سے تعبیر کرتے ہیں ہمارے اسلاف نے اس غرض کے لیے حاصل کی تھی کہ یہاں اسلامی تہذیب جلوہ گر ہو۔ ہم جس نظام زندگی کے قائل ہیں اس کو یہاں عمل میں لایا جا سکے۔ ہم جن قوانین اور جن اصول حیات کو صحیح سمجھتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سرزمین میں رائج ہوں۔ مسلمان قوم کی بقا کا انحصار بھی دوسری تمام قوموں کی طرح اس بات پر ہے کہ جو تہذیب، جو تمدن اور جو اصول حیات اسلام کے نام سے موسوم ہیں، جن کو ہم نے اپنے بزرگوں سے پایا ہے، جن کی بنا پر ہم دوسروں سے الگ ایک مسلمان قوم سمجھے جاتے ہیں۔ یہ صحیح طریقے سے آئندہ نسلوں تک پہنچیں، آئندہ نسلیں اسی رنگ میں رنگی جائیں اور ان کو ہم انہی اصولوں کے مطابق تیار کر کے جائیں تاکہ اس پاکستان میں مسلمان قوم زندہ رہ سکے۔ مسلمان افراد زندہ نہیں رہ سکتے لیکن قوم صدہا برس تک زندہ رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس قابل ہو کہ اس تہذیبی میراث کو منتقل کر سکے اور نسل در نسل اس کے منتقل ہونے کا سلسلہ چلتا رہے۔ اگر ہم ان امتیازی خصوصیات کو باقی نہ رکھ سکیں اور ہماری نئی نسلیں اسلامی تہذیب کے بجائے مثلاً امریکی تہذیب میں رنگی جائیں تو آئندہ یہ پاکستان نہ ہوگا بلکہ امریکستان ہوگا۔ ہماری نسلیں موجود رہیں گی مگر امریکیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوں گی۔ وہ اسلامی تہذیب کا بقا نہیں ہوگا اور اس سے ہمارا قومی تشخص بدل جائے گا۔ اس چیز سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ طلبہ کا مسئلہ حقیقت میں کیا ہے اور وہ کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ محض تعلیم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہمارے قومی وجود اور اس کے بقا کا مسئلہ ہے۔ ہم یہاں ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے اسی طرح زندہ اور باقی رہ سکتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل جو درس گاہوں میں تیار ہو رہی ہے وہ ٹھیک ٹھیک اسلامی تہذیب کی حامل ہو اور اس کی علمبردار بن کر اس سرزمین میں رہے۔

تنزانیہ کی اسلام دشمنی

تنزانیہ کے صدر جولیس نریرے کی بائیں بازو کے دانشور بڑی تعریفیں کرتے ہیں ۔ بھارت نے نریرے کو انعام بھی دیا ہے ۔ لیکن نریرے کی انسان دوستی کا حال تنزانیہ کے مسلمانوں سے دریافت کیجیے ۔ مخالفین کے لیے نریرے حکومت کے دل میں کوئی نرمی نہیں ہے ۔ اشتراکیت کے خلاف جو بھی آواز کہیں سے اٹھتی معلوم ہوتی ہے اسے بلا تاخیر دبا دیا جاتا ہے ۔ تنزانیہ کے بارے میں ایک رپورٹ کے مطابق :۔

> وہاں بغیر مقدمہ کے نظر بندی کا سلسلہ بے تکلف جاری ہے جس پر شبہہ گزرتا ہے اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا ہے ۔ مخالفین کو تھانوں اور جیلوں میں سخت اذیت پہنچائی جاتی ہے ۔ تعلیم گاہوں میں اشتراکی تعلیم لازم کر دی گئی ہے اسی طرح اشتراکی دیہات بنائے گئے جن میں سب ملکیتیں بزور ضبط کر لی گئی ہیں ۔

قیام امن کے لیے نریرے حکومت نے ایک فورس تیار کی ہے جس کا نام سنگو سنگو ہے ۔ اس فورس کا مقصد بظاہر امن و امان قائم کرنا ہے لیکن حقیقت میں یہ بھٹو کے زمانے کی ایس ایف ایس ہے جس کا اصل مقصد مخالفین اشتراکیت کو کچلنا اور دبانا ہے ۔ یہ فورس کٹر اشتراکیوں پر مشتمل ہے جو خوف و دہشت کے ذریعے لوگوں کو مذہب سے روکتے ہیں ۔ سنگو سنگو میں زیادہ تر عیسائی اور بت پرست قبائل کے افراد بھرتی کیے گئے ہیں جو اپنے عقائد کے اعتبار سے بھی اسلام دشمن ہیں ۔ وہ مسلمانوں کو جس طرح تنگ کرتے اور دباتے ہیں اس کا اندازہ ایک رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے

جھیل وکٹوریہ کے قریب ایک گاؤں بوزورو گا پر سنگو سنگو نے چھاپہ مارا اور تمام گاؤں والوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے ان کی قمیصیں اتروالیں ۔ پھر انہیں سورج کے رخ میں منہ کر کے اس کی عبادت کرنے پر مجبور کیا

مسلمانوں نے مزاحمت کی تو ان کی مسجدیں گھس کر قرآن پاک کے نسخے پھاڑ دیے گئے۔

یہ مسلمانوں کا اس ملک میں حال ہے جس کی ۷۰ فیصدی آبادی مسلمان ہے۔ جولیس نریرے عیسائی اور اشتراکی ہے اور تمام کلیدی سرکاری مناصب پر عیسائی اور غیر مسلم چھائے ہوئے ہیں۔ یہ نیریرے ہی تھا جس نے یوگنڈا پر حملہ کرکے عیدی امین کو نکالا تھا۔ عیدی امین کا قصور یہ تھا کہ وہ مسلمان تھا اور مسلمانوں کو بڑھاوا دیتا ہے۔ یہ چیز عیسائیوں کو کھا گئی۔ چنانچہ عیدی امین کے مخالفین نے نیریرے سے ساز باز کرکے یوگنڈا پر حملہ کیا اور وہاں عیسائی حکمران مسلط کر دیا گیا۔ عیدی امین کے بارے میں مغربی پریس میں یہ پروپیگنڈہ عام تھا کہ وہ ظلم کرتا ہے لیکن اس کے جانے کے بعد خود مغربی پریس نے انکشاف کیا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ مخالفین حکومت کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔

تنزانیہ کے دستور کے مطابق مملکت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور مذہب کے معاملے میں وہ غیر جانبدار ہے لیکن مسلمانوں کے معاملے میں اس کا طرز عمل کسی طرح بھی غیر جانبدارانہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کی ایک انجمن ایسٹ افریقن مسلم ویلفیئر سوسائٹی تھی اس کی فعالیت حکومت کو کھٹکتی تھی چنانچہ اسے توڑ کر خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔

اب دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ اسلامی نام ترک کر دیے جائیں۔ (مغاربہ میں تو یہ مہم بڑی شدت سے اٹھائی گئی ہے) اسلامی ناموں کے ہجے اس طرح تبدیل کر دیے گئے ہیں کہ ان کی اسلامی پہچان باقی نہیں رہی۔

تنزانیہ کی آبادی دو کروڑ ہے جس میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ مسلمان ہیں لیکن ان کو مملکت سے جو حصہ ملتا ہے اس کا اندازہ ذیل سے کیا جا سکتا ہے۔

دارالسلام یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں ۳۳ طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ ان میں صرف ایک مسلمان ہے

دندان سازی کے چودہ طلبہ کو حال ہی میں ڈگری دی گئی ہے، ان میں صرف ایک مسلمان تھا۔

مفادِ عامّہ

یہ اصطلاح حقائق کو چھپانے کا ایک بہانہ ہے۔ یہ سیاسی بے حیائی کی ایک غلیظ قسم ہے حکومت کا کوئی ترجمان جب یہ اصطلاح استعمال کرکے لوگوں کے منہ بند کرتا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "دال میں کالا ہے" مفاد حکومت اور مفاد خاص کے لیے مفاد عامہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

عیسائی مشنریوں کی ہولناک سرگرمیاں

پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ بنگلہ دیش میں تقریب دس لاکھ مسلمانوں نے بھوک اور فاقہ سے تنگ آکر عیسائیت قبول کرلی ہے۔ یہ خبر اگرچہ مبالغہ آمیز تھی تاہم یہ بڑی ہولناک اور سنسنی پیدا کرنے والی تھی۔ یہ خبر درحقیقت بنگلہ دیش اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر عبد السبحان کے بیان پر مبنی تھی۔ انھوں نے ۱۹ مئی ۱۹۸۵ء اپنے ایک بیان میں بتایا تھا کہ :-

"پچھلے پندرہ برس میں تقریب دس لاکھ مسلمان عیسائی ہو چکے ہیں۔"

اس کی وجہ انھوں نے یہ بتلائی کہ مسلمان انتہائی غربت و افلاس کا شکار ہیں۔ بھوک سے تنگ آکر وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ڈائرکٹر جنرل اسلامک فاؤنڈیشن بنگلہ دیش کے بیان کی روشنی میں جب تحقیق کی گئی تو یہ خبر قدرے مبالغہ آمیز نکلی پھر بھی یہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے لمحہ فکریہ فراہم کرتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائی مشنری ان ممالک میں بڑی سرگرم ہے جہاں حکومت کا رجحان غیر مذہبی ہو یا جہاں کے اقتصادی حالات اچھے نہ ہوں عیسائی مشنریوں کے ایک جریدے کے مطابق عیسائی مشنریوں نے پچھلے ستّر سال میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اس کے مطابق :-

عیسائیوں کی تعداد میں پچھلے ستر سال میں اضافہ ہوا ہے۔ پہلے عیسائی ایک ارب دس کروڑ تھے اب وہ ڈیڑھ ارب ہیں اور دنیا کی کل آبادی کا ۳۲ فی صد عیسائی ہے۔

(انٹرنیشنل بلیٹن آف مشنری ریسرچ جنوری ۱۹۸۵ء)

اس جریدے میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ عیسائیت قبول کرنے والوں کی اکثریت مسلمان ہے

عہد قریب میں زیادہ تر عیسائی انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش، فلپائن اور افریقہ میں بنے ہیں۔
عیسائی مشنریوں کی تعداد بھی حیرت انگیز ہے۔ مشنری جریدے کے مطابق افریقہ اور ایشیا میں کام کرنے والے مشنریوں کی تعداد اس وقت ڈھائی لاکھ ہے اور ان کے تحت قریب ۵۳ لاکھ مبلغ و مشنری کام کر رہے ہیں۔
ان مشنوں کو مغرب سے بے پناہ امداد ملتی ہے اور ان کے بجٹ ترقی پذیر ہیں۔
۱۹۷۰ء میں ان کا بجٹ ۷۰ ارب ڈالر تھا، ۱۹۸۰ء میں یہ بجٹ بڑھ کر ۱۰۰ ارب ڈالر ہو گیا۔
ورلڈ کرسچین انسائیکلوپیڈیا کے مطابق پوری دنیا میں عیسائیت کے تبلیغی مقاصد کے لیے ۱۲۷ ارب ڈالر سالانہ خرچ ہو رہا ہے۔
ان تبلیغی مشنوں کو دنیا کی بڑی بڑی ریاستوں سے فنڈ ملتے ہیں۔ مغربی جرمنی کے بجٹ میں تبلیغی مقاصد کے لیے ایک باقاعدہ مد موجود ہے اور مغربی جرمنی کے ہر شہری کو اس مد کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور دینا پڑتا ہے۔ پھر یہ مشن اپنا سرمایہ بڑے بڑے اداروں میں لگاتے ہیں جس کے نفع کی ایک مد اُن کی سالانہ آمدنی میں شامل ہوتی ہے۔
ایک اندازے کے مطابق مشنوں کو اپنے سرمایے سے حاصل شدہ سالانہ نفع ۷۵ ارب ڈالر تک ہوتا ہے۔
افریقہ کے لیے تبلیغی مشن کا عنوان ہے "مسیح کو افریقہ لے چلو"۔ اس تبلیغی مہم پر اس وقت دل کھول کر خرچ کیا جا رہا ہے۔
عیسائی مشنوں کے ایک اور جریدے PLAIN TRUTH نے بتایا ہے کہ
عیسائی مشنوں کے زیر اہتمام دنیا بھر میں چلنے والے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنوں کی تعداد ۲۱ ہزار ہے۔ یہ تمام اسٹیشن صرف تبلیغی پروگراموں کے لیے وقف ہوتے ہیں۔
اسی طرح انجیل کی اشاعت پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اسی جریدے کے مطابق [illegible] میں ۴½ کروڑ انجیل کے نسخے مفت تقسیم کیے گئے۔ پچھلے ۶۰ سال سے عہد نامہ جدید کے اوسطاً ۴½ کروڑ نسخے ہر سال تقسیم کیے جا رہے ہیں۔
اگر کسی ملک میں کوئی سانحہ مثلاً طوفان یا قحط آجائے تو ان مشنوں کی سرگرمی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان مشنوں کے نزدیک مصیبت اور غربت دو نہایت قیمتی اسباب ہیں فروغ عیسائیت کے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مسلم ممالک پر زیادہ توجہ ہے کیونکہ دنیا کی دو تہائی غریب آبادی مسلم ممالک میں پائی جاتی ہے۔

رسائل و مسائل

عذابِ قبر کا انکار گمراہی ہے

(سید احمد قادری)

سوال

یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ عذاب قبر نہیں ہے۔ وہ دلیل میں "سورہ یٰس" کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ مَنۢ بَعَثَنَا مِن مَّرۡقَدِنَاۜ هَٰذَا (ہماری خوابگاہ سے ہمیں کس نے اٹھایا) مہربانی کرکے اس کا جواب دیجئے۔

جواب

جو لوگ اس آیت کو عذاب قبر سے انکار کے لئے دلیل بناتے ہیں ان سے پوچھئے کہ اس میں عذاب قبر کا انکار کہاں ہے؟ اس میں یہ تو نہیں کہا گیا ہے کہ عذاب قبر نہیں ہوگا۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ لوگ کس طرح اس کو دلیل بناتے ہیں تو اس کا جواب دیا جائے۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم کو ہماری قبر سے کس نے اٹھا کھڑا کیا۔ (یٰس آیت ۵۲)

اس آیت سے پہلے کی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اور صور پھونکا جائے گا تو وہ دفعتہً قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے (یٰس آیت ۵۱)

آیت ۵۱ میں "اجداث" کا لفظ آیا ہے یہ جدث کی جمع ہے۔ اس کے معنی قبر ہیں۔ اسی کے لئے آیت ۵۲ میں "مرقد" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے مرقد کا ترجمہ بھی "قبر" کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ترجمہ اس آیت میں سب سے بہتر ہے۔

عذاب قبر قرآن کریم سے بھی ثابت ہے اور صحیح احادیث سے بھی اور جو چیز قرآن و حدیث دونوں

سے ثابت ہو، اس کا انکار گمراہی کے سوا اور کیا ہو گا؟ سورہ المومن میں ہے۔

دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام پیش کئے جاتے ہیں اور جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم ہو گا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔ (المومن: ۴۶)

یہ آیت فرعون اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں ہے۔ یہ آیت قریبا برزخ کے عذاب کا صریح ثبوت ہے اس میں عذاب کے دو مرحلوں کا ذکر ہے۔ ایک کم تر درجے کے عذاب کا جو ہزاروں برس سے فرعون اور آلِ فرعون کو دیا جا رہا ہے اور قیامت تک دیا جاتا رہے گا۔ دوسرا شدید تر عذاب جو قیامت کے بعد انہیں دوزخ میں دیا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح جو صحیح احادیث میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ قریبا برزخ میں ہر مجرم اور ہر صالح انسان کو اس کا آخری ٹھکانا صبح و شام دکھایا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کا کوئی شخص جب مر جاتا ہے تو اس پر اس کا آخری ٹھکانا صبح و شام پیش کیا جاتا ہے وہ جنتی ہو یا جہنمی اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیری آخری جائے قرار جب اللہ تعالیٰ تجھے قیامت کے دن دوبارہ اٹھا کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔

(مختصر تفسیر ابن کثیر ج ۳ بحوالہ بخاری و مسلم و مسند احمد)

عذاب قبر کے بارے میں اتنی کثیر احادیث مروی ہیں کہ معنوی طور پر انہیں متواتر کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث یہ ہے:-

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور اس نے کہا ہم عذاب قبر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں پھر حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب قبر کے بارے میں سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نعم عذاب القبر حق (ہاں عذاب قبر حق ہے یعنی ثابت ہے اور ایک حقیقت ہے) حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ اس کے بعد آپؐ ہر نماز میں عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے۔

(مختصر تفسیر ابن کثیر بحوالہ بخاری)

اگر عذاب قبر و ثواب قبر سے متعلق تمام احادیث جمع کی جائیں اور ان کی تشریح کی جائے تو ایک طویل مقالہ یا ایک کتاب تیار ہو جائے گی۔

ان قطعی دلائل کی بنا پر اہل السنۃ والجماعت اور علمائے حق کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب کے سب عذاب قبر کے قائل ہیں۔ ان میں کوئی اس کا منکر نہیں ہے۔

درود تاج وغیرہ

(سید احمد قادری)

آج کل میرے ذہن میں ایک الجھن پیدا ہوگئی ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ درود تاج درود لکھی اور دعائے گنج العرش کی کوئی سند نہیں ہے۔ یہ انگریزوں کی سازش تھی کہ انھوں نے مسلمانوں میں اس طرح کی چیزوں کو رواج دینے میں مدد کی۔ اتفاق سے میں نے ان چیزوں کا مطالعہ کیا۔ مجھے تو ان میں کوئی بدعقیدگی اور خرابی نظر نہیں آئی۔ درود تاج میں دافع البلاء والوباء والقحط والمرض والالم ہے لیکن اسی کے ساتھ باذن ربہ ذی الحکم بھی ہے۔ بعض کتابوں میں یہ جملہ چھوٹ گیا ہے۔ اس جملے کے بعد تو یہ بات غلط معلوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح درود لکھی اور دعائے گنج العرش میں بھی کوئی خرابی نظر نہیں آتی تو پھر انھیں پڑھنے میں کیا حرج ہے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ مہربانی کر کے میری الجھن دور کیجیے۔ ایک بار پہلے بھی میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا اور آپ نے جواب سے نوازا تھا۔

جواب

آپ کے اصل سوال کا جواب دینے سے پہلے دو اصولی باتیں عرض کرتا ہوں، اگر آپ انہیں سامنے رکھیں تو انشاء اللہ آپ کے ذہن کی الجھن دور ہو جائے گی۔ پہلی بات یہ کہ دین اسلام مکمل ہو چکا ہے۔ دنیا و آخرت کی فلاح اور اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے جتنی چیزیں ضروری تھیں وہ سب بتا دی گئی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز چھوٹ گئی ہو۔ دوسری یہ کہ مشکوک اور مشتبہ عمل کو چھوڑ کر ہمیں یقینی اور غیر مشتبہ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ یقینی اور غیر مشتبہ عقائد و اعمال صرف قرآن کریم اور صحیح احادیث نبوی میں موجود ہیں۔ قرآن کریم کتاب ہدایت بھی ہے اور کتاب تلاوت بھی۔ اس کو تلاوت پر اجر کا عالم یہ ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ درود کی تعلیم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دی ہے پہلے

آپ نے تشہد (التحیات) میں سلام کی تعلیم دی السلام علیک ایہا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ، پھر جب سورہ احزاب کی آیت ۵۶ نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو آپؐ پر صلوٰۃ و سلام کا حکم دیا گیا ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضورؐ سے دریافت کیا، آپؐ نے ہمیں سلام کا طریقہ تو بتا دیا ہے، ہم آپ پر درود کس طرح سے بھیجیں ان کے اس سوال پر آپؐ نے وہ درود سکھایا جو ہم اور آپ نماز میں التحیات کے بعد پڑھتے ہیں، اس کے علاوہ آپؐ نے درود کے دوسرے صیغے بھی سکھائے ہیں اور وہ احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اب آپ خود غور کریں کہ کوئی مسلمان، قرآن کریم کی تلاوت ترک کر کے یا کم کر کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے درود کو چھوڑ کر دوسروں کے بتائے ہوئے درود کیوں پڑھے؟

اب میں آپ کے سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں، آپ نے درود تاج کے ایک غلط فقرے کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر اس کے بعد باذن ربہ ذی الحکم کا جملہ بڑھا دیا جائے تو اس کی قباحت دور ہو جائے گی لیکن آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ کس دلیل کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلاؤں اور وباؤں کو دفع کرنے کا اختیار دے رکھا تھا؟ یہ بات نہ قرآن میں ہے نہ صحیح احادیث میں، گویا یہ اپنی طرف سے ایک من گھڑت بات ہے ـــــ دعائے گنج العرش کا تو نام بھی صحیح نہیں ہے، گنج فارسی ہے اور عرش عربی، اس لئے گنج العرش کی ترکیب غلط ہے، درود تاج ہو یا درود لکھی یا دعائے گنج العرش اس کے پڑھنے پر جس اجر اور جن برکات و فوائد کی خبر دی گئی ہے اس کی سند کیا ہے؟ کسی کام کے بارے میں یہ بتانا کہ اس کے کرنے سے یہ ثواب ملے گا یا تو اللہ کا کام ہے یا رسول کا، قیاس سے یا اپنی عقل سے کسی کام کے بارے میں یہ کہنا کس طرح صحیح ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اتنا اجر دے گا؟ مسلمان اسی اجر اور انہیں فوائد کے لئے جو بالکل من گھڑت ہیں درود تاج اور درود لکھی اور دعائے گنج العرش پڑھتے ہیں اور دھوکا کھاتے ہیں، میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ درود تاج وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں۔ اور وہی پڑھیں جس کی تعلیم اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے۔

تنقید و تبصرہ

سیرت حضرت علی کرم اللہ وجہہ عمار رفیقی صفحات ۲۰۔ ٹائٹل کاغذ کتابت عمدہ۔ آفسٹ کی طباعت قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

اس پمفلٹ کے مؤلف نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ کتابچہ پہلے ماہنامہ نور میں قسطوں میں چھپتی رہی اور اب کتابی شکل میں شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب چونکہ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے اور انہیں کے لئے پیش کی جا رہی ہے لیکن اس سے فائدہ بڑے لوگ بھی اٹھا سکتے ہیں۔

صحابہ کرام بالخصوص خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی سیرتیں بچوں سے زیادہ بڑی عمر کے لوگوں کے لئے مفید ہیں۔ امید ہے کہ مختصر کتاب سے بڑے اور چھوٹے سب ہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے

مؤمن کون لوگ ہیں؟

مومن وہ لوگ ہیں جن کی اطاعت محض ظاہری نہیں ہے، یا دل ناخواستہ نہیں ہے بلکہ دل سے وہ اسلام کی رہنمائی کو حق مانتے ہیں۔ ان کا ایمان یہی ہے کہ فکر و عمل کا جو راستہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے وہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے اور اسی کی پیروی میں ہماری فلاح ہے۔

جس چیز کو اللہ اور اس کے رسول نے غلط کہہ دیا ہے ان کی اپنی رائے بھی یہی ہے کہ وہ یقیناً غلط ہے اور جسے اللہ اور اس کے رسول نے حق کہہ دیا ہے ان کا اپنا دل و دماغ بھی اسے برحق ہی یقین کرتا ہے۔

بے مثال پائیداری
لاجواب ہوائی
QAMAR ENTERPRISE
CALCUTTA-39 • PATNA-8

MONTHLY
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN
NEW DELHI-110002

Regd. No. D.NO. (DN)-348
R.N. NO. 42893/84
SEPT. 85

صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس میں چھپا

ماہنامہ
زندگی نو
نئی دہلی ۲

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

• اسلام کا فلسفۂ اخلاق • اسلام کیسے اخلاق پیدا کرنا چاہتا ہے • عام انسانی اخلاق اور اسلامی اخلاق کا فرق • دین کی بنیادی تعلیمات سمجھنے کے لیے ایک ناگزیر کتاب۔

بناؤ اور بگاڑ

• دنیا میں قوموں کے عروج وزوال کے اخلاقی ضابطے • انسانیت کی فلاح کے بنیادی اصول • زندگی کا حقیقی شعور پیدا کرنے کے لیے دل نشیں رہنمائی

اسلام اور جاہلیت

• علم اور قیاس کا فرق اور ان کے زندگی پر اثرات • زندگی کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ • اسلام اور جاہلیت کا فرق • جاہلیتِ خالصہ اور اس کی اقسام • دین کا شعور اور یقین بخشنے والی کتاب۔

مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی

جلد: ۳	محرم الحرام ۱۴۰۶ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۵ء	شمارہ: ۴

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے
جناب سید احمد عروج قادری، مدیر "زندگیِ نو" گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں چھپوا کر
دفتر ماہنامہ "زندگیِ نو" ۱۵۲۵، سوئی والان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: [illegible] فون: [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

۳۰ راگست ۱۹۸۵ء کے ہندوستان ٹائمز دہلی میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان یہ ہے:۔ "اسلامک فنڈامنٹلزم این آئیڈیا ہوز ٹائم ہیز گون" "اسلامی بنیاد پرستی۔ ایک نظریہ جس کا زمانہ گزر چکا ہے" یعنی اسلام ایک آوٹ آف ڈیٹ نظریہ ہے۔ یہ مضمون لندن یونیورسٹی میں پالیٹکس کے ایک پروفیسر ELIE KADOURI کا ہے۔ یہ مضمون ڈیلی ٹیلیگراف لندن میں چھپا تھا اور اب ہندوستان ٹائمز دہلی میں شائع کیا گیا ہے۔ اس اخبار نے ہندوستان کے باشندوں کو بھی اس مضمون سے محروم رکھنا مناسب نہیں سمجھا اس لیے کہ جس طرح لندن کا معلم سیاسیات احیائے اسلام کی تحریکات سے خوف زدہ ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ یہاں کا قومی پریس لرزہ براندام ہے۔ اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ شائستہ علمی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس میں مذہب کے خلاف بازاری زبان استعمال نہیں کی گئی ہے۔ اس انگریزی زبان کے مقالہ کا مطالعہ کر ہی رہا تھا کہ مرکزی حکومت زیر سرپرستی شائع ہونے والا ایک رسالہ "یوجنا" نظر سے گذرا۔ اس کا ایک شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۸۵ء کو خاصے اہتمام اور شان کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس خصوصی شمارہ کا عنوان یہ ہے:۔ "یہ بے ہودگی آخر کب تک" مذہب کو "بے ہودگی" کہا گیا ہے۔ گویا یہ شمارۂ خصوصی اپنے نام اور عنوان ہی سے بازاری زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس شمارے کے مقالہ نگار بازاری لوگ نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے دانشور اور مرکزی حکومت کے بعض وزرا ہیں۔ دانشوروں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اس کے بعض مقالے میں کسی کتاب کے مقدس اور وحی الٰہی پر مبنی ہونے کو بلکہ خدا کے وجود پر یقین ہی کو حماقت قرار دیا گیا ہے بعض مقالات میں فرشتوں کو ڈھونگ کہا گیا ہے۔ مذہب کو یورپین مارکس نے افیون کہا تھا اس کے ہندوستانی شاگردوں نے استاد سے آگے بڑھ کر مذہب کو سماجی حجت

کہہ لینے کو کیا قرار دیا ہے۔ بعض مقالہ نگاروں کے نزدیک دنیا میں فساد و جنگ و جدال کی جڑ مذہب ہے اور مذہب کو معقولیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ ایک پہلو سے مذہب کے خلاف یہ بازاری زبان لندنی پروفیسر کی شائستہ زبان سے اچھی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کو پڑھتے ہی مذہبی انسان کا خون کھول جاتا ہے اور وہ اس رسالے کی بے ہودگی پر لعنت بھیج کر اس کو بند کر دیتا ہے۔ یہ رسالہ کانگریسی حکومت کے زیر سرپرستی نکل رہا ہے جو گاندھی جی کو باپوئے قوم کہتی، ان کو اپنا پیشوا مانتی اور ان کا نام رٹنے سے اس کی زبان کبھی نہیں تھکتی۔ اس میں ایک مقالے کا عنوان ہے۔ "آیئے مل کر تحریک احیائے مذہب کا مقابلہ کریں" یہ عنوان پڑھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ تمہارے استاد یہ مقابلہ کر کے تھک چکے ہیں۔ اب تم بھی اپنے بازو آزمالو۔

بات لندنی پروفیسر کے مقالے سے شروع ہوئی تھی اس مضمون کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب ایران نے یورپ و امریکہ کے دانشوروں کو بوکھلا دیا ہے۔ ابتدا میں لکھا گیا ہے:۔

> "ایران میں ۱۹۷۸ء - ۱۹۷۹ء کے دوران ہنگامے شروع ہوئے تھے جو بالآخر شاہ ایران کے زوال اور خمینی کی فتح پر ختم ہوئے۔ اسی وقت سے اسلام اور اس کی حیات نو، نیز بنیاد پرستی اور اس کا اثر و نفوذ ذرائع ابلاغ کا ایک اہم موضوع بن گیا ہے۔ ایک مذہب کی پیش رفت اور اس کے اقدام کا یہ واقعہ مغربی تہذیب کے لیے ایک خطرہ ہے جو عقلیت پرستی، ترقی اور روشن خیالی کے غیر متزلزل یقین پر مبنی ہے۔"

اس کے بعد مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بنیاد پرستی یا احیائے اسلام کی تحریک صرف ایران میں نہیں ہے بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی ہے۔ اس نے سعودی عرب، مصر اور بعض خلیجی ملکوں کے نام بھی لیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مغربی دانشور انقلاب ایران کو شیعی و سنی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اسلام مارچ کر رہا ہے، وہ آگے بڑھ رہا ہے اور وہ اسلامی تحریک کو مغربی تہذیب کے لیے ایک چیلنج سمجھ رہے ہیں۔ مقالہ نگار نے پاکستان اور سوڈان وغیرہ میں نفاذ شریعت کی کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی ہے کہ احیائے اسلام کی جدوجہد میں زور اوپیک کی تنظیم اور پٹرول کی قیمت میں اضافے کے بعد پیدا ہوا ہے حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ پٹرول کی دولت اسلامی تحریکات کو دبانے میں تو صرف ہوتی ہے اس کو ابھارنے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ انہوں نے شاید پٹرول والے مسلمان ملکوں اور اسلامی تحریکات میں وہ ربط د

تعلق دکھانے کی کوشش کی ہے جو عیسائی حکومتوں اور مشنریوں کے درمیان ہے یا تو حقیقت حال ان کو معلوم نہیں یا بالقصد وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی تحریکات پٹرول کی دولت کے بل پر چل رہی ہیں۔ کیا وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ مثال کے طور پر انڈونیشیا جیسے ملکوں میں عیسائی مشنریوں کو تو آزادی اور سہولت حاصل ہے لیکن اسلامی تحریکات پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ مقالہ نگار چونکہ اسلامی تحریک کو سمجھے بغیر اس سے ناراض ہیں اس لیے وہ تضاد بیانی میں بھی مبتلا ہوگئے ہیں۔ ایک طرف وہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ پٹرول کی دولت احیائے اسلام کی جد وجہد کو آگے بڑھا رہی ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی لکھتے ہیں:۔

"بنیاد پرستوں کی ایک خاص شکایت ہے۔ یہ شاہ ایران کے خلاف خمینی کی مہم میں بھی بہت نمایاں رہی ہے اور سادات کے قتل کی سازش (۱۹۸۱ء) کرنے والوں کے درمیان بھی کارفرما رہی ہے وہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کے موجودہ حکمراں خدا کے نافرمان اور فرعون ہیں۔ (فرعون کو قرآن میں ایک ظالم بادشاہ قرار دیا گیا ہے) اور چونکہ وہ خدا کے نافرمان ہیں۔ اس لیے ظالم جابر بدکردار ہیں۔ اس موقف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر خدا کی فرماں بردار حکومتیں قائم ہوں تو ان کے تحت سب کو مساوات اور سلامتی حاصل ہوگی۔

اس کے معنے یہ ہوئے کہ بنیاد پرست جن فراعین کو ان کے تخت سے اتارنا چاہتے ہیں وہی فراعین ان کو اپنی دولت سے قوت پہنچا کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلا رہے ہیں۔ یہ بات ایسی ہی ہے جیسے ہندو پاک میں جماعت اسلامی کے مخالفین پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ امریکہ نہ جانے کتنی تعداد میں اس کو ڈالر مہیا کر رہا ہے۔ اندھی مخالفت سے کوئی بات بعید نہیں ہے۔

اس مقالے میں بنیاد پرستی کی بھی ایک تعریف بیان کی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے احیائے اسلام کے بارے میں یہ سوال قائم کیا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے اور کہاں سے اس کا احیاء شروع ہوگا؟ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا ہے:۔

خمینی یا اخوان المسلمین کے حسن البناء اور سید قطب یا پاکستان کے ابوالاعلیٰ مودودی کی جانب سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اسلام، مغربی تہذیب کے ساتھ ربط و تعلق اور (مسلم دنیا پر) اس کے غالب آجانے کے نتیجے میں بگاڑ اور اپنے اصل مزاج سے انحراف کا شکار ہوا ہے۔ لہٰذا جس چیز کو بنیاد پرستی

کہا جاتا ہے وہ اسلام کی جدید کرشن سے تطہیر اور ایک سچے اسلامی سماج کے قیام کی کوشش کا نام ہے“

مقالہ نگار نے جو جواب تیار کیا ہے اس میں جزوی صداقت موجود ہے لیکن اسلامی تحریک صرف ماڈرنائزیشن سے تطہیر کی قائل نہیں ہے بلکہ اسلام کی تعلیمات میں جو چیزیں باہر سے لاکر داخل کر دی گئی ہیں ان سب سے اسے پاک کرنا چاہتی ہے۔ خواہ یہ بیرونی اور اجنبی چیزیں مشرق سے داخل کی گئی ہوں یا مغرب سے ــــــ

اسلام کی حیات نو سے خوف کا جو احساس مقالہ نگار کے ذہن میں ہے اُسے کم دکھانے کے لیے اس نے لکھا ہے کہ احیائے اسلام کی جدوجہد سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ غیر مسلم دنیا پر اس کے اثرات برائے نام ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مسلم ممالک کے باہمی تنازعات و اختلافات کا حوالہ بھی دیا ہے۔

”اسلام کوئی سپر پاور نہیں ہے اور مسلم ریاستیں اپنی حکومتوں کے تنوع اور باہم متصادم یا ناقابل توافق مفادات کے ساتھ کوئی متحدہ لائحہ عمل اختیار نہیں کر سکتیں“

مقالہ نگار نے بات تو صحیح لکھی ہے لیکن اس کے سمجھنے کا انداز غلط ہے۔ افسوس ہے کہ مقالہ نگار نے اسلام کا ایک مکمل دین، طریق زندگی اور ضابطۂ حیات کی حیثیت سے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وہ یہ غلط سمجھتے ہیں کہ احیائے اسلام کی تحریک صرف اقتدار چاہتی ہے۔ یہ خیال دو لحاظ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ تحریک اسلامی کے کارکن اپنا اقتدار قائم کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ دوسرے یہ کہ اقتدار تحریک اسلامی کا اصل مقصد نہیں ہے، بلکہ حصول مقصد کا ایک لازمی ذریعہ ہے۔ تحریک اسلامی اس نظام رحمت کو برپا کرنا چاہتی ہے۔ جو تمام انسانوں کے لیے ان کے رب نے نازل کیا ہے۔ یہ صرف مغربی تہذیب کے لیے چیلنج نہیں ہے بلکہ ہر غیر اسلامی تہذیب کے لیے چیلنج ہے۔

مقالہ نگار نے مغربی تہذیب کو عقلیت، ترقی اور روشن خیالی پر مبنی قرار دیا ہے لیکن افسوس کہ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ عقلیت کیا ہے، ترقی کیا ہے اور روشن خیالی کیا ہے؟ کیا یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ کی عقلیت، انکارِ خدا، آپ کی ترقی، مادہ پرستی اور آپ کی روشن خیالی، عریانی، فحاشی اور اباحیت کے سوا اور کیا ہے؟

مقالے کی ابتدا میں خمینی کی جدوجہد اور شاہ کے خلاف ان کی کشمکش کی تعریف کی گئی ہے اس لیے کہ شاہ کی حکومت ظالمانہ اور مستبدانہ تھی جس کی تائید امریکہ کر رہا تھا لیکن مقالے کے آخیر میں خمینی کے عہد حکومت کو شاہ کے عہد حکومت سے بھی زیادہ ظالمانہ اور قابل نفرت قرار دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ رونا بھی رویا گیا ہے کہ موجودہ ایران نے امریکہ کی جو شدید مخالفت اختیار کر رکھی ہے اس نے مشرق وسطیٰ میں طاقت کے توازن کو بگاڑ ڈالا ہے۔ روس

کی طاقت بڑھ گئی ہے اور امریکہ کی گھٹ گئی ہے۔ گویا ایران، یورپ اور امریکہ پر کابوس کی طرح مسلط ہے: ۔
دانشور مقالہ نگار نے پوری ہوشیاری کے ساتھ اپنا مقالہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی "ہمدردی" پر ختم کیا ہے

"اس وقت دنیا میں اسی کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ انسانیت کے اتنے عظیم حصہ کی واقعاتی حالت اور اس کا مستقبل ہمارے لیے باعث تشویش اور موجب تفکر ہے۔ اس کے مستقبل کے امکانات خواہ وہ سیاسی ہوں، سماجی ہوں یا اقتصادی، روشن نظر نہیں آتے۔ نیز یہ بھی واضح نہیں ہے کہ موجودہ صورت حال میں اصلاح کب شروع ہو سکے گی، کس طرح وہ انسانی توانائیاں آزاد ہوں گی جن کی نمائندگی یہ گروہ کرتا ہے یا کس طرح ایسے اداروں کا قیام عمل میں آسکتا ہے جن کے ذریعے عوامی پالیسی اور نجی خواہشات کی مخالف رخ حرکت کو روکا جا سکے۔"

مغربی دانشوروں کا یہ وہ فن ہے جو ابھی تک ان کے مشرقی شاگردوں کو نہیں آسکا ہے۔ اس پورے مقالے کو سامنے رکھ کر اس عبارت کا تجزیہ کیجیے۔ احیائے اسلام کی جدوجہد کو مغربی تہذیب کے خلاف چیلنج قرار دیا گیا ہے۔ مغربی تہذیب کو عقلیت، تمدن اور روشن خیالی پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ اسلامی تہذیب (نعوذ باللہ) اندھی عقیدت، زوال اور تاریک خیالی پر مبنی ہے۔ اس روشنی میں ہمدردی کے الفاظ پڑھیے تو صاف دکھائی دے گا کہ مقالہ نگار یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ اور روشن خیال حکومتوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ اگر دنیا کے اسی کروڑ مسلمانوں کو اس تحریک اسلامی کے جال میں پھنسنے سے نہ روکا گیا تو پھر مغربی تہذیب کی خیر نہیں ہے۔

امریکہ کی تنظیم اور ایران کے انقلاب نے مغربی دانشوروں کے اذہان پر جو اثر ڈالا ہے یہ مقالہ اس کا ایک چھوٹا سا آئینہ ہے۔ اس آئینے میں ان کی ذہنی کیفیت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مقالہ کا مطالعہ غصہ نہیں پیدا کرتا بلکہ یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ مغربی دانشوروں کے سامنے انہیں کی زبان اور انہیں کے اسلوب میں اسلامی نظام حیات اور اسلامی تہذیب کو واضح کرنے کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ خود اپنے ملک میں مغربی تہذیب کے دلدادوں اور مغربی دانشوروں کے شاگردوں کو یہ سمجھانا ابھی بہت ضروری ہے کہ وہ شوق سے مذہب کا مقابلہ کریں لیکن بازاری زبان استعمال نہ کریں اور ایسی باتیں نہ کہیں کہ اہل علم انہیں پڑھ کر ان کے دعوائے عقلیت کو بے عقلی تصور کرنے لگیں آخر خدا کے وجود کا انکار کون سی عقلمندی ہے، عقل تو خدا کے وجود کو اس طرح تسلیم کرتی ہے جس طرح بینائی رکھنے والا آفتاب کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور جس طرح ہر انسان اپنے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ ایسی باتیں بھی نہ کہیں کہ

واقفیت رکھنے والے لوگ ان کی ناواقفیت کا ماتم کرنے لگیں۔ آخر یہ کون باخبر انسان تسلیم کر سکتا ہے کہ دنیا میں جنگ و جدال کی جڑ مذہب ہے۔ دو عالمگیر جنگیں کیا مذہبی جنگیں تھیں؟ کیا ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم مذہبی جنگ میں برسائے گئے تھے؟ ان دو بڑی جنگوں کے جانی و مالی نقصانات کا صحیح میزانیہ آج تک نہیں لگ سکا ہے۔ اس وقت بھی دنیا میں جو لڑائیاں ہو رہی ہیں ان میں کتنی مذہبی اور کتنی غیر مذہبی ہیں اس سے آگے بڑھ کر یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں جو فرقہ وارانہ فسادات یا پولیس ایکشن ہوا کرتے ہیں کیا واقعی وہ مذہب کی بنیاد پر ہوتے ہیں یا ان میں اکثر و بیشتر صرف سیاست کی بنیاد پر کرائے جاتے ہیں؟ کیا مذہب کے مخالفین کذب و افترا کے ہتھیاروں سے مذہب کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں؟

آج سے ۶۰، ۷۰ سال پہلے عام طور سے مسلمانوں اور تنگ ذہن علماء کا جو حال تھا اس میں اسلام کے خلاف جو افترا کیا گیا اور اس پر جمود و خمود کا جو الزام لگایا گیا وہ حقیقی اسلام پر تو غلط الزام تھا لیکن تنگ ذہن علماء نے لوگوں کے سامنے اسلام کا جو نقشہ پیش کر رکھا تھا اس پر جمود و خمود کا الزام بڑی حد تک صحیح تھا۔ اس لئے الزام لگانے والوں کو تھوڑی سی کامیابی بھی ملی لیکن اسلام کا مسخ شدہ تصور بھی اتنا جاندار ثابت ہوا کہ روس اور چین جیسی اشتراکی اور جبار حکومتیں بھی اپنی مملکت میں مذہب کو ختم نہیں کر سکیں۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے جمود و خمود کی برف بھی پگھل چکی ہے اور حقیقی اسلام کا جلوۂ دلکش بھی سامنے ہے اس لئے کذب و افترا کے ہتھیاروں، بازاری زبانوں اور طاقت کے مظاہروں سے دین اسلام کا مقابلہ، حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اشتراکیت کبھی روس میں [illegible] نہیں آئی اور چین میں تو وہ دم توڑ چکی ہے، وہاں مذہب پر لگائی گئی پابندیاں ڈھیلی کی جا رہی ہیں اور روس میں بھی مذہب اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا ہے۔ روس کے لیڈر مذہب کی اندرونی قوت سے خوف کھا رہے ہیں اور انھوں نے الحادی پروپیگنڈا تیز کر دیا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے معذور ہیں کہ جو پروپیگنڈا تیس چالیس سال پہلے کامیاب نہ ہو سکا وہ اب کیا کامیاب ہوگا۔ روس مسلمانوں کے جن علاقوں پر قابض ہے وہاں کے مسلمان قرآن کریم سے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ اگر کہیں بھی قرآن کا کوئی نسخہ مل جائے تو اسے اپنے سینوں سے لگا لیتے ہیں۔ روس میں قرآن کی اشاعت پر پابندی ہے اس صورت حال میں اگر مسلمانوں کو قرآن بہ قیمت کہیں مل جائے تو وہ ایک جلد کا ہدیہ دو دو ہزار اور چار ہزار روپے دے کر بھی شوق سے اس کو خرید لیتے ہیں۔ افغانستان پر روس کے حملے نے اسلام

کا اظہار تحریر کر دیا ہے۔ امید ہے کہ روس کی یہ جارحیت احیائے دین کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

رسالہ "یوجنا" میں اگر صرف اسلام پر کیچڑ اچھالی گئی ہوتی تو ہمارے برادران وطن کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگتی لیکن اس نے خود مذہب پر کیچڑ اچھالی ہے خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو اس لئے یہاں کے نام نہاد قومی پریس میں "یوجنا" کی بجائے اس کے خلاف مراسلے شائع کئے جا رہے ہیں —— یہاں کی بے چاری کمیونسٹ پارٹیوں کو سمجھنا چاہئے کہ جب روس اور چین ان ہتھیاروں سے جنہیں وہ ہندوستان میں استعمال کرنا چاہتے ہیں، مذہب کو شکست نہیں دے سکے تو وہ کیا دے سکیں گے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ کمیونسٹ حضرات اسلام کے نظام رحمت کا مطالعہ کریں، اس پر غور کریں، امید ہے کہ اسلام کا غیر جانب دارانہ مطالعہ انہیں اشتراکیت کے جال سے باہر کھینچ لائے گا۔ افسوس ہے کہ وہ حقیقی مذہب کا منصفانہ مطالعہ نہیں کرنا چاہتے۔ صرف کیڑے نکال لینے کے لئے ادھر ادھر سے کچھ پڑھ لیتے ہیں اور پروپیگنڈے کے لئے اس کو استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اشتراکیت ہندوستان میں ایک عقیدے اور نظریے کی حیثیت سے کبھی کامیاب نہیں ہوگی —— ہم مرکزی حکومت سے کہتے ہیں کہ اگر اس نے "یوجنا" میں مذہب کے خلاف جاہلانہ مقالوں کی اشاعت نہ روکی تو اس سے فائدہ کے بجائے اس کو نقصان پہنچے گا۔

"یوجنا" میں چند مسلمانوں کے مضامین بھی ہیں، ہم ان سے خاص طور پر عرض کرتے ہیں کہ وہ تو مسلمان گھروں میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے ان کو اسلام کے مطالعہ کے مواقع زیادہ حاصل ہیں وہ جس شخص کے نام سے چڑھتے ہیں اس کی کتابیں فی الواقع حقیقی اسلام کے مطالعہ کے لیے بہت مفید ہیں اور سیکڑوں مسلمان نوجوانوں کو ان کتابوں نے اشتراکیت کے جال سے باہر نکالا ہے اور ان پر اسلام کی حقیقت واضح کی ہے۔ شرط یہ ہے کہ تعصب کے ساتھ نہیں بلکہ انصاف کے ساتھ ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر وہ "سلامتی کا راستہ" غور سے پڑھیں اور پھر اپنے ذہن سے یہ سوال کریں کہ:-

کیا اس کتاب میں کوئی بات ایسی بھی ہے جو عقل و خرد کے خلاف ہو؟ کیا اس کتاب میں کوئی بات ایسی بھی ہے جو انسانی فطرت کے خلاف ہو؟ کیا اس کتاب میں کوئی بات ایسی بھی ہے جو فرقہ وارانہ یا طبقاتی کش مکش پیدا کرتی ہو؟ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے،

تخلیق انسانی میں

نظریۂ اسلام اور نظریۂ سائنس کا فرق

(جناب اکرام الدین احمد مرحوم)

یَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۔ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

(البقرۃ :- رکوع - ۲۴)

بعض روایات میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی تاریخ کے چاند کے بارے میں مذکورہ سوال کیا گیا تھا کہ اس کے نمودار ہونے بڑا ہونے اور پھر گھٹنے کا راز کیا ہے ۔

بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا تھا کہ اے اللہ کے رسول پہلی تاریخ کا چاند کس لیے بنایا گیا ہے سوال کا یہ دوسرا پیرایہ تا لیا جواب کے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔

قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۔ — کہہ دیجیے کہ یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کے تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں

لوگوں کے لیے احرام باندھنے اور کھولنے کے وقت کے تعین کے لیے روزہ رکھنے اور روزہ ختم کرنے نکاح طلاق عدت اور دوسرے معاملات تجارت یعنی لین دین میں مدتوں کے تعین کے لیے نیز دوسرے امور دینی و دنیوی میں بھی

خواہ یہ جواب پہلے سوال کا ہو یا دوسرے سوال کا دونوں صورتوں میں اس کا رخ خالص نظری علم کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی عملی زندگی کی طرف ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ پہلی تاریخ کا چاند کس طرح چاند بن جاتا ہے ۔ حالانکہ یہ بات ان کے اس سوال کے مفہوم میں داخل تھی کہ پورے چاند

کے ہلال میں تبدیلی ہونے کا راز کیا ہے؟ اس طرح یہ نہیں بتایا کہ نظام شمسی میں اور اجرام سماوی کی حرکت اور ان کے درمیان توازن میں چاند کا کیا مقام ہے۔ اگرچہ یہ بات سوال میں شامل تھی کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی تاریخ کا چاند کس لیے بنایا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جواب دینے کا انداز ہمارے لیے کیا رہنمائی کرتا ہے

قرآن ایک مخصوص تصور یا ایک مخصوص سماج پیدا کرنا چاہتا ہے وہ زمین میں ایک نئی امت برپا کرنے آیا تھا جسے انسانیت کی رہنمائی کا ایک خاص کردار ادا کرنا تھا کہ یہ امت سماج کا ایک خاص نمونہ پیش کرے جو اس سے پہلے کبھی نہیں پیش کیا جا سکا تھا اور ایک ایسی زندگی گزار کر دکھلائے جو اس سے پہلے کبھی نہیں گزاری گئی تھی اور اس طرح اس طرز زندگی کے اصول زمین پر قائم کر جائے اور انسانوں کو اس کی طرف لے آئے۔

ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا سراغ لگانے والا جواب دریافت کرنے والوں کو فلکیات کا نظری علم عطا کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ ان تھوڑی معلومات کے باوجود جو انہیں اس زمانے میں میسر تھیں، ان کے لیے اس علم کا پوری طرح سمجھ لینا ممکن بھی ہوتا۔ اس میں بہت شبہ ہے کہ ان کے لیے ایسا ممکن ہوتا کیونکہ اس طرح کا نظری علم بہت لمبے چوڑے مقدمات کا محتاج ہوتا ہے جو اس زمانے تک مرتب نہیں ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایسا جواب دینے سے گریز کیا جس کی سمجھنے کی صلاحیت اس وقت انسانوں میں نہیں پائی جاتی تھی اور جو اس اولین کام کے لیے کوئی زیادہ مفید بھی نہ ہوتا جس کے لیے قرآن آیا تھا۔ اور یہ تو بہر صورت واضح ہے کہ ایسے جوابات کی مناسب جگہ قرآن نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن اس چیز کی معلومات سے کہیں زیادہ بڑی چیز کی خاطر آیا ہے۔

قرآن، فلکیات، کیمیا، طب یا سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ اگر قرآن کے پرجوش حامی کوشش کرتے ہیں کہ اس کے اندر یہ علوم تلاش کریں اور دوسری طرف اس کے بعض نکتہ چیں اس میں ان علوم کے خلاف باتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔

یہ دونوں کوششیں اس کتاب کا مزاج، اس کا کردار اور اس کا میدان عمل نہ سمجھ سکنے کی دلیل ہیں۔ اس کا میدان نفس انسانی اور حیات انسانی ہے۔ قرآن کا کام یہ ہے کہ کائنات کا ایک عمومی تصور عطا کر کے اور اس کے خالق سے اس کا تصور واضح کرے اور یہ بتلائے کہ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کا اپنے رب سے کیا تعلق ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر وہ زندگی کا ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے

علوم سے زیادہ ہے، کیونکہ یہ موضوع خود وہ انسان ہے جو ہر طرح کے علوم دریافت کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تفتیش، تجربا ور تطبیق انسان کی عقل کے خواص میں سے ہے۔ قرآن خود انسان کی تعمیر اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے، وہ اس کی شخصیت اس کے ضمیر اس کی عقل اور اس کے فکر کو بناتا ہے ساتھ ہی وہ انسانی سماج کی تشکیل کے عمل میں معاون ہوتا ہے جو انسان کو اس کے اندر ودیعت کردہ ان قوتوں کو سلیقے کے ساتھ استعمال کرنے کا پورا پورا موقع دے

صحیح تصور اور صالح فکر و شعور رکھنے والے انسان کو نیز ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کے بعد جو انسان کو سرگرمی عمل کا پورا موقع دے، قرآن انسان کو تفتیش اور تجربے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ اب وہ علم اور تفتیش اور تجربے کے میدان میں غلطی بھی کر سکتا ہے اور صحیح نتائج تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ قرآن نے اس کے لیے صحیح غور و فکر اور تصورات کے پیمانے البتہ مقرر کر دیے ہیں۔

یہ بات درست نہ ہوگی کہ کائنات کے بارے میں جن آخری حقائق کا ذکر قرآن کائنات کے مزاج اس کے خالق سے اس کے تعلق اور اجزائے کائنات کے درمیان باہمی ربط واضح کرنے کے دوران میں کبھی کبھی کرتا ہے، ان کو ہم انسانی عقل کے قائم کردہ مفروضات اور نظریات کا پابند بنا دیں۔ یہ طریقہ تو ہمیں ان سائنٹفک حقائق کے سلسلے میں بھی نہیں اختیار کرنا چاہیے جن تک انسان اپنی دانست میں تجربے کے قطعی طریقے سے پہنچتا ہے۔ قرآن کے حقائق آخری قطعی اور مطلق حقائق ہیں انسانی تحقیق جو حقائق دریافت کرتی ہے، قطع نظر اس کے کہ اس تحقیق کے نتائج کیا ہیں وہ نہ آخری ہوتے ہیں نہ قطعی۔ یہ حقائق انہی حدود کے اندر ہی درست ہوتے ہیں جن کے اندر انسانی تجربہ کیا جاتا ہے۔ جن حالات میں یہ تجربات کیے گئے ہوں اور جن آلات و ذرائع سے ان میں کام لیا گیا ہو وہ بھی ان کی حدیں مقرر کرتے ہیں۔ لہٰذا انسانی سائنٹفک طریقۂ تحقیق کی روشنی میں یہ طریقہ اختیار کرنا غلط ہوگا کہ ہم قرآن کے آخری حقائق کو ایسے حقائق پر معلق کر دیں جو آخری نہیں ہیں۔ انسان کی رسائی بس ایسے ہی حقائق تک ممکن ہے۔

یہ تو سائنٹفک حقائق کا معاملہ تھا جہاں تک ان مفروضات و نظریات کا سوال ہے جنہیں سائنٹفک کہا جاتا ہے بات زیادہ واضح ہے فلکیات کے جملہ نظریات انسان کے ظہور اور اس کے مختلف مراحل کے متعلق نظریات انسانی نفسیات اور اس کے رویے کے بارے میں تمام نظریات اور سماج کی تشکیل اور اس کے مختلف ادوار کے سلسلے میں پیش کیے جانے والے نظریات کا یہی حال ہے کہ خود انسان کے نزدیک سائنٹفک حقائق

ہی ہیں بلکہ نظریات و مفروضات ہیں ان کی تمام قدر و قیمت اس میں منحصر ہے کہ یہ کائنات، حیات، نفسیات اور سماج کے بہت سے مظاہر کی توجیہ و تشریح کے لیے موزوں پائے جا رہے ہیں تا آنکہ کوئی دوسرا مفروضہ مرتب کیا جا سکے جو نسبتاً زیادہ مظاہر کی توجیہ و تعبیر کر سکے یا نسبتاً زیادہ گہری توجیہ و تشریح کر سکے معلوم ہوا کہ ان نظریات میں ترمیم و تبدیلی اور کمی و بیشی ممکن ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نئے ذریعہ تفتیش کی ایجاد کے سبب یا قدیم مشاہدات کی کسی نئی تعبیر کے سامنے آجانے کی وجہ سے کوئی نظریہ یا مفروضہ بالکل الٹ جائے۔ قرآن کے عام اشارات کو سائنس کے نت نئے اور بدلتے رہنے والے نظریات سے جوڑنے کی ہر کوشش بلکہ ان کو ان سائنٹفک حقائق سے جوڑنا بھی جن کے بارے میں ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ وہ مطلق نہیں ہوتے اولاً تو منہاج کے لحاظ سے غلط ہیں۔ مزید برآں اس طریقہ کار کے تین پہلو اور بھی ہیں جو قرآن کے مقام بلند کے اعتبار سے کسی طرح مناسبت نہیں رکھتے۔

(۱) یہ داخلی شکست خوردگی ہے جو بعض لوگوں کو اس گمان میں مبتلا کیے ہوئے ہے کہ اصلی چیز سائنس ہے اور قرآن کا کام اس کے پیچھے چلنا ہے۔ لہذا وہ سائنس کے ذریعے قرآن کو قوت بخشنا چاہتے ہیں یا سائنس سے قرآن کے حق میں دلیل فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنے موضوع پر ایک مکمل اور مدلل کتاب ہے اور وہ جو حقائق بیان کرتا ہے وہ آخری اور قطعی حقائق ہیں۔ سائنس اپنے موضوع میں یہ حال ہے کہ وہ کل جس بات کو ثابت کر چکی ہے اسے آج رد کر دیتی ہے اور جن حقائق کو وہ دریافت کرتی ہے وہ نہ تو آخری ہوتے ہیں نہ مطلق کیونکہ سائنس کا واسطہ انسان اور اس کی عقل اور اس کے ذرائع و آلات پر ہیں جن کی ماہیت ہی ایسی ہے وہ ایک بھی آخری اور مطلق حقیقت نہیں عطا کر سکتے۔

(۲) قرآن کے مزاج اور اس کے کام کی نوعیت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ سکنا یعنی یہ بات نہ سمجھ سکنا کہ قرآن آخری اور مطلق حقیقت ہے جس کا مشن انسان کی ایسی تعمیر ہے جو جس حد تک انسان کا اپنا مزاج اس بات کی اجازت دے۔ کائنات اور قانون الٰہی سے ہم آہنگ ہو تا کہ انسان اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات اور قانون الٰہی سے اس کا دوست بن کر رہے۔ اس کے بعض رازوں سے واقف ہو جائے اور اس کے بعض قوانین کو اپنے کار خلافت میں استعمال کرے۔

یہ قوانین فطرت انسان کو غور و فکر، تحقیق و تفتیش اور تجربہ و تطبیق کے ذریعے اس حد تک معلوم

ہوتے ہیں جس حد تک اس کی خداداد عقل جا سکتی ہے۔ وہ عقل جو اسی لیے دی گئی ہے کہ اس سے کام لیا جائے نہ صرف اس لیے کہ جو مادی معلومات بالکل عیاں ہو کر سامنے آ جائیں ان کو مان لے اور بس

(۳) نصوص قرآنی کی قدرے تکلف اور حیلہ کے ساتھ ہر بار نئی تاویل کی جائے تاکہ ہم ان نظریات اور مفروضات سے ان کی مطابقت ثابت کر سکیں جو ناپائیدار اور بدلتے رہنے والے واقع ہوئے ہیں اور جن میں ہر آن نئی باتوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

یہ باتیں قرآن کے شایان شان نہیں اور جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے یہ طریقہ بطور طریقہ کے بھی غلط ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سائنس کائنات حیات اور انسان کے بارے میں جو نظریات اور حقائق سامنے لائے جائیں ان سے ہم قرآن کے فہم میں کوئی فائدہ نہ اٹھائیں ہرگز نہیں۔ مذکورہ باتوں سے ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں تھا اور یہ بھی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ سبحانہ خود فرماتا ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم السجدہ ۵۳)

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے

اس اشارہ کا تقاضا ہے کہ سائنس آفاق و انفس میں اللہ کی جو نشانیاں بھی دریافت کر سکے ہم ان پر مسلسل غور و فکر کرتے رہیں اور اپنے فکر میں قرآن کے معنے کو ان علمی انکشافات کے مطابق وسیع تر کرتے رہیں۔ یہ کام کیسے کیا جائے بالخصوص ایسی صورت جبکہ ہم قرآن کے آخری اور مطلق نصوص کو ایسے معنی کا پابند نہیں بنانا چاہتے جو نہ آخری ہوتے ہیں نہ مطلق۔ اس سوال کا جواب بعض مثالوں کے ذریعہ دینا مفید ہوگا۔ قرآن کریم کہتا ہے:۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (الفرقان رکوع ۱)

اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسے ایک خاص اندازے پر رکھا۔

اب سائنٹفک تحقیقات یہ انکشاف کرتی ہیں کہ اس کائنات میں بڑی باریکی کے ساتھ ہم آہنگی اور نظم کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ زمین کی یہ مخصوص شکل سورج کا زمین سے اس قدر فاصلہ پر واقع ہونا سورج اور زمین، چاند اور زمین کے حجم کے درمیان مخصوص نسبتوں کا پایا جانا۔ زمین کی حرکت کی یہ مخصوص فاصلے پر

واقع ہونا سورج اور زمین، چاند اور زمین کے حجم کے درمیان مخصوص نسبتوں کا پایا جانا۔ زمین کی حرکت کی یہ مخصوص رفتار پھر اس کا ایک محور پر ایک خاص حد تک جھکا ہوا ہونا۔ اس کے بالائی سطح کی یہ نوعیت اور اسی طرح کی ہزاروں خصوصیات جو زمین کی زندگی کے لیے سازگار اور موزوں بنائی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی چیز نہ ایک عارضی حادثہ ہو سکتی ہے، نہ اتفاقی قرار دی جا سکتی ہے جس کے پیچھے کوئی مقصد نہ ہو ـــ یہ تحقیقات (وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا) کے معنے میں وسعت پیدا کرتی اور ہمارے فکر کے اندر اس کے مفہوم میں گہرائی پیدا کرتی ہیں اس میں کوئی حرج نہیں کہ مفہوم کی گہرائی اور معانی کی وسعت کی خاطر ان جیسی معلومات کا احاطہ کیا جائے ایسا کرنا درست بھی ہے اور مطلوب بھی۔ مگر جو چیز نہ تو جائز ہے نہ عملی اعتبار سے درست قرار دی جا سکتی ہے وہ وہ باتیں ہیں جو حسب ذیل مثالوں کے ذریعے سامنے آتی ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ) ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے بنایا۔)

پھر ڈاروِن اور ڈاروِن کا نظریہ نشو و ارتقا سامنے آتا ہے جو یہ مفروضہ قائم کرتا ہے کہ زندگی ایک خلیہ کی صورت میں شروع ہوئی اور خلیہ پانی میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔

پھر یہی خلیہ مختلف مراحل سے گزر کر بالآخر انسان کی تخلیق پر منتج ہوا۔ اب ہم اس نص قرآنی کو لیکر اس نظریے کے پیچھے لپکنے لگے تاکہ یہ کہہ سکیں کہ یہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ نہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نظریہ آخری نہیں کیونکہ ایک صدی سے کم مدت میں بھی اس میں اتنی ترمیمیں ہوئی ہیں جنھوں نے اسے تقریباً بدل کر رکھ دیا ہے۔ وراثت کی اکائیوں (GENES) کے بارے میں جو ہر نوع کے خصوصیات کی حامل ہوتی ہے اور ایک نوع کے دوسرے نوع میں تبدیل ہونے میں مانع ہوتی ہیں۔ ناقص معلومات پر مبنی ہونے کے سبب اس نظریہ میں ایسی کمزوری ظاہر ہو چکی ہے جو اس کو تقریباً غلط ٹھہرا دیتی ہے۔ یہ امکان بہرحال ہے کہ کل کو یہ غلط ثابت ہو جائے اور رد کر دیا جائے دوسری طرف قرآن کی بیان کردہ حقیقت آخری ہے جو یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کے معنے یہی ہوں آیت صرف انسان کے آغاز کی بنیاد بتاتی ہے اس آغاز کی تفصیلی کیفیت نہیں بیان کرتی۔ وہ صرف ایک بات کی حد تک آخری ہے جو اسے بیان کرنا مقصود ہے یعنی یہ کہ انسان کی اٹھان کہاں سے ہوئی بس، اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔

قرآن کریم کہتا ہے۔ (والشمس تجری لمستقر لہا) اس بیان سے دو سو برس کے

بارے میں ایک آخری حقیقت سامنے لاتا ہے۔ یعنی یہ کہ سورج حرکت کرتا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ سورج اپنے گرد کے ستاروں کی نسبت سے تقریباً ۱۳ میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے لیکن فلکیات کی یہ تحقیقات آیت قرآنی کا عین مطلب نہیں قرار دی جا سکتیں۔ یہ اضافی حقیقتوں کا بیان ہے جو آخری نہیں اور قابل ترمیم و تردید ہیں۔ آیت قرآنی میں ہمیں صرف ایک آخری حقیقت بتائی ہے کہ سورج حرکت کرتا ہے۔ پس ہم اس کو مذکورہ تحقیقات کا پابند ہرگز نہیں بنائیں گے۔ قرآن کریم کہتا ہے

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (الانبیاء - آیت ۳۰)

کیا وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان و زمین باہم ملے ہوئے ہیں۔ پھر ہم نے انھیں جدا کیا۔

پھر ایک نظریہ سامنے آتا ہے جو کہتا ہے کہ زمین سورج ہی کا ایک ٹکڑا تھی جو اس سے الگ ہو گیا اب ہم قرآن کی اس نص کو ایسکرو ڈرائیٹ کرتے ہیں تاکہ سائنس کے اس نظریے کو اختیار کرکے یہ کہہ سکیں کہ یہی بات آیت قرآنی میں بھی کہی گئی ہے۔ نہیں، آیت کا مطلب بعینہ یہ نہیں ہے کیونکہ یہ ایک نظریہ ہے جو آخری نہیں ہے۔ زمین کے آغاز کے بارے میں سائنٹفک ثبوت کے اعتبار سے اسی پایہ کے دوسرے نظریات بھی موجود ہیں جہاں تک حقیقت قرآنی کا سوال ہے وہ آخری اور مطلق ہے اور وہ صرف انتا تعین کر دیتی ہے کہ زمین آسمان سے الگ ہوئی ہے۔ کیسے ؟ وہ آسمان کیا چیز ہے جس سے وہ الگ ہو گئی ہے۔ ان باتوں سے آیت کوئی تعرض نہیں کرتی۔ اس لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ اس مسئلے کے بارے میں کسی ایک سائنٹفک مفروضے کے حق میں یہ کہا جائے کہ وہی آیت کا آخری مفہوم ہے۔

یہاں بھی چند مثالیں کافی ہوں گی۔ کیونکہ ہمارا منشا و یہ واضح کرنا تھا کہ سائنٹفک انکشافات سے آیات قرآنی کے معانی میں گہرائی اور وسعتیں پیدا کرنے کا فائدہ اٹھانے کا صحیح طریقہ کیا ہوگا۔ بغیر اس کے کہ آیت کو کسی مخصوص نظریہ یا سائنٹفک حقیقت سے جوڑ کر اس سے اس کی مطابقت ثابت کی جائے

(باقی)

إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ

اقبال کی نظم "سیرِ فلک" قرآن کے آئینہ میں

(۲)

(جناب محمد بدیع الزماں صاحب)

دوسرے بند کے پہلے تین اشعار میں جنت کا نظارہ ہے جہاں وہ سب کچھ ہے جس کی آنکھیں یا کانوں کو آرزو ہو سکتی ہے۔ جہاں شاخوں کی ڈالیوں پر چڑیاں چہچہاتی رہتی ہیں۔ جہاں حوریں بے حجاباز جلوہ فروش نظر آتی ہیں۔ جہاں "ساقیانِ جمیل" یعنی خوبصورت لڑکے جیسے قرآن میں غلمان کہا گیا ہے۔ ہاتھوں میں جام شراب لیے جنتیوں کو پلانے کے لیے گھومتے رہتے ہیں۔ جہاں شراب پینے والوں میں کافی ہماہمی رہتی ہے۔ جنت کے یہ سارے تصورات درج ذیل آیات سے ماخوذ ہیں:۔

"ہرگز نہیں، بے شک نیک آدمیوں کا نامۂ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے اور تمہیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر؟ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ (ابرار) بڑے مزے میں ہوں گے۔ اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر تم خوش حالی کی رونق محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی

کوشش کریں۔ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پییں گے

"مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں۔ حالانکہ وہ ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ آج ایمان والے کفار پر ہنس رہے ہیں مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں۔ مل گیا نا کافروں کو ان حرکتوں کا ثواب جو وہ کیا کرتے تھے۔

(سورۃ المطففین ۸۳۔ رکوع ۱)

تم لوگ اس وقت (روز حشر) تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ دائیں بازو والے سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔ اور بائیں بازو والے تو بائیں بازو والوں (کی بدنصیبی) کا کیا ٹھکانا۔ اور آگے والے تو پھر آگے والے ہیں (وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ) وہی تو مقرب لوگ ہیں۔ (اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ) نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔ (فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ) اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں کم۔ مرصع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ ان کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لیے دوڑتے پھرتے ہوں گے جسے پی کر نہ ان کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہے چن لیں۔"

(سورۃ الواقعہ ۵۶۔ رکوع ۱)

"وہ (جنتی) ایک دوسرے سے جام شراب لپک کر لے رہے ہوں گے جس میں نہ یاوہ گوئی ہوگی نہ بدکاری اور ان کی خدمت میں وہ لڑکے (غلمان) دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو انہی کے لیے مخصوص ہوں گے۔ ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ (سورۃ طور ۵۲۔ رکوع ۱)

"ان کو (جنتیوں کو) وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی، یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لیے ایسے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں۔"
(الدہر ۷۶۔ رکوع ۱)

"وہ (جنتی) آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان سے بیاہ دیں گے۔" (سورۃ الطور ۵۲ رکوع ۱)

جنت کے نقشہ کی ترجمانی کر چکنے کے بعد اقبالؔ اس نظم کے دوسرے بند کے چوتھے شعر سے دوزخ کی کیفیات بیان کرتے ہیں جسے وہ ایک "تاریک خانہ سرد و خموش" بتاتے ہیں۔ تاریک ایسا جیسا قیس یعنی مجنوں کی قسمت اور لیلیٰ کی زلفیں۔ خنکی ایسی کہ اس کے سامنے کرۂ زمہریر کی سردی ماند ہے۔ قربان جائیے اقبالؔ کی تخیل کی پرواز اور انداز بیان پر۔ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ، اس کی گرمی اور اس کے آسمان پر اٹھنے والے شعلے اور ان شعلوں سے آنکھوں کو چوندھیانے والی روشنی کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے مگر اقبالؔ نے جب جہنم کو دیکھا تو وہ اتنی سرد تھی جتنی سردی کرۂ زمہریر پر بھی نہیں پڑتی۔ اتنی تاریک کہ ہاتھوں کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔

اتنا کہہ چکنے کے بعد اقبالؔ جو باتیں اس نظم میں ہمارے آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ "شعلے بھی ہیں مستعار اس کے" یعنی جہنم میں یہ آگ اور اس کے شعلے مستعار یعنی مانگے ہوئے دوسروں کے ہوتے ہیں جس آگ کو دیکھ کر انسان کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ آخری شعر میں وہ اس مانگے کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ دنیا والے جب جہنم میں آتے ہیں تو وہ خود اپنا انگار یعنی آگ ساتھ لاتے ہیں جس سے سارا جہنم دہک اٹھتا ہے اور وہی روشنی اور شعلے نظر آتے ہیں جن کا نقشہ ہمیں خدا نے بتایا ہے۔ "اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں" سے مراد وہ برا "نامہ اعمال" ہے جس میں بدکرداریوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے رہتے ہیں۔ دوزخ کے نقشے کے یہ تصورات درج ذیل آیات پر مبنی ہیں:-

"ہرگز نہیں، یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے۔ (كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْفُجَّارِ لَفِى سِجِّينٍ) اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ قید خانے کا دفتر کیا ہے۔ (وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا سِجِّينٌ) ایک کتاب ہے لکھی ہوئی (كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ) تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے (وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ) جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ (وَمَا يُكَذِّبُ بِهِۦٓ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ) اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں، بالیقین اس روز

یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے۔ پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہی
چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔" (المطففین ۸۳ - رکوع ۱)

اقبال کا یہ شعر

شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے   جن سے لرزاں ہیں مرد غیرت کوش

میں لفظ "لرزاں" غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور درج ذیل آیات کا ترجمان ہے :-

جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال لیا۔ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ آگ ان کے چہروں کی
کھال چاٹ جائے گی اور ان کے جبڑے باہر نکل آئیں گے۔ (سورۃ المومنون ۲۳ - رکوع ۶)

"وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں۔ ان کے سروں پر کھولتا
ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں بلکہ پیٹ کے اندر کے حصے تک گل جائیں گے۔ اور
ان کی خبر لینے کے لیے گرز ہوں گے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل
دیے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزہ۔" (سورۃ الحج ۲۲ - رکوع ۳)

"مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر
گھسیٹا جائے گا۔۔۔ اسی جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان گردش کرتے رہیں گے۔"

(سورۃ الرحمٰن ۵۵ - رکوع ۲)

"اس روز (قیامت کے دن) تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوں گے۔
تارکول کے لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے۔
یہ اس لیے ہوگا کہ اللہ ہر متنفس کو اس کے کیے کا بدلہ دے۔ (لیجزی اللہ کل نفس بما
کسبت) اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔" (سورۃ ابراہیم ۱۴ - رکوع ۷)

"ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے
میں لے چکی ہیں۔ وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی
تلچھٹ جیسا ہوگا اور ان کا منہ بھون ڈالے گا۔ بدترین پینے کی چیز اور بہت بری آرام گاہ۔"

(سورۃ الکہف ۱۸ - رکوع ۴)

"اب اس شخص کی بدحالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار

اپنے منہ پہ ملے گا۔ ایسے ظالموں سے تو کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزا اس کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے۔"
(سورۃ الزمر ۳۹۔ رکوع ۳)

"جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔"
(سورۃ النازعات ۷۹۔ رکوع ۲)

"بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے۔ اس وقت یہ کہیں گے "ہائے ہماری کم بختی۔ یہ تو یوم الجزاء (یوم الدین) ہے۔" یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ حکم ہوگا "گھیر لاؤ سب ظالموں اور ان کے ساتھیوں اور ان معبودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے۔ پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔ اور ذرا انہیں ٹھہراؤ۔ ان سے کچھ پوچھنا ہے — کیا ہو گیا تمہیں۔ اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔ ارے آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ ایک دوسرے کی طرف مڑیں گے اور باہم تکرار شروع کر دیں گے۔ اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے۔ مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ (اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً دردناک سزا کا مزہ چکھنے والے ہو اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔
(سورہ الصٰفٰت۔ ۳۷۔ رکوع ۱و۲)

اس نظم "سیر فلک" کا آخری شعر درج ذیل آیات کا ترجمان ہے :۔

"ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور قیامت کے روز ایک نوشتہ اس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا۔ پڑھ اپنا نامۂ اعمال آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔
(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ رکوع ۲)

اس مضمون کو اقبال ہی کے درج ذیل شعر پر ختم کرنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اس مضمون کے عنوان اور موضوع بحث سے مطابقت رکھتا ہے۔ ؎

یہ "لسان العصر" کا پیغام ہے   اِنَّ وعدَ اللہِ حقٌّ یاد رکھ!

نوٹ: "لسان العصر" سے مراد اکبر الہ آبادی ہیں۔)

کیا خودکشی کو قانونی جواز ملنا چاہیے

اسلامی زاویۂ نگاہ

(۲)

(سید معین الدین قادری)

جو شخص زندگی سے بیزار اور مبتلائے آزار ہو اس کو اپنی مرضی سے معالج کے تعاون سے یا اس کے بغیر مرنے کا حق ہے یا نہیں کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا جواب ہے کہ نہیں ہے۔

قتل نفس کی ممانعت قرآن پاک میں (بنی اسرائیل ۱۷/۳۳) محض اس معنے میں نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو باستثنا ان پانچ صورتوں کے جن میں انسانی جان کی حرمت مرتفع ہو جاتی ہے، قتل نہ کرے بلکہ اس مفہوم میں بھی ہے کہ انسان کی اپنی جان بھی قابل حرمت ہے۔ جتنا بڑا جرم قتل انسان ہے اتنا ہی بڑا جرم و گناہ خودکشی بھی ہے اور اس کی اجازت کسی حالت میں کسی شرط کے ساتھ نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منشائے قرآنی کی تفہیم و تشریح کے طور پر صریح الفاظ میں خودکشی کی مختلف صورتوں کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے مرتکب کے لیے سخت عذاب کی خبر دی ہے۔ یہ احادیث ملاحظہ ہوں:-

(۱) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تردی من جبل فقتل نفسہ فھو فی نار جہنم یتردی فیہا خالدا مخلدا فیہا ابدا ومن تحسی سما فقتل

جس نے پہاڑ کی بلندی سے گر کر خودکشی کی وہ آتش دوزخ میں گرتا رہے گا جہاں اس کو ہمیشہ رہنا ہوگا جس نے زہر پی کر جان دی، زہر کا پیالہ اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ آتش دوزخ میں تا ابد زہر آشام رہے گا جس نے

نفسہ فسمہ فی یدہ یتحساہ فی نار جہنم خالداً مخلداً فیہا ابداً ومن قتل نفسہ بحدیدۃ فحدیدتہ فی یدہ یتوجا بہا فی بطنہ فی نار جہنم خالداً مخلداً فیہا ابداً (بخاری، مسلم)

جس نے زہر پی کر خودکشی کی وہ ہمیشہ ہمیشہ آتش دوزخ میں رہیگا اور اس آلہ کو اپنے شکم میں داخل کرتا رہیگا

(۲) وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذی یخنق نفسہ یخنقہا فی النار والذی یطعنہا یطعنہا فی النار (رواہ البخاری)

جس نے اپنے کو پھانسی لگا کر جان دی وہ دوزخ میں خود کو پھانسی لگاتا رہے گا جس نے نیزے سے خودکشی کی وہ دوزخ میں خود کو نیزے سے زخم پہنچاتا رہے گا۔

(۳) عن جندب بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان فیمن کان قبلکم رجل بہ جرح فجزع فاخذ سکینا فحز بہا یدہ فما رقا الدم حتی مات قال اللہ تعالیٰ بادرنی عبدی بنفسہ فحرمت علیہ الجنۃ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے جو لوگ تھے ان میں سے ایک شخص کسی طرح زخمی ہوگیا۔ زخم کی شدت سے سراسیمہ ہو کر اس نے چھری لی اور اپنا زخمی ہاتھ کاٹ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ خون بند نہ ہونے کے باعث آخر کار وہ مرگیا۔ اس کے حق میں فرمان الٰہی یہ ہوا کہ میرے بندے نے اپنے کو ہلاک کرنے میں مجھ پر سبقت کی ہے اس لیے میں نے اس پر جنت حرام کردی۔

(مشکوٰۃ، کتاب القصاص، ص ۲۹۹)

خودکشی کے سلسلے میں کتاب و سنت اور اسلامی زاویہ نگاہ اور اس فعل شنیع کو قانونی جواز دیے جانے کے حامیوں کے نقطۂ نظر کا بنیادی فرق یہ ہے کہ آخر الذکر کے نزدیک انسان اپنی جان کا خود مالک ہے اور اپنی اس ملکیت کو باختیار خود تلف کرنے کا مجاز ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وسیع تر مفاد، بیماری کی نوعیت اور بعض دیگر اہم عوامل کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس کے برخلاف قرآن دو ٹوک اور غیر مبہم اعلان کرتا ہے کہ الا ان للہ من فی السموات والارض آگاہ رہو آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے سب اللہ کے مملوک ہیں۔

(یونس ۱۰/۶۶)

"یہ جان اللہ کی ملکیت ہے اور ہم اس کے اتلاف تو درکنار اس کے کسی بے جا استعمال کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ دنیا کی اس امتحان گاہ میں اللہ تعالیٰ جس طرح بھی ہمارا امتحان لے۔ اسی طرح آخر وقت تک ہم کو امتحان دیتے رہنا چاہیے خواہ حالات امتحان اچھے ہوں یا برے۔ اللہ کے دیے ہوئے وقت کو قصداً ختم کر کے امتحان سے بھاگ نکلنے کی کوشش بجائے خود غلط ہے۔ کجا کہ یہ فرار بھی ایسے جرم عظیم کے ذریعے کیا جائے جسے اللہ نے صریح الفاظ میں حرام قرار دیا ہے۔ اس کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ آدمی دنیا کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور ذلتوں اور رسوائیوں سے بچ کر عظیم تر اور ابدی تکلیف و رسوائی کی طرف بھاگتا ہے۔ (۱۷/۲۳ ج ۳ ۳ تفہیم ج ۲ ص ۳۴۱)

اسلام کسی بھی معاملے میں محض سلبی (NEGATIVE) پہلو نہیں اختیار کرتا۔ اس مسئلے میں بھی اس نے ایسا نہیں کیا ہے کہ خودکشی اور اتلاف جان کو حرام قرار دے کر بات ختم کر دی ہو یا محض ترہیب سے کام لیا ہو اور عذاب الیم کی بشارت کے ذریعے لوگوں کو ایک غلط اقدام سے باز رکھنے کو کافی سمجھا ہو۔

جو لوگ مبتلائے آلام، آزمائشوں سے دوچار، پر مسائل زندگی سے فکرمند، گراں بار، خستہ و ریش و دل فگار ہوں اسلام انہیں ہمت دلاتا ہے ان کے حوصلے کو طاقت بخشتا ہے۔ انہیں ابھارتا ہے کہ اولوالعزم انسانوں کا شیوہ اور شعار اپنائیں۔ کوہ ثبات کی طرح اٹل رہیں اور پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دیں۔ نماز کے ذریعے ایمان کو قوت دیں اور قلب کو توانائی بہم پہنچائیں اور جو ایسا کرے اس کے لیے بشارت ہے کہ اس کو اللہ کی معیت حاصل ہوگی اللہ جو طاقت کا حقیقی سرچشمہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا	اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ	لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ	آزمائشیں آئیں گی، جان کا نقصان
وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ	ہوگا۔ مال کا گھاٹا ہوگا۔ فاقے کا سامنا ہوگا
وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ	خوف و خطر سے واسطہ پڑے گا، پیداوار تلف
الصّٰبِرِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ	ہوگی ـــ ان ساری آزمائشوں میں جو
مُّصِیْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ	ثابت قدم رہیں گے ان حالات میں جو لوگ
اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ	صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو

صلوات من ربھم ورحمۃ وا ولئک ھم المھتدون

کہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی اس کی رحمت ان پر سایہ فگن ہو گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں

(البقرہ ۲/ ۱۵۵ تا ۱۵۷)

اسلامی نظام عقائد میں اور نظام فکر میں نہ مایوسی کی گنجائش ہے، نہ اتلاف جان کی اور نہ احساس بیچارگی کی۔ مومن کا یقین ہے کہ انسانی زندگی کی انتہا قبر نہیں جس زندگی کی انتہا قبر ہے وہ عارضی ہے اس کے بعد بھی زندگی ہے وہ دائمی ہے اور حقیقی ہے وہاں جو انعام اللہ سے ملے وہ بہتر بھی ہو گا اور باقی رہنے والا بھی ہو گا۔ یہ یقین دنیوی زندگی کی بے شمار محرومیوں کا مداوا بن جاتا ہے۔ یہ یقین بڑی سے بڑی حرماں نصیبی اور پہاڑ جیسی افتاد کے مقابلے کی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اسلام کا فلسفہ زندگی اور بنیادی عقیدہ ہے جو زوال بصارت کی شب دیجور میں بھی یقین کی شمع روشن رکھتا ہے اور مومن کے قدم ڈگنے نہیں دیتا۔ بینائی گئی چہ غم!
مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے

(۱) وعن انس قال سمعت النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ سبحانہ وتعالیٰ اذا ابتلیت عبدی بحبیبتیہ ثم صبر عوضتہ منھما الجنۃ یرید عینیہ (رواہ البخاری)

جب میں اپنے بندے کو ان دونوں سے محروم کر کے آزماتا ہوں جو اس کو محبوب ہوتی ہیں تو ان دونوں کے عوض میں اسے جنت عطا کرتا ہوں۔ دو سے مراد دونوں آنکھیں۔

(۲) عن ابی سعید عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال ما یصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا ھم ولا اذی ولا غم حتی الشوکۃ یشاکھا الا کفر اللہ بھا من خطایاہ (متفق علیہ)

مسلمان کسی مشقت، مضرت، بیماری، آزار سے دو چار ہو۔ یہاں تک کہ اس کو معمولی سا کانٹا بھی چبھے۔ افتاد چھوٹی ہو یا بڑی۔ اللہ اس کو گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ اس کی کچھ خطاؤں سے درگذر فرماتا ہے

(۳) عن جابر قال دخل رسول الله صلى الله عليه وسلم على ام السائب فقال مالك تزفزفين قالت الحمى لا بارك الله فيها فقال لا تسبي الحمى فانها تذهب خطايا بني ادم كما تذهب الكير خبث الحديد (رواه مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام سائب کے یہاں تشریف لے گئے (دیکھا کہ وہ کپکپا رہی ہیں) دریافت فرمایا یہ تم پر لرزہ کیوں طاری ہے؟ بولیں ستیاناس ہو اس کا یہ بخار ہے۔ آپ نے فرمایا بخار کو برا بھلا نہ کہو یہ اولاد آدم کے گناہوں کو ایسے نیست و نابود کر دیتا ہے جیسے لوہار کی دھونکنی لوہے کے زنگ کو۔

یہی نہیں کہ آخرت میں جزائے اعمال کا یقین اور مصائب و آفات اور غم و آلام کی انعام خداوندی کے ذریعے تلافی، خطاؤں کی معافی اور کوتاہیوں سے درگذر کا وعدہ ناسازگار حالات میں مومن کو برداشت کی طاقت اور تحمل کا حوصلہ عطا کرتا ہے بلکہ آنے والی زندگی میں ملنے والی دنیا سے نجات اور رحمت و مغفرت کی امید بار غم کو ہلکا اور مومن کو شکر الٰہی سے تر زبان رکھتی ہے۔ انتہائی اذیت کے عالم میں بھی جو سنے مزاج پرسی کی تو جواب "الحمد للہ" ملا۔ حرف شکایت زبان پر نہ آیا، نہ شکایت آزار اور نہ شکوۂ روزگار۔

کتاب و سنت کی تصریحات اور اسلامی عقائد کی بنیاد پر جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے اس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ رحمت و شفقت اور خیر خواہی کا معاملہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ بیماروں کی عیادت، حاجتمندوں کی امداد، فقراء و مساکین پر انفاق، اعزہ و اقارب بلکہ حتی کہ مسافر و ہمنشین کے حقوق کی رعایت اس معاشرے کی شناخت ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرہ ہمدردی، جذبہ خدمت اور انسانیت دوستی کا ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں کوئی معذور، محتاج، بیمار، پریشان حال فکرمند اپنے کو تنہا اور بے سہارا محسوس نہیں کر سکتا۔ پھر اس خدمت اور بہی خواہی، تیمارداری اور دلجوئی میں تفوق اور برتری کا انداز نہیں ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو ذلت کا اور دوسروں پر انحصار کا تلخ اور رنج کا احساس ہو اور عزت نفس اور خودداری اس کو موت کا منصوبہ بنانے اور معالج سے اس کی تکمیل پر اصرار کرنے پر مائل کرے۔ یہاں دکھ درد اور احسان جتا کر نیکیاں ضائع کرنے کا چلن نہیں۔ یہاں تنگ حال بلال کو "سیدنا بلال" کہہ کر وہ خطاب کرتا ہے جو فی الجملہ صاحب ثروت بھی ہے جس کے رعب سے دل سینوں میں کانپتے تھے جو منصب خلافت اور کرسی اقتدار پر بھی متمکن ہے۔ یہاں ابوذر غفاری جیسے درویش مزاج افراد کے انسان ہیں جاہ و ثروت جن کی قلندرانہ زندگی سے میل نہیں کھاتی۔ ہم جیسوں میں جو غنی کہلاتا ہے وہ

ان سے التجا کرتا ہے کہ اس کا پیش کردہ زہد یہ قبول کریں اور شرف قبولیت نہیں حاصل ہوتا۔ یہاں نابینا ابن ام مکتوم رضؓ کے مقابلہ میں قریش کے سرداران متکبر و جبار و مغرور ساقط تصور کیے جاتے —
پھر اس معاشرے (اسلامی۔ عملاً اور فی الواقع) میں کوئی معذور، عاجز، درماندہ، فاقہ کش اور تنگ حال، آلام روزگار کا شکار، دوسروں پر انحصار کے غم میں موت کا تمنائی کیونکر ہو سکتا ہے؟

اس صالح معاشرے کی تعمیر کن خطوط پر ہوئی۔ درج ذیل احادیث سے اندازہ ہوگا۔

(۱) عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ یقول یوم القیامۃ یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی قال یا رب کیف اعودک وانت رب العالمین قال اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعدہ اما علمت انک لو عدتہ لوجدتنی عندہ (رواہ مسلم)

اللہ تعالیٰ روز قیامت ارشاد فرمائے گا۔ اے فرزند آدم میں بیمار رہا تو نے میری عیادت نہ کی۔ بندہ عرض کرے گا "اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار اور پالنہار ہے میں تیری عیادت کیونکر کرتا۔ فرمایا "کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے۔ تجھے معلوم نہ تھا کہ اگر اس کی بیمار پرسی کرتا تو تجھے میرا تقرب اور خوشنودی حاصل ہوتی۔"

(۲) عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من توضأ فاحسن الوضوء وعاد اخاہ المسلم محتسبا بوعد من جہنم مسیرۃ ستین خریفا (مشکوۃ بحوالہ ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا۔ (ہر عضو کو ٹھیک سے دھویا) اور اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کی وہ ساٹھ سال کی مسافت کے جہنم سے دور کر دیا گیا۔

(۳) وعن ثوبانؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان المسلم اذا عاد اخاہ المسلم لم یزل فی خرفۃ الجنۃ حتی یرجع (مسلم)

مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی بیمار پرسی کرتا ہے تو وہ اس وقت تک باغ جنت میں رہتا ہے جب تک مریض کے پاس سے واپس نہیں ہوتا۔ اتنی دیر اس کا ثواب [illegible] رہتا ہے۔

(۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

عودوا المریض واطعموا الجائع وفکوا العانی	بیمار کی عیادت کرو۔ بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور
(بخاری ـــ راہ عمل ص ۱۳۷)	مبتلائے مشقت غلام کی رہائی کا انتظام کرو۔
(۵) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	باہمی مودت و محبت میں تم کو مسلمان ایسے
وسلم تری المومنین فی تراحمھم	نظر آئیں گے جیسے ایک ہی جسم کے اعضاء ہوں
وتوادھم وتعاطفھم کمثل الجسد	ایک کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو باقی اعضاء
اذا اشتکی عضو تداعی لہ سائر الجسد	بخار و بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور
بالسھر والحمی (نعمان بن بشیر متفق علیہ)	اس کا ساتھ دیتے ہیں۔
چو عضوے بدرد آورد روزگار	دگر عضوہا را نماند قرار
(۶) عن ابن عباس قال سمعت	اس کا ایمان تشنۂ تکمیل ہے جو شکم سیر ہو اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول	اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہ جائے

لیس المومن بالذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ (مشکوٰۃ)

(۷) جریر ابن عبداللہ فرماتے ہیں "ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صبح کے وقت حاضر تھے کہ اتنے میں کچھ لوگ آئے تلواریں باندھے، موٹے کمبل لپیٹے۔ ان کے جسم کا بیشتر حصہ ننگا تھا۔ ان کے فاقے اور تنگ دستی کا منظر دیکھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک فرط تاثر سے زرد پڑ گیا۔ آپ کاشانۂ نبوت میں تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے۔ بلال کو حکم دیا کہ اذان دیں (نماز کا وقت ہو چکا تھا) ـــ نماز کے بعد آپ نے خطبہ دیا۔ خطبہ میں آپ نے سورۂ نساء کی ابتدائی آیات تلاوت فرما کر وحدت الٰہ اور وحدت آدم کی جانب توجہ دلائی۔ صرف الٰہ واحد ہی عبادت کا مستحق ہے۔ اولاد آدم کو ایک دوسرے کے ساتھ شفقت و رحمت کا معاملہ کرنا چاہیے۔ پھر سورۂ حشر کی آیت تلاوت فرمائی اور تقویٰ اور زاد آخرت کی فکر کرنے کی ہدایت فرمائی۔ بعد ازاں ارشاد فرمایا: "لوگوں کو چاہیے کہ صدقہ دیں، دینار دیں۔ ایک صاع کھجور دیں۔ آپ نے فرمایا کہ کسی کے پاس کھجور کا آدھا ٹکڑا ہو تو وہ بھی دے (کم و بیش کی قید نہیں، ہمدردی، اخلاص اور زاد آخرت کی فکر شرط ہے۔ تقریر کا یہ اثر ہوا کہ انصار میں سے ایک صاحب دوڑے ہوئے گئے اور ایک تھیلی لا کر پیش کر دی جو ان کے ہاتھ میں سماتی نہ تھی۔ پھر تو سلسلہ بندھ گیا۔ آں حضرت کے سامنے غلے اور کپڑے کے دو ڈھیر الگ الگ لگ گئے۔ غربا و مساکین کے لیے راحت کی یہ فوری سبیل ہوتے دیکھ کر اور اپنے جاں نثاروں اور اطاعت شعار متبعین میں تقویٰ اور زاد آخرت

انسانیت دوستی اور کشادہ دلی کے آثار کا مشاہدہ کرکے چہرہ مبارک دمک اٹھا جیسے آپ ذریعے وصل گیا ہو
ایک لمبی حدیث سے مستفاد (مسلم)

(۸) ان ابواب الخير لكثيرة - التسبيح والتحميد والتهليل والامر بالمعروف والنهي عن المنكر وتميط الاذى عن الطريق وتسمع الاصم وتهدي الاعمى وتدل المستدل على حاجته وتسعى لشدة ساقيك مع اللهفان المستغيث وتحمل لشدة ذراعيك مع الضعيف فهذا كله صدقة منك على نفسك

نیکی کے دروازے بہت ہیں (جو جنت میں کھلتے ہیں) سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کا ورد۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، راستے سے راہ گیروں کو تکلیف پہنچانے والی اشیاء کو ہٹانا، ثقل سماعت سے معذور (بہرے آدمی) کو باواز بلند گفتگو کے (جو اگر مسلسل ہو تو پُر مشقت ہوتی ہے) سننے میں سہولت بہم پہنچانا، نابینا کو راہ چلتے سہارا دینا راستہ دکھانا، مستمند و حاجتمند کی رہنمائی، مشورہ طلب کرے تو اسکی حاجت برآری کیلیے اعانت پنڈلیوں کی ساری طاقت کے ساتھ آفت زدہ اور حیران کی مدد کے لیے تگ و دو کرنا، کسی بوڑھے یا ناتوان کی بوجھ اٹھانے میں مدد کرنا، بازوؤں کی پوری طاقت سے سہارا دینا۔ یہ سب ایسے کام ہیں جو اجر و ثواب میں مالی صدقات سے کم نہیں (جو مالی مقدرت نہ رکھتا ہو ان خدمات کے ذریعہ اور ان کاموں کے واسطے سے اجر و ثواب آخرت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

(ابوذر غفاری - زاد راہ صلاا)

(۹) وعن صهيب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم عجبا لامر المومن ان امره كله خير و

مومن کا معاملہ عجیب ہے، ہر حال میں اس کے لئے بھلائی ہے اور یہ امتیاز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ مسرت سے بہرہ ور ہوا

لیس ذٰلک لاحد الا للمومن ان — تو شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے حق میں
اصابتہ سرّاء شکر فکان خیرا لہ و ان — بھلائی ہے مصیبت سے دوچار ہوا تو صبر کرتا
اصابتہ ضرّاء صبر فکان خیرا لہ (مسلم) — ہے اور یہ بھی اس کے حق میں بھلائی ہے۔

ہوائے زندگانی نرم خیز اور مسرت افزا ہے تو شکر ہے کشتیٔ حیات وقف طوفان و تلاطم ہے تو صبر ہے

غلط اندیشی کیوں؟ عقدهٔ لاینحل کی کشود

ایک زوال بصارت کے علاوہ ہر اعتبار سے صحت مند ہشتاد سالہ انجینئر اور ان جیسے یا ان سے بہت زیادہ آلام و افکار کے نرغے میں گرفتار لوگ جو زندگی سے فرار کے خواہاں اور موت کی آغوش میں سکون کے آرزومند ہیں ان کی اصل مشکل وحی الٰہی کی رہنمائی سے محرومی، قیاسی فلسفوں، بے خدا اور خدا فراموش تہذیبوں اور ظن و تخمین کی بنیاد پر قائم کردہ مسلمات کا چکر ہے۔ شب و روز اپنے مشکلات و مسائل کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ بے شمار عقدہ ہائے لاینحل ہیں جن کی گرہ کھولنا چاہتے ہیں لیکن گرہ کشا ناخن میسر نہیں۔ غلط مقام سے فکر کی ابتدا کرتے ہیں اور غلط نتیجے پر پہنچتے ہیں — وہی نہیں ڈاکٹر ڈیو (DAVE) اور مقالہ نگار جیسے ان کے غم خوار بھی — سب نے خالق کو گم کر دیا ہے اس کے وجود کے ممکن ہے منکر نہ ہوں (کوئی بلید الذہن ہی اس زمانے میں وجود باری کا منکر ہو سکتا ہے) اس کی صفات کا، قدرت کا، حقوق اور اختیارات کا شعور نہیں رکھتے۔ یہ لوگ فکر کی ابتدا اس مقام سے کرتے ہیں کہ انسان اپنے خالق کا مملوک نہیں اپنی مرضی کا خود مالک ہے اور اس کے اتلاف کا بنیادی حق رکھتا ہے۔ یہی ان کی غلطی ہے۔ مریض ذہن کی غلط اندیشی پر حیرت ہے ان کی بے ربطی افکار پر جو صحت مند جسم کے اندر صحت مند دماغ رکھتے ہیں دوسروں کی صحت کے نگراں ہیں۔

اصل شے زندگی کا فلسفہ، اس پر تعمیر ہونے والا معاشرہ اس کی بنیاد پر وجود پذیر ہونے والا معاشرتی ماحول ہے جو صلاحیت فکر اور سلامتی جان کی ضمانت بن سکے۔ اس کے بغیر انسانی جان کی قدر و قیمت حشرات الارض سے بھی کمتر رہے گی۔

فکر انسانی کے لیے اسلام ہی صالح اور مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے جو اس کو غلط راہ پر پڑنے اور غلط نتائج پر پہنچنے سے محفوظ و مصون کر دیتا ہے اور اسلامی معاشرہ — بشرطیکہ اسلامی ہو — ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے ہم مسلک اور ہم خیال ہی نہیں تمام بنی نوع انسان کو "خدا کا کنبہ" سمجھتے ہیں اور سب کی دل جوئی

اور خدمت کو رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ باور کرتے ہیں۔ اسلام ایک ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں آدمی مشکلات میں بھی ہارنے کے بجائے مطمئن اور خندہ جبیں رہتا ہے اور موت کو آواز نہیں دیتا۔

اے مرگِ ناگہاں! ترا انتظار ہے

یہ شبِ تار جس کا نام عہدِ حاضر کے انسان کی زندگی ہے اس سے نکلنے کی واحد راہ وحی الٰہی کی روشنی اور رہنمائی سے استعانت و استفادہ ہے۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

اقبالؒ

سعید نورسی
اسلام کے داعیِ کبیر

(الدکتور محسن عبدالحمید)

وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ رباط (مراکش) ایک ماہنامہ "دعوۃ الحق" کے نام سے شائع کرتی ہے۔ اس رسالہ کے نومبر ۱۹۸۴ء کے شمارے میں بدیع الزماں نورسی رحمۃ اللہ کے سوانح حیات پر ڈاکٹر محسن عبدالحمید کے قلم سے ایک طویل مقالہ مطالعے میں آیا۔ اس مقالہ کی ابتداء میں سعید نورسی کے عہد کی ایک جھلک بطورِ تمہید پیش کی گئی ہے۔ یہ تمہید سلطان عبدالحمید ثانی کی سیاسی بصیرت اور ان کی دینی حمیت، بظاہر مسلمانوں کی لیکن درحقیقت یہودیوں کی جمعیۃ اتحاد و ترقی، سلطان عبدالحمید کی معزولی، مصطفےٰ کمال کی کرتوت، الغائے خلافت، اتاترک کے الحادِ ترکی سے اسلامی شریعت کی جلاوطنی اور سوئٹزرلینڈ کے قانون کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اسی تمہید سے مجھے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ حیاتِ ترکیہ پر جو دائرۃ المعارف ترکی میں شائع ہوا تھا اس میں صراحت کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کا انکار درج ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

ہم ذیل میں سوانح حیات کے حصے کی تلخیص پیش کرتے ہیں۔ ذیلی عنوانات ہم نے قائم کیے ہیں۔

(ادارہ زندگی نو)

ابتدائی حالات زندگی شرقی اناطولیہ کے صوبہ تبلیس کے قصبوں میں ایک قصبہ "نورس" ہے۔ اس قصبہ کے ایک صالح متقی کردی خاندان میں ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں سعید نورسی پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ انھوں نے دینی مکاتب و مدارس میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ انھوں نے ابتدائی صرف ونحو کی تعلیم اپنے بھائی ملا عبداللہ اور دوسرے علماء سے حاصل کی

پھر انھوں نے مختلف قصبوں اور شہروں میں جاکر معتبر کتابوں اور مستند اساتذہ سے دینی علوم پورے ذوق و شوق اور شغف کے ساتھ حاصل کیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ عطا کی تھی جس کو خارق عادت کہنا صحیح ہے۔ اس کا اعتراف ان کے تمام اساتذہ نے کیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک نے نورسی کے تحت امتحانات لیے اور وہ سب میں کامیاب ہوئے۔ (مقالہ نگار نے ہر بات کے لیے مستند حوالے دیے ہیں) نورسی کی قوت حافظہ کا حال یہ تھا کہ انھوں نے ایک ہفتہ میں جمع الجوامع جیسی مشکل کتاب یاد کرلی تھی۔ اپنے منطقہ کے تمام علماء کو مباحثوں میں انھوں نے شکست دی تو ان سب نے مل کر ان کا نام "سعید المشہور" رکھا۔ پھر وہ تبلیس گئے اور وہاں سے شہر "تیلو" گئے۔ اس شہر کی ایک عبادت گاہ میں معتکف ہوکر انھوں نے فیروز آبادی کی قاموس المحیط حرف سین تک یاد کرلی۔

درس و تدریس کی ابتدا

۱۸۹۲ء میں ملّا سعید شہر ماردین گئے اور وہاں کی مسجد جامع میں درس دینا شروع کیا اور لوگوں کے سوالات کے جوابات بھی دینے لگے لیکن ان کے حاسدوں نے شہر کے حاکم سے ان کی چغلی کھائی۔ اس نے ان کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا اور وہ "تبلیس" پہنچا دیے گئے۔

تبلیس کے حاکم کو جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو اس نے اصرار کرکے ان کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ یہاں ان کو فرصت ملی کہ اس کے وسیع کتب خانے سے فائدہ اٹھائیں چنانچہ انھوں نے فلسفہ، علم کلام، منطق، تفسیر، حدیث و فقہ اور کتب نحو کا مطالعہ کیا اور جن علوم و فنون کے متون انھوں نے یاد کیے۔ ان کی تعداد اسّی تک پہنچ گئی اور اسی شہر میں انھوں نے وہاں کے ایک بڑے عالم الشیخ محمد الکفروی سے علوم دین کی آخری تعلیم حاصل کی۔

بدیع الزماں کا لقب

۱۸۹۴ء میں وہ شہر "وان" گئے اور وہاں انھوں نے ریاضیات، فلکیات، کیمیا، طبقات الارض، فلسفۂ جدیدہ، تاریخ، جغرافیہ اور دوسرے علوم کا اتنا گہرا مطالعہ کیا اور وہ درجہ حاصل کیا کہ ان علوم کے متخصصین بھی حیران رہ گئے۔ اسی شہر میں ان کی وسعت علم اور حیرت انگیز ذہانت کے اعتراف کے طور پر ان کو بدیع الزماں (نادرۂ روزگار) کا لقب دیا گیا۔

قرآن کے بارے میں برطانیہ کے ایک وزیر کا اظہار خیال

انھیں ایام میں بدیع الزماں سعید نورسی نے مقامی اخبارات میں پڑھا کہ برطانیہ کے وزیر مستعمرات

گلیڈاسٹون نے پارلیمنٹ میں قرآن ہاتھوں میں لیکر کہا کہ جب تک یہ کتاب مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے ہم ان پر اپنا حکم نہیں چلا سکتے۔ ہمارے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہم اس کتاب کو دنیا سے غائب کر دیں یا مسلمانوں کا تعلق اس سے توڑ دیں (۱) یہ خبر پڑھ کر نورسی سخت اضطراب میں مبتلا ہو گئے اور ان کی نیند حرام ہو گئی۔ انھوں نے سوچا کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی قائم کرنا ضروری ہے جو ایک طرف اسلام کے حقائق اور اس کے علوم کی نشر و اشاعت کرے اور دوسری طرف مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دے کہ وہ علمی میدان میں آگے بڑھیں اور اپنی مادی و روحانی زندگی کو اونچا اٹھائیں۔ یہ تجویز لے کر وہ ۱۸۹۶ء میں استنبول گئے لیکن وہاں کے ذمہ دار لوگوں نے اس تجویز کو بہرے کانوں سے سنا آخر وہ ناکام ہو کر اپنی جگہ واپس آ گئے۔

استنبول کا دوسرا سفر

اس دوسرے سفر تک ان کی علمی شہرت پورے ملک میں پہنچ چکی تھی اور استنبول بھی ان کی علمی شہرت سے گونج رہا تھا وہ ۱۹۰۷ء میں دوبارہ استنبول گئے تو اس مرتبہ طلباء و علماء دونوں ہی نے ان کا استقبال کیا۔ طلبہ نے بھی اور علماء نے بھی ان سے سوالات کیے اور انھوں نے ہر سوال کا پوری وسعت علمی کے ساتھ جواب دیا۔ اس کے نتیجے میں تمام لوگوں نے ان کی علمی امامت کا اعتراف کیا اور کہا کہ اس علم و فضل کا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے۔ ترکی کے عالم سید حسن فہمی پاشا ادخلو نے اپنی یادداشت میں ان سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے

> استنبول میں جب ایک جوان آئے جن کو بدیع الزماں کہا جاتا تھا تو اس وقت میں مدرسہ "الفاتح" میں معلم تھا۔ میں نے سنا کہ انھوں نے اپنے بالاخانے کے دروازے پر یہ لکھ کر لٹکا دیا ہے کہ "یہاں ہر مشکل حل ہوتی ہے اور ہر سوال کا جواب دیا جاتا ہے اور جواب دینے والا خود کسی سے کوئی سوال نہیں کرتا" یہ سنکر مجھے خیال آیا کہ اس طرح کا دعوے کرنے والا مجنون ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن تمام طلبہ اور علماء جو ان سے مل کر آتے وہ ان کی تعریف و تحسین کرتے۔ اس چیز نے میرے دل میں بھی ان سے ملنے کی رغبت پیدا کی۔ اس وقت استنبول میں مجھے سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا۔ میں نے کچھ مشکل ترین اور دقیق ترین سوالات منتخب کیے اور یہ سوالات "الٰہیات" یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں تھے۔ اس تیاری کے بعد میں ان سے ملنے گیا اور وہ تمام سوالات

۱؎ قرآن کا دنیا سے غائب کر دینا تو کسی حکومت کے بس میں نہیں ہے۔ البتہ انگریزوں نے قرآن سے مسلمانوں کا تعلق توڑ دینے میں اچھا خاصہ رول ادا کیا ہے۔ (مترجم)

ان کے سامنے رکھے۔ انھوں نے ان سوالات کے جو جوابات دیے وہ اتنے عجیب اور حیران کن تھے جیسے وہ اس وقت میرے ساتھ تھے جب میں وہ سوالات منتخب کر رہا تھا اور وہ کتابیں ان کے سامنے تھیں جن سے میں نے وہ سوالات منتخب کیے تھے۔ میں بالکل مطمئن ہو گیا کہ ان کا علم ہماری طرح کسبی نہیں ہے بلکہ علم لدنی ہے۔

استنبول میں انھوں نے سلطان عبدالحمید سے بھی ملاقات کی اور ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اسلامی علوم کے مدارس کے ساتھ جدید علوم کے مدرسے بھی قائم کیے جائیں اور یہ بات انھوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اتنی جرأت سے کہی اور سلطان سے اس انداز میں گفتگو کی کہ درباریوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے چنانچہ ان کو طبیبوں کے پاس بھیجا گیا کہ وہ انہیں جانچ کر بتائیں کہ یہ پاگل تو نہیں ہو۔ امراض دماغی کے طبیب نے جواب دیا کہ اگر ان کے دماغ میں جنون کا ایک ذرہ بھی ہو تو دنیا میں کوئی ایک شخص بھی صحیح الدماغ نہیں ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ان میں جنون کا شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کو وزارت داخلہ بھیجا گیا اور وزیر داخلہ سے یہ مکالمہ ہوا۔

وزیر: ۔ سلطان نے خاص طور پر آپ کو سلام کہا ہے اور ایک ہزار قرش آپ کا وظیفہ مقرر کیا ہے اور جب آپ اپنے شہر واپس جائیں گے تو آپ کو تیس لیرہ (ترکی سکہ) وظیفہ ملتا رہے گا اور بطور ہدیہ اسی لیرہ سلطان نے آپ کے لیے بھیجا ہے

بدیع الزماں: ۔ میں کسی سرکاری عہدے یا وظیفہ کا خواہش مند نہیں ہوں اور اگر ایک ہزار لیرہ بھی ہو تو میں ہرگز قبول نہ کروں گا۔ اس لیے کہ میں یہاں کسی شخصی اور ذاتی غرض سے نہیں آیا ہوں بلکہ مملکت کی مصلحت کے پیش نظر آیا ہوں۔ آپ لوگ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ دراصل اس بات کی رشوت ہے کہ میں خاموش ہو جاؤں

وزیر: ۔ اس طرح تم ارادۂ سلطانی کو رد کر رہے ہو اور بادشاہ کا ارادہ رد نہیں کیا جاتا۔

بدیع الزماں: ۔ میں اسی لیے رد کر رہا ہوں کہ سلطان کو یہ بات بری لگے اور وہ مجھے بلائیں تاکہ میں ان کے سامنے حق گوئی کا فریضہ انجام دے سکوں۔

وزیر: ۔ سوچ لو، اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

بدیع الزماں: ۔ بہانے مختلف ہیں اور موت ایک ہے۔ اگر میں قتل کر دیا گیا تو قلب امت میرا مقبرہ ہوگا۔ میں جب استنبول کے لیے روانہ ہوا تھا تو میں نے اپنی جان اپنی ہتھیلی پر رکھ لی تھی۔ تمہارا جی چاہے کرو

اس لیے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے انجام سے واقف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ امت کو بیدار کروں اور اس
لیے کہ میں بھی اس ملک کا شہری ہوں اور اس کا ایک فرد ہوں۔ یہ کام میں نے اس لیے شروع نہیں کیا ہے کہ کوئی عہدہ
حاصل کروں۔ میرے جیسا آدمی حکومت کی خدمت اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ حکومت کو نصیحتیں کرے اور
یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان میں تاثیر ہو اور تاثیر اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب نصیحت ذاتی مفاد کی
آلائش سے پاک ہو اس لیے میں کوئی عہدہ اور وظیفہ رد کرنے کے لیے مجبور ہوں۔

وزیر: سا بے شہر میں آپ جن علوم کی نشر و اشاعت کی تجویز رکھتے ہیں وہ مجلس وزراء میں زیر بحث آ چکی ہے۔

بدیع الزماں: پھر اس تجویز کو کیوں موخر کیا جاتا ہے اور نیز سے لیے عہدے کی پیشکش میں جلدی
کیوں کی جاتی ہے۔ کیا آپ لوگ شخصی مفاد کو مفاد عامہ پر ترجیح دیتے ہیں؟ (وزیر کے پاس اس بات کا کوئی
جواب نہ تھا۔)

اس کے بعد بدیع الزماں کی دعوت اسلامی اور تیز ہو گئی۔ وہ اپنی کتابوں میں اخبارات و رسائل میں مجلس
شوریٰ اور نفاذ شریعت کی دعوت پوری صراحت کے ساتھ دینے لگے۔

جمعیۃ اتحاد و ترقی کا پھندا

بدیع الزماں کی شہرت اور عوام پر ان کے اثر کی وجہ سے ماسونی جمعیۃ اتحاد و ترقی نے ان کو اپنے پھندے
میں پھانسنا چاہا۔ "سلانیک" میں جمعیۃ اتحاد و ترقی کے صدر مشہور یہودی "عمانوئیل قرہ صو" نے بدیع الزماں سے ملاقات
کی اور تھوڑی دیر کی گفتگو میں وہ بھاگ کھڑا ہوا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ اس شخص کی گفتگو نے مجھے اسلام
کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا تھا اس لیے میں نے گفتگو بند کر دی۔

گرفتاری

جمعیۃ اتحاد و ترقی کے الحاد کی تردید بدیع الزماں نے جمعیۃ محمدی کے نام سے شروع کی۔ وہ گرفتار کر کے فوجی
محکمہ میں لائے گئے۔ انھوں نے اس قدر جرأت مندانہ صریح اور بلیغ انداز میں اپنے موقف کا دفاع کیا کہ رئیس محکمہ کمال متاثر ہو گیا
اور ان کو بری کر دیا۔ انھوں نے جو تقریر کی تھی اس کا اقتباس یہ ہے:۔

> اگر میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو میں حقائق اسلام میں سے کسی ایک حقیقت پر انہیں قربان کر دینے میں نہ
> ہچکچاتا۔ میں کہتا ہوں کہ میں ایک طالب العلم ہوں اور ہر چیز کو شریعت کی ترازو میں تولتا ہوں۔ میں
> صرف ملت اسلام پر یقین رکھتا ہوں۔ میں تم سے کہتا ہوں اور میں اس برزخ

کے سامنے کھڑا ہوں جس کو تم قید خانہ کہتے ہو، مجھے اس ٹرین کا انتظار ہے جو مجھے آخرت تک پہنچا
میں یہ بات اس لیے نہیں کہتا ہوں کہ صرف تم سنو، بلکہ اس لیے کہتا ہوں کہ یہ پوری دنیا میں گونجے (نورسی جب محکمہ میں داخل ہوئے
تھے تو پردہ اٹھا کر ان کو ان لوگوں کی لاشیں دکھائی گئی تھیں جن کو پھانسی دی جا چکی تھی
یہ کام نورسی کو مرعوب اور خوف زدہ کرنے کی خاطر کیا گیا تھا) انھوں نے کہا میں تو آخرت
کا مشتاق ہوں اور ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں جو پھانسی پر لٹکا دیے گئے ہیں ۔
پہلے کی مستبد حکومت عقل کی دشمن تھی اور اب یہ زندگی کی دشمن ہے ۔ جنون زندہ باد، موت
زندہ باد اور ظالموں کے لیے جہنم زندہ باد (بدیع الزمان زندہ باد، جرأت ایمانی زندہ باد،
کلمہ حق زندہ باد۔ مترجم)

گلو خلاصی کے بعد "وان" واپس آئے اور وہاں کے خاندانوں اور قبیلوں میں وعظ و درس کا سلسلہ شروع کیا اور ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "مناظرات" رکھا۔

شام کا سفر

۱۹۱۱ء میں انھوں نے بلاد شام کا سفر کیا اور جامع اموی میں ایک بلیغ علمی خطبہ دیا۔ مسلمانوں کو انھوں نے حوصلہ، بیداری، حرکت اور اسلام کی اخوت کو پوری مضبوطی کے ساتھ تھام لینے کی دعوت دی۔ یہ تقریر "خطبہ شامیہ" کے نام سے چھپ چکی ہے۔

جہاد میں شرکت اور گرفتاری

بلقان کی جنگ اور جنگ عظیم اول میں سعید نورسی رضاکار فوج کے قائد متعین کیے گئے تھے "بتلیس" میں جب روسی فوجیں داخل ہوئیں تو ان کے مدرسے کے اساتذہ، طلبہ اور دوسرے رضاکاروں نے ان کی قیادت میں روسی فوجوں سے دست بدست جنگ کی۔ بدیع الزماں زخمی ہوئے اور انہیں گرفتار کر کے مشرقی روس بھیج دیا گیا۔ قید خانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو انہیں موت تک پہنچا سکتا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:۔

مشرقی روس کی فوجوں کا سالار اعلیٰ قیصر کا ماموں "نیکولا نیوکلاریخ" تھا وہ قیدیوں کو دیکھنے قید خانہ میں آیا کرتا۔ وہ آتا تو تمام قیدی اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے لیکن بدیع الزماں بیٹھے رہتے۔ یہ بات سپہ سالار نے نوٹ کی۔ وہ دوسری دفعہ ان کے سامنے سے گزرا لیکن یہ کھڑے نہیں ہوئے۔ جب تیسری بار بھی یہ کھڑے نہیں ہوئے تو وہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو ترجمان کے واسطے سے ہوئی۔ نیکولا نے

پوچھا شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں ؟ سعید نورسی نے جواب دیا۔ میں نے آپ کو پہچانا۔ آپ نیکولا نیکولیفچ قیصر کے ماموں اور منطقہ قفقاز کے سالار اعلیٰ ہیں۔ اس نے کہا جب یہ بات ہے تو تم نے میری توہین کیوں کی ؟ نورسی نے کہا ہرگز نہیں میں نے کسی کی توہین نہیں بلکہ وہ کیا جو میرا عقیدہ مجھے حکم دیتا ہے۔ اس نے کہا۔ تمہارا عقیدہ تمہیں کیا حکم دیتا ہے ؟ سعید نے جواب دیا۔ میں ایک علم رکھنے والا مسلمان ہوں اور میرے قلب میں ایمان ہے جس کے قلب میں ایمان ہوتا ہے وہ اس سے افضل ہے جس کے قلب میں ایمان نہیں۔ اگر میں آپ کے لیے کھڑا ہوتا تو اپنے عقیدے کی توہین کرتا۔ اس لیے میں کھڑا نہیں ہوا۔ یہ سنکر اس نے کہا تم نے مجھے بے ایمان کہہ کر میری توہین کی بلکہ میری پوری فوج اور قیصر کی توہین کی ہے اس لیے اس معاملے پر غور اور فیصلے کے لیے ایک فوجی عدالت قائم کی جائے گی۔ چنانچہ یہ عدالت قائم ہوئی اور اس میں سعید نورسی کا مقدمہ پیش ہوا۔ قید خانے کے تمام قیدیوں نے بدیع الزماں سے اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ وہ سالار اعلیٰ سے معافی مانگ لیں اور وہ جب آئے تو کھڑے ہو جائیں۔ انھوں نے انکار کیا اور کہا۔

"میں آخرت کا مشتاق ہوں اور اس بات کا مشتاق ہوں کہ مر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دوں اس لیے میں اپنے ایمان کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

فوجی عدالت نے نورسی کی موت کا فیصلہ دیا جس دن انہیں پھانسی دینی تھی اس دن چند فوجی انہیں لینے کے لیے آئے اور ایک افسر ان کے ساتھ آئے اور سعید نورسی مسرت وابتہاج کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور روسی افسر سے کہا مجھے امید ہے کہ آپ آخری فریضہ ادا کرنے کی مہلت دیں گے اور وہ یہ ہے کہ میں وضو کر دوں اور دو رکعت نماز پڑھ لوں ______

انھوں نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سالار اعلیٰ یہ پورا منظر ایک ٹیلے پر کھڑا دیکھ رہا تھا وہ ٹیلے سے اتر کر نورسی کے قریب آیا اور جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے کہا مجھے امید ہے کہ میری معذرت قبول کریں گے۔ مجھے گمان تھا کہ آپ کا میرے لیے کھڑا نہ ہونا میری اہانت کے لیے تھا لیکن اب مجھے یقین آگیا ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ آپ کے عقیدے اور ایمان کا حکم تھا اس لیے میں نے فوجی عدالت کا حکم منسوخ کر دیا اور میں آپ کو آپ کی صلابت دینی پر مبارک باد دیتا ہے اور دوبارہ آپ سے معذرت طلب کرتا ہوں۔" پھانسی کا قصہ تو ختم ہوا لیکن قید باقی رہی۔

سعید نورسی تقریباً ڈھائی سال تک جیل میں رہے۔ اس کے بعد جب زار شاہی کے خلاف روس میں بغاوت ہوئی تو حیرت انگیز طور پر ان کو جیل سے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔ جیل سے نکل کر وہ جرمنی ہوتے ہوئے استنبول پہنچ گئے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ "دار الحکمۃ الاسلامیہ" کے رکن مقرر کیے گئے۔ بڑے بڑے علماء دار الحکمۃ

کے رکن مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کے رکن مقرر کیے جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ علوم جدیدہ کے بھی عالم تھے۔ حکومت نے اس کے لیے ایک بڑی تنخواہ یا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ نورسی بقدر ضرورت اسے اپنی ذات پر خرچ کرتے اور باقی رقم اپنی کتابوں کی طباعت پر صرف کرتے اور وہ کتابیں لوگوں میں مفت تقسیم کرتے۔

جب سامراجی حکومتوں کی فوجیں استنبول میں داخل ہو گئیں تو اس مصیبت کو نورسی نے عالم اسلامی کے لیے نیزے کی ضرب قرار دیا اور اس کے خلاف جذبہ جہاد کے لیے انھوں نے کمر کس لی۔ انھوں نے پمفلٹ تصنیف کرنے شروع کیے جن میں انگریزوں اور دوسرے حملہ آوروں کے خلاف عوام کو ابھارتے ان سے جہاد کرنے کی دعوت دیتے اور دوسری طرف عوام میں حوصلہ پیدا کرتے۔ انہیں مایوس ہونے سے بچاتے۔ وہ پمفلٹ ان کے دوستوں اور طلبہ کے ذریعے پوشیدہ طور پر لوگوں میں تقسیم کیے جاتے۔ اناطولیہ سے جب غاصبوں کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی تو انھوں نے ایک سو بارہ مفتیوں اور عالموں کا فتویٰ اس کی تائید میں شائع کیا۔ ان کی شہرت اور اعدائے اسلام کے خلاف ان کے جہاد کی وجہ سے انقرہ کی حکومت نے متعدد بار انقرہ آنے کی دعوت دی وہ ۱۹۲۲ء میں انقرہ گئے اور اسٹیشن پر حکومت کی طرف سے ان کا شاندار استقبال کیا گیا لیکن جلد ہی بدیع الزماں کو معلوم ہو گیا کہ حکومت انقرہ کے ارکان اسلام اور اس کے فرائض و واجبات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ ترکی کو اسلام سے دور ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے داعی اسلام کو جو صدمہ پہنچا ہو گا وہ ظاہر ہے۔ انھوں نے انقرہ کی پارلیمنٹ میں ایک مؤثر تقریر کی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ پارلیمنٹ کے ۶۰ ممبر نماز پڑھنے کے لیے باہر گئے اس چیز نے مصطفےٰ کمال کو بہت پریشان کیا۔ سعید نورسی اور اس کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا اس نے نورسی سے کہا۔

"بے شک ہمیں آپ جیسے عالم کی ضرورت ہے۔ ہم نے آپ کو یہاں اس لیے بلایا تھا کہ آپ کی اہم رایوں سے استفادہ کریں لیکن آپ نے سب سے پہلا کام ہمارے لیے یہ کیا کہ نماز کی باتیں شروع کر دیں۔ آپ کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوئی کہ اس مجلس کے ارکان میں تفرقہ ڈال دیں۔"

سعید نورسی نے مصطفےٰ کمال کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تیز لہجہ میں کہا:۔

"اے پاشا! اے پاشا! ایمان کے بعد سب سے بڑی حقیقت جو جلوہ گر ہوتی ہے وہ نماز ہے اور جو شخص نماز نہیں پڑھتا وہ خائن ہے اور خائن کا حکم مردود ہے۔"

اس کے بعد مصطفےٰ کمال نے یہ طے کیا کہ نورسی کو واعظ عام بنا کر اناطولیہ بھیج دے لیکن سعید نورسی نے جانے

سے انکار کر دیا وہ انقرہ ہی میں تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ انھوں نے اللہ کے وجود اور اسلامی عقائد کے احکام پر کتابیں لکھیں تاکہ اس انحراف کا مقابلہ کیا جاسکے جو مغرب کی راہ سے مسلم معاشرے میں داخل ہو رہا تھا۔ انقرہ میں آٹھ ماہ قیام کے بعد وہ "وان" آگئے۔ وہاں وہ غیر آباد مقامات اور پہاڑوں پر عبادت اور غور و فکر کرتے رہے لیکن اس حال میں بھی حکومت نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان کو آزاد چھوڑے رکھے چنانچہ وہ گرفتار کرکے استنبول لائے گئے اور وہاں سے ایک دور دراز گاؤں "بارلا" میں لاکر قید کر دیے گئے۔ یہ گاؤں ایک پہاڑ پر آباد تھا۔ اس وقت کے حکام نے یہ سمجھا کہ اس طرح الحاد کے خلاف اس تحریک کو وہ بے اثر کر دیں گے جو بدیع الزماں سعید نورسی کی قیادت میں چل رہی تھی لیکن وہ غلطی پر تھے۔ ترکی کا یہ دور دراز علاقہ سعید نورسی کے نور سے جگمگا اٹھا اور دعوت اسلامی کا ایک عظیم مرکز بن گیا۔ اسی قید خانے میں انھوں نے اپنی عظیم کتابیں لکھیں ان میں اسلامی حقائق پیش کیے گئے۔ الحادی اور تشکیکی لہروں اور موجوں پر بند باندھے گئے اور مسلمانوں کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنے عقیدے اور اپنے اسلام کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کی کتابیں، رسالے اور پمفلٹ حیرت انگیز طریقے سے ترکی کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیل گئے۔ مردوں اور عورتوں نے ان کے لاکھوں نسخے نقل کیے اور پورے ملک میں پھیلا دیے۔ ان کتابچوں نے ایک طرف ترکی عوام کو ایمان و اسلام کی حقیقت بتائی اور دوسری طرف ان پر یہ واضح کیا کہ اسلام کے بارے میں اتاترک کی حکومت کا منصوبہ کیا ہے۔ پورے ملک میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ آخر کار ملحد اتاترک کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔

سعید نورسی کی دوبارہ گرفتاری اور عدالت میں ان کا ایمان افروز بیان

۱۹۳۲ء میں حکم صادر ہوا کہ عربی زبان میں اذان نہ دی جائے۔ سعید نورسی نے یہ حکم نہیں مانا اور ان کے شاگردوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ یہ لوگ مسجد کے اندر عربی زبان میں اذان دیتے تھے جب یہ بات حکومت کو معلوم ہوگئی تو اس نے نورسی کو "اسپارطہ" بھیج دیا وہ چند مہینے "رسائل نور" تصنیف کرتے رہے۔ ۱۹۳۵ء کی کسی صبح کو بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔ ان میں سعید نورسی بھی تھے وہ ایک فوجی عدالت میں پیش کیے گئے اور ۱۱ ماہ کی ان کو سزا دی گئی جرم یہ بتایا گیا کہ انھوں نے ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں عورتوں کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ بے پردہ باہر نہ نکلیں بلکہ چادر یا برقع اوڑھ کر نکلیں۔ اپنے دفاع میں حاکم عدالت کے سامنے جو تقریر انھوں نے کی وہ ان کی مشہور تقریروں میں ہے۔ اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:-

مجھے اس تہمت میں یہاں لایا گیا ہے کہ میں ایک رجعت پسند شخص ہوں اور مذہب کا پروپیگنڈا کرتا ہوں جس سے

اس عالم میں جو کچھ واقع ہو سکتا ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ کسی عمل کا ممکن ہونا اور چیز ہے اور اس کا واقع ہونا اور چیز ہے محض امکان پر عتاب نازل کرنا اور سزا دینا صحیح نہیں ہے۔ دیکھو ماچس سے ممکن ہے کہ کسی کا گھر جلا دیا جائے اب اگر کسی کے پاس ماچس ہو تو کیا یہ امکان اس کو مرتکب جرم قرار دے گا؟ —— میں جو علوم اسلامی میں مشغول ہوں تو اس کا محرک اللہ کی رضا کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ کیا میں صوفیہ کے طریقوں میں مشغول ہوں؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ ہمارا یہ زمانہ ایمان کی حفاظت کا زمانہ ہے طریقت کی حفاظت کا زمانہ نہیں ہے۔ بہت سے لوگ جنت میں اس کے بغیر داخل ہوں گے کہ وہ صوفیہ کے کسی طریقے سے تعلق رکھتے تھے یا نہیں لیکن کوئی شخص جنت میں ایمان کے بغیر داخل نہیں ہوگا۔

تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ اتنا مال کہاں سے آیا ہے کہ تم اپنے ارد گرد ایک جماعت کی شکل میں لوگوں کو جمع رکھتا ہے؟ اور میں یہ پوچھتا ہوں کہ تمہارے پاس وہ کون سے وثائق ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میں نے کوئی جماعت بنائی ہے یا میں ایسے کام کر رہا ہوں جس کے لیے مال کی ضرورت ہے؟

ایک گردش ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

"اسکی شہر" کی جیل میں سعید نورسی نے ۱۱ ماہ کی سزا کاٹی۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ان کو شہر "قسطمونی" میں جلاوطن کر دیا گیا۔ پولیس کی مرکزی چوکی کے سامنے ایک مکان میں ان کو نظر بند کیا گیا اور سات سال تک وہ نظر بند رہے۔ اس مدت میں وہ "رسائل نور" لکھتے رہے اور پتہ نہیں کن ذرائع سے ترکی کے ہر گوشے میں پہنچتے رہے اور ان رسالوں کا یہ پھیلاؤ حکومت کو پریشان کرتا رہا۔ سعید نورسی کی زندگی کا بڑا حصہ اس مقام سے اس مقام اور اس جیل سے اس جیل میں گذرا۔ گویا "ایک گردش ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں"۔ ہر سزائے قید کے وقت انھوں نے عدالتوں میں جو بیانات دیئے وہ حوصلہ، ہمت، بے خوفی اور جرأت ایمانی کے چراغ ہیں جو ترکی میں اسلام کی روشنی پھیلاتے رہے اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔ (نیزلی) کی عدالت میں جو بیانات انھوں نے دیئے ہیں وہ تمام بیانات سے زیادہ جرأت مندانہ ہیں۔ ان کے چند اقتباسات ہم ذیل میں دے رہے ہیں۔

سعید نورسی پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ایک خفیہ دینی جماعت بنائی ہے جو موجودہ لادینی حکومت کو ختم کرنے کے لیے عوام کو ابھارتی ہے۔ اس کے جواب میں سعید نورسی نے کہا:

"ہاں ہم ایک جماعت ہی ہیں، یہ جماعت ہر زمانے میں چار کروڑ افراد پر مشتمل رہی ہے۔ اس جماعت کا جو عظیم الشان دستور ہے اس کے تحت یہ ہر روز پانچ بار اپنے ارکان کے درمیان ربط و تعلق

کر رہا ہے رسالے کا کام کرتی ہے تاکہ اس کا سب سے اہم تصور بھائی چارہ اور برادری کا ہے۔ یہ شعار ہے
انما المومنون اخوۃ (بلاشبہ مومن بھائی بھائی ہیں) ہم اسی مقدس اور عظیم جماعت کے
افراد ہیں۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ان مسلمان بھائیوں کو علمی انداز میں قرآن کے حقائق بتائیں اور انہیں
مضبوط بنائیں اور یہ مقاصد ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہے۔ اس ابدی قید خانے سے
اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے جو ہر وقت ہمیں دھمکاتا رہتا ہے۔"

النام کا یہ جواب کتنا گہرا، کتنا محسوس اور کتنا ایمان افروز ہے۔ انھوں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا:-

"تم رسالہ نور کی حرکت کو کیسے روک سکتے ہو، اس لیے کہ وہ حقائق قرآن کی خدمت ہے اور قرآن
وہ حقیقت ہے جس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم سے جڑا ہوا ہے اور کس کی مجال ہے کہ وہ اس
رشتے کو کاٹ سکے جو عرش عظیم سے جڑا ہوا ہے۔"

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر خفیہ سیاست و جمعیت کا اتہام کس طرح لگ سکتا ہے جو باہم قرآن
کی حجیت اس کے معجزات اور اس کے بیانات کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں جبکہ دوسری طرف دین
سے خارج ڈاکٹر دوزی کو یہ حق حاصل ہے کہ قرآن اور اس کے حقائق پر بے شرمی کے ساتھ بہتان باندھے
اور پھر اسے ایک مقدس کام سمجھا جائے۔ اس لیے کہ یہ رائے اور فکر کی حریت ہے۔ کیا رائے اور فکر کی
آزادی اسی کا نام ہے؟ رہا قرآن کا نور تو لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو روشن رکھتا ہے۔ اس کو خطرہ
قرار دیا جائے اور جتنے گھناؤنے الفاظ ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے لیے استعمال کیے جائیں۔ اس
معاملے میں فکر اور رائے کی حریت اور اس کا تقدس کہاں چلا جاتا ہے؟

"تم لادینی جمہوریت کی بات کرتے ہو؟ کہا جاتا ہے کہ دین و مذہب سے اس کا تعلق نہیں ہے
نہ اچھا نہ برا یعنی وہ غیر جانبدار رہتی ہے۔ لیکن تمہارا حال کیا ہے؟ تم نے ہر جرم، ہر اخلاقی گندگی
یہاں تک کہ خدا پر جھوٹ اور افترا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے اور یہ تم رائے، فکر اور ضمیر کی حریت کے
نام پر کر رہے ہو لیکن جب تمہارے سامنے قرآن کی کسی آیت کی تفسیر و تشریح کی جاتی ہے تو تم چیخنے
لگتے ہو خفیہ جمعیت، سیاست، خطرہ۔"

اس کے بعد سعید نورسی نے جس خدائیت اور جذبات کا مظاہرہ کیا اسے پڑھیے:-

"اگر معاملہ یہی ہے تو اچھی طرح جان لو کہ اگر میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو میں اللہ کے دین پر

اس سب کو قربان کرنے کے لیے بالکل تیار ہوتا ہے۔ میں تمہارے شر سے صرف ایک گھر میں پناہ لیتا ہوں اور وہ ہے حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

"تم مجھ کو محکوم کر رہے ہو کہ میرے اعمال و بیانات تخریب اندرونی اور امن عامہ میں خلل پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تمہارے اپنے تخریب اندرونی ہے اور تم ہی علم کا بہانہ بنا کر دین اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں تیس سال سے دعوت کا کام کر رہا ہے تو اس طویل زمانے میں اس کی وجہ سے کوئی ایک واقعہ بھی امن عامہ کے خلاف ہوا ہے اور کیا تم اس کا کوئی ثبوت دے سکتے ہو؟ اب تم کان کھول کر سن لو۔ اے وہ لوگو جنہوں نے دنیا کے عوض اپنا دین بیچ ڈالا ہے اور کفر مطلق نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں اپنی اس انتہائی قوت سے جو مجھے اللہ نے عطا کی ہے، کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔ ہماری انتہائی آرزو یہ ہے کہ اسلام کی چھوٹی سے چھوٹی حقیقت پر اپنے سر نچھاور کر دیں۔"

اپنی ذات، اپنی دعوت حق اور اسلام کی طرف سے جو دفاع انھوں نے کیا اس میں یہ بھی کہا: —

"ہم ہزار بار جیل میں رہنے کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کہ اس استبدادی حکومت کے سایہ میں حرمتوں کو چاک چاک ہوتا ہوا دیکھیں۔ اس ظالم حکومت میں کوئی آزادی باقی نہیں ہے۔ نہ علم کی آزادی، نہ ضمیر کی آزادی، نہ اظہار خیال کی آزادی اور نہ دین کی آزادی۔"

زنادقہ اور منافقین نے تمہاری پشت پناہی سے دھوکا کھا کر عدل اور حق کے گال پر طمانچے مارے ہیں۔ انھوں نے استبداد کو جمہوریت، ارتداد کو نظام حکومت، جہل اور حماقت کو تمدن اور ظلم کو قانون بنا ڈالا ہے اور اس طرح انھوں نے اپنے وطن سے غداری کی ہے اور اس پر ایسی ضرب لگائی ہے جو کوئی اجنبی بھی اس پر نہیں لگا سکتا ہے۔

اور دفاع میں آخری حد تک جو بات وہ کہہ سکتے تھے وہ یہ تھی: —

"خبردار! یہ بھی طرح جان لو کہ اگر میرے سر میں جتنے بال ہیں اتنے سر ہوتے اور ہر ایک سر میرے جسم سے کاٹا جاتا تو میں اس سر کو جو حقائق قرآنیہ کی نذر ہے، زندیقوں کے آگے کبھی نہ جھکاتا۔"

استاذ نورسی ۱۹۵۰ء تک اس حال میں رہے کہ کبھی جیل میں اور کبھی نظر بند۔ پھر جب ملک میں آزادانہ انتخابات ہوئے اور ایسی پارٹی برسر اقتدار آئی جو ملحد و زندیق نہ تھی۔ تو اسلام پر حملہ جو تہائی صدی سے جاری تھا اس کی شدت

کر ہمت اور بہادری سے اس کا موقع ملا کہ رسائل نور کو طباعت نصیب ہوئی اور سعید نورسی کو بھی ملک میں چلنے پھرنے کی آزادی ملی۔

وفات

بدیع الزماں سعید نورسی آخر وقت تک اپنے کاموں میں سرگرم اور چست رہے۔ یہاں تک کہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو وہ اپنے رب سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ترکہ

بدیع الزماں سعید نورسی رحمہ اللہ نے اپنے ترکے میں کتابیں چھوڑیں۔ وہ رسائل نور کی تصنیفات سے مشہور ہوئے۔ ان رسائل کا اصل موضوع اسلامی عقائد و اعمال ہیں خواہ وہ کلی ہوں یا جزئی۔ ان کی قوت حافظہ وسعت مطالعہ اور خارق عادت ذہانت کا ذکر ان کے حالات میں ہو چکا ہے۔ قرآن کریم ان کی زندگی کے لیے پانی تھا اور وہ اس کی مچھلی تھے۔ ان کے تمام رسائل میں وہی جذبات، وہی خیالات اور وہی عقائد و نظریات پھیلے ہوئے ہیں جو انھوں نے قرآن سے حاصل کیے تھے۔ ترکی زبان میں ان کے رسائل کی تعداد ۱۳۰ ہے جس کی تقسیم یہ ہے :-

مقالات۔ ۳۳ مقالے ۷۵۰ صفحات ہیں۔ مکتوبات ۵۴۰ صفحات ہیں۔ لمعات۔ ۳۳ لمعات ۴۳۰ صفحات ہیں۔ شعاعات۔ ۱۵ شعاعیں ۶۴۰ صفحات ہیں۔ ضمیمہ "بارلا" و ضمیمہ قسطمونی ۴۲۰ صفحات ہیں۔ ضمیمہ امیر داغ دو جز ہیں۔ پہلا جز ۲۸۴ صفحات ہیں اور دوسرا جز ۲۲۰ صفحات ہیں۔ اب ان میں سے بعض رسائل ایک مستقل جلد میں چھپ گئے ہیں۔ اس جلد کے صفحات ۲۲۰ ہیں۔ مستقل موضوعات پر بھی بعض رسائل ہیں جیسے المدخل الی عالم النور۔ مفتاح النور۔ محاکمات۔ سیرت ذاتیہ۔ عربی زبان میں بھی انھوں نے ۵ رسالے لکھے۔ بعض لوگوں نے ان رسائل کی تعریف میں یہ سچی بات لکھی ہے کہ یہ رسائل عصر حاضر اور اس کے بعد آنے والے زمانے کو روشن کرتے ہیں۔ یہ پوری نوع انسانی کو قرآن کے حقائق بتلاتے ہیں۔ یہ رسائل ایمان و اسلام، فکر و روح و قلب و عقل کی پیاس بجھاتے ہیں۔ یہ عصر حاضر کی زبان میں جدید اسلوب میں وقت کے چیلنج کا جواب دیتے ہیں۔

رسائل نور کے ترجمے عربی زبان میں

استاذ جلیل عبدالکریم باردینی نے معجزات قرآنیہ حشر۔ معجزات احمدیہ۔ حزب اکبر نوری کا ترجمہ ایک ہی مجموعہ میں کیا ہے۔ جو تقریباً ۴۱۰ صفحات میں آیا ہے۔ استاذ حسان قاسم الصالحی نے رسائل نور کے مندرجہ ذیل مجموعے

شائع کیے ہیں:-

(۱) قطوف من ازاہیر النور ۲۳۵ صفحات — یہ ۱۹۸۳ء میں بغداد سے شائع ہوا

(۲) رسالۃ الحشر ۱۲۶ صفحات یہ ۱۹۸۳ء میں 〃 〃 〃

(۳) الآیۃ الکبریٰ ۹۴ صفحات یہ ۱۹۸۴ء میں 〃 〃 〃

(۴) زہرۃ النور ۹۴ صفحات یہ ۱۹۸۴ء میں 〃 〃 〃

(۵) ملائکہ، بقاء روح اور آخرت۔ ۴۳ صفحات۔ یہ ۱۹۸۴ء میں موصل سے شائع ہوا

(۶) الشیوخ۔ ۹۳ صفحات یہ ۱۹۸۴ء میں 〃 〃 〃

نوٹ:- زندگی نو کے مدیر حقیر کی رائے میں اس مقالے کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کرکے ہزاروں کی تعداد میں پھیلانا چاہیے۔

(بقیہ صفحہ ۴۹ — بیعت کی سات قسمیں)

کس چیز پر بیعت کر رہے تھے؟ انھوں نے کہا موت پر۔ یہ حدیث مسلم، ترمذی، نسائی اور بیہقی میں بھی ہے۔

(۷) سمع وطاعت پر بیعت

عبادہ بن الصامت سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی سمع وطاعت پر تنگی میں بھی، آسانی میں بھی، خوشی میں بھی ناگواری میں بھی۔ الخ

اس معنی کی روایت بخاری و مسلم میں بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سمع وطاعت پر بیعت پر بیعت کیا کرتے تھے۔

نوٹ:- سالم علی بہنساوی عربی زبان کے ایک مشہور مصنف ہیں۔ ان کی کتاب الحکم وقضیۃ تکفیر المسلم کے ایک حصہ کا ترجمہ۔

بیعت کی سات قسمیں

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے جن چیزوں پر بیعت لی تھی، محدثین اور فقہاء نے ان کی سات قسمیں قرار دی ہیں جو احادیث سے مستنبط ہیں۔

(۱) **بیعت اسلام** (الف) مسند امام احمد میں ہے کہ اسود بن خلف نے فتح مکہ کے دن رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ایک پہاڑ کے قریب لوگوں سے اسلام اور شہادت پر بیعت لے رہے ہیں اسود کے بیٹے محمد نے پوچھا کہ شہادت کیا ؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ اللہ پر ایمان اور لا الٰہ الا اللہ وان محمد اعبدہ ورسولہ کی شہادت پر بیعت لے رہے تھے۔ یعنی ہر شخص حضور کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہتا تھا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں) ہیثمی نے کہا ہے کہ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(ب) بیہقی نے اپنی روایت میں کہا ہے کہ لوگ، بڑے اور چھوٹے، مرد اور عورتیں، سب آپ کے پاس آئے اور آپؐ نے اسلام اور شہادت پر ان سے بیعت لی۔ یہی بات طبرانی نے معجم کبیر و صغیر میں، امام بغوی نے حاکم اور ابو نعیم نے روایت کی ہے۔

(ج) بخاری و مسلم نے مجاشع بن مسعود سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں اور میرے بھائی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ میں نے کہا۔ یا رسول اللہ ہم سے ہجرت پر بیعت لیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ ہجرت تو ہجرت کرنے والوں کے ساتھ تمام ہو چکی تو میں نے کہا کہ آپ اب کس چیز پر ہم سے بیعت لیں گے ؟ آپ نے فرمایا۔ اسلام اور جہاد پر۔

(د) ابو عوانہ نے اپنی مسند میں روایت کی ہے کہ جریر بن عبد اللہ نے جس دن مغیرہ بن شعبہ کی وفات ہوئی

تھی۔ جو لوگوں سے کہا۔ میں تمہیں اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ میں نے اپنے اسی ہاتھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اسلام پر اور آپ نے مجھ پر مسلمان کی خیرخواہی کا فریضہ عائد کیا تھا۔ تو رب کعبہ کی قسم میں تم سب کا خیر خواہ ہوں۔ بخاری جلد ا میں یہ حدیث زیادہ مکمل طور پر مروی ہے۔

ان تمام حدیثوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام میں داخلے کے لیے مردوں اور عورتوں سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت پر بیعت لیتے تھے۔ دوسری احادیث میں صراحت ہے کہ آپؐ نے بیعت کے وقت کسی عورت کا ہاتھ کبھی نہیں چھوا۔

(۲) اعمال اسلام پر بیعت

(الف) طبرانی نے جریرؓ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان چیزوں پر بھی بیعت کی جن چیزوں پر عورتوں نے آپؐ سے بیعت کی تھی۔ عورتوں سے جس بیعت کا اس حدیث میں ذکر ہے اس کی وضاحت بخاری، احمد، ابویعلیٰ اور طبرانی کی حدیثوں میں ہے سلمیٰ بنت قیس سے روایت ہے۔ یہ بنی عدی بن نجار کی ایک خاتون تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ اور قدیم الاسلام تھیں۔ انھوں نے آپ کے پیچھے بیت المقدس اور کعبہ دونوں طرف رخ کرکے نماز پڑھی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور میں نے انصار کی چند عورتوں کے ساتھ آپ سے بیعت کی۔ یہ بیعت ان چیزوں پر تھی: ۔"ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ چوری نہ کریں۔ زنا نہ کریں۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں۔ اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں (اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت بچہ تو کسی اور کا جنے اور شوہر سے کہے کہ یہ تیرا ہی بچہ ہے) اور معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں۔ (عورتوں کی اس بیعت کے لیے سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (مترجم)

(ب) امام احمد نے جریرؓ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ اور ہر مسلم کے لیے خیرخواہی پر۔ یہ روایت بخاری، مسلم اور ترمذی میں بھی ہے۔

(۳) بیعت ہجرت

(الف) امام احمد نے، بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن ابی خیثمہ، ابوعوانہ، بغوی۔ ابونعیم اور طبرانی نے حارث بن زیاد الساعدی سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوم الخندق کو میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور آپ لوگوں سے ہجرت پر بیعت لے رہے تھے۔ ہم نے یہ سمجھا کہ ہمیں بھی بیعت کرنے کے لیے بلایا جائے گا۔ تو میں نے

کہا۔ یارسول اللہ اس سے آپ ہجرت پر بیعت لیجیے۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ کون ہے؟ میں نے کہا یہ میرے چچا کا لڑکا ہے جو طے ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں تم لوگوں سے ہجرت پر کیسے بیعت لوں گا۔ لوگ تمہاری طرف ہجرت کرکے آتے ہیں۔ تم ان کی طرف ہجرت کرکے نہیں جاتے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ جو شخص انصار سے محبت کرتا ہے یہاں تک کہ وہ مرجائے تو وہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کریگا کہ اللہ اس سے محبت کرتا ہوگا اور جو شخص انصار سے بغض رکھے اور پھر مرجائے تو وہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ اس سے نفرت کرتا ہوگا۔ (کنز العمال ج ۸۔ مجمع الزوائد ج ۱۔ اصابہ ج ۱)

(ب) امام مسلم نے اپنی صحیح میں بریدہ الاسلمی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے جنگ کے لیے فوج کی کوئی ٹکڑی بھیجتے تھے تو امیر لشکر کو یہ ہدایت فرماتے تھے کہ تم دشمن کی فوج کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کی طرف دعوت دینا۔ پہلی بات یہ کہ وہ اسلام لے آئیں اور دارالہجرت کی طرف منتقل ہوجائیں (یعنی مدینہ کی طرف ہجرت کریں) اگر وہ اسلام لانے سے انکار کریں تو دوسری بات یہ کہ ان سے جزیہ کا مطالبہ کرنا اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو پھر جنگ۔ اور جو اسلام لے آئے لیکن ہجرت نہ کرے تو اس پر وہ قوانین جاری ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں پر جاری ہوتے ہیں۔ البتہ اسے مال فے میں حصہ نہیں ملے گا۔

( ) بیعت علی النصرۃ

مسند احمد میں حضرت جابرؓ سے ایک طویل روایت مروی ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں گھر گھر جاتے۔ مکہ کے مشہور دو بازار عکاظ اور مجنہ میں جاتے۔ حج کے موقع پر قبائل عرب کے خیموں میں جاتے اور فرماتے کون مجھے پناہ دیتا ہے۔ کون میری مدد کرتا ہے کہ میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا دوں اور اس کو جنت ملے گی۔ لیکن کوئی شخص اس کے لیے تیار نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یثرب سے آپ کی طرف بھیجا۔ لوگ مکہ جاتے رہے اور اسلام لاتے رہے۔ یہاں تک کہ یثرب کے ہر گھر میں اسلام داخل ہوگیا۔ ہم نے سوچا کب تک ہم رسول اللہ کو مکہ میں چھوڑے رکھیں گے۔ چنانچہ ستر افراد کا ایک قافلہ مکہ گیا۔ اس قافلے سے جن چیزوں پر آپ نے بیعت لی ان میں ایک یہ تھی۔

وعلی ان تنصرونی فتمنعونی اذا	اور اس بات پر کہ جب میں تمہارے پاس
قدمت علیکم مما تمنعون	آجاؤں گا تو تم میری مدد کروگے اور ان

منه انفسكم وازواجكم وابناءكم ولكم الجنة	چیزوں سے میری حفاظت کروگے جن سے اپنے آپ کی اپنی بیویوں کی اور اپنے بیٹوں کی حفاظت کرتے ہو اور اس کے بدلے میں تمہیں جنت ملے گی

(۵) بیعت جہاد

حسن بن سفیان ۔ طبرانی ۔ ابونعیم ۔ حاکم اور بیہقی نے بشیر بن الخصاص سے روایت کی ہے ۔ انھوں نے کہا ۔۔۔۔۔۔ کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کرنے کے لیے آیا ۔ میں نے پوچھا ۔ یا رسول اللہ آپ کس چیز پر بیعت لیتے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک پھیلایا اور کہا تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ ایک ہے ۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے ہیں اور اس کے رسول ہیں اور پانچ نمازیں ان کے وقتوں میں ادا کرو اور فرض زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو اور حج کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو ۔ میں نے کہا ۔ یا رسول اللہ سب چیزیں تو میں کروں گا لیکن دو چیزیں نہیں ۔ جہاد نہیں اور صدقہ نہیں ۔ خدا کی قسم میرے پاس صرف ۱۰ ذود (تین سے لیکر دس تک کی تعداد کو ذود کہتے ہیں) اونٹ ہیں ۔ یہ میرے اہل و عیال کی ضرورت پوری کرتے ہیں ۔ باقی رہی جہاد کی بات تو میں ایک بزدل آدمی ہوں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ جنگ میں جو پیٹھ پھیر کر بھاگے وہ اللہ کا غضب لیکر لوٹے گا ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں جنگ میں جاؤں تو کہیں پیٹھ نہ پھیروں ۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا اور اسے حرکت دیتے ہوئے فرمایا ۔ اے بشیر! نہ صدقہ نہ جہاد تو پھر کس طرح جنت میں داخل ہوگے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ دست مبارک پھیلائیے ۔ میں آپ سے بیعت کروں گا ۔ آپ نے ہاتھ پھیلایا اور میں نے تمام چیزوں پر بیعت کی ۔ اس حدیث سے صدقہ اور جہاد کی اہمیت پوری طرح واضح ہوتی ہے

(۶) موت پر بیعت

بخاری میں سلمہ بن الاکوع سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور پھر ایک درخت کے پاس چلا گیا ۔ جب سب لوگ بیعت کر چکے تو آپ نے فرمایا ۔ اے ابن الاکوع ! کیا تم بیعت نہیں کروگے ۔ میں نے کہا ۔ یا رسول اللہ! میں بیعت کر چکا ۔ آپ نے فرمایا ۔ پھر بھی ۔ چنانچہ میں نے دوبارہ بیعت کی ۔ ایک راوی نے پوچھا ۔ اے ابومسلم اس دن آپ لوگ

باقی بر صفحہ

قرآن حکیم کا روسی زبان میں ترجمہ

(افضل جاوید)

روسی شہروں میں چار کروڑ تیس لاکھ لوگ مسلمان ہیں۔ یعنی روس کی ۱۶٫۷ فی صد آبادی مسلمان ہے۔ اور ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۰ء تک روس میں مسلمانوں کی آبادی ۶ کروڑ ۴۰ لاکھ یعنی کل آبادی کا ۱۲ فی صد ہو جائے گی۔ آبادی کے تناسب میں یہ تبدیلی روسی قیادت اور روس کی مسلح افواج کے لیے سخت پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔ نیز پاکستان، ایران، افغانستان میں اسلامی قومیت کے تیزی سے پھیلتے ہوئے اثرات پر بھی روس خوش نہیں ہے۔

مسلمانوں کی کسی بھی تحریک کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے روس نے مذہب مخالف پروپیگنڈے کے سیل بے پناہ کا اہتمام کیا ہے۔ ایک روسی کتاب کے مطابق صرف ازبکستان میں ایک سال کے دوران میں دہریت پر ۹۴ ہزار نو سو لیکچر دیے گئے۔ تاریخ کی کتابوں میں وسطی ایشیا کے روسی بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد انتہائی مفلسی کی زندگی گذارتے تھے اور ان پر ظلم کیا جاتا تھا۔ مذہب سے چھٹکارا ملا تو دن پھر گئے ہیں۔ روس میں مذہبی سرگرمیوں پر سخت پابندیاں ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں مذہبی تبلیغ کا اشارہ بھی جرم ہے۔ تعلیم اور اسکول مکمل طور پر سیکولر ہیں۔

بخارا، تاشقند اور سمرقند کے نام کس مسلمان نے نہیں سنے۔ یہ علاقے اسلامی تہذیب کے اہم مراکز رہے ہیں۔ یہاں سے نامور علماءِ دین اٹھے اور لاکھوں کی تعداد میں طلبہ علم دین کی تشنگی بجھاتے رہے ہیں لیکن اسلامی تہذیب کے ان گہواروں کو عالم اسلام سے مستقل طور پر بیگانہ بنا دیا گیا ہے۔ اس سے بڑی بدقسمتی کا پہلو یہ ہے کہ خود مسلمان ان علاقوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اب بھی روس کے مقبوضہ ترکستان میں کروڑوں مسلمان رہتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہم سب کا یہ دینی اور اخلاقی فرض ہے کہ ہم ان مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کریں اور

ان کا اسلامی تشخص برقرار رکھنے میں ان کی بھرپور تائید و معاونت کریں۔

روسی ترکستان کے مسلمان صدیوں سے متعصب عیسائی زاروں اور ان کے بعد ان کے کمیونسٹ جانشینوں کے مقابلوں میں اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھنے کی سرتوڑ جدوجہد کرتے رہے ہیں اور اس کے لیے وہ صدیوں سے تکلیفوں اور مشقتوں کو سہنے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مساعی اور حربوں کے باوجود روسی ان کی مخصوص مشرقی اور اسلامی تہذیب کو مٹانے میں ناکام رہے ہیں۔

روسیوں کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو اسلام کے علمی ورثے سے محروم کیا جائے۔ قرآن پاک سے ان کا رشتہ منقطع کر دیا جائے اور عالم اسلام سے ان کا رابطہ باقی نہ رہنے پائے۔ روس اب تک اپنے ان مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ روس کے ان مقبوضہ مسلمان علاقوں کے مسلمانوں کو اگر کہیں سے قرآن پاک کا کوئی نسخہ مل جائے تو وہ اسے نہایت قیمتی متاع سمجھ کر اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ چونکہ روس میں قرآن کی اشاعت پر پابندی ہے اور اس کی درآمد کی اجازت نہیں اس لیے ایک نسخے کی قیمت دو ہزار روپیے سے چار ہزار روپیہ پاکستانی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود روسی مسلمان اسے خریدنے پر فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔

روسیوں نے یہ کوشش کی ہے کہ مذہبی اصطلاحات کو ایسے معانی پہنا دیے جائیں کہ وہ مضحکہ خیز معلوم ہوں۔ روس کے ایسے اقدامات کے بداثر مٹانے کے لیے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ روس کے زیر تسلط ان علاقوں کے مسلمانوں تک ایسا لٹریچر پہنچا دیا جائے جس میں دینی اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہو تاکہ وہاں کے نوجوان مسلمان دین کے اصل مفہوم کو سمجھ سکیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کو ان کی اصل روح کے ساتھ سیکھ سکیں۔ اس مقصد کے لیے کچھ چھوٹی بڑی دینی کتابوں کے روسی زبان میں تراجم تو پہلے ہی کیے جا چکے ہیں۔ لیکن اب ان میں ایک نہایت قیمتی اضافہ تفہیم القرآن کے آخری حصہ کا ہوا ہے۔ اس جزء میں آخری پارے کی تفسیر کے علاوہ مقدمۃ القرآن اور "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کا ترجمہ بھی شامل ہے اور اسے انتہائی دیدہ زیب طباعت اور خوبصورت جلد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

ابتدا میں قرآن پاک کا عربی متن ہے اس کے نیچے اس کا روسی رسم الخط میں تلفظ دیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد ترجمہ اور تفسیر روسی زبان میں پیش کی گئی ہے۔ اس کے مترجم روس کے تربیت یافتہ افغان انجینیر شاہ محمود صاحب ہیں جنھوں نے مسلسل چار سال کی عرق ریزی کے بعد اسے تیار کیا اور بعد میں روسی زبان کے ماہرین نے اس پر نظر ثانی کی۔ اس طرح آہنی دیوار کے پیچھے روس کے زیر تسلط مسلمانوں کے لیے روس کے خلاف مصروف جہاد افغان مسلمانوں کے ایک نمائندے نے ایک خوب صورت اور بیش بہا تحفہ تیار کر کے پیش کیا ہے۔

افغان انجینئر شاہ محمود جو روس کے حالات اور اس کے باشندوں کی نفسیات سے اچھی طرح آگاہ ہیں ہمیں یقین ہے کہ جب ان کی یہ عظیم دینی کاوش ۔ "روسی زبان میں قرآن پاک کا یہ ترجمہ" جس بھی روسی مسلمان تک پہنچے گا اس کے اندر ایک بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ کیونکہ روسی مسلمانوں کو روسی کمیونسٹ قیادت نے اس بات سے بالکل بے خبر رکھنے کی کوشش کی ہے کہ دینی عقائد میں بھی کوئی معقولیت ہے اور ان عقائد کی پشت پر بھی کوئی منطقی دلیل ہے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دینی عقائد محض توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ جب قرآن پاک واضح براہین کے ساتھ ان مسلمانوں کے پاس پہنچے گا تو ان مسلمانوں کا دینی اعتقاد اور ایمان زیادہ پختہ ہو جائے گا اور خود ملحدوں اور کمیونسٹوں کے نظریات ڈگمگا جائیں گے اور مسلمانوں پر ان نظریات کی بھیانک تصویر کے عکس واضح ہو جائیں گے۔

قرآن کریم اور اسلامی لٹریچر کی اثر انگیزی سے روسی قیادت بے خبر نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے ہر طرح کی یہ احتیاطی تدابیر کر لی ہیں کہ یہ روحانی غذا وہاں کے مسلمانوں کا اور دیہی شہروں تک نہ پہنچ سکے لیکن اللہ کے بندے بھی ہر جگہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ خیالات اور نظریات کا راستہ روکنا کسی بھی دنیاوی طاقت کے لیے ناممکنات میں سے ہے۔ روسی قیادت تمام تر مادی کوششوں کے باوجود اپنی یہ پریشانی دور نہیں کر سکی کہ روس میں خفیہ چھاپے خانے کس طرح کام کر رہے ہیں۔ خفیہ عبادت گاہیں کیسے بن گئیں جہاں رات کی تاریکیوں میں مسلمان جمع ہو کر اللہ سبحانہٗ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اس کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں بھی یہی صورت حال ہے۔

ان مسلمانوں کے ہاتھ میں جب کسی دینی کتاب کا کوئی نسخہ آجاتا ہے تو وہ اپنے خفیہ ذرائع سے اس کے مزید نسخے چھاپنے اور اسے پھیلانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس وقت روسی مسلمانوں تک دین کا علم پہنچانے کا موثر ترین ذریعہ افغان مجاہدین ہیں۔ روسیوں نے وسط ایشیا کے مسلمانوں تک خود پہنچنے کا جو راستہ بنایا ہے اور جارحیت کی کارروائیوں کے لیے اسے استعمال کر رہے ہیں، افغان مجاہدین یہی راستہ روس کی محکوم قوموں کو جگانے اور ان کے لیے احساس دین پیدا کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ بحمد اللہ افغان مجاہدین اپنی ان کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ روس اپنے ہی جال میں خود پھنس کر رہ گیا ہے۔

رسائل و مسائل

کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردے کو زندہ کر دیتے تھے؟

(سہیل احمد قادری)

سوال

سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ مشہور ہے کہ آپ کو مردے کو زندہ کر دینے کا معجزہ حاصل تھا اس موقع پر آپ قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ فرمایا کرتے تھے۔ کیا قرآن و حدیث اس کی تصدیق کرتے ہیں؟ اگر قرآن و حدیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے تو مہربانی فرما کر ان امور کی وضاحت فرمائیے

(۱) جس شخص کو انھوں نے زندہ فرمایا اس کا کیا انجام ہوا؟ کیا وہ دوبارہ دنیوی زندگی میں واپس آگیا؟

(۲) کیا قرآن و حدیث یہ بتاتے ہیں کہ کسی شخص کو دوبارہ موت آسکتی ہے؟

جواب

جی ہاں! قرآن کریم میں اس کی صراحت موجود ہے۔ میں یہ صراحت پیش کرنے سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کو دیے گئے معجزات کے بارے میں چند باتیں اجمالی طور پر پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ معجزے کے لیے قرآن کریم میں آیت اور آیات کے الفاظ آئے ہیں جس کے لغوی معنی نشانی اور نشانیوں کے ہیں۔ معجزہ چونکہ نبوت کی نشانی اور اس کی دلیل ہوتا ہے اس لیے اس کو آیۃ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ معجزہ اس واقعہ کو کہتے ہیں جو سلسلۂ اسباب کے خلاف غیر عادی طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ظہور و وقوع کے لیے اسباب کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا ہے لیکن کبھی کوئی واقعہ اس کے خلاف بھی ظاہر ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ معجزے کا ظہور اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتا ہے۔ کیونکہ سلسلۂ اسباب پر حکمرانی اسی کی ہے معجزہ کسی نبی کے اختیار سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے حکم سے ظاہر ہوا ہے۔

چوتھی بات یہ کہ معجزہ اس خلافِ عادت واقعہ کو کہتے ہیں جو کسی نبی کے ہاتھ سے ظاہر ہوا ہو۔

پانچویں بات یہ کہ یقین اسی معجزے پر ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے جو قرآن سے ثابت ہوا ور اس کے بعد اس معجزے پر جو صحیح احادیث سے ثابت ہو۔

چھٹی بات یہ کہ قرآن اور صحیح احادیث میں جس قدر مذکور ہوگا وہی یقینی ہوگا۔ ان چھ باتوں کو سامنے رکھیے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو معجزے دیے گئے تھے ان کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ میں ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

(اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے کافی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لانے والے ہو۔" (آل عمران - ۴۹)

اس آیت کریمہ میں مذکورۂ ذیل کے معجزات کا ذکر ہے:۔

(الف) مٹی سے کسی پرندے کی صورت بناتے، اس پر دم کرتے اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرندہ ہو جاتی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں فارسی کا یہ شعر کہا گیا ہے۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس شعر میں دمِ عیسیٰ سے مراد یہی پھونک ہے۔

(ب) مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دینا۔

(ج) مردے کو زندہ کر دینا

(د) بغیر دیکھے یہ بتا دینا کہ لوگوں نے کیا کھایا ہے اور گھروں میں کیا ذخیرہ کیا ہے؟

ان چار معجزات میں تیسرا معجزہ مردے کو زندہ کرنا ہے۔ قرآن کریم سے اس کی تصدیق ہو گئی کہ ان کو

احیائے موتیٰ کا معجزہ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات یہ ہیں:۔

(۱) جس مردے کو زندہ کرتے تھے قرآن میں اس کی وہ تفصیل نہیں ہے جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔ اس میں زندہ کرنے کا طریقہ بھی مذکور نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ قم باذن اللہ کہتے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ سے دعا کرتے ہوں اور مردہ زندہ ہو جاتا ہو۔ تفصیلات جاننے کا کوئی یقینی ذریعہ بھی موجود نہیں ہے۔

(۲) قرآن سے ثابت ہے کہ بطور معجزہ، مردے کو زندہ کیا گیا ہے تاکہ کسی نبی کی نبوت پر دلیل قائم کی جائے یا کسی نبی کو زندگی کے بعد موت کا مشاہدہ کرایا جائے۔ اس کے لئے آپ سورہ البقرہ کی آیات ۲۵۹-۲۶۰ کا مطالعہ کیجئے۔ قرآن سے یہ بھی ثابت ہے کہ بطور معجزہ جمادات میں بھی اس کی زندگی پیدا کر دی گئی ہے جیسی حیوانات میں ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ یہی تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے قرآن میں پڑھا ہوگا اور نہ پڑھا ہو تو پڑھ لیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، سانپ بن جاتا تھا اس کے لئے آپ سورہ طٰہٰ کی آیات ۱۷ تا ۲۱ کا مطالعہ کیجئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کے سانپ بن جانے کا ذکر قرآن کی کئی سورتوں میں ہے۔ اخیر میں میرا یہ مشورہ ہے کہ آپ پورا قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھ لیں۔

عبارت سمجھی نہیں اور الزام لگا دیا

خط

عرض ہے کہ مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن میں واقعہ معراج کے بارے میں میرے ایک رشتہ دار نے اعتراض کیا ہے، آپ اسے کلا نہ کر دیں تاکہ میرا ذہنی انتشار دور ہو۔ معراج کے بارے میں مولانا نے حاشیہ میں لکھا ہے: (یہ سب جزوی چیزیں ہیں اس کا انکار کرنے والے کو کافر نہیں کہہ سکتے) اس پر ہمارے رشتہ دار نے کہا کہ یہاں مولانا نے حدیث سے انکار کیا ہے اور اس طرح حدیث کے انکار کرنے والے کو کافر کہا جاتا ہے لہٰذا مولانا بھی......

جواب

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ معراج جسمانی کے قائل ہیں جو احادیث سے ثابت ہے وہ اس کے صحیح

قائل ہیں کہ احادیث میں جو تفصیلات ہیں وہ قرآن کے خلاف نہیں ہیں بلکہ قرآن کے بیان پر اضافہ ہیں اور مولانا نے حاشیہ میں جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے:۔

"حدیث کی یہ زائد تفصیلات قرآن کے خلاف نہیں ہیں بلکہ اس کے بیان پر اضافہ ہیں اور ظاہر ہے کہ اضافہ کو قرآن کے خلاف کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا تاہم اگر کوئی شخص ان تفصیلات کے کسی حصہ کو نہ مانے جو حدیث میں آئی ہیں تو اس کی تکفیر نہیں کی جا سکتی البتہ جس واقعہ کی تصریح قرآن کر رہا ہے۔ اس کا انکار موجب کفر ہے۔"

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۸۸-۵۸۹)

یہ عبارت آپ کے رشتہ دار نے سمجھی نہیں اور الزام لگا دیا۔ اس عبارت میں تین باتیں کہی گئی ہیں:۔

(الف) حدیث میں معراج سے متعلق قرآن سے جو زائد تفصیلات ہیں وہ قرآن کے خلاف نہیں ہیں بلکہ اس پر اضافہ ہیں۔

(ب) ان تفصیلات کے کسی حصہ کا کوئی شخص انکار کر دے تو اس کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔

(ج) جس واقعہ کی تصریح قرآن میں ہے اس کا انکار کافر بنانے والا ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ اس عبارت میں مولانا مودودیؒ نے حدیث کا انکار کیا ہے یا اس کا اثبات کیا ہے؟ آپ کے رشتہ دار نے الٹی بات کہی ہے۔ ان سے کہیے کہ ان کو جس عالم پر اعتماد ہو اس سے دریافت کریں کہ کسی مسلمان کو کب کافر قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان سے یہ بھی کہیے کہ وہ اردو زبان نہیں جانتے ہیں اس کو سیکھنے کی کوشش کریں اور اگر آپ اردو زبان جانتے ہوتے تو ان کو خود جواب دیتے، مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ آپ چونکہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے۔ اس لیے میں نے جواب دینا مناسب سمجھا۔

MONTHLY Regd. No. D.NO. (DN)-348
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN R.N. NO. 42893/84
NEW DELHI-110002 OCT. 85

صرف ٹائٹل دہلی آرٹ پریس میں چھپا۔

ماہنامہ
زندگیِ نو
نئی دہلی ۲
Dr.
J. M. I. New Delhi
Jamia Nagar

مُدیر: سیّد احمد قادری

جلد: ۳	صفر ۱۴۰۶ھ مطابق نومبر ۱۹۸۵ء	شمارہ: ۵

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لئے
جناب سیّد احمد عروج قادری، مدیر زندگی نو، گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

پرنٹر، پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں چھپواکر
دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ ○فون: ۳۲۶۴۸، ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

محمد احمد خاں اور شاہ بانو کے مقدمہ میں سپریم کورٹ نے نفقہ مطلقہ کے بارے میں جو فیصلہ دیا ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یادگار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے اس فیصلے کا زہر نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ اس مقدمے کے پس منظر پر جو تحقیقی رپورٹیں شائع ہوئی ہیں ان سے پوری طرح یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ شاہ بانو صاحبہ اور ان کے صاحبزادے نے یہ مقدمہ محمد احمد خاں سے انتقام لینے کے لیے دائر کیا تھا۔ شاہ بانو اپنے سابق شوہر سے انتقام لینا چاہتی تھیں اور صاحبزادے اپنے والد سے انتقام لینا چاہتے تھے اور یہ جذبہ اتنا تیز تھا کہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت جو قطعاً ایک غیر اسلامی دفعہ ہے۔ شاہ بانو صاحبہ نے نفقہ کا مطالبہ کر کے اپنے سابق شوہر کو شکست دی حالانکہ وہ اس کی ضرورت مند نہ تھیں۔ وہ اگر نہیں سوچ سکتی تھیں تو ان کے صاحبزادے ضرور سوچ سکتے تھے کہ وہ اپنے والد سے انتقام لے رہے ہیں یا قانون شریعت سے۔

سپریم کورٹ کے اس غیر اسلامی اور غیر منصفانہ فیصلے کا سبب کون بنا؟ مسلمان اس فیصلے کے خلاف بجا طور پر مضطرب ہیں لیکن ان کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ سپریم کورٹ کو یہ موقع کس نے بہم پہنچایا۔ آج بھی شاہ بانو صاحبہ کو کوئی ندامت نہیں ہے اور وہ اسلام دشمن تنظیموں کی ہیروئن بنی ہوئی ہیں۔ اس حقیر نے کئی سال پہلے زندگی میں یہ لکھا تھا کہ مسلمانوں کا سب سے سنگین مسئلہ منافقین اور منافقات کا ہے۔ مسلمانوں کو انہیں آستین کے سانپوں سے سب سے زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ مسلمانوں کے مسائل کے حل کی راہ میں یہ گروہ ایک چٹان کی طرح حائل ہے۔ یہ مسلمانوں کی صفوں کو اندر سے ڈائنامیٹ کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو اجتماعی طور پر اس زہریلے

گروہ کے بارے میں کچھ سوچنا چاہیے۔ ہم حکومت کے پاس وفد لے جاتے ہیں، میمورنڈم پیش کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ان منافقوں کے پاس دعوتی و تبلیغی وفد لے جانا چاہیے اور ان کی خدمت میں یہ میمورنڈم پیش کرنا چاہیے کہ وہ ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے سے باز آجائیں۔ اگرچہ جعفر بنگال اور صادق دکن جیسے لوگوں سے اصلاح کی توقع بہت کم ہے لیکن اس طرح ان پر حجت قائم ہو جائے گی۔

عدالت عالیہ کی سب سے اونچی کرسی نے اپنی "بے تعصبی" کا جو ثبوت دیا ہے اس کی کہانی بھی ایک ماہر قانون داں نے شائع کردی ہے۔ اس پر اخبار قومی آواز لکھنؤ ۸ را کتوبر ۱۹۸۵ء نے یہ عنوان لگایا ہے ——
"متھرا اہیر بنام شاہ بانو، دوہرے عدالتی معیار کی کہانی" پروفیسر طاہر محمود صدر شعبۂ قانون دہلی یونیورسٹی کا ایک مضمون ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوا ہے اس کا اردو ترجمہ کئی اخبارات میں چھپا ہے۔ میرے سامنے قومی آواز لکھنؤ ہے۔ پورا مضمون پڑھنے کے لائق ہے حاصل یہ ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی قانون میں نیچی ذات والوں کے ساتھ جو امتیاز برتا گیا ہے اس کے خلاف الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس کیرتی نے فیصلہ دیا تھا اس کی اپیل سپریم کورٹ میں کی گئی تھی۔ سپریم کورٹ کی ایک بنچ نے جسٹس کیرتی پر تنقید کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے، پڑھیے :-

"ہماری رائے میں فاضل جج نے یہ نکتہ سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ دستور ہند کی بنیادی حقوق والی دفعات کا اطلاق فریقین کے پرسنل لا پر نہیں ہوتا ہے۔ عدالت کو چاہیے کہ فریقین کے پرسنل لا کا بعینہ اسی طرح اطلاق کرے جیسے کہ اس کے اصول ہندو قانون کی مستند کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ان اصولوں کے نفاذ کے ضمن میں فاضل جج کو عصر جدید کے اپنے تصورات کو نافذ العمل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

(دیکھیے مقدمہ کرشنا سنگھ بنام متھرا اہیر اے آئی آر ۱۹۸۰ سپریم کورٹ ۷۰۷)

اس کے بعد شاہ بانو کیس کا فیصلہ پڑھیے۔ یہاں معاملہ ہر لحاظ سے بالکل برعکس ہے۔ بنیادی حقوق کی دستوری دفعہ تیاگ رہی۔ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ بھی مسلمانوں کے پرسنل لا اور ان کے مسلّمہ و متفقہ مذہبی قانون کے مقابلے میں فوقیت رکھتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جج صاحبان نے مفسر قرآن، مصلح قوم اور ریفارمر وکیل کی حیثیت بھی بطور خود حاصل کرلی ہے۔ اس پر جناب طاہر محمود صاحب نے بجا طور پر حیرت اور افسوس کا اظہار

کیاہے۔ انھوں نے لکھاہے :-

"مختلف مذاہب کی الہامی کتابوں کے سلسلے میں عدالت عالیہ کا یہ دہرا معیار ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ اگر طبقہ اکثریت کے شاستر اور وید متعدد میں وغیرہ عدالتوں کے دائرۂ تشریح نو سے باہر ہیں تو اہل اسلام کی واحد الہامی کتاب کے ساتھ اس سے مختلف سلوک کس طرح روا رکھا جا سکتا ہے۔ دنیا کی کوئی منطق یا کوئی اور دلیل اس امتیاز کو جائز قرار نہیں دے سکتی۔"

یہ مدیر صاحب نے بات تو سچ لکھی ہے لیکن ایک دلیل ایسی ہے جو اس طرح کے فیصلوں کو جائز کر دیتی ہے، وہ دلیل ہے، ذہنیت کی دلیل، طاقت و اختیار کی دلیل، جنگل کے قانون کی دلیل، کسی مذہب کے خلاف بغض کی دلیل۔ اتنے دلائل ہیں جو اس طرح کے فیصلوں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے تو اس دفعہ کی رعایت بھی نہیں کی ہے جس کے مطابق انھوں نے اپنا فیصلہ دیا ہے کیونکہ مرکزی وزیر جناب عارف محمد خاں صاحب کے بقول یہ دفعہ انہیں مطلقہ عورتوں کو دوسری شادی تک یا موت تک نفقہ دلواتی ہے جو بے سہارا ہوں۔ کیا شاہ بانو بے سہارا ہیں؟ مسلمانوں کی تاریخ نے بہت سے دشمنوں کو یاد رکھا ہے۔ انہیں بھی یاد رکھے گی

انصاف کو آواز دو، انصاف کہاں ہے؟

اس صورت حال میں کہ انصاف کی کرسیاں بھی مسلمانوں کے لیے ظلم کی کرسیاں بنتی جا رہی ہیں۔ ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟

اگر ہم اس ملک میں جس کو اسلام نے بہت کچھ دیا ہے، مسلمان بنکر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اس وقت ہماری سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ اور دستور ہند کی بس بھری دفعہ ۴۴ کو حذف کرانے یا اس کے زہر سے مسلمانوں کو بچانے اور مستثنیٰ قرار دینے کے لیے آئین و قانون کے دائرے میں ہم جو کچھ کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہ کریں۔ دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ ابلاغ کے تمام ذرائع استعمال کر کے مسلمانوں کو آمادہ کریں کہ وہ اپنے مقدمات عدالتوں میں نہ لے جائیں بلکہ آپس ہی میں تصفیہ ثالثوں کے ذریعہ یا شرعی پنچایتوں کے ذریعہ طے کرلیں وہ جج صاحبان کو اس کا موقع نہ دیں کہ وہ اسلامی شریعت کے خلاف فیصلے کر سکیں۔ تیسری ذمہ داری جو مسلمانوں کے مسائل کا اصلی حل ہے، یہ ہے کہ وہ شرعی قوانین پر پوری طرح خود عمل کرنا شروع کر دیں۔

تکاثر

(سید احمد قادری)

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ه حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ه كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ه ثُمَّ كَلَّا
سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ه كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ه لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ه ثُمَّ
لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ه ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ه

ترجمہ :- تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔ ہرگز نہیں عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا پھر (سن لو) کہ ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا) تم دوزخ دیکھ کر رہو گے پھر (سن لو) تم بالکل یقین کے ساتھ اس کو دیکھ لوگے۔ پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔

تشریح :- اس تشریح میں ہم نے زیادہ تر امام رازی کی تفسیر کبیر کو سامنے رکھا ہے۔

سابق اور لاحق سے ربط

اس سورہ سے پہلے "القارعہ" ہے اور اس کے بعد "العصر" سورہ "القارعہ" میں قیامت کی ہولناکی بیان کی گئی ہے اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ وہاں کامیاب وہی ہوگا جس کے پلڑے بھاری ہوں گے اور ناکام وہی ہوگا جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اور جہنم میں جھونکا جائے گا۔

اس کے بعد سورہ تکاثر میں بے حد پر زور اور لرزا دینے والے انداز میں یہ تنبیہ ہے کہ تم اپنی زندگیاں جن چیزوں کے حصول میں کھپا رہے ہو وہ قیامت کی میزان میں بے وزن ہوں گی اور آج جس جہنم کا تم انکار کر رہے ہو کل اس کا مشاہدہ اس میں جل کر کرو گے اور تمہیں کوئی شک باقی نہ رہے گا۔ اس کے بعد سورہ "العصر" میں یہ

بتایا گیا ہے کہ قیامت کی میزان کو وزنی بنانے والی چیزیں کیا ہیں۔ اس طرح یہ درمیان کی سورۃ اپنے سابق اور لاحق سے مربوط ہو جاتی ہے۔

اِلْہَاء کے معنے

یہ "لہو" سے باب افعال کا مصدر ہے۔ اس کے معنے کسی کو کسی چیز سے غافل کر دینے کے ہیں۔ امام رازی نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ الہاء کے معنے "لہو" کی طرف اپنا رخ اور اپنی توجہ موڑ دینے کے ہیں اور لہو ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی طرف خواہش نفس انسان کو بلاتی ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ کسی چیز میں مشغولیت دوسری چیز سے اعراض یعنی روگردانی کی مقتضی ہے اسی لیے اہل لغت کہتے ہیں اَلْھَانِی عَن کذا۔ اس نے مجھے فلاں چیز بھلا دی اور دوسری چیز میں مشغول کر دیا۔

تکاثر کے معنے

تکاثر کثرت سے باب تفاعل کا مصدر ہے۔ اس کے تین معنے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت سے حاصل کرنے کی کوشش کرے، دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔ (۱)

تکاثر کس چیز میں؟

اس سورہ میں 'تکاثر' کا لفظ مطلق استعمال کیا گیا ہے۔ کس چیز میں تکاثر اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے تاکہ آخرت سے غافل کرنے والی دنیا کی تمام چیزیں اس میں داخل ہو جائیں۔ امام رازی رحؒ نے لکھا ہے کہ تکاثر میں یہ چیزیں داخل ہیں:۔

"افراد کی کثرت، مال کی کثرت، جاہ و مرتبہ کی کثرت، اعزہ و اقربا اور انصار و اعوان کی کثرت فوج کی کثرت ـــ غرض یہ کہ اس میں دنیا کی تمام لذات و شہوات داخل ہیں"

تکاثر نے کس چیز سے غافل کیا؟

امام رازی رحؒ نے لکھا ہے کہ اس کی عدم صراحت کی حکمت بھی یہی ہے کہ اس میں ہر وہ چیز داخل ہو جائے جو آخرت میں فائدہ پہنچانے والی ہو۔ مثلاً اللہ کے ذکر سے غفلت، معرفت الٰہی میں واجبات و مستحبات سے غفلت

(۱) تفہیم القرآن ج ۶ ص ۴۴۲

تفکر و تدبر سے غفلت۔ اور اگر ہم اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ سے پہلے کی سورت پر غور کریں تو معنے یہ ہوں گے کہ تکاثر نے تم کو قیامت (قارعہ) کے حساب کتاب اور جنت سے پہلے اس کی تیاری سے غافل کردیا اور اگر بعد والے فقرے سے اس کو مربوط کریں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تکاثر نے تم کو اتنا غافل کیا کہ تم قبروں کو بھول گئے یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ یعنی تا مرگ خواب غفلت سے نہ جاگے۔

انسانی سعادت کے بارے میں ایک نفیس بحث

امام رازیؒ نے انسانی سعادت کے بارے میں ایک نفیس گفتگو کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سعادت (خوش نصیبی) کا تعلق تین چیزوں سے ہے۔ نفس سے۔ بدن سے۔ ان دونوں سے الگ باہر کی چیزوں سے نفس کی سعادت علم اور اخلاق فاضلہ میں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب یہ دعا کی تھی کہ رَبِّ ھَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھے صالحین میں ملا)[۲] تو اس سے مراد یہی دونوں چیزیں تھیں یعنی علم و حکمت اور اخلاق فاضلہ محمودہ۔ اور انہیں دونوں کے ذریعہ بقائے ابدی اور سعادت سرمدی حاصل ہوتی ہے۔ یہ سعادت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ بدن کی سعادت صحت اور جمال میں ہے اور یہ دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ خارج کی سعادت دو قسموں میں بٹی ہوئی ہے۔ ضروری اور غیر ضروری ضروری مال اور جاہ[۳] ہے۔ غیر ضروری رشتہ دار اور دوست احباب ہیں۔ یہ تیسرے درجہ کی چیز ہے۔ یہ خارجی چیزیں بھی دراصل بدن ہی کے لیے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب کسی عضو میں تکلیف پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی اس کو دور کرنے کے لیے مال بھی صرف کرتا ہے اور جاہ بھی۔ فضلائے روزگار بدن کی صحت و سلامتی بھی دراصل نفس کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ جب تک انسان تندرست نہ ہو وہ سعادت نفس کے حصول کے لیے تگ و دو نہیں کر سکتا۔ جب یہ بات تمہیں معلوم ہوگئی تو اب میں کہتا ہوں کہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس چیز کو مقدم رکھے جو اہم ہو۔ اگر انسان مال و دولت، جاہ منصب اور اعوان و انصار کو مقدم رکھتا اور ان کو ترجیح دیتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ سعادت کے اعلیٰ درجے پر پست اور ادنیٰ درجے کو ترجیح دے رہا ہے اور یہ بات خلاف حق اور انسانی شرافت و حیات کے برعکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت کی ہے اور فرمایا ہے اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ یعنی حصول دنیا کی ہوس نے تم کو اعلیٰ اور اہم تر شے آخرت سے غافل کر دیا ہے۔

---

(۲) الشعراء ۳ (۳) عزت، قدر و منزلت، مرتبہ

عصر حاضر کا حال

عصر حاضر میں ایمان و طاعت اور آخرت سے غفلت کا جو حال ہے وہ نزول قرآن کے وقت سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہے کیونکہ ایام جاہلیت کے عرب مال کے ساتھ اولاد کی کثرت پر بھی فخر کرتے تھے۔ اب خاندانی منصوبہ بندی ایک فلسفہ زندگی کی طرح رائج کی جارہی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ معیار زندگی کو بڑھانے کا خبط ہے معیار زندگی بڑھانے کا انحصار مال پر ہے۔ اس لیے لوگ حصول مال کی تونس میں مبتلا ہیں۔ مال اور اقتدار اس زمانے کے لات و ہبل ہیں جو پوری دنیا میں پوجے جارہے ہیں۔ عصر حاضر کی جاہلیت نے جاہلیت عرب کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

کلّا کے معنٰی

یہ لفظ زیادہ تر حرف تنبیہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنٰے "ہرگز نہیں" کیے جاتے ہیں۔ اس سے مقصود منکرین حق کے کسی خیال باطل کی تردید ہوتی ہے۔ یہاں جس خیال خام کی تردید کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا پرست لوگ، مال، اولاد، سامان عیش و نشاط، جاہ و منصب، اقتدار اور اسی طرح کی دوسری متاع دنیا کی کثرت اور اس میں دوسروں سے مسابقت کو ترقی، خوش نصیبی اور کامیابی سمجھ رہے تھے۔ کہا گیا کہ ہرگز نہیں تمہارا خیال صحیح نہیں ہے عنقریب تم اپنے خیال باطل کا انجام بد دیکھ لوگے۔ کلّا سوف تعلمون کے فقرے کی تکرار تاکید کے لیے ہے جو تنبیہ کرنے والے کے غیظ و غضب کی علامت ہے۔ گویا ایک وعید کے بعد دوسری وعید ہے جیسے کوئی کہے اقولُ لکَ ثم اقول لک لا تفعل (میں تم سے کہتا ہوں، میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ یہ کام نہ کرو۔ امام رازی نے اس تکرار کی کئی وجوہ اور لکھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ پہلا فقرہ عذاب قبر کو بتا رہا ہے اور دوسرا فقرہ عذاب قیامت کو، یعنی تمہیں اپنا انجام پہلے قبر میں معلوم ہوگا اور پھر قیامت میں۔ اس مفہوم کے لحاظ سے کلّا سوف تعلمون۔ کی تکرار تاکید کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر فقرے کی مراد الگ الگ ہے۔ کلّا لو تعلمون علم الیقین (ہرگز نہیں اگر تم یقین کے ساتھ جانتے) امام رازی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں "لو" حرف شرط کا جواب بالاتفاق محذوف ہے لیکن وہ جواب محذوف کیا ہے اس میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں امام رازی نے لکھا ہے کہ جواب اسی لیے حذف کیا گیا ہے کہ جواب مختلف ہوسکتے ہیں اور ان میں ہر ایک صحیح ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اگر تم اپنی اس روش کا انجام یقین کے ساتھ جانتے تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا یا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اگر تمہیں یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوتا کہ تم کیوں پیدا کیے گئے ہو تو تم اس چیز میں مشغول

(باقی ص ۴۵ پر)

"غیر اسلامی تصوّف" کا مقدمہ

(سید احمد قادری)

میری کتاب "اسلامی تصوف" کئی سال ہوئے شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپنے والا ہے۔ میں تصوف کے دوسرے رخ پر بھی ایک کتاب شائع کرنے والا ہوں۔ تصوف کی کتابوں کے اقتباسات بھی جمع کر لئے ہیں لیکن کتاب مرتب کرنے کا وقت نہیں مل رہا ہے یہ مقدمہ بھی اس وقت مرتب ہو سکا تھا جب میں چھٹی لیکر وطن گیا تھا۔ خیال آیا کہ یہ مقدمہ "زندگی نو" میں شائع کر دیا جائے۔ کیا پتہ اصل کتاب مرتب کرنے کا وقت ملے یا نہ ملے۔ یہ مقدمہ خود ایک مستقل چیز ہے۔

مقدمہ

ایک طرف مختلف فلسفہ ہائے حیات رکھنے والے ممالک اور قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں اور دوسری طرف یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اور اسلامی مملکت کی حدود میں پھیلا اس نے اسلامی عقائد میں نئے مباحث کا دروازہ کھول دیا۔ ان مباحث کا مرکزی نقطہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات تھیں۔ اس فلسفہ کا سب سے مہلک اثر یہ پڑا کہ عقائد کے اثبات کے لیے بھی صرف انسانی عقل کو محور بنا لیا گیا۔ شرعی دلائل کی اہمیت کم ہو گئی اور ہر چیز عقل انسانی کی ترازو میں تولی جانے لگی خواہ وہ عقل کے محدود دائرے میں آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ جو چیزیں انسانی حواس و ادراک سے ماورا ہیں۔ ان کے بارے میں بھی عقلی تیر تکے چلائے جانے لگے۔ اس کے نتیجے میں قیاسات اور ظن و تخمین کا ایک بازار گرم ہو گیا۔ عقائد کی دنیا میں شکوک و شبہات کی آندھیاں چلنے لگیں اور الحاد نے پر نکالے

فلسفہ یونان اور اس کے اثر سے پیدا شدہ الحاد کا مقابلہ کرنے کے لیے علمائے اسلام نے علم کلام کی طرح ڈالی اور فلسفہ کا جواب فلسفہ سے دینے کی کوشش شروع کی اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ الحاد کا جو سیلاب امڈ رہا تھا

کی طرح آگے بڑھ رہا تھا تھم گیا اس کی رفتار کم ہو گئی۔ لیکن اس نے اسلامی عقائد کی جڑیں ہلادی تھیں اور کتاب و سنت کے دلائل کو پیچھے ڈال چکا تھا۔ علم کلام نے اصل مرض کی تشخیص نہیں کی اور وہ بھی دراصل عقل ہی کے آگے پیچھے دوڑتا رہا۔

خلافت، منہاج نبوت سے بہت پہلے ہٹ چکی تھی۔ مادیت اور دنیا پرستی چھائی ہوئی تھی۔ دین اسلام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ سیاست و حکومت کا تھا جو خلفاء، سلاطین اور امراء و وزراء کے لیے مخصوص تھا اور دوسرا حصہ عبادات اور فقہی احکام کا تھا جو علماء اور فقہاء کے لیے خاص تھا۔ یہ ماحول تھا جس میں تصوف کی ابتدا ہوئی۔ وہ مادہ پرستی کے خلاف عملاً دنیا پر آخرت کی ترجیح کے نیک جذبے سے شروع ہوا اور ایک عرصہ تک اس کی سادگی برقرار رہی لیکن آگے چل کر مختلف نظریات، یونانی فلسفے اور علم کلام نے تصوف کے گوشوں پر بھی چھاپہ مارا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر گفتگو شروع ہو گئی۔ غیر اسلامی نظریات اس میں گھس آئے اور رفتہ رفتہ انسان کا مقصد حیات ہی بدل کر رہ گیا۔ سیاست و حکومت کو دنیا داری کے خانہ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کی صرف پرستش اور اس کے عشق اور اس کے وصل و وصال کو زندگی کا مقصد قرار دیا گیا اور یہی چیز حقیقی دین سمجھی جانے لگی، اس میں مشغول لوگ "اللہ والے" کہے گئے اور "اولیاء" کا ایک مستقل طبقہ پیدا کر دیا گیا۔ وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، فنا و بقا، فانی فی اللہ، باقی باللہ، واصل بحق، خدا رسیدہ اور اسی طرح کی دوسری اصطلاحیں وجود میں آئیں۔ شریعت، طریقت، حقیقت دین کے تین درجات بن گئے۔ اگرچہ صوفیہ کرام یہ کہتے رہے کہ طریقت اور حقیقت، شریعت سے الگ نہیں ہیں لیکن اپنی کتابوں میں "حقیقت" کی جو تشریحات انھوں نے کی ہیں اور تصوف کا جو فن انھوں نے مرتب کیا ہے وہ شریعت سے الگ ہے۔ شریعت پر تو کم ہمت اور سطحی قسم کے لوگ اکتفا کرتے ہیں۔ شریعت اور حقیقت کے اسی تصادم کا نتیجہ ہے کہ تصوف کی کتابیں تضاد بیانی سے بھری ہوئی ہیں۔ "اولیاء" کو اس کائنات میں متصرف اور صاحب اختیار قرار دے کر گویا "توحید حقیقی" کے دعوے کا ثبوت مہیا کیا گیا۔ "طبقہ اولیاء" کے جو مقامات و درجات مقرر کیے گئے ہیں اس نے ان کو انبیاء کرام سے افضل قرار دینے کی راہ ہموار کی اور یہ چیز علم التصوف میں ایک مستقل بحث کی طرح داخل ہو گئی۔

"حقیقت" کی تشریح "اولیاء" کے لیے تجویز کردہ اوصاف اور ان کے مخصوص مراتب و مقامات کے لیے قرآن کریم اور صحیح احادیث میں دلائل موجود نہ تھے اور مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ

قرآن اور احادیث سے دلائل پیش کیے جائیں اس لیے ایک طرف قرآن کریم کی آیات اور صحیح احادیث کی ایسی تاویلیں کی گئیں جن سے عربی لغت، کتاب و سنت کی تعلیمات اور صحابہ و تابعین ناآشنا ہیں اور دوسری طرف اس کام کے لیے احادیث وضع کی گئیں اور انہیں تصوف کی کتابوں میں پھیلا دیا گیا۔ ایک اور کام جس نے دین کو بے حد نقصان پہنچا دیا یہ کیا گیا کہ دین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، "ظاہر اور باطن" یعنی شریعت اور حقیقت بعض صوفیہ نے ظاہر کے لیے علم الاحکام اور باطن کے لیے علم الاسرار کی اصطلاح وضع کی۔ جس مسئلے کا ظاہر سے تعلق ہو اس کا فیصلہ ائمہ فقہ کے حوالے کیا گیا اور جس مسئلے کا تعلق باطن سے ہو اس کا فیصلہ ائمہ تصوف کے سپرد کیا گیا اور باطنی مسائل کے لیے ائمہ تصوف کے الہامات، مکشوفات اور مشاہدات کو اصل دلائل کی حیثیت دی گئی حالانکہ دین کی اس تقسیم کا کسی بڑے سے بڑے عالم یا صوفی کو بھی حق نہیں ہے کیونکہ نبوت و رسالت ختم ہو چکی ہے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تصوف کی کتابیں ایک آمیزہ اور مخلوط بن گئیں۔ کچھ چیزیں اسلامی اور کچھ چیزیں غیر اسلامی۔

فلسفیانہ تصوف نے صوفیوں میں دو گروہ پیدا کیے۔ ایک گروہ نے "حقیقت تک پہنچ جانے والوں کے لیے شریعت کے احکام پر عمل کرنا یہاں تک کہ نماز ادا کرنا بھی غیر ضروری قرار دے دیا اور وہ الحاد کی راہ پر جا پڑا اور دوسرے گروہ نے ہر حال میں شریعت کی پابندی کو ضروری کہا اور اپنی کتابوں میں ملحدین اور ملحدانہ تصوف کی پرزور تردید بھی کی۔ ان دونوں گروہوں میں بس یہی فرق ہے ورنہ جہاں تک فلسفیانہ تصوف کا تعلق ہے دونوں اس کے قائل ہیں۔

کتاب کا یہ مختصر مقدمہ حسب ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

(۱) مقصد تالیف

اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ ہے کہ کتب تصوف میں جو غلط، قابل اعتراض اور غیر اسلامی چیزیں مخلوط ہو گئی ہیں ان کو سامنے لایا جائے اور لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ غلط اور غیر اسلامی چیزیں ہیں۔ اس کتاب کا مقصد تصوف کی پوری تاریخ بیان کرنا نہیں ہے اور نہ یہ مقصد ہے کہ تصوف کے تمام مباحث کی تفصیل پیش کی جائے۔ میرا احساس یہ ہے کہ کتب تصوف کی غیر اسلامی باتوں نے مسلم معاشرے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ یہاں تک کہ وہ غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی سمجھنے لگے ہیں۔ ان کتابوں کی جو باتیں دین اسلام کے مطابق ہیں ان کو مثبت انداز میں اس حقیر نے اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح تصوف کی

تین اہم کتابیں" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں تین کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کے اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کو الگ الگ نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے کی یہ تیسری کتاب ہے جس میں کتب تصوف کے غیر اسلامی اجزا کو الگ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

فی الواقع یہ کتاب بھی اسلامی تصوف کی حمایت ہی میں مرتب کی گئی ہے۔ اس لیے کہ لوگوں کو جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ غیر اسلامی تصوف کیا ہے وہ اسلامی تصوف کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے اور نہ کما حقہ اس پر عمل کر سکتے ہیں۔

(۲) تصوف کی چند قدیم عربی کتابوں کا تعارف

اس کتاب کا موضوع تصوف کے آغاز سے عصر حاضر تک اس میں تغیرات کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے لیکن تصوف کی چند قدیم عربی کتابوں کا مختصر تعارف نامناسب بھی نہیں ہے۔ تصوف کا آغاز دوسری صدی ہجری کے وسط تک ہو چکا تھا لیکن تصوف پر کوئی کتاب ۲۰۰ھ تک نہیں لکھی گئی تھی۔

۱۔ کتاب الرعایۃ فی التصوف

تصوف کی سب سے پہلی کتاب غالباً ابو عبداللہ الحارث المحاسبیؒ (۱۶۵-۲۴۳ھ) کی کتاب الرعایۃ فی التصوف ہے۔ اس کتاب نے محدثین کرام اور علمائے شریعت کو چوکنا کیا۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ مسلم معاشرے میں ایک خلاف سنت طریق زندگی پھیل رہا ہے۔ حارث محاسبی نے اس کتاب کے علاوہ دوسری کتابیں بھی لکھی ہیں مگر کتاب الرعایۃ ان کی سب سے مشہور اور ضخیم کتاب ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور متکلم (علم الکلام کے ماہر) بھی تھے اور انھیں نے تصوف میں علم کلام کے مسائل داخل کرنے کی ابتدا کی۔ کہا جا سکتا ہے کہ "احسان" کو فلسفیانہ تصوف بنانے کا آغاز انھیں بزرگ نے کیا تھا۔ بعد کو تصوف پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے اور غالباً حضرت محاسبی ہی نے سب سے پہلے "اخلاص" کا اعلیٰ درجہ یہ بتایا کہ عمل جنت کے حصول کے لیے نہ کیا جائے بلکہ صرف اللہ کے لیے کیا جائے۔ یہ رائے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ جنت کی تحقیر کی جانے لگی۔ خطیب بغدادی نے روایت کی ہے کہ ابو زرعہ (وقت کے ایک بڑے محدث) سے حارث محاسبی اور ان کی کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا:-

فقال ایاک وھذہ الکتب۔	(ابو زرعہ) نے کہا کہ ان کتابوں سے بچو۔ یہ
ھذہ کتب بدع وضلالات	بدعتوں اور گمراہیوں کی کتابیں ہیں۔ تم احادیث

علیک بالاثر فانک تجد	کو پکڑو۔ ان میں تم ایسی باتیں پاؤ گے جو تمہیں
فیه ما یغنیک عن هذه	ان کتابوں سے بے نیاز کر دیں گی۔ ان سے کہا
الکتب قیل لهٗ فی هذه	گیا کہ ان کتابوں میں عبرت انگیز باتیں ہیں
الکتب عبرة قال من لم یکن	جواب میں انھوں نے کہا جس شخص نے کتاب اللہ
لهٗ فی کتاب الله عبرة فلیس	سے عبرت حاصل نہیں کی اس کے لیے ان کتابوں
له فی هذه الکتب عبرة	میں بھی کوئی عبرت نہیں ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا۔ کیا مالک بن انس، سفیان ثوری، اوزاعی اور ائمۂ متقدمین نے بھی اس طرح کی کتابیں لکھی ہیں۔ جو لوگ تصوف کے قائل ہیں انھوں نے اہل علم کی مخالفت کی ہے۔ یہ لوگ سند میں کبھی حارث محاسبی کو پیش کرتے ہیں، کبھی عبدالرحیم دیبلی کو، کبھی حاتم اصم کو اور کبھی شقیق بلخی کو۔ پھر انھوں نے بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا۔ لوگ بدعتوں کی طرف کس تیزی سے لپکتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے بھی لوگوں کو حارث محاسبی کی طرف میلان سے متنبہ فرمایا تھا۔ مثلاً حارث محاسبی کا یہ قول کہ " اللہ نے بغیر آواز کے تکلم فرمایا"۔ انھوں نے اس قول کے قائل کا انکار کیا اور اس کو بدعتی قرار دیا۔ حافظ ابن کثیر نے " البدایۃ والنہایۃ میں" امام احمد کے جو حالات لکھے ہیں اس میں انھوں نے امام بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام احمد منصور بن عمار اور ان جیسے لوگوں کی صحبت کو ناپسند کرتے تھے اس لیے کہ حارث محاسبی اپنے زہد کے باوجود علم کلام سے اشتغال رکھتے تھے اور امام احمد علم کلام کو ناپسند کرتے تھے۔ اس پر ابن کثیر نے یہ اضافہ کیا ہے کہ امام احمد ان صوفیوں کی صحبت کو اس لیے ناپسند کرتے تھے کہ حارث محاسبی وغیرہ نے تقشف اور سلوک پر جو باتیں لکھی ہیں ان کا کوئی ثبوت، شریعت میں نہیں ہے۔ ابوزرعہ رازی نے بھی حارث محاسبی کی تصنیف کتاب الرعایۃ کو بدعت کہا تھا۔ محاسبی کے زمانے میں چونکہ مسلم معاشرے پر علماء، فقہاء اور محدثین کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ اس لیے ان کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی جب وفات ہوئی تو ان کے جنازے کے ساتھ صرف چار آدمی تھے۔ کتب تصوف میں ضعیف احادیث، بے سند اور عجیب و غریب واقعات لکھنے کی ابتدا بھی اسی کتاب سے ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

(۲) کتاب الصدق | یہ کتاب حضرت ابوسعید احمد بن عیسےٰ الخزاز (م ۲۸۶) کی تصنیف ہے

اور کتاب الرعایۃ کے بعد تصوف کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں صدق کو محور بنا کر مقامات کی تشریح کی گئی ہے۔ مثلاً "صدق فی الاخلاص" "صدق فی الانابۃ" "صدق فی المحبۃ وغیرہا"
اس کتاب میں بھی ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو بے سند ہیں۔ مثلاً حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا گیا ہے:۔
(۱) ان کا لباس صرف ایک چادر تھا جسے اوڑھ کر ببول کے دو کانٹے لگا لیا کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کا لقب "ذوالخلالتین" پڑ گیا تھا۔" (پروفیسر یوسف سلیم تاریخ تصوف)
(۲) احادیث میں وارد ہے کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو حصول لذت کے لیے کھاتے تھے اور نہ حصول مسرت کے لیے پہنتے تھے۔ (ایضاً)
اس کے علاوہ شرعی اصطلاحات (مثلاً زہد) کی مبالغہ آمیز تشریحات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔

(۳) رسائل جنید

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی کتاب تاریخ تصوف میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی تحقیق و تفصیل سے لکھے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں رسائل جنید کا بھی مفصل تعارف کرایا ہے۔ ہم اس کے چند اقتباسات یہاں پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:۔

"رسائل جنید میں جو ۱۹۶۲ء میں لندن سے شائع ہوئے ہیں حسب ذیل رسائل شامل ہیں:۔
(۱) رسالہ الی بعض اخوانہ (۲) رسالہ الی یحیی بن معاذ الرازی (۳) رسالہ الی بعض اخوانہ (۴) رسالہ الی ابی بکر الکسائی الدینوری (۵) رسالہ بغیر عنوان (۶) رسالہ الی عمرو بن عثمان المکی (۷) رسالہ الی یوسف بن حسین الرازی (۸) دوا الارواح (۹) کتاب الفناء (۱۰) کتاب المیثاق (۱۱) کتاب فی الالوہیۃ (۱۲) کتاب فی الفرق بین الاخلاص والصدق (۱۳) باب آخر فی التوحید ۱۵ تا ۱۹ بھی اسی موضوع پر ہیں (۲۰) آخر مسئلہ (۲۱) ادب المفتقر الی اللہ۔
ان عنوانات سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ تصوف میں مکاتیب و رسائل کا جو سلسلہ جاری ہوا اس کی ابتدا حضرت جنید نے کی تھی۔ دوسری یہ کہ توحید پر بحث کا آغاز حضرت جنید ہی کے وقت میں ہو گیا تھا۔
پروفیسر یوسف سلیم صاحب نے ان کے رسائل سے ان کی جو تعلیمات مرتب کی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:۔
حضرت ہجویری نے حضرت جنید کے ایک قول کا مطلب یہ بیان کیا ہے:۔
"حقیقی توحید میں انسانی صفات باقی ہی نہیں رہتیں کیونکہ انسانی صفات قائم بالذات اور مستقل نہیں

محض رسوم ہیں سراسر غیر مستقل اور عارضی ہیں جیسے آئینے میں عکس۔ فاعل حقیقی صرف خدا ہے اس
کے سوا وہ در اصل صفات باری ہیں۔ (تاریخ تصوف ص ۲۲۳)
ایک دفعہ لوگوں نے ان سے توحید کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا:۔
"توحید وہ معنی ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ توحید کے معنی میں مکمل علم پوشیدہ ہے"۔
راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جس توحید کی تعریف نہیں ہو سکتی وہ قرآنی توحید نہیں ہے اس لیے کہ قرآن تو توحید
کی تشریح سے بھرا ہوا ہے اور دین اسلام کا اصل الاصول توحید ہی ہے۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔
جنیدؒ نے اس امر کی صراحت بھی کی ہے کہ اللہ کی صفات اور اس کے افعال سب اس کی ذات
میں مندرج ہیں یعنی اس طرح داخل ذات ہیں کہ ان میں کوئی امتیاز نہیں ہے اور جب سالک توحید
کے اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ صفات اور افعال سب ذات میں مندرج
ہیں اور اس وقت وہ خود بھی بالکلیہ ذات میں جذب ہو جاتا ہے "من تو شدم تو من شدی"
والا معاملہ ہو جاتا ہے"۔
پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت جنید نے توحید کے چار مراتب بیان کیے ہیں۔ توحید عوام۔ توحید علماء
توحید خواص اور توحید اخص خواص۔ حضرت جنید نے یہ بھی کہا ہے۔
تصوف کی ماہیت یہ ہے کہ خدا بندے پر بندے کی حیثیت سے موت طاری کر دے اور پھر اپنی ذات
میں ان کو دوبارہ زندہ کر دے۔ (تاریخ تصوف ۲۳۷)
یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ رسائل جنید اگر واقعی حضرت جنید ہی کے رسائل ہیں تو پھر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رسائل
ہی نظریہ وحدۃ الوجود کی بنیاد ہیں۔ یہ حضرت جنید کے تصوف کا وہ رخ ہے جو اب تک مجھ سے مخفی تھا۔

(۴) کتاب اللمع

یہ کتاب طاؤس الفقرا ابو نصر عبداللہ بن علی بن محمد بن یحیٰی السراج طوسی (م ۳۷۸) کی تصنیف ہے۔ یہ
تصوف کی ایک جامع کتاب ہے۔ مصنف کے عہد تک تصوف پر جو کچھ لکھا گیا تھا وہ سب اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔
اس کے علاوہ جو غلط باتیں تصوف میں داخل کر دی گئی تھیں، ان کی تردید بھی کی گئی ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم صاحب
نے لکھا ہے:۔
سراج نے اس کتاب میں ان تمام غیر اسلامی عقائد مثلاً حلول اور اتحاد کی بڑی شدت کے ساتھ

تردید کی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں اسماعیلیہ، قرامطہ، باطنیہ اور زنادقہ کے ذریعے داخل ہو گئے تھے۔"　　　(تاریخ تصوف ۳۳۰)

یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ جس طرح حلول اور اتحاد غیر اسلامی عقیدے ہیں اسی طرح وحدۃ الوجود بھی غیر اسلامی عقیدہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ پروفیسر صاحب حلول و اتحاد کی تغلیط اور اس وحدۃ الوجود کی تصویب کرتے ہیں جس میں اثنینیت یعنی دوئی حرام ہے جب اللہ کے سوا دوسرا کوئی موجود ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ حلول اور اتحاد کو غلط ہونا ہی چاہیے۔ کیونکہ حلول بھی دوئی کے بغیر ممکن نہیں اور اتحاد بھی دوئی کے بغیر ممکن نہیں۔

(۵) قوت القلوب

یہ کتاب ابو طالب محمد بن علی بن عطیۃ الحارثی المکی (م ۳۸۶) کی تصنیف ہے۔ ابو طالب مکی نے ابو نصر سراج کی وفات سے آٹھ سال بعد وفات پائی ہے۔ قوت القلوب بھی تصوف کی ایک جامع اور ضخیم کتاب ہے۔ متعدد علماء، مورخین اور صوفیہ نے اس کتاب کو تصوف کی بے نظیر کتاب قرار دیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کتاب میں بھی ضعیف اور باطل احادیث موجود ہیں اور توحید کے بارے میں ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو نہ کتاب و سنت کے مطابق ہیں اور نہ صحابہ و تابعین کا علم ان سے آشنا ہے۔ میں صرف ایک عبارت یہاں نقل کرتا ہوں۔

> اور بعض عارفوں نے یوں کہا ہے کہ ربوبیت کا ایک سر (راز) ہے۔ اگر وہ ظاہر ہو جائے تو نبوت باطل ہو جائے گی اور نبوت کا بھی ایک سر ہے اگر وہ ظاہر ہو جائے تو علم باطل ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں علماء کا بھی ایک سر ہے اگر وہ ظاہر ہو جائے احکام باطل ہو جائیں گے۔ پس قیام ایمان اور استقامت شرع کے لیے اسرار کو پوشیدہ رکھنا ہی بہتر ہے۔
>
> (پروفیسر یوسف سلیم چشتی تاریخ تصوف)

اس کتاب میں ظاہر و باطن اور اہل ظاہر و اہل باطن کی تقسیم بھی موجود ہے۔

(۶) رسالہ قشیریہ

یہ کتاب امام زین الاسلام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن بن عبد الملک بن طلحہ بن محمد القشیری الشافعی (م ۴۶۵ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۴۳۷ھ میں تصنیف کی گئی تھی۔ اس نے بڑی مقبولیت حاصل کی (۱)۔ یہ چھ کتابیں تصوف کی امہات کتب ہیں۔ ان کتابوں نے فلسفیانہ تصوف کے جو بیج بوئے تھے وہ آگے

(۱) میں نے اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے اور آخر میں امام قشیری کے حالات بھی لکھے ہیں۔

پھل کر تناور درخت بن گئے ہیں۔

(۳) قرآن اور حدیث کو صحیح طور پر سمجھنے کے مسلمہ اصول

یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت یا کسی صحیح حدیث کو سمجھنے اور اس سے کوئی حکم مستنبط کرنے یا کوئی نتیجہ نکالنے کے لیے ان مسلمہ اصول پر عمل کیا جائے جو قرآن اور حدیث کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان سے احکام و نتائج اخذ کرنے کے لیے ضروری قرار دیے گئے ہیں۔ مذاہب، نظریات و خیالات کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ غلط مذاہب اور غلط نظریات و خیالات پر قرآن و حدیث سے جو استدلالات کیے گئے ہیں ان میں مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے کیونکہ مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کیے بغیر قرآن و حدیث سے کسی غلط مذہب یا غلط نظریہ و خیال پر استدلال کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ مسلمہ اصول یہ ہیں :-

(۱) قرآن اور حدیث سے کوئی ایسی بات نکالنا غلط ہے جو عربی لغت اور کتاب و سنت کی اصطلاحات کے خلاف ہو۔ قرآن و حدیث سے مستنبط کسی بات میں صحت اسی وقت آسکتی ہے جب اس کی خلاف ورزی نہ کی گئی ہو۔

(۲) جو بات اخذ کی گئی ہو وہ دینی مسلمات کے خلاف نہ ہو۔

(۳) کسی آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹ کر ایسی بات نکالنا جس سے قرآن و حدیث کی تعلیمات میل نہ کھاتی ہوں غلط ہوگی۔

(۴) کسی آیت کی ایسی تفسیر یا تاویل جس سے فی الواقع اس کی معنوی تحریف ہوتی ہو مردود اور بالکل غلط ہوگی۔

(۵) کسی آیت سے کوئی ایسا خیال پیدا کرنا یا کوئی ایسا عمل اخذ کرنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، آپ کی سیرت طیبہ، اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرامؓ کی سیرت مجموعہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو غلط ہے۔

ان پانچ نکات میں کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے جو تمام علمائے امت کے نزدیک تسلیم شدہ نہ ہو۔ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کو سمجھنے کے لیے بھی ان مسلمہ اصولوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(۴) نقطۂ انحراف۔ ذات و صفات کے فلسفیانہ مباحث

اللہ رب العزت کی ذات و صفات کے بارے میں انسان جو کچھ اور جتنا کچھ جان سکتا تھا وہ سب قرآن کریم اور صحیح احادیث میں بتا دیا گیا ہے۔ دین اسلام کو اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا ہے۔ اب نہ کوئی کتاب اترنے والی ہے اور نہ کوئی نبی آنے والا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور

وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ - ۳)

اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں قرآن کریم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تعلیمات کے مطابق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک ایسی بلند مرتبہ جماعت تیار ہوئی جس سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی جماعت، قیامت تک زمین کی سطح پر پیدا نہیں ہوگی۔ اس جماعت کو دنیا و دین کی کسی کامیابی کے لئے ذات وصفات کے بارے میں ان مباحث کی ضرورت نہیں پڑی جو بعد کو پیدا ہوئیں۔ فلسفہ اور علم کلام جب تصوف میں بھی داخل ہوا تو صوفیہ کے درمیان بھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور عقیدہ توحید کے بارے میں وہ بحثیں شروع ہوئیں جو نہ قرآن میں تھیں اور نہ احادیث میں۔ صوفیہ نے خدا کی ذات وصفات کے بارے میں وہ کچھ جاننا چاہا جو نہ خدا نے بتایا تھا، نہ اس کے رسول نے اور نہ رسول کے مقدس ساتھیوں نے ــــــــ

اسلامی تصوف میں یہی وہ نقطۂ انحراف تھا جس نے تصوف کو اسلامی اور غیر اسلامی افکار و اعمال کا ایک مخلوطہ بنا کر رکھ دیا اور یہی نقطۂ انحراف تھا جس نے صوفیوں کی ایک جماعت کو الحاد کے راستہ پر ڈال دیا۔

(۱) کیا خدا کی صفات اس کی ذات میں داخل یعنی عین ذات ہیں؟ (۲) کیا خدا کی صفات اس کی ذات سے الگ یعنی غیر ذات ہیں؟ (۳) کیا خدا کی صفات لاعین ولا غیر ہیں یعنی نہ وہ ذات میں داخل ہیں اور نہ ذات سے الگ ہیں؟ (۴) کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا کی ذات کسی صفت سے متصف نہ ہو؟۔

متکلمین نے یہ موقف اختیار کیا کہ صفات الٰہی لاعین ولا غیر ہیں (اور یہی بات عقائد کی کتابوں میں داخل ہو گئی) یعنی نہ وہ ذات الٰہی کے اندر داخل ہیں اور نہ اس سے الگ ہیں۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ لاعین ولا غیر ہیں تو پھر ذات الٰہی سے ان کے ربط کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب شاید متکلمین نہیں دے سکے ہیں۔

معتزلہ نے صفات کی نفی کر دی اور اپنے کو اصحاب التوحید کہنا شروع کر دیا۔ اب یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ توحید کیا ہے؟ جس چیز کو واضح کرنے کے لئے قرآن نازل ہوا اور لوگوں کو شرک سے ہٹا کر توحید کی طرف لانے میں رسول نے اپنی جان کھپائی وہی چیز مجہول قرار پائی اور اس کی حقیقت پر لمبی چوڑی بحثیں شروع کر دی گئیں۔ یہ مباحث چونکہ کتاب وسنت کے مباحث نہ تھے اس لئے ان میں ان سوالات کے جوابات

نہیں مل سکتے تھے اس لئے متکلمین اور صوفیہ دونوں مجبور تھے کہ جوابات کسی اور چیز سے حاصل کریں۔ متکلمین نے عقل سے جوابات حاصل کئے اور صوفیہ نے الہامات وقیاسات وتشبیہات سے۔ ذات و صفات اور توحید کی فلسفیانہ بحث تصوف میں اس طرح داخل ہوئی ہے کہ حارث محاسبی کے عہد سے عہد حاضر تک اس سے پیچھا نہیں چھوٹا ہے۔ اس سلسلے میں اگلوں نے جو کچھ کہا تھا پچھلے اس کو دہراتے چلے آئے ہیں۔ میں یہاں ان مباحث کو تفصیل سے پیش کرنا بے کار سمجھتا ہوں البتہ نمونہ کے طور پر مولانا حسین احمد مدنی مرحوم و مغفور کی ایک تحریر نقل کرتا ہوں۔

جناب باری عز اسمہ ہماری عقل و ادراک سے نہایت ہی زیادہ بلند و بالا ہے۔ لیس کمثلہ شیئ۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان و وہم   وز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم

مگر تقریب وتفہیم کے لئے مندرجہ ذیل مثال پیش کرتا ہوں:۔

ہر انسان میں ایک مرتبہ ذات کا ہے، اس درجہ میں وہ سب سے بے بہرہ اور غیر متعلق ہے دوسرا درجہ صفات کا ہے جو کہ تمام تعلقات خارجیہ کا سبب ہے۔ اس کا وصف کرم اس کو داد و دہش پر آمادہ کرتا ہے، اسی پر وہ فقیروں اور فقراء، ارباب حاجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ وصف اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی حاجت مندیوں سے بیچین ہو جائے اور اپنے مال و زر کو ان تک پہنچانے میں دریغ نہ کرے۔ وصف شجاعت قتل و قتال، قہر و غلبہ پر مجبور کرتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس تمام اوصاف یہی معاملہ رکھتے ہیں۔ تیسرا مرتبہ جوارح کا ہے جس کے وسیلے سے وہ مقتضیات صفات کو خارج میں انجام دیتا ہے کریم شخص میں داد و دہش کی نوبت آتی اور ظہور پذیر ہوتی ہے، شجاع میں قتل و قتال قہر و غلبہ کی خارج میں صورت بنتی ہے۔ اگر یہ جوارح نہ ہوتے تو مقتضیات صفات کے ظہور کی صورت نہ بنتی۔ اسی طرح بلا تشبیہ تمام ذات باری عز اسمہٗ تمام خلائق سے مستغنی اور غیر متعلق ہے۔ اسی کی صفات کا لا ھو کہ لا غیر ولا عین ہیں، واسطہ بین القدیم والحادث ہیں، وہی تعلقات پیدا کرنے والی ہیں اس کے بعد مرتبہ اسماء کا ہے۔ یہ اسمائے عالیہ اپنے اپنے اقتضاءات کے موافق تمام عالم میں تصرف کرتے ہیں جیسے کہ انسان کے جوارح اپنی اپنی قابلیت کے موافق تصرف کرتے ہیں۔ اسم رزاق مخلوقات کو رزق پہنچاتا ہے جیسے کہ انسان کا ہاتھ داد و دہش کا کام انجام دیتا ہے۔ اسم خلاق، ماہیات ممکنہ

بالعلم الازلی کو نعمت وجود بخشتا ہے اور اسی طرح تمام اسمائے مقدسہ کے تصرفات ہیں۔ اسماء باری عز اسمہ ہمارے اسماء کی طرح تاثیر و قوت سے خالی نہیں ہیں۔ لاعین و لاغیر از ذات مقدسہ ہیں ان میں وہ قدرت جو کہ صفاتیہ ذاتیہ میں سے ہے ظہور پذیر ہے جس سے اس کے تصرفات عالم میں جاری ہیں جیسے کہ ہمارے جوارح ہماری صفات کے مظاہر ہیں۔ اسماء باری تعالیٰ کا تعلق ہر انسان کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ہے کسی شخص کا مربی اسم علیم ہے کسی کا مربی اسم قدیر ہے۔ کسی کا دوسرا اسم ہے۔ اہل اللہ کا ارشاد ہے۔ طرق الموصل الی اللہ بعدد انفاس الخلائق اس کا راز بھی یہی ہے جو اسم کسی کا مربی ہے اس اسم کے ذکر اور تصور دائمی سے اس کو جلد ترقی ہو سکتی ہے مگر اس کا تمیز کرنا ماہرین کو بھی مشکل ہے اس لیے اسم جامع اللہ سالک کو تعلیم دیا جاتا ہے۔ سالک کی ترقی اس کے اسم مربی تک ہو سکتی ہے۔ (۱)

اس مکتوب کو پڑھ کر ذہن میں پہلی بات یہ آتی ہے کہ ایک طرف باری عز اسمہ کو لیس کمثلہ شیئ کہنا (جیسا کہ قرآن میں ہے) اور اس کو بجا طور پر انسانی عقل و ادراک، خیال و قیاس و گمان و وہم سے بالاتر قرار دینا اور دوسری طرف انسان کی مثال دے کر اس کو سمجھانے کی کوشش کرنا دو متناقض و متضاد باتیں ہیں۔ انسان کے پاس کسی چیز کو سمجھنے کے جتنے ذرائع ہیں جب وہ ان سب سے ماوراء ہے تو پھر اس کی ذات و صفات اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہر سعی، سعی لاحاصل ہے۔ دوسری بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ انسان کا وجود، مرتبۂ ذات میں محض ذہنی اور وہمی ہے، خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں اور نہ ہو سکتا ہے تو کیا ذات باری عز اسمہ کا وجود بھی مرتبۂ ذات میں محض ذہنی اور وہمی ہے؟ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مقدسہ میں سے ہر اسم کو ایک مستقل متصرف وجود قرار دینا یونانی اور ہندوستانی فلسفے کے لحاظ سے جو اوثان و اصنام کے چکر سے نکل نہیں سکا ہے صحیح ہو تو ہو اسلامی عقیدۂ توحید کے لحاظ سے بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔ اللہ رب العزت کو اپنی صفت تخلیق کے ظہور کے لئے کسی جارحہ کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورہ یٰسین کی دو آیتیں ۸۱-۸۲ پڑھئے۔

۱؎ مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتوبات ج ۲۔ مکتوب ۱۱ ص ۶۹

کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟
کیوں نہیں جبکہ وہ ماہر خلاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ
ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں جو بحثیں کتب تصوف میں بھری پڑی ہیں اوپر کا مکتوب اس کا ایک محض معمولی نمونہ ہے۔

(۵) وحدۃ الوجود ذات و صفات اور ان کے درمیان باہمی ربط کی جو بحثیں شروع ہوئیں ان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صوفیہ وحدۃ الوجود تک پہنچیں جو اصلاً یونانی فلسفے اور ہندی ویدانت کا نظریہ ہے تصوف میں اس کی داغ بیل سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ (۲۱۵ — ۲۹۸ھ) کے عہد ہی میں پڑ گئی تھی اور ان کے شاگرد حسین بن منصور الحلاج (المصلوب ۳۰۹ھ) نے علانیہ انا الحق کا نعرہ لگایا تھا اور اسی جرم میں ان کو سولی دی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ اس وقت تک حکومت میں بھی اسلامی عقائد کا رکھ رکھاؤ باقی تھا۔ عدالتوں میں اسلامی شریعت نافذ تھی اور عوام بھی کافرانہ و مشرکانہ نعرے برداشت نہیں کرتے تھے لیکن حالات میں بایزید بسطامی تک پہنچتے پہنچتے اتنی بڑی تبدیلی واقع ہو چکی تھی کہ جب انہوں نے سبحانی ما اعظم شانی اور لیس فی جبتی سوی اللہ کے نعرے لگائے تو کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی۔

حلاج کی تصنیف کتاب الطواسین صوفیہ کے حلقوں میں برابر متداول رہی ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی کتاب تاریخ تصوف میں حلاج کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

> میں وہی تو ہوں جسے میں چاہتا ہوں یا محبت کرتا ہوں اور وہ جس سے میں محبت کرتا ہوں میں ہے ہم دو روحیں ہیں جو ایک ہی جسم میں رہتی ہیں۔ اگر تو مجھے دیکھتا ہے تو گویا اسے دیکھتا ہے اور اگر تو اسے دیکھتا ہے تو گویا ہم دونوں کو دیکھتا ہے (ص ۲۶۵)

اس قول پر پروفیسر صاحب نے یہ حاشیہ دیا ہے:۔

> "قارئین دھوکا نہ کھا جائیں۔ یہ وحدۃ الوجود نہیں ہے بلکہ حلول یا اتحاد ہے کیونکہ حلاج بار بار دوئی کا اعلان و اعتراف کر رہا ہے۔ وحدۃ الوجود کی رو سے دوئی محال ہے کیونکہ لا موجود فی الحقیقۃ الا اللہ۔ یہ کائنات اس کی تجلیات کا دوسرا نام ہے۔ دگر ہیچ۔"

تصوف کی کتابوں میں حلول، اتحاد اور وحدۃ الوجود کی اصطلاحیں بکثرت مستعمل ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ ان تینوں کے مفاہیم بیان بتا دیے جائیں۔ پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی نے ایک حاشیہ میں لکھا ہے:۔

"حلول کا مطلب ہے خدا کا کسی انسان کے جسم عنصری یا جسد مادی میں داخل ہو جانا اسے انگریزی میں (INCARATION) اِن کریشن کہتے ہیں۔ نصاریٰ بالعموم حلول کے قائل ہیں۔ اتحاد کا مطلب ہے خدا اور بندے کا متحد فی الذات ہو جانا اسے (FUSION) کہتے ہیں۔ حلول میں خدا اور انسان دونوں مل کر ایک شے ہو جاتے ہیں۔ جیسے پانی اور شکر مل کر ایک تیسری شے شربت بن جاتے ہیں۔ اتحاد میں دونوں اپنی اپنی حالت ذاتی پر برقرار رہتے ہیں۔ اسلام کی رو سے حلول اور اتحاد دونوں کفر ہیں۔ وحدۃ الوجود کا عقیدہ ان دونوں عقیدوں سے مختلف ہے اور اسلام کی رو سے کفر نہیں ہے۔ (ص ۲۵۷)

پروفیسر صاحب نہ صرف تصوف بلکہ وحدۃ الوجود کے بھی زبردست حامی ہیں انھوں نے یہاں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کوئی اسلامی عقیدہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہ اسلام کی رو سے کفر نہیں ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ اسلام سے نہیں بلکہ باہر سے تصوف میں داخل ہوا ہے۔ عہد حاضر کے ایک بزرگ جناب عارف لاہوری صاحب نے اپنی کتاب "اصول تصوف" میں لکھا ہے:۔

"جاننا چاہیے کہ دائرۂ ثانی قلب کی رسائی سے پہلے (کہ وہ توحید کے ظاہر ہونے کا مقام ہے) توحید کی بات کرنا اور وحدۃ الوجود کا اعتقاد رکھنا شریعت کے بالکل برخلاف ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے توحید وجودی کے لیے دعوت نہیں دی ہے بلکہ احکام شریعت کے لیے جو کتاب و سنت پر موقوف ہیں اور باطل معبودوں کی نفی بھی کرتے ہیں اور عبادت کے لیے صرف معبود حقیقی کو یگانہ قرار دیتے ہیں۔ (ص ۳۱۴)

ہم صرف اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ جس چیز کی انبیائے کرام علیہم السلام نے دعوت نہیں دی وہ جس طرح عوام کے لیے غلط ہے اسی طرح خواص کے لیے بھی غلط ہے۔ انبیاء کرام خواص کے لیے الگ دین اور عوام کے لیے الگ دین نہیں لائے تھے۔ ایک ہی دین ہے جو عوام کے لیے بھی ہے بلکہ اخص الخواص کے لیے بھی۔

وحدۃ الوجود کی مختلف تشریحیں کی گئی ہیں لیکن اس نظریہ کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس کائنات میں صرف اللہ موجود ہے اور دوسری تمام چیزوں کا وجود محض خیالی اور وہمی ہے صوفیہ

نے اس مسئلے پر ہزاروں صفحات سیاہ کیے ہیں۔ اس نظریے نے جو اثرات پیدا کیے اس کے بارے میں ہم یہاں صرف ایک عبرت ناک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

شہر بھڑوچ میں ایک درویش تھے جو ہر چیز کو "اللہ" کہتے تھے۔ شاہ عبدالرزاق ان سے ملاقات کو گئے جب ان کے مکان پہنچے تو انھوں نے کہا۔ بیا (آؤ اللہ) وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے تو انھوں نے کہا۔ ملامت انا اللہ انداز" یعنی گھوڑے سے زین الگ کردو۔ شاہ عبدالرزاق نے زین اتار کر گھوڑے کو چھوڑ دیا کہ گھاس کھائے وہ گھاس کھائے اور اچھلنے کودنے لگا تو درویش نے کہا "اللہ، اللہ را خورد و سرکشی و جہیدن را خواہد" اللہ نے اللہ کو کھایا اور اب اچھلنا کودنا چاہتا ہے۔ درویش نے شیخ قدس سرہ سے کہا کہ تم بھی کہو " ہمہ اللہ، سب اللہ" حضرت شیخ نے یہ فرمایا کہ میرا یہ حال نہیں ہے۔ یہ سن کر درویش نے چاہا کہ بددعا دیں۔ شیخ نے فرمایا۔ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی برکت سے میرا کچھ نہ بگڑے گا۔ یہ سنکر درویش کو سکون ہو گیا۔ پھر تو وہ حضرت شیخ پر بہت مہربان ہو گئے اور ان کے لیے کھانا لائے۔ چند دن حضرت شیخ ان کی صحبت میں رہے۔ درویش نے ان سے کہا کہ اب میری زندگی کے آخری ایام ہیں۔ میں اب اس دنیا سے منتقل ہو جاؤں گا اور تم جہاں کہیں بھی ہوگے تمہیں خبر کروں گا۔ چند دن کے بعد حضرت شیخ نے اپنے حلقہ ملکوتیہ میں درویش کو دیکھا کہ مسرت ان کی پیشانی سے ظاہر ہو رہی ہے اور اسی نشست میں دیکھا کہ ان کا سر ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت شیخ غمزدہ ہو گئے۔ اس کے بعد بھڑوچ سے کچھ لوگ آئے اور خبر دی کہ لوگوں نے فلاں درویش کو اللہ کے حق کا دعویٰ کرتے ہوئے قتل کر دیا اور وہ اللہ کے جوار میں پہنچ گئے۔ (۱)

ایک دوسری کتاب ملفوظ رزاقی میں اتنا اضافہ ہے کہ درویش نے حضرت شیخ سے کہا تھا۔ اللہ، اللہ را کشتند۔ اللہ نے اللہ کو مار ڈالا۔ (۲)

ابن عربی اور شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ نے اس مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے اگر صرف اسی کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ اور یہ جو عبرت ناک واقعہ ہم نے نقل کیا ہے وہ اس مسئلے کی ایک عملی تشریح ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ نظریہ اسلامی نہیں ہے اس لیے جس تصوف کی بنیاد وحدۃ الوجود پر ہو یا جس میں اس کو ایک اعلیٰ مقام دیا گیا ہو وہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ (باقی)

۱؎ مناقب رزاقیہ بزبان فارسی مرتبہ مولانا نظام الدین محمد انصاری فرنگی محلی لکھنوی مطبوعہ مجتبائی لکھنو
۲؎ ملفوظ رزاقی۔

تخلیقِ انسانی میں

نظریۂ اسلام اور نظریۂ سائنس کا فرق

(۲)

(جناب اکرام الدین احمد مرحوم)

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ۔ (الاعراف ۔ ۱۱)

خلق کے معنے وجود میں لانے کے اور تصویر کے معنے صورت اور خصوصیات عطا کرنے کے بھی ہوتے ہیں ۔ یہ دونوں انسان کے درجے ہیں نہ کہ مرحلے کیونکہ ثم کبھی زمانی ترتیب کے بجائے معنوی ترقی ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ صورت گری کا عمل مجرد وجود سے اونچا مرتبہ رکھتا ہے کیونکہ خام مادہ بھی وجود رکھتا ہے لیکن صورت گری جس کے معنے انسانی صورت شکل اور خصوصیات عطا کرنے کے ہیں موجود کے مدارج سے بلند تر درجہ ظاہر کرتا ہے ۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو صرف وجود نہیں بخشا بلکہ اسے ترقی پذیر خصوصیات کا حامل وجود بنایا یہ اللہ رب العالمین کے اس قول کی طرح

الذی اعطی کل شیءٍ خلقہٗ	جس نے ہر چیز کو اس کی صورت دی پھر راہ
ثم ھدٰی (طٰہٰ آیت ۵۰)	دکھائی

ہر چیز کو اس کی تخلیق کے وقت اس کی خصوصیات دی گئیں اس کا کام بتایا گیا اور اس کام کی انجام دہی کے سلسلے میں اس کی رہنمائی فرمائی گئی تخلیق اور خصوصیات کرنا اور نیز رہنمائی عطا کرنے کے درمیان کوئی زمانی فصل نہیں تھا ۔ اگر ہدایت کے معنے اللہ کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے جائیں تو بھی اس معنے میں فرق نہ آئے گا پھر یہ سمجھا جائے گا کہ ہر چیز کی تخلیق کے وقت اس کو اس کے رب کی طرف رہنمائی فرمائی گئی یہی آدم کے ساتھ

بھی تھا اس کی تخلیق کے وقت ہی اسے اس کی صورت اور انسانی خصوصیات دی گئیں۔

ہم جس معنے کو ترجیح دیتے ہیں وہ یہ ہے "ثم" درجہ کی بلندی ظاہر کرتا ہے نہ کہ زمانی ترتیب۔ بہرحال آدم کی تخلیق اور جنس انسانی کی امتحان کے سلسلے میں قرآن کے تمام نصوص اس رائے کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس مخلوق کو اس کی انسانی خصوصیات اور اس کا منفرد کردار عطا کرنے کا کام اس کی تخلیق کے ساتھ ہی انجام پایا تھا۔ انسانی تاریخ میں ترقی ان خصوصیات کے ظہور وارتقا ان کی مہارت اور ان کے معیار میں بلندی حاصل کرنے کے اعتبار سے ہوئی انسان کے وجود میں ترقی نہیں عمل میں آئی ہے کہ ایک نوع سے ترقی کرکے دوسری نوع بن جانے کے مسلسل عمل سے انسان وجود میں آیا ہو جیسا کہ ڈارون کا کہنا ہے۔

نشوو ارتقا کے نظریے کا زمین کی کھدائی سے برآمد ہونے والی چیزوں کے بھروسے پر یہ کہنا کہ حیوانات میں ایک دوسرے سے ترقی یافتہ مراحل ہوتے ہیں جن کے درمیان زمانی ترتیب پائی گئی ہے محض ایک ظنی نظریہ ہے یقینی امر نہیں ہے کیونکہ طبقات الارض میں چٹانوں کی عمروں کی تعیین خود ایک ظنی امر ہے۔ستاروں سے نکلنے والی شعاعوں کے ذریعے ستاروں کی عمروں کے تعین کی طرح اس کی بنیاد بھی مفروضات پر ہے۔ اس بات میں کوئی امر مانع نہیں کہ کل کو دوسرے مفروضات سامنے آئیں جن سے عمروں کے تخمینے بدل جائیں۔

فرض کیجیے کہ چٹانوں کی عمریں یقین کے ساتھ متعین کی جاسکتی ہیں تو بھی اس میں کوئی امر مانع نہیں ہو کہ حیوانوں کی مختلف انواع، جو ایک دوسرے سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں، زمین پر پائے جانے والے حالات کے سلسلے میں زمانی اعتبار سے یکے بعد دیگرے وجود میں آتے رہے ہوں۔ کیونکہ اس وقت زمین پر جس قسم کے حالات تھے وہ انہیں انواع کے لیے خصوصی سازگاری فراہم کرتے رہے ہوں بعد میں جب یہی حالات بدل گئے اور بدلے ہوئے حالات بعض انواع کے لیے سازگار نہ رہ گئے تو یہ انواع ختم ہو گئیں لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس میں سے ایک نوع دوسری نوع میں تبدیلی کے ذریعے اس میں سے نکلی ہو۔ ڈارون اور اس کے بعد لوگوں نے زمین کی تہوں میں سے جو چیزیں برآمد کی ہیں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ثابت کرسکتیں وہ قطعی اور یقینی طور پر یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ فلاں نوع جسمانی طور پر فلاں دوسری نوع سے ترقی کرکے نکلی ہے جو زمانی اعتبار سے اس سے قبل پائی جاتی تھیں جیسا کہ ان چٹانوں کی تہوں اور قسموں کی بنا پر کہا جاسکتا ہے جن میں وہ پائی گئی ہوں۔ وہ صرف اتنا ثابت کرسکتی ہیں کہ زمانی اعتبار سے بعد میں پائی جانے والی نوع پہلے پائی جانے والی نوع سے زیادہ ترقی یافتہ ہے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے اس کی یہ توجیہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت زمین میں جو حالات پائے جاتے تھے وہ اس نوع کے لیے سازگار تھے۔ پھر جب حالات بدل گئے

تو ایک دوسری نوع کے ظہور کے لیے سازگار ہو گئے۔ چنانچہ یہ دوسری نوع ظاہر ہوئی اور حالات کی تبدیلی اس پہلی نوع کے خاتمہ کا سبب بنی جو اس سے پہلے مختلف حالات میں پائی گئی۔ اس توجیہ کی روشنی میں نوع انسانی کا آغاز آزادانہ قرار پائے گا جو اس زمانے میں واقع ہوا جبکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب زمین کے حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ وہ اس مخصوص نوع کے وجود میں آنے اور پروان چڑھنے کے لیے سازگار ہیں۔

انسان کے ظہور کے بارے میں قرآن کریم کے نصوص بحیثیت مجموعی اس رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ انسان حیاتیاتی، عضویاتی، عقلی اور روحانی اعتبار سے اتنا منفرد ہے کہ جدید ڈاروینیت کے علمبردار جن میں خدا کے بالکل انکار کرنے والے بھی شامل ہیں خود کو اس انفرادیت کے اعتراف پر مجبور پاتے ہیں۔ یہ اس رائے کے حق میں ایک مزید دلیل ہے کہ انسان کی اٹھان مستقل بالذات رہی ہے۔ جسمانی ارتقاء کے ذریعے دوسری انواع میں شمولیت یا اشتراک کبھی نہیں پایا گیا۔ منفرد مخلوق جس کے بارے میں قرآن کے تمام نصوص کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ہم قطعیت نہیں اختیار کرتے کہ اس کا ظہور آزادانہ ہوا ہے۔ اس کے ظہور کا اعلان ایک ایسی کائناتی مجلس میں کیا گیا جس میں ملاء اعلیٰ حاضر تھے۔

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْآ اَنَّ السَّمٰوٰتِ	کیا وہ لوگ جنھوں نے انکار کر دیا ہے غور
وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا	نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ	ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی
اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (انبیاء)	سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔

بظاہر کائنات کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں فلکیات کے نظریات میں جیسے جیسے ترقی ہو رہی ہے ویسے ویسے وہ تیرہ سو سال پہلے کے قرآن کی بیان کردہ حقیقت کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ ان کے پیش نظر قرآن کا یہ بیان کہ آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا غور و فکر کے لائق ہے۔

موجودہ نظریہ یہ ہے کہ ستاروں کے مجموعے ـــــ مثلاً نظام شمسی جو سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیاروں پر مشتمل ہے جن میں چاند اور زمین شامل ہیں پہلے ایک تھا۔ پھر اس نے الگ ہو کر مختلف کروں کی شکل اختیار کر لی۔ زمین بھی سورج کا ایک جزو تھی پھر اس سے الگ ہو کر ٹھنڈی ہوئی لیکن یہ بات فلکیات کا ایک نظریہ ہوئی جو آج مقبول ہے اور کل رد کیا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نظریہ آ سکتا ہے جو کسی دوسرے مفروضے کی بنا پر بظاہر کائنات کی تفسیر زیادہ بہتر طور پر کرنے کے سبب نظریہ کا درجہ حاصل کر لے۔

ہم اصحاب عقیدۂ قرآنی اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ قرآن کے یقینی نصوص کو کسی غیر یقینی نظریہ پر محمول کریں جو آج مقبول ہے کل رد کیا جا سکتا ہے اس لیے ہم قرآن کریم کی اس تفسیر میں قرآن کے نصوص اور ان نظریات کے درمیان مطابقت کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو سائنٹفک کہلاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان نظریات کی نوعیت ان ثابت شدہ سائنٹفک حقائق سے مختلف ہے جو تجربے کے قابل ہیں مثلاً دھاتوں کا گرمی پاکر پھیلنا یا پانی کا بھاپ بن کر پھیلنا اور پھر ٹھنڈک کی وجہ سے منجمد ہو جانا وغیرہ دوسرے سائنٹفک حقائق جیسا کہ ہم اس تفسیر میں پہلے بھی واضح کر چکے ہیں۔ ان حقائق کا مقام سائنٹفک نظریات سے مختلف ہے۔ قرآن نہ تو سائنٹفک نظریات کی کتاب ہے نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ تجرباتی طریقے سے سائنس مرتب کرے۔ وہ پوری زندگی کے لیے ایک نظام ہے یہ نظام عقل کی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ اپنے حدود کے اندر آزادانہ سرگرم عمل ہو سکے۔ وہ سماج کو ایک ایسا مزاج عطا کرتا ہے کہ وہ عقل کو آزادانہ استعمال کا پورا موقع دے۔ قرآن ایسی جزئیات اور تفصیلات سے نہیں تعرض کرتا جو خالص سائنٹفک ہوں۔ یہ امور عقل کی تربیت اور اس کے لیے آزادی عمل کے اہتمام کے بعد عقل ہی کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

کبھی کبھی قرآن بعض کائناتی حقائق کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے، مثلاً یہ حقیقت جس کا بیان مذکورہ آیت میں ہے اس حقیقت پر ہمارے یقین کے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ یہ قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ اگرچہ قرآن سے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آسمانوں اور زمین کے جدا ہونے یا آسمانوں کے زمین سے جدا ہونے کا عمل کس طرح انجام پایا۔ ہم فلکیات کے ان نظریات کو قبول کرتے ہیں جو قرآن کے بیان کردہ اس مجمل حقیقت کے خلاف نہ جاتے ہوں لیکن ہم قرآن کے بیان کو فلکیات کے کسی نظریے کے تابع نہیں بناتے نہ انسان کے نظریات سے قرآن کی تصدیق چاہتے ہیں کیونکہ قرآن تو خود ایک حقیقت یقینی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلکیات کے موجودہ نظریات اس نص قرآنی کے اجمالی مفہوم سے نہیں ٹکراتے اگرچہ یہ ان نظریات سے صدیوں پہلے آیا تھا۔ واللہ خلق کل دابۃ من ماء۔ آیت کا دوسرا ٹکڑا — وجعلنا من الماء کل شیئ حی، بھی ایک حقیقت بیان کرتا ہے

سائنس داں اس حقیقت کی دریافت اور اثبات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس دریافت کا سہرا وہ ڈاروِن کے سر باندھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی سب سے پہلے پانی کے آغوش میں پروان چڑھی۔ بلاشبہ اس حقیقت کا ادراک چونکا دینے والا ہے۔ مگر یہ بات کہ یہ قرآن میں مذکور ہے نہ ہمارے لیے باعث تعجب ہے، نہ قرآن

کی صداقت کے بارے میں ہمارے یقین کے اندر کوئی اضافہ کرتی ہے۔ کیونکہ قرآن کے تمام بیانات کی کامل صداقت پر ہمارا اعتقاد ہمارے اس ایمان سے ابھرتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ سائنٹفک انکشافات یا نظریات سے ان بیانات کی مطابقت اس اعتقاد کا منبع نہیں ہے۔ یہاں ہم زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ڈارون اور اس کے رفقاء کا نظریہ نشوو ارتقاء اس مخصوص نکتہ کی حد تک نص قرآنی کے مفہوم سے نہیں ٹکراتا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ

ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے بنایا پھر اسے محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی برکت والا ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ پھر اس کے بعد تم کو مرنا ہے پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ۔ یہ نص انسان کے نشوونما کے مراحل کی طرف اشارہ کرتی ہے مگر ان کا تعین نہیں کرتی۔ یہ بتاتی ہے کہ انسان ایک تسلسل کے ساتھ کچھ مراحل سے گزر کر مٹی سے انسان بنا ہے۔ مٹی مصدر اول یا پہلا مرحلہ ہے اور انسان آخری مرحلہ۔ یہ حقیقت ہمیں قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم ان سائنٹفک نظریات میں اس کی مطابقت نہیں تلاش کرتے جو انسان کی نشوونما یا زندگی کے آغاز سے بحث کرتے ہیں۔

قرآن یہ حقیقت اس لیے بیان کرتا ہے کہ اسے خدا کی صنعت پر اور اس عظیم تبدیلی پر غور و فکر و تدبر کا مقام بنانا ہے جو مٹی اور انسان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جس نے اس مٹی سے سلسلہ وار نشوونما پائی ہے۔ قرآن اس سلسلے وار عمل کی تفصیل سے تعرض نہیں کرتا کیونکہ اس کے سامنے جو عظیم مقاصد ہیں اس کے لیے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں تک سائنٹفک نظریات کا تعلق ہے وہ نشو و ارتقا کا تعین درجہ بدرجہ عمل سامنے لانے اور اسے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ انسان اور مٹی کے درمیان کے سلسلے کی مختلف کڑیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ سکیں۔ اس کوشش میں یہ سائنٹفک نظریات کامیاب بھی ہو سکتے ہیں اور غلطی بھی کر سکتے ہیں جبکہ قرآن نے اس کی تفصیلات کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ ہمارے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ دو چیزوں کے درمیان خلط بحث کریں۔ ایک چیز وہ ثابت شدہ حقیقت ہے جس کو قرآن بیان کرتا ہے یعنی سلسلہ ارتقا اور دوسری چیز وہ جس کی ثابت شدہ حقیقت کی کوشش سائنس داں کر رہے ہیں جو محض نظریات ہیں یعنی اس سلسلہ ارتقا کی کڑیوں کی دریافت یہی وہ کوششیں ہیں جس کے نتائج صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی ایک بات آج صحیح قرار پائی ہے، کل کو انسانی تحقیق کے طریقوں اور تفتیش کے ذرائع کے آگے بڑھنے کے ساتھ غلط بھی قرار پا سکتی ہے۔

کبھی کبھی قرآن اسی حقیقت کا ذکر اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں کرتا ہے (بدا خلق الانسان من طین) اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنانے کی ابتدا مٹی سے کی اور ان مراحل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا جن سے انسان گزرا ہے۔ اس باب میں ہمیں اس نص کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو زیادہ تفصیلی بیان سامنے لاتی ہیں یہ وہ بیان ہے جو بتاتا ہے کہ انسان مٹی کے جوہر سے بنا ہے۔ معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا نص اپنے مخصوص سیاق کی رعایت سے ان مراحل کا ذکر مختصر کر دیتی ہے

جہاں تک اس بات کا جواب ہے کہ انسان نے مٹی سے سلسلہ وار نشو و نما کس طرح پائی تو جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا قرآن اس بارے میں اس لیے خاموش ہے کہ یہ بتانا اس کے مقاصد میں نہیں داخل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں کڑیاں اس طور پر ہوں کہ جیسا کہ سائنس کے نظریات بتاتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مختلف ہوں، ہو سکتا ہے کہ درمیانی مراحل کی نوعیت اور ان کے تکمیل پانے کی توجیہ کچھ اور ہو جو ابھی دریافت نہ کی جا سکی ہو اور اس کے اسباب و عوامل بھی دوسرے ہوں جن کا ابھی تک آدمی سراغ نہ لگا سکا ہو۔ لیکن قرآن کے تصور انسان اور ان سائنٹفک نظریات کے تصور انسان کے درمیان بنیادی فرق ہے کہ قرآن انسان کو مقام بلند کا حامل معزز قرار دیتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس میں خدا کی روح پھونکی گئی ہے اور اس روح پھونکنے کے عمل نے اسے مٹی کے جوہر سے انسان بنا دیا اور اسے وہ خصوصیات عطا کی ہیں جن کے طفیل وہ انسان بنا اور تمام دیگر حیوانات سے مختلف ہوا۔ یہاں آکر اسلام کا زاویہ مادیت پسندوں کے نقطۂ نگاہ سے

بالکل مختلف اور جدا ہو جاتا ہے۔

یہ نوع انسانی کے آغاز کے بارے میں تھا کہ وہ مٹی کے جوہر سے ہوا جہاں تک ایسا ہو چکنے کے بعد ایک فرد انسانی کی نشوونما کا تعلق ہے اس کی راہ دوسری ہے۔ (فکسونا العظام لحما) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں) جنین کے بارے میں قرآن نے جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے ان کو پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے کیونکہ ان حقائق کی تفصیل زمانہ حال میں جنین کے مراحل کی تشریح کرنے والے علم کی ترقی کے بعد سامنے آئی ہے رہی یہ بات کہ ہڈی کے خلیے گوشت کے خلیوں سے جدا اور مختلف ہوتے ہیں۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جنین میں پہلے ہڈی کے خلیے تشکیل پاتے ہیں۔ ہڈی کے خلیوں کے نمودار ہونے اور جنین کا ڈھانچہ مکمل ہونے سے پہلے گوشت کا ایک خلیہ بھی نہیں پایا جاتا یہی وہ حقیقت ہے جس کو نص قرآنی (فخلقنا المضغة عظاما فکسونا العظام لحما ثم انشانا خلقا آخر) یہ ہے وہ انسان جو امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ کیونکہ انسان کا جنین اپنے جسمانی مراحل میں حیوانی جنین کے مشابہ ہوتا ہے۔
انسان کا جنین ایک اور ہی مخلوق ہو جاتا ہے۔ وہ ممتاز مخلوق جو ارتقاء کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ حیوان کا جنین حیوان ہی کے درجے میں رہ جاتا ہے۔ ترقی کرنے اور کمال تک پہنچنے کی ان خصوصیات سے محروم رہتا ہے جو انسانی جنین کا مابہ الامتیاز ہے۔

انسانی جنین میں کچھ ایسی خصوصیات رکھی گئی ہیں جن کے طفیل وہ بعد کے مراحل میں انسانی راہ اختیار کر لیتا ہے اور وہ حقیقی مراحل کے آخر میں ایک دوسری مخلوق بن جاتا ہے جبکہ حیوانی جنین حیوانی مرحلہ ہی میں رہ جاتا ہے۔ کیونکہ اسے یہ خصوصیات نہیں دی گئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ حیوان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے حیوانی مرتبے سے تجاوز کر کے مرحلہ در مرحلہ میکانکی طور پر انسان کے مرتبہ تک پہنچ جائے جیسا کہ مادی نظریات کا کہنا ہے حیوان اور انسان دو مختلف انواع ہیں جن میں خدا کی طرف سے روح پھونکنے کے سبب فرق ہو گیا جس کے طفیل مٹی کا جوہر انسان بنا۔ دونوں کے درمیان فرق کی وجہ اس روح کا پھونکا جانا بھی ہے جس کے طفیل کچھ ایسی خصوصیات پیدا ہوئیں جنہوں نے انسانی جنین کو ایک دوسری مخلوق بنا کر نکالا۔ انسان اور حیوان صرف حیوانی بناوٹ میں ایک دوسرے کے مشابہ رہتے ہیں۔ پھر حیوان حیوان ہی رہ جاتا ہے اس مقام سے آگے نہیں بڑھتا جبکہ انسان ایک دوسری مخلوق بن جاتا ہے جس میں کمال تک پہنچنے کی صلاحیت ہے جس کے لیے اسے بنایا گیا ہے۔ ایمان امتیازی خصوصیات کے طفیل ہی ممکن ہوا جنھیں اللہ نے اسے

ایک بامقصد تدبیر کے تحت عطا فرمایا ہے نہ کہ نوع حیوانی سے میکانکی طور پر مرحلہ وار تبدیلیوں کے ذریعے نوع انسانی میں بدل جانے کے سبب۔

نظریہ نشو و ارتقاء ایک کمزور بنیاد پر قائم ہے کیونکہ یہ نظریہ یہ فرض کرلیتا ہے کہ انسان حیوانی ترقی کے ایک مرحلے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ حیوان انسان کے مرتبے تک مرحلہ وار تبدیلیوں کے ذریعہ پہنچنے والی خصوصیات کا حامل ہے۔ مشاہدے میں آنے والے حقائق انسان اور حیوان کے درمیان رشتے کی وضاحت کے سلسلے میں اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ حیوان ان خصوصیات کا حامل نہیں۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اپنی حیوانی جنس کے حدود پر آ کر رک جاتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ انسان کا حیوانی ارتقاء ہو سکتا ہے۔ "کسی طرح ہوا ہو جس طرح" ڈاروں نے بیان کیا ہے ہو سکتا ہے کسی اور طرح ہوا ہو لیکن نوع انسانی اس حد تک جتاتی ہے کہ وہ کچھ مخصوص صلاحیتوں کی حامل ہے جو اسے انسان بناتی ہیں اور یہ خصوصیات میکانکی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ وہ کسی خارجی قوت کا دیا ہوا بامقصد عطیہ ہیں

قُلْ سِيْرُوا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا	ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ
كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ	اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔ پھر
النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى	اللہ دوبارہ بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (عنکبوت ۲۰)	ہر چیز پر قادر ہے۔

یہاں زمین میں چل پھر کر اس امر پر غور و فکر کرنے کا حکم دیتے وقت کہ اللہ نے خلق کا آغاز کیسے کیا ہے، ماضی کا صیغہ استعمال کرنا دل میں ایک خاص خیال پیدا کرتا ہے یہ کہ زمین کے اندر ایسی چیزیں موجود ہیں جو پہلی بار زندگی کے ظہور اور اس ظہور کی کیفیت کی طرف رہنمائی کر سکیں مثلاً زمین کی کھدائی سے برآمد ہونے والی چیزیں جن کے مطالعے سے آج کل بعض سائنس داں زندگی کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیسے شروع ہوئی کیسے پھیلی اور اس نے کیسے ارتقاء پایا؟ —— اگرچہ یہ سائنس داں زندگی کا راز دریافت کرنے میں بالکل ناکام رہے ہیں کہ اس کی ماہیت کیا ہے؟ وہ زمین پر کہاں سے آئی اور زمین پر پہلا انسان کیسے وجود میں آیا۔ اس مفہوم کے لحاظ سے یہاں اللہ نے پہلی بار زندگی کے ظہور کی تحقیق و تفتیش کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ اس کے بارے میں واقفیت حاصل ہو جائے۔ پھر اس سے دوبارہ زندگی پانے پر استدلال کیا جائے۔

اس خیال کے ساتھ ایک دوسرا خیال بھی آتا ہے وہ یہ کہ جو لوگ اس آیت کے اولین مخاطب تھے وہ اس طرح کی سائنٹیفک تفتیش کی صلاحیت سے محروم تھے جو زمانۂ حال میں شروع ہوئی۔ لہٰذا اس زمانے میں ان کے اندر اس کی استطاعت نہ تھی کہ اس طریقے سے اس حقیقت کا پتہ چلا سکیں جس کی دریافت مقصود تھی بشرطیکہ آیت کا مقصد بھی قرار پائے۔ لہٰذا یہ رائے اختیار کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ان سے کسی دوسرے کام کا مطالبہ کر رہا ہے جس کا انجام دینا ان کے لئے ممکن تھا اور جس کے ذریعہ وہ جس حد تک ممکن ہوتا دوسری بار زندگی پانے کا تصور سمجھتے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ لوگ اس بات پر غور کریں کہ مختلف علاقوں نباتات، حیوانات اور انسانوں میں زندگی کا آغاز کس طرح ہوتا ہے۔ اس صورت میں زمین میں چلنے پھرنے کی دعوت کا مقصد یہ ہے مشاہدات ومناظر کے ذریعہ شعور وادراک میں تازگی اور بیداری پیدا کرنا ہوگا۔ تاکہ وہ زندگی کے پیدا کرنے کے سلسلے میں قدرت الٰہی کے آثار پر غور وفکر کر سکے جو دن رات کے ہر لمحے سامنے آتے رہتے ہیں۔

ایک اور مفہوم ممکن ہے جو زیادہ اہم اور اس قرآن کے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھنے والا ہے وہ یہ کہ قرآن کی رہنمائی انسان کی تمام نسلوں کے لئے اور ہر سطح کے ذہن والوں کے لئے اور ہر طرح کے حالات میں ہر طرح کے وسائل وذرائع کے ساتھ گذاری جانے والی زندگی کے لئے ہے۔ چنانچہ وہ اس رہنمائی کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر ایک اس سے استفادہ کر سکے۔ بقدر اس کے حالات، وسائل زندگی واستعداد اس کا ساتھ دے سکیں اور ممکن بنا سکیں۔ اس رہنمائی میں ہمیشہ ترقی پذیری باقی رہتی ہے۔ تاکہ زندگی آگے بڑھتی رہے اور یہ رہنمائی اس کی قیادت کرتی رہے۔ اس تعبیر کی روشنی میں مذکورہ بالا دونوں خیالوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں رہ جاتا بھی بات زیادہ موزوں اور اقرب الی الصواب ہے۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُۥ سٰجِدِينَ ۝	جب میرے رب نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں پھر میں جب اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔

(ص ۷۱-۷۲)

ہم روح پھونکنے کی کیفیت سے تو ناواقف ہیں مگر اس کے اثرات جانتے ہیں۔ یہ اسی کے اثرات ہیں جنہوں نے اس انسان کو اس زمین کی تمام مخلوقات سے ممتاز کر دیا اس نے ایسے عقلی و روحانی ارتقاء کی خصوصیت

عطا ہوئی ہے۔ اس کے طفیل عقل انسانی ماضی کے تجربات پر غور کرتی اور مستقبل کے لئے منصوبہ بناتی ہے اور اسی کا فیضان ہے کہ انسان کی روح عقل و حواس کی مدد سے حاصل کی جا سکنے والے علم سے آگے بڑھ کر ان امور تک رسائی حاصل کر لیتی ہے جو عقل و حواس کے لئے مجہول ہیں۔

عقل و روحانی ارتقاء کی خصوصیت خالصتہً انسانی خصوصیت ہے۔ زمین پر بسنے کوئی دوسرا جاندار اس خصوصیت میں انسان کا شریک نہیں۔ پہلے انسان کی پیدائش کے وقت مختلف انواع و اجناس کے جاندار موجود تھے۔ مگر اس طویل تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نوع یا جنس نے یا اس کے کسی ایک فرد نے بھی عقلی اور روحانی طور پر ترقی کی ہو۔ اگر ہم اعضاء جسم کی حد تک ارتقاء تسلیم بھی کر لیں تو بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ عقلی و روحانی انسان کی تخلیق خصوصی ہوتی ہے

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ اور اللہ نے تم کو اگایا زمین سے پھر تم کو دوبارہ
ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۙ اسی میں لے جائے گا اور پھر تمہیں باہر نکالے گا۔

زمین سے انسان کی اٹھان کی تعبیر اگانے سے کرنا ایک عجیب اور معنی خیز تعبیر ہے۔ یہ تعبیر مختلف شکلوں میں قرآن میں بار بار آئی ہے۔ بلاشبہ یہ منظر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اس میں یہ اشارہ مضمر ہے کہ زمین پر زندگی کا اصول ایک ہی ہے اور یہ کہ زمین سے انسان بھی اسی طرح نکلا ہے جس طرح نباتات۔ وہ اس کے بنیادی عناصر سے تشکیل پاتا ہے اور اسی کے بنیادی عناصر سے غذا حاصل کرتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ پس وہ اسی کی نباتات میں سے ایک ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زندگی کی اس قسم سے نوازا ہے جس طرح نباتات کو زندگی کی دوسری قسم عطا کی ہے۔ وہ دونوں زمین کی پیداوار ہیں اور دونوں اس ماں کے دودھ پر پروان چڑھتے ہیں۔ یہی طرح ایمان مومن کے اندر زمین اور دوسرے جانداروں سے اس کے رشتے کا ایک حقیقی اور جاندار تصور پیدا کرتا ہے۔ ایسا تصور جس میں علم کی باریکی اور احساس کی قوت اور تازگی ہے۔ کیونکہ وہ ضمیر میں زندہ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ قرآن کے اچھوتے طریقہ معرفت کا امتیازی وصف ہے

سورۃ والعصر کی تفسیر میں انسان کے مقام بلند کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو تصور انسان کی نظر میں اس کے مقام کو گرا دے وہ انسان کو پستی کی طرف لے جائے گا اسی بنا پر ڈارونزم، فرائڈیت اور مارکسزم کے لائے ہوئے تصورات انسانی فطرت انسانی کے رہنمائی کے سلسلے میں بدترین کردار کے حامل ہیں۔ یہ انسان کو یہ سکھاتے ہیں کہ ہر پستی، ہر گندگی، ہر ذلت قدرتی اور عین متوقع ہے اسے غیر متوقع نہیں سمجھنا چاہیے لہذا

اس سے شعر ملنے کی بھی ضرورت نہیں۔

جدید فلسفہ، فلسفہ تاریخ، نفسیات، اخلاقیات وغیرہ پر جاہلی تصورات کے گہرے اثرات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس قسم کی علمی اور فکری کوششوں کا معاملہ کمسٹری، فزکس، بیالوجی اور طب جیسے علوم سے بلکل مختلف ہے اس وقت تک جب تک یہ علوم عملی تجربات کے دائرے میں رہیں اور واقعی نتائج ریکارڈ کرنے پر قناعت کریں ان سے آگے بڑھ کر کسی نوع کی فلسفیانہ تعبیر نہ پیش کریں۔ اس طرح کے تجاوز کی ایک مثال ڈارونزم ہے جو بیالوجی میں مشاہدات اور ان کی ترتیب و تجربے سے آگے بڑھ کر بغیر کسی علمی ضرورت اور دلیل کے صرف مخصوص میلانات و خواہشات کے تحت یہ رائے بھی ظاہر کرتا ہے کہ زندگی کے آغاز و ارتقاء کی تشریح کے لیے عالمِ طبیعی سے ماورا کسی خارجی قوت کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

بقیہ تراجم:

کرایا ہے لیکن یہ رعایت سیاہ فاموں کے لیے گویا اشک شوئی کے مترادف ہے۔ سیاہ فاموں کا اصل مطالبہ ہے کہ سیاہ فاموں کے سیاسی حقوق بحال کیے جائیں اور ایک آدمی ایک ووٹ کے مطابق نظام حکومت قائم کیا جائے جنوبی افریقہ کے ایک سفید فام سیاست داں نے سیاہ فاموں کے اس مطالبے پر تبصرہ کیا کہ اس کا مطلب ہے کہ سفید فام اقلیت، جنوبی افریقہ کی سیاہ فام اکثریت کے سپرد کرکے خود اسی طرح محکوم بن جائے جس طرح سیاہ فام اب تک ہیں

کامیابی قربانیوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتی

جنوبی افریقہ میں سیاہ فاموں کی سفید فاموں کے خلاف بغاوت بدستور جاری ہے۔ اب تک قریباً ساڑھے چھ سو افراد پولیس کی گولیوں کا نشانہ اور ہزاروں افراد نظر بند ہو چکے ہیں۔ گرفتار شدگان میں ایک ہزار کے قریب اسکول کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں جنہوں نے اسکول سے نکل کر سفید فام حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا تھا۔

قربانی ضائع نہیں جاتی۔ جو سفید فام حکومت کبھی ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی اور سیاہ فاموں کا جنوبی افریقہ میں حق زیست بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ بالآخر اس کی گردن جھکنا شروع ہو گئی ہے۔ امریکہ سمیت یورپ کے تمام ممالک نے جنوبی افریقہ کا مقاطعہ کر دیا ہے۔ اس سے جنوبی افریقہ کے سکے (رینڈ) کی قیمت اچانک گر گئی اور اس پر ہر طرف سے لعنت ملامت ہونے لگی چنانچہ جنوبی افریقہ کی حکومت نے سیاہ فاموں کے لیے مزید مراعات دینے کا اعلان کر دیا ہے

ایک رعایت یہ ہے کہ سیاہ فام جو پہلے افریقہ کے شہری نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اب شہری سمجھے جائیں گے دوسری یہ ہے کہ اب ان پر اپنے ساتھ پاس بک رکھنے کی پابندی نہیں ہو گی۔ پاس بک رکھنا ہر غیر سفید فام کے لیے لازم ہے اور جو غیر سفید فام (ہندوستانی یا سیاہ فام) پاس بک رکھنے سے قاصر ہو گا وہ مستوجب سزا ہو گا۔ اس پاس بک میں پاس بک رکھنے والے کا نام پتہ اور پیشہ اور دوسرے کوائف ہوتے ہیں۔ اس پاس بک کے ذریعے گویا سیاہ فام آبادی کو کنٹرول میں رکھا جاتا تھا۔ پاس بک کا قانون حقیقت میں جبر کا ایک ذریعہ تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال اوسط دو سے پانچ لاکھ افراد پاس ایکٹ قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں جیل کی ہوا کھاتے ہیں۔ گاندھی جی جب جنوبی افریقہ گئے تھے تو اپنی سیاسی زندگی کا آغاز انہوں نے پاس بک کے قانون کی خلاف ورزی ہی سے کیا تھا تو یہ قانون سینکڑوں افراد نے اپنا خون دے کر اب منسوخ

(باقی برصفحہ ۲۴)

بزم سلیمانی بھوپال کا سمینار

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت پر سو سال گزر جانے کے بعد ان کی یاد میں بزم سلیمانی بھوپال نے سہ روزہ سمینار (۴-۵-۶ ستمبر) منعقد کیا تھا۔ اللہ کے فضل سے وہ بہت کامیاب رہا اس حقیر کے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا۔ میں نے "خطبات مدراس" پر ایک مختصر مقالہ بھیجا تھا اور ایک نظم ارسال کی تھی شرکت کا ارادہ تھا لیکن عین وقت پر کچھ ایسی معذوری پیش آگئی کہ میں شریک نہ ہو سکا۔ اس کا افسوس ہے ظاہر ہے کہ نہ میرا مقالہ پڑھا گیا اور نہ نظم، شاید اس مجموعہ میں شائع ہو جو بزم سلیمانی کی طرف سے شائع ہونے والا ہے بزم سلیمانی نے عنایت کر کے چند چیزیں میرے پاس بھی بھیجی ہیں۔

خطبۂ استقبالیہ مولانا عمران خان ندوی، خیر مقدمی عربی خطبہ جو جمہوریہ مصر کے محترم سفیر اور مندوبین کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ مقالہ نگاروں اور ان کے مقالوں کی فہرست۔ محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن مدیر معارف اعظم گڈھ کا کلیدی خطبہ بعنوان حضرت مولانا سید سلیمان ندوی۔ تجاویز جو سمینار میں پاس کی گئیں، ان تجاویز میں چند یہ ہیں:-

(۱) بزم سلیمان منعقدہ دار العلوم تاج المساجد بھوپال کا یہ جلسہ ناظم دار المصنفین سے درخواست کرتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کے جو مضامین الندوہ، معارف اور متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان کو جلد از جلد شائع کریں

(۲) سید صاحب نے ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ کی حیثیت سے جو فیصلے اور احکام جاری کیے ان کو مرتب کرنے کے لیے مولانا محمد عمران خان ندوی سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ایک مجلس عمل کی تشکیل فرمائیں اور ان کی ترتیب اشاعت کے لیے بھوپال کے مقامی ادارے دار القضاء، وقف اور دار العلوم تاج المساجد ایک دوسرے سے اشتراک عمل کریں۔ جمع شدہ فتاوی اور قضایا کی اشاعت میں دار المصنفین اعظم گڈھ اور دار العلوم ندوۃ العلماء سے بھی تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (راقم الحروف اس تجویز کی خصوصیت کے ساتھ تائید کرتا ہے۔)

(۳) بزم سلیمان میں جو مقالے پیش کیے گئے ان کو مرتب کر کے جلد از جلد شائع کیا جائے۔

رسائل و مسائل

عذابِ قبر کی مزید توضیح

خط بعض اہلِ علم نے جدہ (حجاز) سے لکھا ہے:۔

"زندگی نو" تازہ شمارہ ستمبر ۵۸ء میں رسائل و مسائل کے تحت "عذابِ قبر کا انکار گمراہی ہے" نظر سے گذرا۔ اس موضوع پر حال ہی میں احباب کے درمیان کچھ الجھن رہی ہے۔ پیش کر رہا ہوں، امید ہے کہ رفع فرمائیں گے۔

(۱) عذابِ قبر جسم سے متعلق ہوتا ہے یا روح سے؟ بعض قبروں کو کھولنے سے مردے جوں کے توں نکلتے ہیں۔ ایک امریکن سے اس موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ ہم لوگ مردے کو بنا سنوار کر، ہر طرح کے اثرات سے محفوظ رہنے والے بکس میں بند کر کے دفناتے ہیں۔ بعض مقدمات کے سلسلے میں قبر سے مردہ نکالا جاتا ہے اور وہ اسی حالت میں ملتا ہے جس حالت میں دفنایا گیا تھا کبھی یہ مدت پانچ سات سال سے تجاوز کر جاتی ہے اور بعض دفعہ اس امریکن کے کہنے کے مطابق بیس سال بھی۔ سوال یہ ہے کہ غیر مسلم کو عذابِ قبر کیسے سمجھایا جائے۔

(۲) بہت سے غیر مسلم اپنے مردے جلا دیتے ہیں۔ ان کے سامنے ہم عذابِ قبر کی توضیح کس طرح کر سکتے ہیں؟

جواب

آپ کے ان دو سوالات کا جواب دینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت اہم اصولی بات کی طرف توجہ دلائی جائے۔ وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اور جو چیزیں ہماری نگاہوں سے اوجھل اور

ہمارے ادراک سے ماوراء ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، فرشتے، جنت، جہنم، قیامت، ان کے بارے میں ہم اسی قدر جان سکتے ہیں جس قدر اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں بتا دیا ہے۔ ہم سے ایمان بالغیب کا مطالبہ ہے۔ قرآن کریم اور صحیح احادیث کے بیان سے زیادہ تفصیل جاننے کی خواہش لاحاصل ہے اس لیے کہ انسانی عقلیں محدود ہیں، اور بہت سی چیزیں ان کے دائرے سے باہر ہیں ان کی نشان دہی صرف وحی الٰہی کرتی ہے اور کر سکتی ہے۔ اس اصول کو ملنے بغیر ایمان سلامت نہیں رہ سکتا۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ قرآن و صحیح احادیث سے ثابت ہے یا نہیں اور جب معلوم ہو جائے کہ ثابت ہے تو پھر بے چون و چرا اس کو تسلیم کرے۔ جب کسی کو یہ یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسول کی بتائی ہوئی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی تو پھر الجھن کیوں؟ ہم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں یا اپنی عقل پر؟ اس اصولی بات کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے۔ یہ بہت سارے مسائل میں آپ کی الجھن دور کرے گی۔

۱۔ آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قبر کا عذاب ہو یا ثواب، اس کا اصل تعلق روح سے ہوتا ہے عذاب کی جو شکلیں قرآن اور احادیث میں بیان ہوئی ہیں ان کو ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ فرشتے ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اسی طرح شیاطین بھی ہیں لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی جسم پر عذاب ہو رہا ہو لیکن ہم اسے نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کوئی آواز سن سکتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہماری زندگی میں بھی موجود ہے۔ مثلاً ایک شخص سویا ہوا ہے، ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ تکلیف محسوس کر رہا ہے بلکہ کبھی چیخ اٹھتا ہے لیکن دوسرا شخص جو اس کی بغل میں لیٹا ہوا ہو اس سے بالکل بے خبر رہتا ہے وہ کچھ نہیں دیکھتا۔ جسم پر عذاب کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کا کوئی اثر جسم پر نظر آئے جس طرح خواب دیکھنے والے کے جسم پر کوئی اثر نمایاں نہیں ہوتا۔ فرض کیجیے کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ دشمن نے اس کے جسم میں نیزہ بھونک دیا۔ وہ چیخ پڑا لیکن آنکھ کھلی تو جسم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن مردوں کے جسم قبر سے محفوظ نکلتے ہیں اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ عذاب سے بھی محفوظ ہوں۔ عین ممکن ہے کہ ان پر عذاب ہو رہا ہو لیکن ان کو دیکھنے والے دوسرے لوگ بالکل بے خبر ہوں۔

۲۔ آپ اس پر غور کریں کہ مثال کے طور پر آپ کسی غیر مسلم کو فرشتوں کے وجود پر کس طرح مطمئن کریں گے کوئی جزوی مسئلہ کسی کو سمجھانا یا اس پر اس کو مطمئن کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اس کلیے کو نہ سمجھ لے جس سے وہ جزوی مسئلہ نکلا ہے۔ جب تک کسی شخص کو آپ توحید، رسالت، آخرت پر اور وحی الٰہی اور قرآن کے کلام الٰہی

ہونے پر مطمئن نہ کریں وہ ان جزوی مسائل کو کس طرح سمجھ سکتا ہے جو قرآن و احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر بنیاد ہی غائب ہو تو ستون کہاں قائم ہوں گے اور دیواریں کہاں کھڑی ہوں گی؟ کوئی غیر مسلم جب کسی جزوی مسئلے پر اعتراض کرتا ہے تو ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم اس جزوی مسئلے کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اسے سمجھانے میں ناکام رہتے ہیں۔

"قبر" کا جو لفظ قرآن و حدیث میں استعمال ہوا ہے اس سے مراد صرف وہ گڑھا نہیں ہے جس میں مردہ دفن کیا جاتا ہے بلکہ اس سے مراد "برزخ" ہے۔ موت کے بعد سے قیامت تک کے درمیانی زمانے کو برزخ کہتے ہیں۔ مرنے کے بعد سوال و جواب اور عذاب و ثواب کے لیے قبر میں دفن ہونا ضروری نہیں ہے۔ برزخ کا ذکر سورۂ المومنون پارہ ۱۸ آیت ۱۰۰ میں ہے۔ میں یہاں اس کا ترجمہ لکھتا ہوں:۔

امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے
اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک۔

اس آیت میں برزخ کے مرحلے کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے آیت ۹۹ میں موت کے مرحلے کا ذکر ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

(یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کی موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ اے میرے رب مجھے اس دنیا میں واپس بھیج دیجیے جسے میں چھوڑ آیا ہوں"

آیت ۱۰۱ میں قیامت کے مرحلے کا ذکر ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

پھر جونہی کہ صور پھونک دیا گیا ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔

اس طرح ان آیتوں میں انسان کے چاروں مراحل کا ذکر آجاتا ہے۔ زندگی۔ موت۔ برزخ۔ قیامت

جو انسان جل کر خاک ہو جاتا ہے وہ بھی قیامت تک عالم برزخ ہی میں رہے گا۔ سوال و جواب اور عذاب و ثواب کا اصل تعلق چونکہ روح سے ہے اس لیے ہر انسان کو اس مرحلے سے گزرنا ہے۔ جو غیر مسلم اپنے مردوں کو جلا دیتے ہیں ان کو اسی طرح سمجھایا جا سکتا ہے کہ عذاب و ثواب کا اصل تعلق روح سے ہوتا ہے اور روح نہ جلتی ہے، نہ مرتی ہے، وہ باقی رہتی ہے۔ اصل بات یہیں آکر ختم ہوتی ہے کہ عالم برزخ اور عالم آخرت کے بارے میں ہم اتنا ہی جان سکتے ہیں جتنا ہمیں بتا دیا گیا ہے۔ اس پر قیاس کرنے اور عقلی تیر تکے چلانے سے گمراہی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا

اقامت دین کے بارے میں

خط جدہ (حجاز) سے بعض اہل علم نے لکھا ہے:۔

سورۂ شوریٰ کی آیت "اَن اقیموا الدین" سے اقامت دین کی فرضیت واضح ہوتی ہے لیکن ایک عالم دین نے اپنی تحریر میں اس طرح گرفت کی ہے کہ اگر یہ مقصد ہوتا تو اسے قرآن میں بار بار دہرایا جانا چاہیے تھا۔ مہربانی کرکے اس گرفت کا جواب دیجیے تاکہ میری الجھن دور ہو۔

جواب

جواب سے پہلے آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ پورا قرآن ترجمہ کے ساتھ پڑھ لیں۔ اس سے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کریم میں کتنے احکام بار بار دہرائے گئے ہیں اور کتنے احکام ایسے ہیں جو دہرائے نہیں گئے ہیں۔ عالم دین صاحب نے جو گرفت کی ہے اس کے دو جوابات ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن میں جس چیز کو ایک بار حکم دے کر فرض قرار دیا گیا ہے وہ بھی اسی درجے کا فرض ہے جس درجے کا وہ فرض جس کا حکم دہرایا گیا ہے۔ دیکھیے ماہ رمضان المبارک کے روزے کا حکم قرآن میں صرف ایک بار دیا گیا ہے اس کو دہرایا نہیں گیا ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ دین اسلام کے چار عملی ارکان میں ایک روزہ بھی ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ ان عالم دین صاحب کے نزدیک یا تو رمضان کے روزے فرض نہیں ہیں یا یہ کہ ان کی فرضیت کم درجے کی ہے۔ اگر ان عالم دین صاحب سے آپ یہ پوچھ سکتے ہوں تو ضرور دریافت کریں۔ اس کے علاوہ میراث تقسیم کرنے کا حکم بھی ایک ہی بار دیا گیا ہے۔ پتہ نہیں ان عالم صاحب کے نزدیک قرآنی حکم کے مطابق میراث تقسیم کرنے کی حیثیت کیا ہے؟ اس کے بارے میں بھی ان سے پوچھیے۔

عالم صاحب کی گرفت کا دوسرا جواب یہ ہے کہ "دین قائم کرو" کا حکم ایک بار نہیں بیسیوں بار قرآن میں دیا گیا ہے بلکہ پوری پوری سورتیں اسی مقصد سے نازل کی گئی ہیں۔ سورۂ انفال، سورۂ توبہ۔ سورۂ حدید، سورۂ صف۔ ان تمام سورتوں میں جہاد فی سبیل اللہ کے احکام و ترغیبات کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ اللہ کا دین قائم ہو۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۹۳ میں حکم دیا گیا ہے:۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ	تم ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

اس آیت میں قتال کا صرف حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس حکم کی غرض و غایت بھی بتا دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ زمین پر اللہ کا دین قائم ہو جائے "دین اللہ کے لیے ہو جائے" کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی حکم ایک لفظ کے اضافہ کے ساتھ سورۂ انفال میں دہرایا گیا ہے :۔

وقٰتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ	اے ایمان لانے والو! ان سے قتال کرو یہاں
ویکون الدین کلّہ	تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا
للّٰہ ۔ (الانفال۔ ۳۹)	اللہ کے لیے ہو جائے ۔

"اور دین اللہ کے لیے ہو جائے" اس کا مطلب مفسر ابن کثیر نے یہ لکھا ہے ۔

ای یکون دین اللّٰہ ھو الظاھر العالی علیٰ سائر الادیان (مختصر تفسیر ابن کثیر)	یعنی اللہ کا دین ہی غالب اور تمام ادیان پر بلند ہو جائے ۔

اس مطلب کی دلیل کے طور پر ابن کثیر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی یہ متفق علیہ حدیث پیش کی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا ہے جو لڑتا ہے بہادری دکھانے کے لیے اور لڑتا ہے خاندانی حمیت کے جوش میں اور لڑتا ہے دکھاوے کے لیے ان میں کون سی لڑائی فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں) ہو گی؟ آپ نے فرمایا جو اس لیے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، وہی جنگ فی سبیل اللہ ہو گی ۔

اب پورے قرآن میں شمار کیجیے کہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کے لیے کتنی آیتیں نازل ہوئی ہیں اور دین میں اس کو کیا درجہ دیا گیا ہے ۔ اس کے باوجود اگر کوئی عالم یہ کہتا ہے کہ اقامت دین کا حکم دہرایا نہیں گیا ہے تو دو صورتوں میں ایک ہی صورت ہو سکتی ہے یا اس کی غرض یہ ہے کہ قرآن اس طرح نازل ہوتا جس طرح وہ چاہتا ہے یا وہ جانتے بوجھتے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک بالکل غلط بات کہہ رہا ہے ۔ ہم نے ایسے علماء کا معاملہ جو لوگوں کو اقامت دین کی جدوجہد سے باز رکھنے کے لیے اس طرح کی باتیں کہتے اور لکھتے ہیں، خدا پر چھوڑ دیا ہے وہی ان سے سمجھے گا ۔ رسائل و مسائل کے صفحات میں اس مسئلے کی پوری تفصیل پیش نہیں کی جا سکتی ۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ اس موضوع پر لکھی ہوئی تین کتابوں کا مطالعہ کریں (۱) فریضۂ اقامت دین، مولانا صدر الدین اصلاحی ۔ (۲) امت مسلمہ کا نصب العین، سید احمد قادری (۳) اقامت دین فرض ہے ۔ سید احمد قادری ۔

یہ تینوں کتابیں آپ کو مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی علے سے مل جائیں گی

امتِ مسلمہ شہادت کہاں دیگی

سوال

ستمبر ۸۵ء کے پہلے ہفتہ میں میرا قیام دہلی میں تھا۔ وہاں ٹامل ناڈو سے آئے ہوئے ایک نوجوان نے مجھ سے کہا کہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۴۳ میں امتِ مسلمہ کی جس شہادت کا ذکر ہے اس کے بارے میں ٹامل ناڈو کے بعض علماء نے کہا کہ تمام قدیم مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ شہادت آخرت میں دینی ہوگی ان میں سے کسی نے یہ نہیں لکھا ہے کہ امت مسلمہ کو شہادت دنیا میں بھی دینی ہوگی دنیا میں شہادت دینے کی بات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایجاد ہے۔ نوجوان نے کہا کہ میں اس کا جواب نہیں دے سکا۔ آپ مجھے بتلائیے کہ کیا کسی قدیم مفسر نے دنیا میں شہادت دینے کی بات لکھی ہے؟

جواب

میں نے نوجوان کو مختصر جواب دے دیا تھا کہ ہاں لکھی ہے۔ اگر ایس آئی او کے نوجوان اس حقیر کی کتاب "امتِ مسلمہ کا نصب العین" پڑھ چکے ہوتے تو وہ بعض علماء کو جواب دے سکتے تھے۔ میں نے اس کتاب میں سورۂ بقرہ آیت ۱۴۳ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ آیت یہ ہے :۔

وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا	(البقرہ-۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

میں نے اس آیت پر بحث کرتے ہوئے کتاب کے ص ۱۰۸ پر تین سوالات قائم کیے ہیں ان میں پہلا سوال یہ ہے:

"امت مسلمہ کو یہ شہادت کہاں دینی ہوگی؟ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ؟" اس سوال کا جواب میں نے امام رازی کی تفسیر کبیر کو سامنے رکھ کر دیا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ دنیا میں شہادت دینے کا قول ماقبل امام رازی سے نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایجاد نہیں ہے۔ امام رازی نے خود جس بات

کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کو یہ شہادت دنیا میں بھی دینی ہوگی اور آخرت میں بھی۔ ان کے مقالے کی عبارت میں نے اپنی کتاب میں نقل کر دی ہے۔ یہاں میں کچھ مزید عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ امام رازی کا طریقہ یہ ہے کہ آیات پر گفتگو کرنے کے لیے چند مسائل پہلے متعین کر لیتے ہیں اور پھر ہر مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۴۳ پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے "المسئلۃ الخامسۃ" کے تحت لکھا ہے :-

اختلف الناس فی ان الشهادة	لوگوں نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ جو
المذکورۃ فی قوله تعالیٰ لتکونوا	شہادت اللہ تعالیٰ کے قول لتکونوا شہداء
شهداء على الناس تحصل فی	علی الناس میں مذکور ہے وہ آخرت میں
الآخرۃ او فی الدنیا فالقول الاول	ہوگی یا دنیا میں؟ تو پہلا قول یہ ہے کہ وہ آخرت
انها تقع فی الآخرۃ (مفاتیح الغیب ج ۲ ص ۱۲)	میں واقع ہوگی

امام رازی نے اس قول کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ آخرت میں امت مسلمہ کو یہ گواہی دینی ہوگی کہ تمام انبیاء سابقین نے اپنی امتوں کو خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس امت کو خدا کے نافرمان لوگوں کے ان اعمال کے خلاف گواہی دینی ہوگی جن میں انھوں نے مخالفت کی تھی۔ اس کی تفصیل کے بعد انھوں نے "القول الثانی" "دوسرا قول" کے تحت لکھا ہے :-

ان اداء هذه الشهادة انما	یہ کہ شہادت دنیا میں ادا کرنی ہوگی۔
یکون فی الدنیا (مفاتیح الغیب ج ۲ ص ۱۳)	

یہ قول کہ شہادت دنیا میں بھی دینی ہوگی اس کی صحت پر امام رازیؒ نے دلائل دیے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے :-

"ہم نے دلیل سے واضح کیا ہے کہ اس امت کا دنیا میں گواہی دینا ضروری ہے اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ یہ امت قیامت میں بھی گواہ ہو جس طرح حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے"

تامل ناڈو کے جن عالم صاحب نے مولانا مودودی پر الزام لگایا ہے، شاید انھوں نے تفسیر کبیر نہیں پڑھی ہوگی۔

تنقید و تبصرہ

زمخشری کی تفسیر "الکشاف" ایک تحلیلی جائزہ پروفیسر فضل الرحمٰن گنوری، دینیات فیکلٹی و صدر شعبہ دینیات (سنی) صفحات ۵۷۶،

سائز بڑا۔ کاغذ عمدہ، مجلد۔ ناشر:۔ دینیات فیکلٹی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ یوپی۔

یہ کتاب کا پہلا اڈیشن ہے جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا اور اب فاضل مصنف نے "زندگی نو" کو تبصرے کے لیے عنایت کیا ہے۔

یہ ضخیم کتاب ایک خالص علمی کتاب ہے۔ مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ انھوں نے اسلامیات میں پی ایچ ڈی کے لیے یہی موضوع منتخب کیا تھا اور اس پر انہیں ۱۹۷۱ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ان کی یہ کتاب، مقدمے، چار ابواب، اختتامیے، فہرست اور ماخذ و مراجع پر مشتمل ہے ۹۸ صفحات کا مقدمہ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اس میں تفسیر اور تاویل کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔ تفسیر کی ضرورت، اس کی ابتدا اور تدوین پر گفتگو کی گئی ہے اور چھٹی ہجری تک تفسیری رجحانات اور ان کے نمائندوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ پہلا باب زمخشری کے حالات زندگی اور تصانیف پر ہے۔ دوسرا باب کشاف اور اعتزال کے موضوع سے بحث کرتا ہے۔ تیسرا باب کشاف اور اعجاز القرآن پر اور چوتھا کشاف اور بعض دیگر اہم تفسیری رجحانات پر مرتب کیا گیا ہے۔ اختتامیے میں تین عنوانات پر گفتگو ہے۔ کشاف کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ۔ کشاف کے بارے میں ماہرین فن کی رائیں۔ کشاف پر کیا کام کیا گیا۔ مصادر و مراجع ص ۵۲۵ سے ۵۷۶ تک چلے گئے ہیں۔ انگریزی زبان کے مصادر کو ملا کر ان کی تعداد ۴۰۰ تک پہنچتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فاضل مصنف نے اس کتاب پر کتنی محنت صرف کی ہے۔ موجودہ دور میں تفسیر پر عربی زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں کئی ایک مصنف کو مل گئیں اس لیے ان کو سہولت بھی ہوئی ہوگی۔ اس کتاب

کو پڑھنے کے بعد یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ واقعی مصنف کا یہ کام اس لائق تھا کہ اس پران کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جاتی۔ اس طرح کے مقالے تبصرہ نگار نے جتنے پڑھے ہیں ان میں یہ مقالہ علمی لحاظ سے سب سے بلند درجے ہے اس کتاب سے پورا استفادہ ہر پڑھا لکھا آدمی نہیں کرسکتا بلکہ وہی اہل علم پورا استفادہ کرسکتے ہیں جو یونانی فلسفے اور علم کلام سے واقف ہیں۔ تبصرہ نگار قدیم فلسفہ یونان اور علم کلام میں مہارت تو نہیں رکھتا لیکن یہ دونوں علوم اس کے نصاب تعلیم میں داخل تھے اس لیے یہ دونوں علوم اس کے لیے اجنبی نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس نے یہ ضخیم کتاب دل چسپی کے ساتھ پوری کی پوری پڑھی ہے اور فاضل مصنف کو ان کی محنت پر مبارک باد دی ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں شیعیت سے اعتزال کی مصالحت پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسے بھی دل چسپی سے پڑھا گیا۔ باب اول کے ص ۱۰۰ پر "چوتھی صدی ہجری اور شیعیت و اعتزال" کے ذیلی عنوان کے تحت اس کی تفصیل پیش کی گئی ہے شیعیت سے اعتزال کی مصالحت میرے نزدیک ایک اعجوبہ سے کم نہیں ہے لیکن معتزلہ نے اقتدار پرستی اور مخالفین کے ساتھ بربریت کی جو روش اختیار کی تھی اس نے انہیں شیعیت سے بھی مصالحت پر مجبور کیا حالانکہ دونوں میں بون بعید ہے۔ شیعیت اور اعتزال کے درمیان فرق یہ ہے کہ اول الذکر سیاست سے شروع ہوئی اور آگے چل کر "مذہب بن گئی اور اعتزال ایک فلسفیانہ فکر سے شروع ہوا اور آگے چل کر سیاست بن گیا۔ معتزلہ اس لیے گمراہ ہوئے کہ انھوں نے وحی الٰہی کے بجائے عقل انسانی کو محور قرار دیا اور پورے دین کو اس کے گرد گھمانے کی کوشش کی۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ انھوں نے صفات الٰہی کا انکار کیا، آخرت میں رویت باری کا انکار کیا۔ عذاب قبر کا انکار کیا۔ دین میں احادیث کے حجت ہونے سے انکار کیا اور کفر و ایمان کے درمیان ایک درجہ ایجاد کیا۔ زمخشری بھی عقیدۃً معتزلی تھے لیکن اس کے باوجود ان کی تفسیر الکشاف کو اہل السنت والجماعۃ میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی تفسیر سے آج بھی استفادہ کیا جا رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف نے مفسر اور تفسیر دونوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ان کا یہ علمی کارنامہ ایک منفرد کارنامہ ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوا کہ ایک طرف معتزلہ نے اپنے عقیدے کے خلاف صحیح ترین احادیث کو یا تو ماننے سے انکار کیا یا ان میں معنوی تحریف کی اور دوسری طرف اپنے خیال کے موافق ضعیف سے ضعیف حدیث سے بھی استدلال کیا۔ ان مدعیان عقل کو اس میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ مصنف نے لکھا ہے:۔

روایات کے بارے میں زمخشری کے معتزلی ہونے کی بنا پر یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ کم از کم اپنی تفسیر کا

روایات سے ضرور اپنا دامن بچائیں گے جن کی صحت مشکوک ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ معتزلی عقائد کو سہارا دینے یا اہل اعتزال کے فضائل ثابت کرنے کے لیے زمخشری کو اس بات میں قطعاً باک نہیں کہ وہ حد درجہ ضعیف اور واہی روایات سے بھی استناد کرلیں۔ (ص ۳۰۱)

ہر وہ شخص یا گروہ اس کام پر مجبور ہوتا ہے جس نے کوئی بات قرآن و حدیث سے ہٹ کر طے کرلی ہو۔ اپنی بات حدیث سے ثابت کرنے کے لیے تو صوفیہ نے بھی حدیثیں وضع کی ہیں۔ اگر زمخشری نے حد درجہ ضعیف روایت سے استدلال کیا ہے تو اس میں تعجب کیا ہے۔ کوئی غلط بات مسلمانوں میں اس وقت تک رائج نہیں ہوسکتی جب تک آیات قرآن میں من مانی تاویل کرکے اسے صحیح ثابت نہ کیا جائے یا اس کے لیے کوئی حدیث نہ پیش کی جائے خواہ وہ موضوع ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں میں گمراہ فرقوں کا جنگل اسی طرح پیدا ہوا ہے۔

فاضل مصنف نے تفسیر کشاف کی خوبیاں بھی واضح کی ہیں اور خرابیاں بھی۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہند و پاک کے تمام عربی مدرسوں کی لائبریریوں میں موجود رہے کیونکہ اس کتاب سے عربی علوم و فنون سے واقف اشخاص ہی پورا استفادہ کرسکتے ہیں۔

ترجمہ انفاس العارفین

مصنف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح مترجم سید محمد فاروق القادری ایم اے۔ صفحات ۲۵۴۔ کتابت، طباعت، کاغذ بہتر قیمت ۸ ۴ روپیے

ناشر۔ مکتبہ الفلاح۔ دیوبند یوپی۔

دیوبند جو دینی کتابوں کے کتب خانوں کا مرکز ہے وہاں ایک نیا مکتبہ "الفلاح" اچھے خاصے سرمایہ سے قائم ہوا ہے اور اس نے متعدد ضخیم کتابیں شائع کی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کتابوں میں سے ایک ہے۔ انفاس العارفین فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اور میں نے یہ کتاب اس وقت پڑھی تھی جب میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے درجۂ فاضل میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ یہ حقیر چونکہ ایک عالم اور صوفی خاندان میں پیدا ہوا ہے اس لیے نوجوانی ہی سے کتب تصوف کے مطالعہ کا شوق رکھتا ہے۔ اب دوسری بار بڑھاپے میں اس کا ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں چھ صفحات کی فہرست مضامین ہے اور کتاب کے آخر میں ۸ صفحات کا اشاریہ ہے۔ جناب مترجم نے تقریباً ۲۴ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ اس میں انفاس العارفین کا مفصل تعارف ہے۔ اس مقدمہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بہت زور دے کر یہ لکھا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ

کے مسلک تصوف کو جان بوجھ کر لوگوں نے چھپانے کی کوشش کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اور ان کے خاندان کا مسلک تصوف، دوسرے مسالک تصوف سے مختلف نہیں ہے۔ مترجم کی اس بات کو ہر وہ شخص صحیح قرار دے گا جس نے انفاس العارفین اور تصوف پر شاہ صاحب کی دوسری کتابیں پڑھی ہیں اور جس نے سنی سنائی باتوں اور ایک طرفہ سوانح نگاری پر اعتماد نہیں کر لیا ہے۔

مترجم نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انفاس العارفین سات مختلف رسائل کا مجموعہ ہے۔ پہلا رسالہ بوارق الولایۃ شاہ صاحب کے والد گرامی قدر شاہ عبدالرحیمؒ کے حالات میں ہے۔ دوسرا شوارق المعرفۃ ان کے عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد کے حالات میں۔ تیسرا الامداد فی مآثر الاجداد خاندانی بزرگوں کے حالات میں، چوتھا عطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ شیخ محمد پھلتی کے حالات میں۔ پانچواں، النبذۃ الابریزیۃ، جد اعلیٰ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بارے میں، چھٹا مشائخ حرمین کے بارے میں اور ساتواں اپنے بارے میں۔ جناب مترجم نے لکھا ہے:۔

> بظاہر تو اس کتاب کی حیثیت ایک تذکرے کی ہے لیکن درحقیقت یہ کتاب علم شریعت و معرفت کا خزینہ اور حکمت و دانش کا ایسا گنجینہ ہے کہ جس میں تاریخ، فقہ، تصوف، کلام، اور عقائد کے سیکڑوں مسائل باتوں ہی باتوں میں حل کر دیے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کو بجا طور پر خاندان ولی اللہی کے فکر تصوف کا صحیح ترجمان کہا جا سکتا ہے اور یہ کتاب بقول مولانا عبیداللہ سندھی شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور تصوف کی روح ہے (ص ۴۲)

اس کتاب کے بارے میں مترجم نے جو رائے دی ہے اس میں مبالغہ تو ہے لیکن غلط نہیں ہے۔ "حیات ولی" مصنفہ مولوی رحیم بخش دہلوی سے شاہ عبدالرحیمؒ کے بارے میں یہ عبارت نقل کی گئی ہے

> "ہندوستان میں جس معزز اور بزرگوار نے سب سے پیشتر حدیث کے درس و تدریس کی بنیاد ڈالی اور جس مشہور محدث نے اس غریب علم کے شائع کرنے اور پھیلانے میں کوشش بلیغ کی وہ شیخ عبدالرحیم صاحب تھے" (حیات ولی ۱۶۱)

مولوی رحیم بخش دہلی کے تھے اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اس لیے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے خاندان سے ناواقف ہوں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۱۰۰۰ھ میں حجاز سے واپس آئے اور آخر دم تک حدیث کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ ان کا انتقال ۱۰۵۲ھ میں ہوا ہے

شاہ عبدالرحیم صاحب کی وفات ۱۱۳۱ھ میں ہوئی ہے کیسی پڑھے لکھے آدمی کی طرف سے اتنے بڑے تاریخی جھوٹ کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی لیکن "تعصب" وہ بلائے بد ہے جو انسان کی بصیرت کو اندھا کردیتا ہے مترجم نے لکھا ہے :۔

شاہ عبدالرحیم سلسلۂ نقشبندیہ سے تعلق خاطر کے باوجود صوفیا کے مشہور اجماعی مسئلے وحدۃ الوجود کے قائل تھے، اس کے مبلغ اور شیخ ابن عربی کے بے حد معتقد تھے۔　(ص ۹)

خود خواجہ باقی باللہ وحدۃ الوجود کے قائل تھے ۔ مترجم نے لکھا ہے :۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ نظریہ وحدۃ الوجود کے بہت بڑے امام تھے شاہ عبدالرحیم فرمایا کرتے تھے کہ "اگر میں چاہوں تو منبر پر بیٹھ کر "فصوص" کے ایک ایک مسئلہ کو قرآن مجید اور احادیث نبوی سے دلائل کے ساتھ بیان کرسکتا ہوں ۔ (ص ۱۰)

بعض بزرگوں نے تو یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو ہدایہ کو جو فقہ کی کتاب ہے تصوف کی کتاب کے طور پر بیان کرسکتے ہیں اور جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے تو صوفیا نے اس کو فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ بنا کر چھوڑا ہے ۔

اصل کتاب کی جن چیزوں پر اس حقیر نے نشان لگائے ہیں اگر ان سب کو عبارتوں کے ساتھ پیش کرے تو تبصرہ بہت طویل ہوجائے گا ۔ اجمالی طور پر کچھ عرض کروں گا اور چند چیزیں عبارتوں کے ساتھ پیش کروں گا جس تصوف کی بنیاد وحدۃ الوجود اور حقیقت الٰہی کے فلسفیانہ نظریے پر ہو وہ اپنی اصل کے لحاظ سے یکساں ہوگا خواہ سلسلوں اور خانوادوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو، ان میں اختلافات محض جزوی ہوں گے ۔ غیر اسلامی نظریات کو ثابت کرنے کے لیے آیات قرآن کی من مانی تاویلیں بے حد ضعیف اور موضوع احادیث سے استدلال الہام اور کشف و کرامات عجیب و غریب واقعات تصوف کی کتابوں میں مشترک ہیں ۔ اسی طرح تضاد بیانی بھی مشترک ہے، خواہ لکھنے والے کسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہوں ۔ یہ تمام باتیں اس کتاب میں بھی موجود ہیں اور جہاں تک کشف و کرامات اور عجیب واقعات کا تعلق ہے یہ کتاب اس کا خزانہ ہے ۔ غیر اللہ کو سجدے، اللہ کا مشاہدہ بلکہ اس سے جسمانی اتصال، قبلیت، عرس، قوالی، ختم خواجگان، جنت کی بشارت، اپنی بات منوانے کے لیے خدا کے سامنے مچل جانا اور اپنی بات منوا لینا، بلکہ خدا کے فیصلے کو بدلوا ڈالنا ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مجلسوں میں تشریف لانا، خدا تک پہنچ جانے کے بعد عبادات کی ضرورت باقی نہ رہنا اور اسی طرح کی تمام چیزیں اس

کتاب میں بھی موجود ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان جب خدا بن جائے تو کیا چیز ممکن نہیں۔ اس کتاب میں یہ بھی موجود ہے کہ بزرگوں کی قبروں سے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس تصوف کے قائل ہیں اور بزرگوں کی قبروں پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کا رونا روتے ہیں۔ ان کے آنسو مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ اب میں چند عبارتیں پیش کرتا ہوں۔

"صوفیا اور رویت باری" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا گیا ہے :۔

> "والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ بعض درویشوں کے بارے میں مجھے تردد تھا کہ حضرت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ کیا مرتبہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے چشم مشاہدہ سے ایک تجلی دیکھی۔ گویا حضرت حق حسین صورت میں متمثل ہو کر برقع پوش ہیں۔ میرے اور حق کے درمیان کچھ فاصلہ ہے۔ جب اس کا جمال پاک مجھ پر ظاہر ہوا تو دل ہاتھ سے چلا اور مجھے اس سے بھی زیادہ قرب کی خواہش پیدا ہوئی وہ میری اس تمنا پر مطلع ہو کر ذرے اور نزدیک ہوا۔ اس پر آتش شوق بھڑک اٹھی اور خواہش قرب میں اور اضافہ ہوا اس پر مطلع ہو کر وہ اور نزدیک آ گیا۔ اس مرحلہ پر میں برقع کی موجودگی سے تنگ آ گیا اور اس کو ہٹانے کی آرزو کی۔ فرمایا برقع تو بہت باریک ہے جو حسن مستور کو اور نمایاں کر رہا ہے۔ عرض کی پھر بھی حجاب تو ہے۔ بالآخر نقاب اٹھا دی اور پھر فرمایا کہ بعض سالکوں کو پہلا مرتبہ حاصل ہے۔ خاص سالکین کو دوسرا مرتبہ اور اخص الخواص کو مرتبہ ثالث میسر ہے اور فلاں فلاں ان تینوں میں سے کوئی مرتبہ نہیں رکھتے۔" (ص ۹۴)

مرتبہ ثالث پر بھی وہ نہیں ٹھہرے اب جسمانی اتصال کا حال پڑھیے۔ "بے صورت اندر صورت آمدہ" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا گیا ہے :۔

> "والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ میں انتہائی گھٹن محسوس کر رہا تھا کہ دفعۃً مجھ پر ایک تجلی وارد ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک حسین و جمیل عورت زیورات اور جاذب نظر لباس سے مزین ہے وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگی اور اس کے قرب سے میرا شعلۂ شوق بھڑکنے لگا۔ بالآخر وہ مجھ سے بغل گیر ہو کر یک تن ہو گئی۔ میرا وجود اسی کی شکل میں منتقل ہو گیا اور وہ تمام زیورات اور لباس میں نے اپنے وجود میں موجود پائے۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی انبساط و سرور حاصل ہوا اور گھٹن جاتی رہی۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ یہ واقعہ بھی مقام توحید کے حصول پر دلالت کرتا ہے اور گزشتہ واقعہ کی ہی ایک شاخ ہے۔ (ص ۹۴-۹۵)

اللہ میاں پہلے مرد کی شکل میں متمثل ہوئے تھے اور اتصال جسمانی کے وقت عورت کی شکل میں سبحان اللہ عمّا یصفون ۔ میں نے ایک ایسے صوفی کی کتاب میں جو زیادہ سند کا درجہ نہیں رکھتے یہ پڑھا تھا کہ فلاسفۂ یونان تصوف میں ان کے استاذ ہیں لیکن اب سکّہ بند صوفیہ کے کلام سے اس کی تصدیق و تائید مل گئی۔ اس کتاب میں "علوم صوفیاء" کے ذیلی عنوان سے لکھا گیا ہے :-

فرمایا صاحب تحقیق متکلمین (فلاسفہ) حقیقت ممکن اور حقیقت واجب کے درمیان تباین سے ایک ایسا معنے مراد لیتے ہیں جسے قبول کرلینے سے صوفیہ کی تحقیقات پر کوئی زد نہیں پڑتی اور اگر اس پر خوب غور کیا جائے تو صوفیائے کرام اور فلاسفہ کے درمیان بہت ہی معمولی اختلاف ہے۔ فلاسفہ قدیم کے کلام کو حقائق پر محمول کرنا ممکن العمل ہے ۔۔۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک صوفیا کے علوم جمع و فرق کی باریکیوں پر مشتمل ہیں اور متکلمین فلاسفہ کے علوم کا موضوع محض فرق پر اکتفا کرنا ہے اور اس باریک فرق کو ہم اختلاف کا نام نہیں دے سکتے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک طبقہ نے صرف چند چیزوں پر اکتفا کرلیا ہے اور بعض سے صرف نظر کیا (ص ۲۱۱)

صرف ایک اور عبارت پیش کرکے اس تبصرے کو ختم کرتا ہوں :-

"فرمایا کہ اصحاب شہود کو عبادت کی تکلیف و ریاضت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ ان پر عبودیت قائم رکھتا ہے" (ص ۲۹۴)

اس تصوف کے قائل اور اس پر عامل لوگوں کے لیے یہ کتاب لائق مطالعہ و استفادہ ہے۔

معرفت الٰہیہ اول ۔ دوم (کامل) صفحات ۴۲۵ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر ۔ قیمت ۴۵ روپیہ ۔ ناشر ۔ مکتبۃ الفلاح دیوبند ۔ یوپی

اس کتاب کے نیچے یہ عبارت درج ہے :-

"حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھول پوری خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ"

یہ اس کتاب کا پانچواں اڈیشن ہے جو پاکستان میں چھپا تھا اور اب ہندوستان میں شائع کیا گیا ہے یہ کتاب جناب شاہ صاحب کے مرید اور خلیفہ مولانا حکیم محمد اختر صاحب نے مرتب کی ہے ۔ ۴۲۵ صفحات میں

مفصل فہرست مضامین لگی ہوئی ہے۔ تین صفحات میں مقدمہ یا پیش لفظ ہے۔ اس کی تحریر میں شاہ صاحب کے دوسرے خلیفہ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق دامت برکاتہم بھی شریک ہیں۔ یہ کتاب ص ۲۱ سے ص ۹۰ تک مولانا شاہ عبدالغنی پھول پوری کے حالات زندگی اور اس سے متعلق دوسری تفصیلات ہیں۔ ص ۹۱ سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ مرتب کتاب نے لکھا ہے۔ شاہ صاحب کے ۱۶ سال کے مواعظ و نصائح تقاریر کا مجموعہ ہے۔ یہ ضخیم مجموعہ پانچویں بار چھپا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب عوام میں خاصی مقبول ہے۔ اس کتاب کی بنیاد مولانا روم کی مثنوی پر رکھی گئی ہے اور مثنوی مولانا روم کی بنیاد عشق الٰہی پر استوار ہے جس طرح فلسفیانہ تصوف کی کتابیں رطب و یابس کا مجموعہ ہوتی ہیں اسی طرح یہ کتاب بھی ہے۔ تبصرہ نگار نے ضلع اعظم گڈھ کے متعدد اہل علم سے جناب شاہ عبدالغنی پھول پوری کا تذکرہ سن رکھا ہے اس لیے یہ کتاب اس نے شوق سے پڑھی۔ اس کتاب میں جس تصوف کی نمائندگی ہے اس کو "طریق زہد اور طریق عشق" کے ذیلی عنوانات کے تحت یوں واضح کیا گیا ہے :-

> "طریق زہد اور طریق عشق۔ یہ دو طریق وصول الی اللہ کے ہیں۔ طریق زہد میں بہت دیر لگتی ہے اور طریق عشق بہت جلد مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ ہمارے حضرت مرشد مولانا تھانویؒ اس کو یوں سمجھایا کرتے تھے کہ ایک زمین ہے جس میں کھیتی کرنا ہے اور یہ زمین یوں تو خیر مزروعہ ہے لیکن خاردار درختوں سے پُر ہے۔ اب اس زمین کو قابل کاشت بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ایک خاردار درخت کو کاٹ کاٹ کر باہر پھینک دیں اور اس طرح کرتے کرتے عرصہ دراز کے بعد یہ زمین ایک نہ ایک دن صاف ہو کر قابل کاشت ہو جاوے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تمام درختوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دیں اور سب جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائیں۔
>
> عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(یعنی عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہو جاتا ہے تو معشوق کے علاوہ تمام غیر ضروری تعلقات کو سوختہ کر دیتا ہے۔) —— بس یہی دوسرا طریقہ 'طریق عشق' ہے اور پہلا طریقہ 'طریق زہد' ہے قلب میں جس قدر اخلاق رذیلہ اور علائق فانیہ اپنی جڑ پکڑے ہوئے ہیں ان کو ایک ایک کر کے الگ کرنے میں ایک عمر چاہیے اور اس زمانے میں یونہی اوسطاً لوگوں کی عمر زیادہ سے زیادہ صرف

ساٹھ یا ستر سال ہوتی ہے اور اللہ کی محبت کی آگ تمام غیر حق کے تعلقات کو سوخت کر دیتی ہے اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

صنما رہِ قلندر سزوار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہِ و رسمِ پارسائی

صنم سے مراد شیخ کامل ہے یعنی اے محبوب شیخ اگر میرے لیے آپ مناسب سمجھیں تو طریق عشق سے میرا راستہ قطع کرا دیجیے کیونکہ طریق زہد کا راستہ بہت لمبا ہے"۔ (ص ۱۶۳ - ۱۶۴)

یہ لمبی عبارت میں نے اس لیے نقل کی ہے کہ اس تصوف کی پوری نمائندگی ہو جائے جو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس عبارت کا تجزیہ اور اس کی تحلیل مقصود نہیں ہے۔ البتہ اس کتاب سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ کا تصوف بھی طریق عشق ہی پر مبنی ہے۔ یہ حقیر اپنے مطالعۂ تصوف کے پیش نظر یہ خیال رکھتا ہے کہ صوفیہ نے قرآنی محبت کو فلسفیانہ عشق کا ہم معنیٰ قرار دے کر اتنی بڑی غلطی کی ہے کہ اس نے اسلامی تصوف کو غیر اسلامی بنا کر رکھ دیا ہے۔ کیونکہ تصور عشق نے ذات الٰہی کو اپنی منزل مقصود قرار دے لیا جس میں جا کر گم ہو جانا ہی حاصل زندگی ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک جن کتابوں نے مسلمانوں کو فلسفیانہ تصوف کے جال میں پھنسائے رکھا ان میں مثنوی رومی کو ایک اونچا مقام حاصل ہے۔ اس تصوف کے لیے تضاد بیانی لازم ہے۔ جب شریعت یاد آجاتی ہے تو اس کے مطابق باتیں ہونے لگتی ہیں اور جب "حقیقت" کا زور ہوتا ہے تو شریعت گم ہو جاتی ہے۔ شریعت یاد آئی تو شاہ صاحب نے فرمایا۔

"تفکر فی اللہ سے ممانعت اور تفکر فی المخلوقات کا حکم اسی سبب سے سیدنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر سے منع فرمایا ہے۔ (کیونکہ عقل محدود میں غیر محدود ذات کا ادراک محال ہے) اور فرمایا۔ تفکروا فی آلاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کیا کرو اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے لیے تمام نشانیاں زمین میں موجود ہیں۔ انہیں نشانیوں سے اللہ تعالیٰ کو پہچاننا چاہیے"۔ (ص ۱۱۰)

اور جب حقیقت کا غلبہ ہوا تو فارسی اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھا:۔

"حضرت سعدی رح فرماتے ہیں کہ اللہ کے مقربین بندے محبوب حقیقی کے عشق میں اپنی جان سے بھی بے پرواہ ہیں اور محبوب حقیقی کی یاد میں سارے جہان سے بے خبر ہیں۔ یاد حق میں خلق سے بھاگے ہوئے ہیں اور اس منعم حقیقی پر ایسے متوالے ہوگئے ہیں کہ نعمتوں کی طرف سے التفات جاتا رہا۔ صرف ذات منعم

پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں یعنی ان کی وہ محبت جو پہلے بواسطہ امید و حرص تھی اب وفور طلب شوق سے یہ حجاب واسطہ بھی اٹھ گیا۔ اب غلبہ محبت میں بجز ذات ساقی کے کچھ مطلوب نہ رہا اور تریکے اس رفیع مقام پر بواسطے میں ہوئے شر کہ محسوس کر کے جام ے کو زمین پر لڑھکا دیا۔"

(ص ۱۳۸)

یہاں صرف یہ دیکھیے کہ حسب ارشاد نبوی ذات الٰہی میں تفکر اس لیے ممنوع تھا کہ اس کی ذات انسانی عقل و ادراک سے بھی ماوراء ہے اور اب اس عبارت میں ذات الٰہی مطلوب ہے اور اس کے متوالے معرفتِ منعم پہ ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں۔ ذات الٰہی پر پڑے ہوئے تمام حجابات اٹھ گئے ہیں۔ اس عبارت کو پوری طرح وہی سمجھ سکتا ہے جس نے فلسفیانہ تصوف کا مطالعہ کیا ہو سنت نبوی کی پیروی کی تلقین اور اچھی اچھی باتیں اس کتاب میں بھی ہیں۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کتاب میں بھی موضوع احادیث سے احتراز نہیں کیا گیا ہے مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

لِیْ مع اللّٰہِ وقت لا یسعنی فیہ	میرے لیے اللہ کے ساتھ ایک ایسا وقت بھی
ملک مقربٌ ولا نبی مرسل	ہے جس میں نہ کسی مقرب فرشتے کا گزر ہے نہ کسی
(ص ۳۳)	نبی مرسل کا۔

یہ ایک موضوع حدیث ہے جو درایۃً بھی نادرست ہے۔ اس میں غلط انتسابات بھی ہیں۔ اس طرح بسم اللہ ہی غلط ہو گئی ہے۔ اصل کتاب کے پہلے صفحہ پر وَمَا خلقت الجن والانس الا لیعبدون کے بارے میں لکھا ہے:۔

"حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لیعبدون کی تفسیر لیعرفون سے فرمائی ہے اور صاحب جلالین نے اپنی تفسیر میں اسی کو لیا ہے۔ (ص ۹)

صاحب جلالین کی طرف یہ انتساب غلط ہے۔ میرے پاس تفسیر جلالین مطبوعہ ہند بھی ہے اور مطبوعہ عرب بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف بھی یہ انتساب صحیح نہیں ہے۔ تاریخی واقعہ کو حدیث قرار دیا گیا ہے۔

"حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر صحابی اپنی پیاس پر اپنے بھائی کی پیاس کو ترجیح دیتا رہا حتٰی کہ سب کے سب شہید ہو گئے اور پانی پیالہ میں باقی رہ گیا۔ یہ موقع جنگ کا واقعہ ہے" (ص ۱۸۸)

ایسی کوئی حدیث شریف نہیں ہے۔

مولانا تھانوی رح کی طرف ایک انتساب۔

"حضرت مرشدی نے فرمایا تھا کہ اُمَنّا معنے میں عشقنا کے ہے۔ (ص ۲۴۵)

اگر مولانا تھانوی رح کی طرف یہ انتساب صحیح ہے تو یہ تاویل نہیں بلکہ تحریف ہے۔ مثنوی مولانا روم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر آپ کو ماورائے بشریت قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے۔ قل انما انا بشر مثلکم (کہہ دیجیے کہ میں تمہاری طرح بشر ہوں) مثلیت کی تشریح اس کتاب میں پڑھیے۔

"یہ مثلیت ایسی ہے جیسے کہ ایک گلاس سڑی مٹی کا بنا ہوا اور ایک گلاس چاندی کا بنا ہوا اور ایسی سانچہ کا ایک گلاس تمام انمول جواہرات کو گلا کر ڈھال دیا گیا ہو تو وہ سڑی مٹی کا گلاس اگر یہ کہے کہ یہ جواہرات سے ڈھلا ہوا گلاس بھی ہماری طرح ایک گلاس ہے تو انتہائی بے وقوفی کی بات ہوگی۔ سڑی مٹی والا گلاس ذرا اپنے دام بازار میں لگوائے اور پھر انمول جواہرات والے گلاس کے دام لگوائے۔ اس کو تو دو پیسے ملیں گے اور اس گلاس کی قیمت سلطنت وقت بھی نہیں دے سکتا۔

گر بصورت آدمی انسان بُدے احمد و بوجہل ہم یکساں بُدے (ص ۳۰۸-۳۰۹)

یہ ہے دیوبندی تصوف جو بریلوی تصوف کو آنکھیں دکھاتا ہے۔ بہرحال یہ کتاب فلسفیانہ تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لیے قابل مطالعہ ہے۔

(بقیہ تکاثر)

نہ رہتے جس میں مشغولی ہو، بلکہ مقصد زندگی کو حاصل کرنے کی سعی کرتے "علم الیقین" کی ترکیب وہی ہے جو مسجد الجامع کی ہے یعنی موصوف صفت کی طرف مضاف ہے۔ امام رازی رح نے لکھا ہے کہ اس آیت کریمہ میں بے عمل علماء کے لیے عظیم تہدید موجود ہے۔

رویت جحیم

جہنم کی رویت کا فقرہ بھی مکرر ہے۔ "تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر (سن لو) اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے" یہ تکرار کیوں ہے؟ اس کا ایک جواب تو امام رازی رح نے یہ دیا ہے کہ یہ بھی تاکید کے لیے ہے یعنی وعید پر وعید ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ پہلی رویت دور کی ہے جب کفار و مشرکین دور سے شعلے اٹھتے اور بھڑکتے ہوئے دیکھیں گے اور دوسری

رویت یقین کی آنکھوں سے اس وقت ہوگی جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے۔ دور کی رویت کے لیے ذیل کی آیت دلیل ہے۔

"وہ جب دور سے ان کو دیکھے گی تو یہ اس کے غضب اور جوش کی آواز سن لیں گے۔ (الفرقان ۱۲)

دور سے جب دوزخ ان کو دیکھے گی تو یہ بھی اس کو دیکھیں گے اور قریب کا مشاہدہ اس وقت ہوگا جب انہیں ہانک کر دوزخ کے قریب لایا جائے گا "عین الیقین" یقین کی آنکھ سے مراد عینی مشاہدہ ہے۔

نعمتوں کے بارے میں سوال

ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (پھر ضرور اس روز تم سے نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی) "ثُمَّ" عربی نحو کے اعتبار سے حرف عطف ہے جو ترتیب و تراخی یعنی کسی چیز کے کسی دوسری چیز کے بعد ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس کا عام استعمال ہے لیکن یہ کبھی صرف کسی چیز کو الگ سے بیان کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اس صورت میں ترتیب اور تراخی مقصود نہیں ہوتی۔ یہاں مسئلہ یہ ہے کہ نعمتوں کے بارے میں سوال قیامت میں کس جگہ ہوگا؟ یہ آیت کفار و مشرکین کے جہنم رسید ہونے کے بعد ہے تو کیا ان سے نعمتوں کے بارے میں سوال جہنم میں ہوگا؟ امام رازیؒ نے یہاں دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک یہ کہ فرشتے ان سے دوزخ میں سوال کریں گے۔ اس قول کے لحاظ سے "ثم" (پھر) اپنے اصل معنے ہی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں "ثم" ترتیب کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ پھر ہم تمہیں یہ خبر بھی دے ہی دیتے ہیں کہ قیامت میں تم سے اللہ کی نعمتوں کے بارے میں بھی جواب طلبی ہوگی کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی حساب کتاب کے وقت ہوگی اور یہ جواب طلبی کافر سے بھی ہوگی اور مومن سے بھی۔ امام رازیؒ نے ان دو اقوال میں سے کسی قول کو ترجیح نہیں دی ہے بلکہ دونوں کے صرف دلائل بیان کر دیے ہیں ویسے دوسرا قول قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اصلاً جواب طلبی حساب کتاب ہی کے وقت کی جائے گی۔ یہاں ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ "نعیم" سے کون سی نعمتیں مراد ہیں کسی نے کسی نعمت کا ذکر کیا ہے اور کسی نے کسی دوسری نعمت کا امام رازی نے ایک صفحے میں اس کی تفصیل دی ہے لیکن خود جس بات کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ تمام اقوال بطور تمثیل ہیں نہ کہ بطور تعیین۔ اس سے مراد اللہ کی تمام نعمتیں ہیں جو اس نے انسان کو عطا کی ہیں، خواہ ان کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہو یا باطن سے، یا وہ خدا کی کھلی ہوئی نعمتیں ہوں یا چھپی ہوئی۔ یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطور احسان خود ہی فرمایا ہے

"کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور

اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔ (لقمان ۲۰)

ان نعمتوں کو کون گن سکتا ہے؟

کوئی گن سکتا نہیں ان کو کبھی نعمتیں اللہ کی ہیں بے شمار

سید قطب شہید کا تاثر

اس سورہ کی تلاوت کرو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ڈرانے والا (نذیر) بلند مقام پر کھڑا ہو کر اپنی بلند آواز سے نیند کے ماتوں کو پکار رہا ہے، جگا رہا ہے۔ ہر آیت میں ڈرانے والے کے غیظ و غضب کی بجلی کوندرہی ہے۔ اور جب آنکھوں کے سامنے آٹھ بجلیاں بیک وقت لہراتی ہیں تو بدن پر جھر جھری طاری ہو جاتی ہے۔

سورۃ الحدید کی دو آیتیں

اس حقیر کے خیال میں اس سورہ کی تشریح سورۃ الحدید کی آیت ۲۰-۲۱ میں پڑھی جاسکتی ہے۔ میں ان دو آیتوں کے صرف ترجمے یہاں نقل کرتا ہوں:۔

خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی، اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشتکار خوش ہوگئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی پھر وہ بھس بنکر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔ دوڑو، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (الحدید ۲۰-۲۱)

نوٹ:۔ "روڈ ٹو مکہ" کے مصنف جناب محمد اسد کے اسلام قبول کرنے کی ایک سرگزشت "خوش حال بے چینی" کے عنوان سے زندگی رامپور جولائی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ آخری چیز جس نے انہیں قرآن کے کلام اللہ ہونے پر مطمئن کیا وہ سورۃ تکاثر تھی۔ یورپ کی خوش حال بے چینی ان کے لیے معمہ بنی ہوئی تھی سورۃ تکاثر کے مطالعہ نے حل کر دیا

MONTHLY
Regd. No. D.NO. (DN)-348

ZINDGI-E-NAU

1525, SUIWALAN
R.N. .NO. 42893/84

NEW DELHI-110002
NOV. 85

صرف نائٹیل دہلی آرٹ پریس میں چھپا۔

ماہنامہ زندگی نو

نئی دہلی۲

تفہیمات حصہ اول

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(مولانا مودودی کے چند مقالات و مضامین کا مجموعہ)

توحید و رسالت پر دلوں کو مطمئن کرنے والے دلائل ہ اتباع و اطاعت رسولؐ پر سیر حاصل بحث ہ امت مسلمہ کا مقصد وجود اور اسلام کے تقاضے ہ منکرین حدیث و سنت کے حقیقی خدوخال ہ آزادی و رواداری کا صحیح مفہوم ہ اسلامی لٹریچر میں ایک بیش قیمت کتاب ہ آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت۔

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

افادات شاہ ولی اللہ دہلویؒ
ترجمہ: مولانا صدرالدین اصلاحی

فقہی مسائل میں اختلاف کیوں؟ ہ اختلافات کی نوعیت اور ان کا حل ہ اتحاد بین المسلمین کے لیے ایک عظیم پیش کش ہ آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت۔

شہادتِ حق

ہ امت مسلمہ کا مقصدِ وجود کیا ہے ہ اسلام کو مقصد زندگی بنانے کے تقاضے
ہ امت مسلمہ کی انقلابی حیثیت ہ اصلاح امت کے لیے ایک انقلاب انگیز کتاب

مدیر: سید احمد قادری

جلد: ۳	ربیع الاول ۱۴۰۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۵ء	شمارہ: ۶

مضامین کی ترسیل اور دیگر ادارتی امور کے لیے
جناب سید احمد عروج قادری، مدیر "زندگی نو" گھیر سیف الدین خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یو پی)

دفتر ماہنامہ زندگی نو ۱۵۲۵ سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۶۵۳۱۲ ۔ ۲۶۲۲۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

کریم نگر (اے پی) سے ایک جدید تعلیم یافتہ صاحب نے لکھا ہے :۔

دعوت کا مسلم پرسنل لا نمبر ۱۶ر جولائی تا ۲۲ر جولائی کے ص ۶ پر اے ایم فاضلی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہائر مولا کشمیر کا جائزہ جو محمد احمد خاں بنام شاہ بانو کے کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ پر شائع ہوا ہے اس میں موصوف نے مہر کی دو قسموں کی اس طرح تقسیم فرمائی ہے۔

"مہر معجل وہ مہر ہے جس کے انعقاد کا شادی سے یا اس کے بعد کسی بھی وقت مطالبہ کر سکتی ہے جبکہ مہر مؤجل کی ادائیگی طلاق یا موت کی صورت میں رشتۂ ازدواج کے منقطع ہونے پر کی جاتی ہے"

براہ کرم وضاحت فرمائیے کہ اگر مہر مؤجل کے ساتھ نکاح کا انعقاد عمل میں آیا ہو تو کیا ازروئے شرع شوہر بیوی کے مطالبہ پر مہر مؤجل ادا کرنے سے انکار کر سکتا ہے اور کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مہر مؤجل ادا کرنا مجھ پر اس وقت ضروری ہوگا کہ تم کو طلاق دے دوں۔ اس سے پہلے مجھ پر مہر مؤجل ادا کرنا ضروری نہیں ہے"

سپریم کورٹ کے فیصلے میں بھی مہر کے بارے میں اسی طرح کا خیال ظاہر کیا گیا ہے جیسا محترم اے ایم فاضلی صاحب نے لکھا ہے۔ اسی حقیر نے جب سپریم کورٹ کے فیصلے کا ترجمہ پڑھا تھا اسی وقت ارادہ کیا تھا کہ مہر معجل مؤجل پر اظہار خیال کروں گا۔ مکتوب بالا نے مزید تحریک پیدا کی۔

سپریم کورٹ کے فیصلے میں ہے :۔

"الٰہ آباد ہائی کورٹ کے مکمل بنچ کے ایک فیصلے کی اپیل میں پریوی کونسل نے مقدمہ حمیرہ بی بی بنام زبیدہ بی بی میں مہر کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مہر مسلمان قانون کے تحت شادی کی حیثیت عرفی کے تعین کا ایک لازمی جزو ہے۔ ایسا جزو کہ قیام نکاح کے وقت اس کے عدم تعین کی صورت میں قانون یہ کہتا ہے کہ اس کا تصفیہ متعین اصولوں کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ یہ شادی کی ایک شرط سمجھی جاتی ہے اور اصولی طور پر اس کی ادائیگی ہم بستری (وطی) سے پہلے کر دینی چاہیے۔ لیکن قانون اسے دو حصوں میں تقسیم کر دینے کی اجازت دیتا ہے۔ معجل اور مؤجل۔ مہر معجل جو بیوی کی مباشرت سے پہلے ادا کر دی جانی چاہیئے اور دوسرا حصہ یعنی مہر مؤجل جس کی ادائیگی زوجین میں سے کسی ایک کے انتقال یا طلاق کے سبب رشتہ زوجیت کے انقطاع کی صورت میں لازم ہو جاتی ہے۔"

پریوی کونسل کی یہ تحریر زیادہ واضح ہے۔ پھر بھی فقہی قانون کی پوری توضیح نہیں ہوتی۔ "محمڈن لا" پر لکھی ہوئی کتابوں میں مہر معجل اور مہر مؤجل کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ مہر مؤجل کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ طلاق کے بعد ادا کیا جائے۔ مکتوبہ بالا خط میں جو سوال کیا گیا ہے وہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

فقہ کی کتابوں میں مہر کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ پورا معجل۔ پورا مؤجل۔ کچھ معجل، کچھ مؤجل۔ یعنی مہر پورا کا پورا فوراً ادا کیا جائے یا پورا کا پورا مہر بعد کو تاخیر سے ادا کیا جائے اور تیسری قسم یہ ہے کہ مہر کا کچھ حصہ نکاح کے بعد فوراً ادا کیا جائے اور کچھ حصہ بعد کو تاخیر سے ادا کیا جائے۔

فقہ کی کتابوں میں مہر مؤجل کی بھی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک وہ جس میں مہر ادا کرنے کی مدت مقرر کر دی گئی ہو مثلاً چھ ماہ یا ایک سال۔ دوسری یہ کہ مطلق ہو، کوئی مدت مقرر نہ کی گئی ہو۔ ان تینوں کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادائے مہر کے بارے میں یہ بتا دیا جائے کہ قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اصولاً مہر کو معجل ہی ہونا چاہیئے یعنی جو مہر مقرر ہو اس کو تعین کے ساتھ فوراً ادا کر دیا جائے۔ جس بیوی سے مباشرت کر لی گئی ہو اس کو طلاق سے پہلے مہر ادا کر دینے کی بات تو قرآن کریم میں ملتی ہے لیکن ایسی عورت کو طلاق کے بعد مہر دینے کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ مہر پہلے ہی ادا کر دینا چاہیئے۔ سورۃ النساء آیت ۲۰ میں ہے :-

---

"اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کرلو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لینا، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کرکے واپس لوگے؟ اور آخر تم اسے کس طرح لے لوگے جب کہ تم اپنی بیوی سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں؟"

طلاق کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے سورۃ البقرہ میں بھی کہا گیا ہے:۔

"اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو؟"

ان دونوں آیتوں میں طلاق سے پہلے مہر ادا کر دینے کا ذکر ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ بیوی کو تنگ کرکے ادا کیے ہوئے مہر سے کچھ واپس نہ لیا جائے۔ احادیث نبوی کے مطالعہ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ عہدِ رسالت میں لوگ مہر پہلے ہی ادا کر دیا کرتے تھے اور دوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پورا مہر یا مہر کا کچھ حصہ فوراً ادا کر دینے کی ترغیب دیتے تھے۔ ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کیا تو خلوت صحیحہ سے پہلے حضرت علی کو مہر ادا کرنے کی ترغیب دی۔ ایک حدیث میں ہے:۔

مشکوٰۃ کتاب النکاح باب الصداق میں بخاری و مسلم کے حوالے سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا کہ یا رسول اللہ میں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا۔ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ دیر تک کھڑی رہیں۔ وہاں ایک صحابی موجود تھے انھوں نے کھڑے ہو کر کہا یا رسول اللہ اگر آپ کو ضرورت نہیں تو اس عورت کا نکاح مجھ سے کر دیجیے۔ آپ نے فرمایا کیا تمہارے پاس مہر میں دینے کو کچھ ہے انھوں نے کہا میرے پاس میرے ازار (تہمد) کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تلاش کرو۔ خواہ وہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو انھوں نے تلاش کیا لیکن لوہے کی انگوٹھی بھی نہ تھی تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمھیں کچھ قرآن یاد ہے؟ انھوں نے کہا۔ ہاں فلاں فلاں سورۃ یاد ہے۔ آپ نے فرمایا۔ جاؤ میں نے اس عورت سے تمہارا نکاح کر دیا۔ اس کو قرآن کی وہ سورتیں سکھاؤ۔

اس اہم حدیث سے جو مسائل نکلتے ہیں ان سے قطع نظر، یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ فوراً مہر ادا کرنے کے لیے آپ نے ایک لوہے کی انگوٹھی تلاش کروائی۔ اگر مہر موجل کا رواج ہوتا تو آپ دس پانچ درہم میں اس کا

نکاح کر دیتے۔ کچھ تلاش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اسی طرح خلع کے جو واقعات حضورؐ کے سامنے پیش ہوئے ان میں بھی یہ ہے کہ شوہروں نے مہر پہلے ہی ادا کر دیا تھا۔ لعان کے واقعہ میں بھی یہ ملتا ہے کہ شوہر نے مہر پہلے ہی ادا کر دیا تھا۔ ان سب کی تفصیل موجب طوالت ہوگی۔ خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل بھی یہی تھا کہ آپ نے ازواج مطہرات کے مہر نکاح کے وقت ہی ادا کر دیے تھے۔

قرآن کریم کی آیتوں اور ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کو معجل ہی ہونا چاہیے اور یہ چیز اس درجہ واضح ہے کہ اس بات میں فقہائے کرام کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ مہر کی تاجیل (تاخیر) صحیح بھی ہے یا نہیں؟

بدایۃ المجتہد ج ۲ کتاب النکاح فصل صداق میں ہے:۔

"رہی مہر میں تاجیل (تاخیر) تو فقہاء کی ایک جماعت نے اس کو بالکل ناجائز قرار دیا ہے اور ایک جماعت نے اس کی اجازت دی ہے اور ان کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ مباشرت سے پہلے مہر کا کچھ حصہ ادا کر دیا جائے۔ امام مالک کا مسلک یہی ہے۔ جن لوگوں نے مہر مؤجل کو جائز قرار دیا ہے وہ دو جماعتوں میں منقسم ہیں۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ محدود مدت تک تاخیر جائز ہے امام مالک کا مسلک یہی ہے۔ دوسری جماعت نے موت یا فراق تک تاخیر کو جائز کہا ہے۔ امام اوزاعی کا یہی مسلک ہے۔

ابن قدامہ کی المغنی ج ۶ کتاب الصداق میں ہے:۔

اور جائز ہے کہ صداق (مہر) معجل اور مؤجل ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ مہر کا بعض حصہ معجل اور بعض حصہ مؤجل ہو۔

مہر اگر مؤجل ہو اور مطلق ہو یعنی کوئی مدت مقرر نہ کی گئی ہو تو اس کے بارے میں فقہاء کی یہ رائیں نقل کی گئی ہیں:۔

(۱) امام احمد نے یہ کہا ہے کہ اگر کسی نے مہر عاجل و آجل پر نکاح کیا ہو یعنی مہر کا کچھ حصہ معجل ہو اور کچھ مؤجل اور مؤجل کی کوئی مدت مقرر نہ ہو تو یہ مؤجل حصہ یا تو موت کی صورت میں ادا کیا جائے گا یا زندگی میں رشتۂ ازدواج منقطع ہونے کی صورت میں ادا کرنا لازم ہوگا۔ یہی امام نخعی اور امام شعبی کا قول ہے۔

(۲) حسن بصری، حماد بن ابی سلیمان، ابوحنیفہ، ثوری اور ابو عبید کی رائے یہ ہے کہ غیر معینہ مدت باطل ہو جائیگی

اور مہر فوراً ادا کرنا واجب ہوگا۔

(۳) ایاس بن معاویہ اور قتادہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں مہر اس وقت واجب ہوگا جب شوہر بیوی کو طلاق دے دے، یا بیوی جس شہر میں رہتی ہو شوہر اس شہر سے نکل کر دوسرے شہر میں چلا جائے یا اس بیوی پر دوسری بیوی بیاہ لائے۔

(۴) امام مکحول، اوزاعی اور عنبری کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہمبستری کے بعد ایک سال میں مہر ادا کرنا لازم ہوگا۔

(۵) ابو الخطاب کی رائے یہ ہے کہ اس طرح کا مہر فاسد ہوگا اور شوہر کو مہر مثل ادا کرنا ہوگا۔ امام شافعیؒ کی رائے یہی ہے۔

مہر مؤجل کے بارے میں فقہاء کے درمیان اس قدر اختلاف دلیل ہے اس بات کی کہ مہر کی تاجیل کے لیے قرآن و حدیث میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادائے مہر کو طلاق تک یا زوجین میں کسی ایک کی موت تک مؤخر کرنے کے لیے عرف و عادت کے سوا کوئی اور دلیل پیش نہیں کی گئی ہے۔

فتاویٰ ہندیہ کتاب النکاح باب المہر میں ایک مستقل فصل، مہر کی تاجیل اور اس سے متعلق مسائل کے لیے موجود ہے۔ اس پوری فصل کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی میں بھی مہر کی تینوں شکلیں جائز قرار دی گئی ہیں۔ مہر معجل بھی ہو سکتا ہے، مؤجل بھی اور یہ بھی کہ اس کا بعض حصہ معجل اور بعض مؤجل ہو۔ اگر تاخیر کی کوئی معلوم مدت طے کی گئی ہو تو فقہائے احناف کے نزدیک یہ بالاتفاق جائز ہے۔ لیکن اگر کوئی معلوم مدت مقرر نہ کی گئی ہو تو اس کے جواز میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔ اکثر فقہائے احناف کے نزدیک جائز ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ فی نفسہ مدت معلوم ہے اور وہ طلاق ہے یا موت ہے۔ اس بودی اور کمزور دلیل کی بنا پر فقہ حنفی میں مطلق مہر مؤجل کی مدت طلاق یا موت قرار پا گئی ہے۔ محمڈن لا پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں یہی بات اس طرح داخل ہو گئی جیسے مہر مؤجل کی تعریف ہی یہ ہو کہ وہ طلاق کے بعد یا موت کے بعد ادا کیا جاتا ہے۔ بہر حال میری نظر سے کسی کتاب فقہ میں یہ بات نہیں گزری ہے کہ اگر بلا تعیین مدت مہر مؤجل ہو تو بیوی کو طلاق سے پہلے مہر کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔ چونکہ مہر کی مطلق تاجیل بلا دلیل ہے اس لیے اس کو جائز قرار دینے کے باوجود فقہائے احناف میں متعدد مسائل میں اختلافات ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مسئلہ کہ اگر پورا مہر بلا تعیین مدت مؤجل ہو تو کیا بیوی کو اس کا حق ہے کہ شوہر کو مباشرت سے منع کرے؟ اس کا جواب امام یوسف کے نزدیک یہ ہے کہ عورت کو اس کا حق ہے۔ در مختار میں ہے کہ

استحساناً فتوی اسی قول پر ہے۔ علامہ ابن عابدین نے لکھا ہے کہ صدر الشہید یہی فتویٰ دیتے تھے لیکن استاد ظہیر الدین کا فتویٰ یہ تھا کہ بیوی کو اس کا حق نہیں ہے کہ شوہر کو مباشرت سے روکے۔

مہر کو طلاق تک لازماً موخر کرنا عجیب ہے اور اس کو موت تک موخر کرنا عجیب تر ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو کتاب و سنت میں اس کی کوئی دلیل نہیں اور خاندانی نقصانات کے طور پر دیکھیے تو فہرست طویل ہے۔ طلاق تک تاخیر عجیب اس لیے ہے کہ قرآن کریم نے بیویوں کو مہر ادا کرنے کا حکم دیا ہے لیکن طلاق تک اس کو موخر کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مہر جبراً قہراً اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب بیوی، بیوی باقی نہیں رہتی، رشتہ ازدواج منقطع ہو چکتا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ شوہر کی موت تک تاخیر عجیب تر اس لیے ہے کہ مہر شوہر کو ادا کرنا چاہیے لیکن اس کے بعد اس کے ورثہ ادا کرتے ہیں۔ بسا اوقات اس میں جو جھگڑے ٹنٹے کھڑے ہوتے ہیں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں اور بعض صورتوں میں تو نہایت بے ہودہ واقعہ رونما ہوتا ہے۔ عورت کی موت کی صورت میں اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ عورت اپنے مہر سے خود فائدہ نہیں اٹھا سکتی بلکہ اس کے بعد اس کا شوہر اور دوسرے ورثہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس صورت میں بھی طرح طرح کے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

نقصانات میں بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ مہر ادا کرنے کا تاکیدی حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لیکن اس غلط رواج کی وجہ سے لوگوں نے اس شرعی حکم کو مذاق بنا لیا ہے۔ بڑی بڑی رقمیں لوگ اس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ یہ محض رسمی چیز ہے، لینا دینا کچھ نہیں ہے۔ اس طرح نکاح ہی بے برکت ہو جاتا ہے اور ایسے شوہر اپنی بدنیتی کی سزا بھی پائیں گے۔ دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ لڑکی والے، لڑکی کی ہمدردی میں ایسا کرتے ہیں حالانکہ یہ ہمدردی درحقیقت اس کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے۔ کیونکہ بیوی اگر شوہر کو پسند نہ آئی۔ اور دونوں میں نباہ کار دشوار بن گیا تو شوہر مہر کے ڈر سے طلاق نہیں دیتا اور نفرت کی وجہ سے تعلقات زناشوئی قائم نہیں رکھتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت معلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ صورت دونوں کے لیے بداخلاقی کا دروازہ بھی کھول سکتی ہے۔

اس حقیر کا خیال ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کو اس مسئلے پر غور کر کے اس کا کوئی مناسب حل پیش کرنا چاہیے۔ مکتوب بالا میں جو سوال کیا گیا ہے میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ بیوی اگر مہر مؤجل کا مطالبہ شوہر سے کرے تو شرعاً اس کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ میں جب تک طلاق نہ دے دوں مہر ادا نہیں کروں گا۔ اسی طرح میرے نزدیک

بیوی کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ شوہر سے مہر مؤجل ادا کرنے کا مطالبہ کرے اور طلاق تک یا موت تک اس کو مؤخر کرنے کی اجازت نہ دے۔

(۲)

تحفظ شریعت اور ہماری ذمہ داریاں

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳ تا ۷ نومبر ۸۵ء میں تحفظ شریعت کے متعلق حسب ذیل قرارداد منظور کی ہے۔

محمد احمد خاں اور شاہ بانو کے مقدمے کا جو فیصلہ سپریم کورٹ نے کیا ہے وہ ہم مسلمانوں کے لیے ایک بڑے شر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس شر میں ہمارے لیے خیر کا پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر پورے ملک میں تحفظ شریعت کی آمادگی اور بیداری پیدا ہو گئی ہے وہ حکومت سے بجا طور پر دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کو حذف کرنے یا اس سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دینے اور اسی طرح ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن صرف حکومت سے مطالبہ اور عدالتوں کے فیصلوں پر احتجاج کافی نہیں ہے بلکہ تحفظ شریعت کے سلسلے میں ہم مسلمانوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انھیں بھی پورا کرنا لازم ہے اور درحقیقت یہی اس مسئلہ کا حقیقی حل بھی ہے۔ ان ذمہ داریوں میں سے چند ذمہ داریاں یہ ہیں:۔

(۱) سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ مسلمان قوانین شریعت پر خود پوری طرح عمل کریں۔ مسئلہ نکاح کا ہو یا طلاق کا، مہر کا ہو یا عدت کا، نان نفقہ کا ہو یا وراثت کا۔ غرض ان تمام قوانین پر جنھیں مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے اور جن کے تحفظ کے لیے وہ بجا طور پر مضطرب ہیں اس طرح عمل کریں کہ ان کے گھروں میں عدل و انصاف اور پاکیزگی و طہارت کی بہار آجائے اور دوسرے لوگ یہ دیکھ کر محسوس کریں کہ مسلمان صرف عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر ان قوانین کی قدر کرتے ہیں۔

(۲) مسلمان اہل علم کی ذمہ داری یہ ہے کہ دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کے معاشرتی قوانین کا تقابلی مطالعہ کرکے معقول اور مدلل طور پر اسلامی قوانین کی افادیت، موزونیت، توازن و اعتدال اور ان کے حسن و جمال کو واضح کریں اور برادران وطن کے سامنے ان کی ایسی ترجمانی کریں کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس کی معقولیت محسوس کریں بلکہ تحفظ شریعت کی جدوجہد میں وہ ہمارا ساتھ دیں۔ اس کام کے لیے ترسیل و ابلاغ کے تمام ذرائع استعمال کرنے چاہییں۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے کتابچے، جامع تصانیف، سیمینار اور سمپوزیم

(باقی ص ۵۳ پر)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان مشابہت

اور اس کا ایک پراسرار پہلو

(ڈاکٹر محمد ذکی شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان یوں تو بہت سی باتوں میں مشابہت ہے لیکن بعض امور میں یہ مشابہت نہایت دلچسپ عجیب و غریب اور انتہائی پراسرار ہے۔ مثلاً اسی پہلو کو لے لیجیے :۔

حضرت عیسیٰ ؑ کے ظہور کی خبریں انبیاء سابقین دیتے رہے تھے اور بنی اسرائیل کو ان کی بعثت کا انتظار تھا، یہاں تک کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ان کے ظہور کی بشارت دی۔ ٹھیک یہی معاملہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی تھا کہ انبیاء سابقین آپ ؐ کے بھی ظہور کی خبریں دیتے رہے تھے اور بنی اسرائیل کو آپ کی بعثت کا شدت کے ساتھ انتظار تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ ؑ نے آپ کے ظہور کی بشارت دی پھر جس طرح نام لے کر تفصیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ ؑ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر دی تھی اسی طرح نام لیکر تفصیل کے ساتھ آپ نے بھی قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ ؑ کے ظہور کی خبر دی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ حضرت عیسیٰ ؑ ابھی زندہ ہیں اور قیامت کے قریب اس دنیا میں دوبارہ آئیں گے اور یہی اس مشابہت کا سب سے زیادہ عجیب و غریب اور پراسرار پہلو ہے۔ اس کا تعلق صرف مسلمانوں، عیسائیوں یا یہودیوں ہی سے نہیں بلکہ پوری دنیا کی قسمت اس سے وابستہ ہے۔

یہ پہلو خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اب سے تقریباً دو ہزار سال پہلے حضرت عیسیٰ ؑ کو کیوں زندہ اوپر

اٹھا لیا گیا اور ٹھیک قیامت کے قریب انہیں دوبارہ دنیا میں کیوں بھیجا جائے گا؟ اگر اس راز سے ذرا سا بھی پردہ اٹھ جائے تو ہم اس دور کی سائنسی ترقیات، پرپیچ مسائل اور قیامت کے قریب رونما ہونے والے بہت سے واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھ سکیں گے۔

لیکن اس راہ میں عام لوگوں کے لیے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کے بارے میں اختلافات اور متضاد نظریات نے معاملہ کو بری طرح الجھا دیا ہے اور حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے۔ اس لیے ہم نے یہاں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہود و نصاریٰ کا نظریہ

دراصل اختلاف کی ابتدا اسی وقت ہو گئی تھی جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تھا۔ کیونکہ چند لوگوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل نے عام طور پر ان کی رسالت کو تسلیم نہیں کیا تھا اور انہیں مسیح ماننے کی بجائے ان کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ البتہ جو لوگ ان پر ایمان لائے وہ "انصار" کے نام سے مشہور ہو گئے تھے [1]

رہا یہ سوال کہ حضرت عیسیٰ نے کیا پیغام دیا اور ان کے ماننے والوں کا ان کے بارے میں کیا عقیدہ تھا، آج یہ جاننے کا کوئی قدیم اور مستند ماخذ دنیا کے سامنے موجود نہیں کیونکہ اصل انجیل موجود نہیں اور حضرت عیسیٰ کی مختلف سوانح عمریاں جو اناجیل کے نام سے مشہور ہیں ان کی صحت پر خود عیسائی محققین کو یقین نہیں۔ بہرحال یہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کو جس حیثیت سے پیش کرتی ہیں اور موجودہ عیسائیوں کا جو عقیدہ ہے اسی کا خلاصہ بیان پیش کیا جا رہا ہے۔

بنی اسرائیل تین ہستیوں کے منتظر تھے

بائبل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل کو تین ہستیوں کے ظہور کا انتظار تھا۔ (۱) مسیحؑ کا (۲) ایلیاہ اور (۳) ایک عظیم الشان رسول کا، جو بنی اسرائیل میں اس درجہ فائبانہ متعارف تھا کہ اس کی طرف "وہ نبی" (THE PROPET) یا "النبی" کہہ کر اشارہ کر دینا کافی سمجھا جاتا تھا اور سننے والے سمجھ جاتے تھے کہ اس سے کون سا رسول یا نبی مراد ہے؟

---

[1] یہی معاملہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ہوا جب کہ آپ کے بیشتر مخاطبین نے آپؐ کی رسالت کا انکار کیا اور مدینہ کے لوگ آپ پر ایمان لائے اور "انصار" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

بنی اسرائیل میں صدیوں سے یہ روایت چلی آرہی تھی کہ ان میں ایک فرماں روا نجات دہندہ پیدا ہوگا جو انہیں ظلم و ستم سے چھٹکارا دلائے گا اور اس کے عہد میں ایسا انصاف اور امن و امان قائم ہو جائے گا کہ ایسا کبھی نہ ہوا ہوگا[1] اور مفسرین بائبل اس پیش گوئی کو حضرت عیسےٰ ہی کے حق میں سمجھتے ہیں جس کا ذکر اس طرح ہے :

دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی۔ (یسعیاہ، باب، ۱۴) ایلیاہ (الیاس) ایک نبی گزرے ہیں جن کے بارے میں بائبل میں ہے کہ انہیں ایک (غیبی) آگ کے بگولے میں۔ آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا[2] اور یہ کہ وہ حضرت مسیحؑ کے ظہور سے پہلے پھر دنیا میں بھیجے جائیں گے جیسا کہ کتاب ملاکی میں تصریح ہے[3]

اور "اس نبی" کے بارے میں علماء بائبل کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ نبی ہے جس کے ظہور کی خبر خداوند نے حضرت موسےٰؑ کی معرفت یوں دی تھی۔

میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا۔ (استثنا باب ۱۸)

ان ہی تینوں ہستیوں کا بنی اسرائیل کو انتظار تھا کہ یوحنا (یعنی یحییٰؑ) ظاہر ہوئے اور لوگوں کو بپتسمہ دینے لگے تو یہودیوں نے یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ یہ شخص ان تین میں سے کوئی تو نہیں کچھ کاہنوں کو بھیجا۔ ان کاہنوں اور یوحنا کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ بائبل کے الفاظ میں یہ ہے :۔

(کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟) تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیا؟

---

[1] عیسائی علماء اور مفسرین کا کہنا ہے کہ یسعیاہ باب ۱۔ ۹ میں اسی مسیح کے ظہور کی خبر دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر بائبل (A Commentary on The Holy Bible, edited J.R. Dummelow, London, 1944. P. XLV-XLVII

[2] ۲۔ سلاطین باب ۱۱

[3] دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا اور وہ باپ کا دل بیٹے کی طرف سے اور بیٹے کا باپ کی طرف مائل کرے گا۔ (ملاکی، باب، ۴، ۵)

ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ ... انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟ یوحنا نے جواب دیا میں ان سے کہا کہ میں پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں۔ تمہارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے جسے تم نہیں جانتے یعنی میرے بعد کا آنے والا جس کی جوتی کا تسمہ میں کھولنے کے لائق نہیں ...

(انجیل یوحنا، باب ۱، ۱۹-۲۷)

حضرت عیسےٰ کو ایک جماعت نے مسیح تسلیم کرلیا

ایلیاہ کے بارے میں انجیل کی رائے

پھر جب حضرت عیسےٰؑ مبعوث ہوئے تو ایک جماعت نے انہیں مسیح مان لیا اور ان پر ایمان لے آئی۔ لیکن یہودیوں نے عام طور پر مخالفت کی اور یہ اعتراض بھی کیا کہ حضرت عیسےٰؑ مسیح کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ پیشین گوئی کے مطابق ابھی تک ایلیاہ ظاہر نہیں ہوئے۔ یہ اعتراض جب حضرت مسیح کے پیروؤں نے خود حضرت عیسےٰ کے سامنے نقل کیا تو انھوں نے جواب دیا۔

ایلیاہ البتہ آئے گا اور سب کچھ بحال کرے گا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ایلیاہ تو آچکا اور انھوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ابن آدم بھی ان کے ہاتھ سے دکھ اٹھائے گا۔ تب شاگرد سمجھ گئے کہ اس نے ان سے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی بابت کہا ہے۔

(انجیل متی، باب ۱۷، ۱۱-۱۳)

اس جواب کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ ایلیاہ کا انتظار کرنا عبث ہے کیونکہ وہ بہ شکل یوحنا ظاہر ہو چکے اور مخالفین نے انہیں نہ پہچانا اور حاکم وقت نے انہیں قید کر دیا اور پھر ان کا سر کٹوا دیا۔

یہاں یہ بات بھی توجہ کے لائق ہے کہ حضرت عیسےٰؑ نے خود کو "ابن آدم" کہا ہے نہ کہ "ابن خدا"۔

تاہم ایلیاہ کے بارے میں حضرت عیسےٰ سے منسوب اس تاویل کو قبول کرنے میں تامل ہو سکتا ہے کیونکہ بائبل کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ ایلیاہ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا، اور ان کے دوبارہ آنے کا مطلب تھا کہ وہ زندہ آسمان سے اترتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ اگر ایلیاہ اور یوحنا کو ایک ہی شخصیت مان بھی لیا جائے تو یوحنا کی تو ولادت ہوئی تھی نہ کہ آسمان سے اترے تھے۔

غالباً اسی تاویل سے مطمئن نہ ہو کر بعض مفسرین کو یہ کہنا پڑا کہ دراصل حضرت مسیح کی ولادت سے پہلے

یوحنا کا وہی رول تھا جو جناب مسیحؑ کے ظہورِ ثانی کے وقت ایلیاہ کا ہوگا یعنی جب مسیح دوبارہ ظاہر ہوں گے تو اس سے پہلے ایلیاہ کا ظہور ہوگا۔[1]

بہرحال اتنی بات تو واضح ہے کہ یہ متضاد تاویلات اور توجیہات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتیں ایک طرف تو صاف صاف کہا جا رہا ہے کہ وہ ایلیاہ جو آسمان پر آگ کے بگولے میں اٹھا لیے گئے تھے مسیح کی آمد سے پہلے ظاہر ہوں گے اور دوسری طرف یہ بھی تسلیم کیا جا رہا ہے کہ وہ نہیں آئے۔ پھر یہ تاویل کی جاتی ہے کہ ایلیاہ سے مراد یوحنا ہیں اور یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ مسیح کے ظہور ثانی سے پہلے آئیں گے۔ اب بتایئے ان متضاد بیانات میں سے کون سا مانا جائے؟

اور مسائل کی طرح بائبل نے ان متضاد بیانات سے گویا مسئلہ کو حل کر دیا۔ ٹھیک یہی معاملہ "اس نبی" کے ساتھ بھی کیا گیا ہے۔ جس کے ظہور کی حضرت موسیٰ نے خبر دی تھی۔ ملاحظہ فرمایئے۔

بائبل میں تصریح ہے اور شارحین کا اس پر اتفاق ہے کہ "وہ نبی" جس کے ظہور کی پیشین گوئی حضرت موسیٰ نے کی تھی اور "مسیح" دونوں الگ الگ شخصیات ہیں، اور یہودیوں نے ان دونوں کو ایک شخصیت کبھی نہیں سمجھا۔[2]

یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد مسیحی علماء کے لیے "اس نبی" کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنا ناگزیر ہوگیا یعنی ان پر یہ ذمہ داری آگئی کہ بتائیں کہ "وہ نبی" مبعوث ہوا یا نہیں، کیونکہ ان دو میں سے ایک یعنی مسیح تو ظاہر ہو چکے۔ یہ سوال بہت مشکل تھا کیونکہ یہ تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ "وہ نبی" مسیح سے پہلے ظاہر ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ یہ یہودی روایت کے صریحاً خلاف ہوتا جبکہ وہ مسیحؑ کے ظہور تک اس نبی کے منتظر تھے اور آج بھی ہیں۔ دوسری صورت وہ یہ اختیار کر سکتے تھے کہ کہہ دیتے کہ وہ مسیح کے بعد ظاہر ہوگا۔ اس کے معنے ہوئے کہ آئندہ جب وہ ظاہر ہوگا تو اس کی اطاعت لازم ہوگی، اور یہ کہ جناب مسیح کے بعد بھی خدا کا کوئی عظیم الشان

---

[1] اس توجیہ کے لیے ملاحظہ ہو، بائبل، انجیل یوحنا، حاشیہ ص۹۲

The Holy Bible : The Caxton publishing co. Ltd. London 1985

[2] دیکھیے تفسیر بائبل، مقدمہ ص۱۷۱×

اور یہ بات خود اس مکالمے سے بھی واضح ہے جو یہودی علماء اور یوحنا کے درمیان ہوا تھا (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے)

رسول آنے گا۔ یہ تسلیم کرنے کا مطلب تھا نجات "عیسائیت" ہی میں منحصر نہیں لیکن معلوم نہیں کیوں ان عیسائی علماء نے یہ موقف اختیار کرنا پسند نہیں کیا۔ یہ ایک کھلی حقیقت تھی جس سے صرف نظر کرنے کے بعد عیسائی علماء الجھن میں گرفتار رہ گئے اور متضاد باتیں کہنے پر مجبور رہ گئے۔ اب ملاحظہ فرمائیں ان کی عجیب و غریب قسم کی تضاد بیانی لیکن پہلے پیش گوئی کے الفاظ سامنے رکھ لیجیے۔ الفاظ یہ ہیں۔ (بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے اپنے الوداعی خطبے میں حضرت موسٰے نے فرمایا۔

> خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا ... اور خداوند نے مجھ سے کہا ... میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا
>
> (استثنا، ۱۸- ۱۵-۱۸)

یہ تو ممکن ہے کہ آپ کے نزدیک اس اقتباس کے بعض الفاظ تشریح طلب ہوں لیکن اتنا تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہاں ایک نبی کے ظہور کی خبر دی گئی ہے۔ یہ بات ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی انسان ان سطور کو پڑھ کر یا سنکر یقیناً یہی مطلب سمجھے گا جو آپ نے سمجھا ہے یعنی یہ کہ یہاں یہ خبر دی گئی ہے کہ آئندہ زمانے میں خداوند ایک نبی مبعوث فرمائے گا۔ اب دیکھیے اتنے صاف اور سادہ مفہوم کو شارحین بائبل نے کتنا الجھایا ہے۔ ان فقروں کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں "ایک نبی" سے کوئی ایک یا خاص نبی مراد نہیں بلکہ انبیاءؑ کا سلسلہ مراد ہے[1] جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ نہ تو حضرت موسٰے نے بنی اسرائیل کے بھائیوں میں ایک نبی کے ظہور کی خبر دی تھی اور نہ اس پیش گوئی کا کسی خاص نبی پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن مفسرین کی یہ توجیہ اسرائیلی روایات اور خود بائبل کی بے شمار تصریحات کے خلاف ہے[2] خود مفسرین بائبل کو اس کا احساس تھا کہ اس بے معنے توضیح کو کوئی بھی قبول نہیں کرے گا کیوں کہ یہاں "ایک نبی" سے "سلسلۂ انبیاءؑ" مراد لینے کے لیے کوئی بعید سے بعید قرینہ بھی موجود نہیں۔ اس کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں یقیناً یہ سوال گردش کرتا رہے گا کہ اس نبی کا کیا ہوا جس کی خبر موسے علیہ السلام

---

[1] مثال کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر بائبل ۱۳۰، بائبل (Cox Tom) حاشیہ ۱۷۰

[2] ابھی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے نزدیک مسیح اور "وہ نبی" دو علیحدہ علیحدہ شخصیات ہیں اور انہیں صدیوں سے ان دونوں کے ظہور کا انتظار تھا۔ تعجب تو اس پر ہے کہ یہ تشریح بھی اسی تفسیر میں موجود ہے۔

نے دی تھی؟ اور جب تک اس کا جواب انہیں نہ ملے گا لوگ "اس نبی" کا انتظار کرتے رہیں گے۔ چنانچہ اس خطرہ کے پیش نظر اب ان ہی مفسرین نے دوسرے ہی سانس میں یہ بھی لکھ دیا کہ "اس نبی" کے مصداق حضرت مسیحؑ ہی ہیں [1]

یہ تشریح گویا اسی نوعیت کی ہے جیسی بائبل کے مندرجہ ذیل فقرے کی۔

"دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی۔

(یسعیاہ ۷/۱۴)

کا کوئی یہ مطلب بیان کرنے لگے کہ یہاں کنواری کے بیٹے سے مراد ایک قوم ہے کوئی خاص فرد نہیں لیکن پھر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اس سے مراد حضرت عیسےٰ ہیں۔

ظاہر ہے دونوں مطلب صحیح نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی قوم مراد ہے تو اس کا حضرت عیسےٰؑ پر اطلاق نہیں ہو سکتا اور اگر مراد حضرت عیسےٰ ہیں تو پھر پوری قوم مراد لینے سے کیا مفہوم نکل سکے گا؟

بہرحال یہی کیا ساری بائبل میں اس قسم کی بے شمار مثالیں آپ کو مل جائیں گی جہاں مفہوم الجھانے کے لیے متضاد توجیہات کردی گئی ہیں تاکہ کوئی شخص حقیقت نہ پاسکے اور بھٹکتا رہے [2]

جب ایک بار "ہمت" کرکے متضاد توجیہات کردی گئیں تو ان علماء اور مفسرین نے ان تمام پیشین گوئیوں کو جو بائبل میں "اس نبی" کے بارے میں کی گئی تھیں حضرت مسیحؑ پر منطبق کر ڈالا اور اس جوش میں بنا پر انہیں اس کا خیال بھی نہیں رہا کہ خود عیسائی محققین بھی ان سے متفق نہیں ہوسکیں گے۔ چنانچہ جن عیسائی اہل علم نے آنکھیں کھول کر ان تحریروں کا مطالعہ کیا انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان پیشین گوئیوں کو حضرت

---

[1] دیکھیے تفسیر بائبل ۱۳۰ × ۷۷۶ - ۸۲۳ بائبل (Cax/on) حاشیہ ۱۷۰

[2] اس کی ایک مثال ہم گذشتہ مقالے میں دے چکے ہیں جہاں حضرت مسیحؑ کی ولادت کے سلسلے میں متضاد بیانات ملتے ہیں یعنی بقول انجیل

(۱) حضرت عیسےٰؑ کنواری مریم کے بیٹے تھے۔ (۲) یوسف بڑھئی کے بیٹے تھے۔

(۳) خدا کے بیٹے تھے۔

اب اگر کوئی ان فقروں کا مطلب سمجھ سکتا ہے تو سمجھ لے ورنہ کوشش تو یہی کی گئی ہے کہ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"

پر منطبق کرنے کی کوشش میں تحریف کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ پیشین گوئیاں جناب مسیح پر منطبق نہیں ہوتیں[1]۔
اور واقعہ بھی یہی ہے اور پیشین گوئیوں کو چھوڑیئے صرف زیر بحث پیشین گوئی ہی کو لے لیجیے۔ صاف معلوم ہو جائے گا
کہ نہ تو یہ حضرت عیسیٰ پر منطبق ہوتی ہے اور نہ اس تاویل کی گنجائش ہی نظر آتی ہے جو مسیحی علماء نے پیش کی ہے۔

تورات کی پیشین گوئی کا تجزیہ

آپ بائبل کی کتاب استثنا کے باب ۱۸ کے متعلقہ فقروں (۹ تا ۲۲) کا سرسری مطالعہ کر جائیے اور پھر غور فرمائیے۔ دیکھیے اس باب کے فقرہ ۱۸ میں ہے کہ خداوند نے موسیٰ سے خطاب فرماتے ہوئے فرمایا ہے کہ

> میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا۔ وہی وہ ان سے کہے گا۔

یعنی میں بنی اسرائیل کی طرف ان ہی کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا جو تیری یعنی حضرت موسےٰ کی مانند ہو گا۔

اب غور فرمائیے اس فقرے میں کون سا لفظ تشریح طلب ہے جس کا مفہوم حضرت موسیٰ پر واضح نہیں ہوا ہو گا؟ بظاہر حضرت موسےٰ "ان ہی کے بھائیوں" کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے ورنہ وہ خداوند سے پوچھتے کہ "ان ہی کے بھائیوں" سے کون لوگ مراد ہیں۔

اب اس پر خاص طور سے توجہ دیں کہ جب خدا کا قول حضرت موسےٰ ؑ قوم کے سامنے نقل کرتے ہیں تو الفاظ اور ان کی ترتیب الٹ جاتی ہے۔ فقرہ ۱۵ میں حضرت موسےٰ ؑ سے یہ الفاظ منسوب کر دیے گئے ہیں یعنی یہ کہ انھوں نے قوم سے کہا:-

خداوند تیرا خدا تیرے لیے "تیرے ہی درمیان سے"(۱) یعنی "تیرے ہی بھائیوں میں سے"(۲) میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا

دیکھیے خط کشیدہ ۱ کے الفاظ "تیرے ہی درمیان سے" زائد ہیں اور ان ہی کی مزید توضیح کے لیے "یعنی" کا لفظ بڑھا کر خط کشیدہ ۲ کے الفاظ "تیرے ہی بھائیوں میں سے" بیان کیے گئے ہیں (جو فقرہ ۱۸ میں خدا سے منسوب ہیں)

---

[1] ملاحظہ فرمائیں ول ڈوراں "قیصر و مسیح" ۵۵۳۔۵۵۷۔ (Caeser and Christ)
نیز ول ڈوراں "عہد لوئی چہار دہم" ۱۱۲ سے ۱۱۷ (The Age of Louis XIV)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مخاطبین (یعنی بنی اسرائیل) "تیرے ہی درمیان سے" کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھ سکے یا نہیں سمجھ سکتے تھے اس لیے حضرت موسےؑ نے ان کی وضاحت اگلے جملے کی ہے

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "تیرے ہی درمیان سے" میں کیا اشکال تھا؟ کیا مخاطبین نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ان الفاظ سے مراد ہے کہ ان ہی یعنی بنی اسرائیل ہی میں سے ایک نبی مبعوث کیا جائے گا؟ ورنہ بتایئے وہ ان الفاظ کا اور کیا مطلب نکال سکتے تھے؟ کیا وہ "اپنے ہی درمیان" سے مراد بنی اسمٰعیل سمجھ لیتے' جو اس امکانی غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت پیش آگئی ۔

اور لطف یہ کہ اس فقرہ کی تشریح کے لیے (یا یوں کہیے غلط فہمی دور کرنے کے لیے) جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ تشریح کرنے کی بجائے خود وضاحت طلب ہیں' یعنی اگر کوئی نہ سمجھ سکتا ہوگا تو یہ کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں سے کون لوگ مراد ہیں۔ بنی اسمٰعیل یا بنی آدم ہونے کی حیثیت سے کسی دوسری قوم کے لوگ ۔ بالفاظِ دیگر اگر تشریح طلب الفاظ ہوسکتے تھے تو وہ یہ ہیں "تیرے (یا ان کے) بھائیوں میں سے" نہ کہ "تیرے ہی درمیان سے" اور یہاں معاملہ الٹا نظر آرہا ہے' وہ یہ کہ بالکل واضح الفاظ کی وضاحت ان الفاظ سے کی جارہی ہے جو خود محتاجِ وضاحت ہیں ۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی محققین نے جو یہ کہا ہے کہ بائبل میں جابجا تحریف کی گئی ہے' بالکل صحیح ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ حضرت موسےؑ نے خدا کا قول اسی طرح نقل کیا ہوگا جس طرح انھوں نے سنا تھا یعنی یہ کہ :۔

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا ۔

اور یہ ممکن ہے کہ "تیرے ہی بھائیوں" کی تعیین اور توضیح کے لیے انھوں نے یوں فرما دیا ہو کہ تیرے ہی بھائیوں میں سے یعنی بنی اسمٰعیل سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا ۔

اور پھر بعد میں تحریف کرنے والوں نے اس فقرے کو وہ شکل دے دی ہو جو اس وقت بائبل میں موجود ہے ۔ (واللہ اعلم)

اب آگے دیکھیے' اس "نبی" کی ایک ظاہری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ حضرت موسےؑ کی مانند ہوگا' یعنی "اس نبی" کی سیرت حضرت موسےؑ کی سیرت سے بہت مشابہ ہوگی ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے' کیا حضرت عیسےؑ کی سیرت حضرت موسےؑ کی سیرت سے مشابہت رکھتی ہے' آیئے کہ

کسی دوسرے نبی کی سیرت نہ رکھتی ہو؟ دونوں کی سیرت خود بائبل میں محفوظ ہے۔ ہر شخص ایک ہی نظر میں فیصلہ کر سکتا ہے۔ یہاں ہم صرف چند امور کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں

حضرت موسےؑ کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کا پیغام ایک ایسی قوم کو پہنچایا جو بہت طاقتور تھی، اس نے ان کی مخالفت کی۔ پھر مقابلہ ہوا، نظریاتی تصادم میں حضرت موسےؑ غالب رہے اور پھر اپنے ماننے والوں کے ساتھ انھوں نے ہجرت کی، ان کے دشمنوں نے تعاقب کیا۔ لیکن وہ ان تک نہیں پہنچ سکے اور سب تباہ و برباد ہوئے۔ حضرت موسےؑ اور ان کی قوم نے ان ظالموں کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ اس کے بعد حضرت موسےؑ اپنی قوم کی رہنمائی کرتے رہے اور فطری طریقے سے ان کی وفات ہوئی یعنی کوئی دشمن ان کو قتل نہیں کر سکا۔

اب آپ انجیل کے صفحات پڑھ جائیے۔ یہ نمایاں اور صاف حضرت عیسےٰ کی سیرت میں نظر نہیں آئیں گے بلکہ اس کے برعکس حضرت عیسےٰؑ کو (بقول انجیل) چند لوگوں نے گرفتار کیا اور نہایت آسانی کے ساتھ صلیب پر چڑھا دیا، ان کے ساتھی بھاگ گئے اور ان کے دشمن انہیں قتل کرنے یا صلیب پر چڑھا دینے میں کامیاب ہو گئے دنیا نے تو (بقول انجیل) یہی دیکھا کہ بے بسی سے انھوں نے جان دے دی۔

اب آپ دیکھ لیجیے حضرت موسےٰ سے ان کی مشابہت کس پہلو سے نکل رہی ہے[1]

اگر اس کی یہ تاویل کی جائے کہ حضرت مسیح نے اپنے ماننے والوں کو دشمنوں سے ظاہری چھٹکارا نہیں دلایا بلکہ گناہ سے نجات دلادی تو بات جمے گی نہیں کیونکہ حضرت موسےٰؑ کو تو ظاہری طور پر بھی غلبہ حاصل ہوا تھا جو بقول انجیل حضرت عیسےٰ کو حاصل نہیں ہوا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تحریف مصنفین انجیل نے کی ہو یا بعد کے مسیحی علماء اور مفسرین نے، متضاد باتیں مولفین انجیل نے لکھی ہوں، یا بعد کے لوگوں نے یہ کام نسلی عصبیت اور کتمان حق کی نیت سے کیا گیا ہو یا اور کوئی مقصد رہا ہو، اس کا نقصان سب سے زیادہ خود عیسائیوں ہی کا ہوا ہے کیونکہ ان تحریفات اور متضاد بیانات سے خود حضرت عیسےٰ کی شخصیت مستور ہو گئی۔ خود ان کے عہد میں ایمان لانے والوں کے عقائد خواہ کچھ بھی

---

[1] اس کے برعکس آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حضرت موسےٰ کی سیرت میں اتنی واضح مشابہت ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں جون ۱۹۸۳ء سے مئی ۱۹۸۴ء کے "زندگی" کے شمارے ملاحظہ فرمالیں جہاں ہم نے ساٹھ سے زیادہ امور میں مشابہت دکھائی ہے۔

سے ہوں۔ جب سے تحریف شدہ انجیلیں عام ہوئی ہیں لوگوں کے عقائد بدل گئے ہیں۔ انہیں اللہ کے ایک
جلیل القدر رسول کی بجائے خدا کا بیٹا خدا اور معبود بنا دیا گیا۔ ان کی تعلیمات مسخ کر دی گئیں اور جو پیغام
انھوں نے دیا تھا اس سے استفادہ نہیں کر سکے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی طرف وہ باتیں منسوب کر دی گئیں جو انھوں نے کبھی نہیں کہی تھیں۔

دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ جس نبی کے ظہور کی خبر حضرت مسیح نے دی تھی اس کا خیر مقدم کرنے کی بجائے
اس کی مخالفت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اس طرح ہدایت سے محروم ہو گئے اور یہ اس کا سلسلہ قرب قیامت
تک دراز ہو گیا کیونکہ حضرت عیسیٰ کی حیات اور تعلیمات کے بارے میں ہی غلط باتیں نہیں پھیلائی گئیں
بلکہ ان کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے معاملے کو بھی الجھا دیا گیا۔

مصلوب ہونے کی روایت اور اس کے اثرات

انجیل کی روایت کے مطابق یہودیوں نے حضرت مسیح کے خلاف سازش کی اور حاکم وقت پیلاطس نے
انھیں صلیب چڑھا دینے کا حکم دے دیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور جناب مسیح نے صلیب پر جان دے دی۔ ان
کی زبان پر آخری وقت بقول انجیل یہ الفاظ تھے:۔

ایلی ایلی۔ لما شبقتنی یعنی اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ (متی باب ۲۷، ۴۶)

اس کے بعد ان کی لاش ایک قبر میں رکھ دی گئی لیکن جب تیسرے دن رسوم مقررہ کے
مطابق تدفین کے لیے دیکھا گیا تو لاش نہیں ملی۔ یہاں دو روایتیں ملتی ہیں۔ یہود تو کہتے ہیں
کہ حضرت مسیح کے ماننے والے خفیہ طور پر ان کی لاش نکال لے گئے اور مشہور کر دیا کہ وہ
زندہ ہو گئے ہیں۔ (متی باب ۲۸، ۱۱، ۱۵)

البتہ مسیحی روایت یہ ہے کہ وہ واقعی زندہ ہوئے بعض شاگردوں کے سامنے ظاہر بھی
ہوئے۔ اگرچہ دیکھنے والوں کو ان کے بارے میں شبہ ہی رہا۔ پھر بھی مشہور یہی ہے کہ وہ تیسرے دن
زندہ ہو کر اپنے ماننے والوں کے سامنے آئے اور کچھ نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک خاص نصیحت یہ تھی۔ انھوں نے
اپنے شاگردوں سے کہا:۔

"تمہاری سلامتی ہو، جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں۔ اور یہ
کہہ کر ان پر پھونکا اور ان سے کہا
روح القدس لو۔ جن کے گناہ تم بخشو ان کے گناہ بخشے گئے ہیں جن کے گناہ تم قائم رکھو ان کے

اختیارات حضرت عیسیٰ ہی سے بہت

قائم رکھے گئے ہیں [1]

(یوحنا، باب ۲۰، ۲۱-۲۳)

اس کے بعد حضرت مسیح کو آسمان پر اٹھا لیا گیا اور وہ خدا کی داہنی طرف بیٹھ گئے۔ (مرقس باب ۱۶، ۱۹)

مصلوب ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی روایات اگرچہ فن روایت و درایت کی رو سے نہایت کمزور اور ناقابل قبول ہیں لیکن عیسائیوں کا صدیوں سے یہی عقیدہ چلا آ رہا ہے۔

یہ معاملہ قرآن کی نظر میں

لیکن اس بارے میں قرآن کا انکشاف بالکل مختلف ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہودیوں کا کہنا کہ ہم نے مسیح، عیسےٰ ابن مریمؑ رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے —— غلط ہے:—

حالانکہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں ان کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ یقیناً انھوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے [2]

النساء ۴ / ۱۵۷، ۱۵۸

یہ بات عیسائی بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس پر انجیل بھی شاہد ہے کہ مصلوب ہونے کے بعد حضرت مسیحؑ کی لاش غائب ہو گئی۔ اس لیے انہیں زندہ ہوتے ہوئے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ ان کی لاش سامنے نہیں آ سکی اس لیے دو روایتوں کا مشہور ہو جانا ناگزیر تھا اور وہ ہوئیں۔ یعنی یہودیوں نے تو یہ کہہ دیا کہ حضرت مسیح کے ماننے والے لاش اڑا لے گئے، اور عیسائیوں نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ لاش غائب نہیں ہوئی بلکہ اسی سے مسیح دوبارہ زندہ ہو گئے اور لوگوں کو بعد میں دکھائی بھی دیے۔

---

[1] یعنی حضرت مسیح نے خدائی اختیارات اپنے شاگردوں کو منتقل کر دیے اور پھر پادری ان شاگردوں کے جانشین ہوئے جن کو عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حق حاصل ہے جس کے گناہ چاہیں معاف کر دیں اور چاہیں سزا دلوا دیں ان اختیارات کے دو نتائج ہوئے۔ (۱) عیسائی پادریوں نے اپنی مرضی کے مطابق عیسائیت کو جو شکل چاہی دے دی (۲) جنت کے پاسپورٹ دینے پر بعد میں کافی ہنگامہ ہوا اور اس کے خلاف احتجاج کی بنا پر عیسائیوں میں ایک فرقہ ہی احتجاجی (Pretestant) کے نام سے مشہور ہو گیا۔

[2] مسیحی روایت کی تردید اور قرآنی آیت کی شرح کے سلسلے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس پر اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے یہاں اس بحث کو نظر انداز کر دیا ہے۔

مصلوب ہو جانے کے بعد پھر زندہ ہو جانے کی روایت کیوں مشہور ہوئی

اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ جب عیسائیوں نے یہ مان ہی لیا (اگرچہ غلط مانا) کہ حضرت عیسےٰؑ کو صلیب پر آسانی کے ساتھ چڑھا دیا گیا اور نہ تو وہ خود اپنے آپ کو بچا سکے، نہ ان کے خدا نے ان کو بچایا تو خود عیسائیوں کے ذہن میں سوال گردش کرنے لگا کہ وہ مسیحؑ جن کی آمد کے اتنے چرچے تھے اتنا انتظار تھا وہ اتنی آسانی سے مصلوب ہو گئے، تو کیا ان کا یہی مشن تھا؟ اس کے معنے تو یہ ہوئے کہ باطل کی فتح ہو گئی! جو وعدے ان کے بارے میں بائبل میں کیے گئے تھے وہ کہاں پورے ہوئے؟

اس سوال کا اپنی دانست میں جواب دینے اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے مصنفین اناجیل اور ان کے شارحین نے مندرجہ ذیل اصول وضع کیے اور انہیں عیسائیت کے بنیادی عقائد میں شامل کر دیا۔

(۱) خدا نے اپنے پیارے بیٹے یعنی عیسےٰ مسیح کو دنیا میں اس لیے بھیجا کہ وہ بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ بن سکیں، اس کی صورت یہی اختیار کی گئی کہ انہیں صلیب پر چڑھایا گیا اور وہ قربان ہو گئے۔ اس قربانی کے بدلے میں بنی آدم کے گناہ خدا نے معاف کر دیے۔

(۲) یہ کام کسی انسان سے نہیں لیا جا سکتا تھا اس لیے خدا نے اپنے بیٹے کو قربان کیا لہٰذا حضرت مسیح انسان نہیں تھے بلکہ انسان کی شکل میں خدا یا خدا کے بیٹے تھے۔

(۳) حاصل یہ کہ اگر حضرت مسیح مصلوب ہو کر ختم ہو جاتے تو ان کی شخصیت دب جاتی اور ابھر کر سامنے نہیں آسکتی تھی اس لیے یہ کہا گیا کہ وہ مصلوب ضرور ہوئے مگر تیسرے دن زندہ بھی ہو گئے۔

(۴) اس لیے جو کوئی ان باتوں کو مانے گا اور ان کے جانشینوں یعنی پادریوں کی فرمان برداری کرے گا وہ نجات کا مستحق ہو گا، کیونکہ خدا نے مسیح کو خدائی اختیارات سونپ دیے ہیں اور مسیح نے اپنے شاگردوں کے ذریعے پادریوں کو۔

یہ تو ہے مروجہ اناجیل اور کلیسا کے نزدیک حضرت عیسےٰؑ کی ولادت اور قربانی کی حکمت، اس نظریے کی بائبل کے دوسرے بیانات سے کہاں تک تائید ہوتی ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے رفع الی السماء اور قیامت کے قریب نازل ہونے میں جو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں ان کا ذکر انشاء اللہ آئندہ ہو گا۔

غیر اسلامی تصوف کا مقدمہ

(۲)

(سیّد احمد قادری)

(۶) مقصدِ حیات اور انسان کی حیثیت میں تبدیلی

اگر مٹی کا کوئی ڈھیلا زور لگا کر اوپر دور تک اچھال دیا جائے تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اوپر اس کو کوئی روکنے والا موجود نہ ہو تو وہ بلا تاخیر زمین کی طرف واپس آئے گا اس کا اضطراب جاری رہے گا یہاں تک کہ زمین پر آ گرے۔ زمین پر گر کر وہ ساکن ہو جائے گا اور اس کا اضطراب ختم ہو جائے گا اور اگر اس کو اوپر کوئی روکنے والا روک لے تو رکاوٹ ختم ہوتے ہی وہ زمین کی طرف لوٹے گا۔ رکی ہوئی حالت میں اگر اس سے پوچھا جائے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے تو جواب دے گا زمین پر پہنچ جانا۔ زمین ہی اس کی محبوبہ ہوگی اور وہ اس کے دردِ فراق میں آہ و نالہ بھی کرے گا اور چیخیں بھی مارے گا اس لیے کہ زمین ہی اس کی اصل ہے جس سے زبردستی اس کو الگ کر دیا گیا ہے۔ زمین کا عشق اور اگر اس میں جذب ہو جانا ہی اس کا مقصدِ حیات قرار پائے گا۔ اسی طرح انسان کا اپنے بارے میں اگر یہ تصور ہو کہ وہ ذاتِ الٰہی میں جمع اور آسودہ تھا اور دنیا میں بھیج کر اس کو اس کی اصل سے علیحدہ کر دیا گیا ہے تو لازمی طور پر ذاتِ الٰہی کا عشق اور اس کا وصل ہی اس کا مقصدِ حیات ہوگا اور جب تک وہ ذاتِ الٰہی میں ویسا ہی سہی گم نہ ہو جائے اسے چین نہیں آئے گا۔ فلسفہ جب تصوف میں داخل ہوا اور بات وحدۃ الوجود تک پہنچی تو اس نے صوفیہ کو زندگی کا یہی تصور دیا اور اس کو انھوں نے شرحِ صدر کے ساتھ قبول کر لیا۔ جب زندگی ہی کا تصور بدل گیا تو مقصدِ زندگی کی تبدیلی لازمی تھی۔ انھوں نے خدا کی عبادت کی بجائے اس کے عشق اور وصل کو مقصدِ حیات بنا ڈالا۔ یہاں تک کہ بہت سے صوفیہ کو اپنا وجود بھی گناہ نظر آنے لگا۔ وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب

دیرا وجود تما بڑا گناہ ہے کہ اس پر کسی دوسرے گناہ کو ناپا نہیں جاسکتا۔
عشق کی مستی اتنی بڑھی کہ عطار کہہ گزرے

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست — ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

میں کافر عشق ہوں مسلمانی سے مجھے کام نہیں، میری ہر رگ تار بن گئی ہے مجھے زنار پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔
ایک اور شاعر نے کہا:۔

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم — جنیدؒ و شبلیؒ و عطار ہم مست

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے تخلیق بشر کے مقصد کے بارے میں اپنے ایک مرید مولانا فخر الدین مروزی کو اپنے دست مبارک سے لکھے ہوئے ایک خط میں لکھا ہے:۔

اتفاق اصحاب طریقت و ارباب حقیقت برآن است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقت بشر محبت رب العلمین ہے۔ ؎	اصحاب طریقت اور ارباب حقیقت کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان کی تخلیق کا اہم مطلوب اور سب سے بڑا مقصد رب العلمین کی محبت ہے۔

شیخ ہجویری لاہوری نے کشف المحجوب میں جن و انس کی تخلیق کا مقصد معرفت الٰہی قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک معرفت کا حاصل محبت ہے لہٰذا محبت الٰہی تخلیق جن و انس کا مقصد قرار پائی۔ یہاں یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ کتاب و سنت میں محبت الٰہی کا تصور کچھ اور ہے اور تصوف میں کچھ اور ہے۔ دونوں کے درمیان آسمان زمین کی دوری ہے۔ تصوف میں اس کا تصور یہ ہے کہ انسان اپنے معشوق یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات میں اس طرح ڈوب جائے کہ خود اس کا اپنا کوئی وجود باقی نہ رہے اور وہ اپنے معشوق کی ذات میں گم ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب ہمعات میں تصوف کے چار دور قرار دیے ہیں۔ تیسرے دور کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"دراصل ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذات الٰہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذت اندوز ہوں۔"

عہد حاضر کے ایک بزرگ نے لکھا ہے:۔

؎ شیخ عبد الحق محدث دہلوی اخبار الاخیار مطبوعہ مجتبائی دہلی ص ۹۴

"اعلیٰ درجہ کی محبت یہ ہے کہ

تو دروگم شو وصال اینست و بس　　　گم شدن گم کن کمال اینست و بس (۱)

یہ شعر صوفیوں کے زیر استعمال ہے جو صوفیہ کی منزل مقصود کی نشان دہی کرتا ہے۔

"بزرگان دین کے نزدیک سلوک و طریقت کی بنیاد عشق و محبت پر ہے، جس سلوک و طریقت میں محبت الٰہی کی آگ نہ سلگتی ہو اور حب الٰہی کی آتش شعلہ زن نہ ہوا ور جس کے اثرات ظاہر و باطن پر عیاں نہ ہوں وہ طریقت، طریقت ہے اور نہ ایسا سلوک کوئی سلوک۔ ایسی طریقت کے پجاریوں کو اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے۔ (۲)

اصحاب شریعت اور اصحاب طریقت کے درمیان فرق کی صراحت کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے :۔

اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر صوفی در اصل عاشق ہوتا ہے عشق اور تصوف مترادف الفاظ ہیں۔ (۳)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ویدانتی تصوف اور یونانی تصوف کے بھی چند اقوال نقل کیے جائیں۔

اپنشدوں میں جو تصوف ہے اس کے چند اقوال یہ ہیں :۔

(۱) گیان اور دھیان کا اصل مقصد یہ ہے کہ خدا سے وصل نصیب ہو جائے۔ (۲) مقصد حیات دیدار ہے جسے دیدار حاصل نہ ہو سکا اس کا جیون اکارت ہو گیا۔ (۳) مقصد حیات برہمن کو پانا ہے یعنی اس سے ذاتی اتصال پیدا کرنا۔ اس کیفیت اتصال کو بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتے، واصل ہو کر دیکھ لو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ (۴) خدا سے ملنے کے آرزو مند ہو؟ خدا کے عاشقوں کی صحبت اختیار کرو اس سے ملنے کا دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ (۵) عرفان حق نہ کتابوں سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ عقل سے، نہ استدلال سے نہ گفتگو سے نہ مناظرے سے۔ یہ نعمت تو صرف عشق سے حاصل ہوتی ہے۔ (۶) خدا اپنے آپ کو صرف اپنے عاشقوں پر ظاہر کرتا ہے (۴)

شنکر اچاریہ کا قول یہ ہے :۔

"وصیال (مراقبہ) یعنی اب دل کی آنکھ سے اس کے درشن کرو، کیونکہ مقصود حیات محض علم خدا نہیں

---

(۱) اصول تصوف ص ۸۴　(۲) ایضاً　(۳) تاریخ تصوف ص ۳۔ (۴) یوسف سلیم چشتی تاریخ تصوف ص ۲۲۔۲۴

ہے بلکہ دیدار خدا ہے یعنی سالک کو براہ راست مشاہدہ ہو جائے کہ کائنات میں اس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔(۱)

گیتا کہتی ہے کہ یہ عارف ہی انسان کامل کا مصداق ہے اسے مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً جوگی (واصل باللہ) بھگت (طالب مولیٰ) جنانی (عارف) (۲) یونانی تصوف بھی کہتا ہے۔

(۱) غایت حیات اور کمال مقصود مبدءِ اصلی کی طرف بازگشت ہے اور اس بازگشت کا طریقہ عشق ہے۔ (۲) خدا سے واصل ہونے کا طریقہ عشق ہے۔(۳)

جب زندگی کا تصور اور اس کا مقصد بدل گیا تو لازماً دنیا میں انسان کی حیثیت بھی بدل گئی۔ اس کی حیثیت اللہ کے بندے اور اس کے خلیفہ کی نہ رہی بلکہ اس کے عاشق کی ہو گئی اور خدا اور بندے کے درمیان اصل نسبت عاشق و معشوق کی قرار پا گئی اس کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا اور یہی نکلا کہ اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت زندگی کے چند مخصوص گوشوں میں سمٹ کر رہ گئی۔

قرآن کریم نے جن و انس کی تخلیق کا جو مقصد بتایا ہے اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے جس کی دعوت دی ہے وہ اللہ کا عشق نہیں بلکہ اس کی عبادت (بندگی) ہے جس کے دائرے سے زندگی کا کوئی شعبہ خارج نہیں ہے۔ اور قرآن نے دنیا میں انسان کی جو حیثیت بتائی ہے وہ اللہ کے عاشق کی نہیں بلکہ اس کے خلیفہ کی ہے جس کا فرض یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی میں اپنے مالک کی ہدایات و مرضیات کی پیروی اور دنیا کو ان پر چلانے کی سعی کرے۔ خدا کے بھیجے ہوئے دین پر خود چلے اور دنیا میں اس کو قائم رکھنے یا قائم کرنے کی جدوجہد میں اپنی جان کھپا دے۔ خدا کی طرف بازگشت ہر انسان کی ہو گی خواہ وہ مومن اور خدا کا وفادار رہا ہو یا کافر اور خدا کا باغی ہو اس نے اپنے وفاداروں کے لیے جنت اور باغیوں کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ یہ ہے دین کا وہ تصور جو قرآن نے ہمیں دیا ہے اور جسے انبیائے کرام نے اپنے قول و عمل سے ہمیں سمجھایا ہے اس لیے جو تصوف اس تصور دین کے مطابق نہیں وہ غیر اسلامی ہے۔

(۷) مومن اور کافر کے درمیان امتیاز غلط ہے

جس خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اور جو سب کا خالق، مالک اور حاکم ہے اور جو رب العالمین

---

(۱) یوسف سلیم چشتی تاریخ تصوف ص ۵۲ (۲) ایضاً ص ۶۰-۶۱۔

(۳) ایضاً ص ۸۵

ارحم الراحمین اور احکم الحاکمین ہے اس نے تو انسانوں کے درمیان ایمان اور کفر کے لحاظ سے توحید اور شرک کے لحاظ سے نیکی اور بدی کے لحاظ سے وفاداری اور غداری کے لحاظ سے اور ظلم و عدل کے لحاظ سے فرق و امتیاز کیا ہے۔ مومنوں، موحدوں، نیکوں، فرماں برداروں اور منصفوں سے اپنی دوستی کا۔ اور کافروں، مشرکوں، بدوں نافرمانوں اور ظالموں سے اپنی دشمنی کا اعلان کیا ہے پہلے گروہ کو اولیاء اللہ اور دوسرے گروہ کو اولیاء الشیطان قرار دیا ہے۔ اس نے اپنے آخری نبی و رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ کافروں اور باغیوں کے سامنے حق پیش کریں۔ دعوت حق کو فروغ دینے اور دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنے کے لیے جان کھپا دیں اور جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ لیکن وحدۃ الوجود کے حامی اور قائل صوفیہ کہتے ہیں کہ مومن و کافر کے درمیان اس طرح کا امتیاز کرنا غلط ہے۔ کیونکہ سارے انسان مظہر ذات الٰہی ہیں۔ ایک ہی باغ کے سب پھول ہیں۔ کوئی صوفی مومن اور کافر کو دو نظروں سے دیکھنے کی تنگ نظری برداشت نہیں کر سکتا۔ وحدۃ الوجود کے حامی و قائل ایک پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔

> چونکہ ہر شے میں اسی کا جلوہ ہے، ساری کائنات اس کی جلوہ گاہ ہے۔ ہر شے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے اس لیے ہر انسان مظہر ذات و صفات ہے۔ اگر مندر میں اس کا جلوہ ہے تو مسلمان میں بھی وہی جلوہ گر ہے اس لیے صوفی جملہ افراد انسانی کو مظاہر ذات سمجھ کر سب سے یکساں محبت کرتا ہے اسی لیے وہ مسجد کے علاوہ گرجے اور صومعے اور مندر کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کے بعد ایک دوہا نقل کر کے اس کی یہ تشریح کی ہے۔
>
> یعنی اے طالب حق! اس بات پر یقین رکھو اور اپنے کیا منتشر سے محفوظ رکھو کر کعبے، دیر، ٹھاکر دوارے، مندر اور مسجد۔ ہر معبد میں وہی ایک نور جلوہ گر ہے۔ یعنی لوگوں نے مکانوں کے نام تو ضرور مختلف رکھ لیے ہیں مگر مدعو یا مسجود یا مطلوب یا مقصود یا محبوب سب کا ایک ہی ہے۔[1]

گویا وحدۃ الوجود، وحدت ادیان کی بھی دعوت دیتا ہے۔ پتھر کے بت کو سجدہ کیا یا سورج اور چاند کو سب سجدے خدا ہی کے ہیں۔ ایک دوسرے پروفیسر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

> گنگوہ کے شیخ عبدالقدوسؒ نے اعلان کیا۔ انسانوں کے درمیان اہل ایمان و کافر، گناہگار و دیندار، گمراہ و راستی پسند، پاک و ناپاک وغیرہ کی تقسیم بے معنے کیوں ہے؟ سب ایک ہی باغ کے

---

[1] یوسف سلیم تاریخ تصوف

پھول ہیں۔(۱)

مولانا روم نے بھی اسی طرح کی بات لکھی ہے۔ "افکار رومی" کے فاضل مولف نے حوالوں کے ساتھ لکھا ہے۔

"مولانا مذاہب و ملل کے اختلاف کو محض رستوں کا اختلاف مانتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

کہ ازاں سو جملہ ملت یکے است   صد ہزاراں سال و یک ساعت یکے است (۲)

"افکار رومی" میں مولانا روم کے ملفوظات "فیہ ما فیہ" کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"ایمان و کفر کا تفرقہ بھی رستوں تک ہے، منزل پر نہیں۔ سب بحثیں، جھگڑے۔ یہ رستہ غلط، وہ رستہ صحیح، یہ حق ہے، وہ باطل ہے۔ جب منزل پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سب اختلافات رستے کے تھے اور بس۔ منزل مقصود سب کی ایک تھی۔ (۳)

قرآن کریم کی چند آیات

اوپر کے اقوال آپ نے پڑھ لیے۔ اب قرآن کریم کی چند آیات اور بعض احادیث بھی پڑھ لیجیے۔ میں آیات کے ترجمے دے رہا ہوں۔ آپ قرآن میں الفاظ کی تلاوت بھی کر لیں۔

(الف) کافروں سے دشمنی کا اعلان

قرآن کریم میں متعدد آیتیں ہیں جن میں اعلان کیا گیا ہے کہ خدا اور کافروں کے درمیان دشمنی کی نسبت ہے کفار خدا کے دشمن ہیں اور خدا کفار کا دشمن ہے۔

(۱) جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کے دشمن ہیں۔ ان کافروں کا اللہ دشمن ہے۔   (البقرۃ - ۹۸)

(۲) اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف لے جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا۔

(۳) وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہوگا، یہ ہے سزا اس جرم کی کہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔

یہ دونوں آیتیں حم السجدہ کی آیت ۱۹ اور ۲۰ ہیں۔ ان دونوں میں کافروں مشرکوں کو اعداء اللہ یا خدا

۱؎ خلیق نظامی ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جنوری ۸۲ء ۱۹

۲؎ مولانا عبدالسلام رامپوری افکار رومی ص ۲۷۶   ۲۲۳ ایضاً

کے دشمن کہا گیا ہے

(ب) کون لوگ کس کے دوست ہیں

قرآن میں عدو کے مقابلے میں ولی اور اعداء کے مقابلہ میں اولیاء کے الفاظ آئے ہیں۔ اللہ مومنوں کا دوست ہے اور مومن اللہ کے دوست ہیں۔ شیطان کفار کا دوست ہے اور کفار شیطان کے دوست ہیں۔

(۱) جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا دوست اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے دوست شیطان ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جلنے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

(البقرہ - ۲۵۷)

(۲) سنو! اللہ کے اولیاء کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کا رویہ اختیار کیا۔ (یونس - ۶۲-۶۳)

(ج) کافروں کو دوست اور رفیق بنانے کی ممانعت

(۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں (الممتحنۃ ۱)

(۲) تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا۔ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ (ایضاً - ۴)

(د) شیطان کے دوستوں سے قتال کا حکم

(۱) جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں پس شیطان کے رفیقوں اور دوستوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں (النساء ۷۶)

(۲) اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے (التحریم - ۹)

(۸) مومن اور کافر برابر نہیں

(۱) جہنمی اور جنتی کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں (الحشر)
جیسا کہ اوپر گذرا اللہ سے بغاوت کرنے والوں اور کفر و شرک کی راہ اختیار کرنے والوں کے ناقابل معافی جرم کی وجہ سے اللہ ان کا دشمن ہے اور وہ بھی اللہ کے دشمن ہیں اس لیے اللہ نے ان کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے جس میں ہمیشہ وہ جلتے رہیں گے اس کے برعکس اللہ نے اپنے مومن وفاداروں کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے جس میں ہمیشہ وہ رہیں گے۔ مومن اور کافر کے درمیان یہ سب سے بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو کون مٹا ہو سکتا ہے؟

(۲) بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ (السجدہ ۱۸)

(۳) کیا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ (جاثیہ ۲۱)

کسے خبر تھی کہ مسلمانوں میں بھی اس طرح کا خیال پیدا ہو گا اور وہ بھی ایسے برے حکم لگانے میں کوئی تامل نہیں کریں گے۔ مومن اور کافر کے درمیان عقیدہ و عمل کے لحاظ سے یہ تقسیم اللہ تعالیٰ نے کی ہے اور گنگوہ کے شیخ فرماتے ہیں کہ مومن اور کافر میں یہ تقسیم کیوں؟ سب ایک ہی باغ کے پھول ہیں۔ گویا ان لوگوں نے اس خدا کو بھی سبق پڑھایا ہے جس سے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مولانا روم اور شیخ گنگوہ وغیرہما کے اقوال نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی ہیں بلکہ اسلامی شریعت کے مخالف اور معاندانہ ہیں۔ اخیر میں صرف ایک حدیث کا ترجمہ پیش کرتا ہوں

حضرت امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے نفرت کی اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔"

(ابوداؤد و ترمذی)

یہاں موقع بحث کی جہت سے صرف یہ بتانا ہے کہ اللہ کی مخلوق سے جس طرح اللہ ہی کے لیے محبت کی جاتی ہے اسی طرح اللہ ہی کے لیے کسی سے نفرت بھی کی جاتی ہے اور جس طرح کسی کو اللہ کے لیے کچھ دیا جاتا ہے اسی طرح کسی سے اللہ ہی کے لیے کوئی چیز روکی بھی جاتی ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ جب تک مومن میں یہ چاروں باتیں نفسانیت سے ہٹ کر خالصۃً للہ جمع نہ ہو جائیں ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی اور جس مومن میں یہ چاروں باتیں جمع ہو جائیں اس

نے اپنے ایمان کو مکمل کر لیا۔ اگر کوئی بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق سے صرف محبت ہی کرنی چاہیے کسی سے نفرت نہیں کی جانی چاہیے تو یہ ان کے اپنے ذہن کی خیالی بات ہے۔ اسلام سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اسلام دین فطرت ہے، معشوقانہ دین نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نفرت برائی سے ہونی چاہیے۔ برے لوگوں سے نہیں۔ اس قول میں جزوی صداقت موجود ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ برے لوگوں سے نفرت ان کی برائی ہی کی وجہ سے ہونی چاہیے۔ کسی ذاتی مخالفت یا نفسانیت کی بنا پر نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص سے برائی دور ہو جائے تو نفرت محبت میں بدل سکتی ہے اور بدل جاتی ہے۔ لیکن برے لوگ چونکہ برائی سے متصف ہوتے ہیں اس لیے نفرت کا تعلق ان سے ہو جاتا ہے اور سزا کا تعلق بھی ان کی اس ذات سے ہو جاتا ہے جو برائی سے متصف ہے۔ دوزخ میں برے لوگ جلائے جائیں گے۔ دنیا میں بھی سزا برے لوگوں کو دی جاتی ہے ان کی برائی کو نہیں۔ مثال کے طور پر زانی کو سزا دی جاتی ہے۔ زنا کو نہیں۔ آپ قرآن کریم کی آیتوں میں پڑھ آئے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے اور اس نے اپنے آخری رسول کو کافروں اور منافقوں پر سختی کا حکم دیا تھا۔ کوئی بیٹا اگر اپنے باپ سے گستاخی کرے، اس کو اذیت پہنچائے اس کی مخالفت پر تل جائے اور اس کی عزت پر حملہ آور ہو تو باپ کو اپنے اس بیٹے سے نفرت ہو جاتی ہے اور بعض اوقات وہ اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتا ہے۔ انسان کی فطرت میں محبت اور نفرت دونوں داخل ہیں جو لوگ صرف محبت کی بات کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو فریب خیال میں مبتلا کرتے ہیں۔

(۸) کائنات میں اولیاء کا تصرف

جس خیال نے مسلم عوام و خواص کو "انسان پرستی" میں مبتلا کیا وہ یہ ہے کہ اولیاء کاملین کو کائنات میں تصرف کا اختیار دے دیا گیا ہے اور دنیا کا نظم و نسق ان کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ اس بے دلیل خیال کو کسی نے مجمل اور کسی نے مفصل طور پر لکھا ہے۔ سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتوح الغیب میں مجملاً لکھا ہے

انسان اللہ کی اطاعت کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ تکوین اس کے سپرد کر دی جاتی ہے

انھوں نے اس کی یہ دلیل پیش کی ہے۔

وھو قولہ فی بعض کتبہ یا ابن	اور یہ اللہ کا فرمان ہے اپنی بعض کتابوں میں
آدم انا اللہ لا الٰہ الا انا اقول	اے ابن آدم میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی الٰہ
لشیئ کن فیکون اطعنی تقول	نہیں ہے میں کسی شے سے کہتا ہوں "ہو جا"

بشیئ کن فیکون (۱)

تو وہ ہو جاتی ہے۔ تو تیری اطاعت کر پھر تو بھی کسی شے سے کہے گا ہو جا تو وہ ہو جائے گی

اس جملے کی شرح میں شیخ عبد الحق نے لکھا ہے۔

این رد تکوین و اعطاء تصرف در کائنات ثابت و مذکور است بقول حق سبحانہٗ و تعالیٰ در بعض کتابہائے وے کہ بر پیغمبران خود فرستادہ اے فرزند آدم منم خدا، نیست خدا جز من۔ من می گویم چیزے را پیدا شو پس پیدا می شود آں چیز۔ اطاعت و فرماں برداری کن مرا۔ می گوئی تو مر چیزے را شو پس می شود۔

اور یہ تکوین کا حوالہ کیا جانا اور کائنات میں تصرف کا اختیار دیا جانا ثابت اور مذکور ہے حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی بعض ان کتابوں میں جو اس نے اپنے پیغمبروں پر نازل کی ہیں ان میں کہا ہے۔ اے فرزند آدم میں ہی خدا ہوں میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں کسی چیز سے کہتا ہوں، ہو جا تو وہ چیز ہو جاتی ہے میری اطاعت اور فرماں برداری کر، تو بھی کسی چیز سے کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائے گی۔

فتوح الغیب کی عبارت سے اتنا تو معلوم ہوا کہ کسی انسان کو تکوینی اختیارات دینے کا ثبوت قرآن کریم اور احادیث نبوی میں نہیں ہے ورنہ اس کو چھوڑ کر کسی مجہول آسمانی کتاب کا حوالہ نہ دیا جاتا۔ اس کے بعد سوال یہ ہے کہ اتنے اہم معاملہ میں جس کا تعلق توحید و شرک سے ہو کسی مجہول کتاب کی عبارت دلیل بن سکتی ہے یا خود حضرت شیخ کے اپنے اقوال کی بنا پر بھی نہیں بن سکتی۔ اس میں تو اس کتاب کا حوالہ بھی نہیں ہے جس سے یہ عبارت اخذ کی گئی ہے۔

اس طرح کے بے دلیل خیالات نے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو توحید کی صراط مستقیم سے ہٹا دیا ہے۔ قبر پرستی، اولیاء کے ناموں کی دہائی اور بہت سے مشرکانہ اعمال اسی غلوئے عقیدت کے کڑوے کسیلے پھل ہیں شیخ ہجویری لاہوری (م ۴۶۵ھ) نے یہ وہم و خیال کچھ تفصیل سے پیش کیا ہے۔

خداوند تعالیٰ را اولیاء اند کہ ایشاں را — خداوند تعالیٰ کے اولیاء ہیں جن کو اس نے

۱۔ فتوح الغیب مع شرح فارسی شیخ عبد الحق محدث دہلوی مطبوعہ مطبع نامی منشی نول کشور سنہ ۱۲۸۰ھ ص ۴۴۲

بدولتی گردانیدہ است و تخصیص کردہ است و والیاں ملک وے اند کہ برگزیدہ است شان را و نشانہ افعال خود گردانیدہ است و بانواع کرامات مخصوص کردہ و آفات طبیعی از ایشاں پاک گردانیدہ و از متابعت نفس و ہوا شاں را برہانیدہ تا ہمت شاں جز دے نیست و انس شاں بجز با وے نہ۔ (۱)

وہ ہستی اور ولایت کے ساتھ خاص کیا ہے وہ ملک کے والی (حاکم) ہیں جنہیں اس نے منتخب کیا ہے اور اپنے فعل کے اظہار کا نشان بنایا ہے اور انواع و اقسام کی کرامتوں سے ان کو مخصوص کیا ہے اور ان کو طبعی آفتوں سے پاک کر دیا ہے اور نفس و خواہش کی متابعت سے رہائی دے دی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی ہمت صرف اسی کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے اور اس کے سوا کسی دوسرے سے ان کو کوئی انس باقی نہیں رہا ہے۔

یعنی وہ زمینی نہیں بلکہ آسمانی مخلوق بن گئے ہیں۔ آگے اولیاء کی شان میں مزید فرمایا گیا ہے:۔

"آسمان سے پانی ان کے قدموں کی برکت سے برستا ہے اور زمین سے نباتات ان کے احوال کی صفائی سے اگتے ہیں اور مسلمانوں نے کافروں پر فتح انہیں کی ہمت سے پائی ہے۔ (۲)

ابھی بات پوری نہیں ہوئی اس لیے مزید ارشاد ہے:۔

اولیاء حق تعالیٰ مدبران ملک اند و مشرفان عالم و خداوند تعالیٰ مر ایشان را والیان عالم گردانیدہ است و حل و عقد آں بدیشاں بازبستہ و احکام عالم را موصول ہمت ایشاں گردانیدہ است (۳)

خداوند تعالیٰ کے اولیاء ملک کے مدبر ہیں اور عالم کے نگران اور خداوند تعالیٰ نے خاص طور پر ان کو عالم کا والی (حاکم) گردانا ہے اور عالم کا حل و عقد ان کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور احکام عالم کو ان ہی کی ہمت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ مشرکین عرب اللہ ہی کو ملک کا مدبر سمجھتے اور مانتے تھے کسی اور کو نہیں ان کا جرم یہ تھا کہ فرشتوں اور دوسروں کو انھوں نے خدا کی بارگاہ میں بزور شفاعت کا حق دار تسلیم کر لیا تھا اور اسی لیے ان

لہ تصوف کی تین اہم کتابیں بحوالہ کشف المحجوب ص ۱۵۷ (۲) ایضاً ص ۱۵۸ (۳) ایضاً ص ۱۲۹

ان کو پوجتے تھے۔ فلسفیانہ تصوف کہتا ہے کہ اولیاء سلطنت الٰہی کے مدبر ہیں اور عالم کا عمل و عقد اللہ نے انہیں کے حوالہ کر دیا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) اب اگر لوگ اولیاء کی دہائی دے رہے ہیں اور ان کی قبروں کو پوج رہے ہیں تو ان کے اس شرک کا سبب کیا ہے اور کہاں سے ہے؟ جب اولیاء کا مقام یہ ہے تو ان کی معصومیت کا خیال تو کم درجے کی چیز ہے کیونکہ مدبر کائنات ہونے کا مقام تو انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی حاصل نہ تھا۔

مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۸۲ھ) نے لکھا ہے:۔

اب ان ایمان والے صدیقوں کا حال سنو، اور اپنی ناقص عقل سے ان کے متعلق رائے زنی نہ کرو کیونکہ یہ وہ بزرگان دین ہیں کہ دنیا کا نظم و نسق انہیں کے قدموں کے نیچے ہے اور دین کا استحکام ان کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ مغربی و مشرقی دنیا ان کے حکم و فرمان کے تابع ہے۔(1)

شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۳۵ھ) نے علماء راسخین یا بلند درجہ صوفیہ کے مراتب و مقامات بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان میں شاید سب سے اونچا مقام "قیومیت" کا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی جو خلافت ملی اور اس نے جو بار امانت قبول کیا وہ ان کے نزدیک تمام اشیاء کی قیومیت ہے۔ ان کے خیال میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام مقام قیومیت پر فائز ہوئے تھے۔ قیومیت کا یہ مقام کیا ہے؟ یہ خود حضرت شیخ سرہندی کے الفاظ میں پڑھیے:۔

و آں امانت بزعم ایں حقیر قیومیت جمیع	اور وہ امانت اس حقیر کے گمان میں تمام
اشیاء است بر سبیل نیابت کہ مخصوص بہ کمل	اشیاء کی قیومیت ہے جو بر سبیل نیابت انسان
افراد انسان است یعنی معاملۂ انسان	کے کامل افراد کے ساتھ مخصوص ہے یعنی انسان
بجائے می رسد کہ او را قیوم جمیع اشیاء	کامل کا معاملہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے
بحکم خلافت می سازند و ہمہ را افاضۂ وجود	کہ بحکم خلافت اس کو تمام اشیاء کا قیوم
و بقائے سائر کمالات ظاہری و باطنی بتوسط	بنا دیتے ہیں اور سب کو وجود کا فیض اور تمام
او رسانند اگر ملک ست باو متوسل است	ظاہری و باطنی کمالات کی بقا اسی کے توسط
و او را اگر جن و انس است باو متشبث و	سے پہنچاتے ہیں۔ اگر فرشتہ ہے تو اسی سے

(1) مکتوبات صدی مکتوب ۸۷ ص ۵۲۶

فی الحقیقت توجہ جمیع اشیاء بجانب او است و ہمہ نگران او اند (۱)

متوسل ہے اور اگر جن و انس ہے تو اسی کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ اور فی الحقیقت تمام اشیاء کی توجہ اسی کی طرف ہے اور سب اسی کو تکتے ہیں

شیخ احمد سرہندیؒ نے اس کو اپنا "زعم" قرار دیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ زعم قرآن کے خلاف ہے۔ یہ محض تخیل کی پرواز ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ "قیومیت" وہی چیز ہے جس کو پہلے کے صوفیہ "غوثیت" کہتے آئے ہیں

"سید احمد کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ عبداللہ مطریؒ سے استفسار کیا کہ فرمائیے۔ افراد، ابدال، غوث قطب وغیرہ کے مدارج میں کیا فرق ہے اور ان کی تعداد کس قدر ہوا کرتی ہے۔ شیخ نے فرمایا بھائی جان ہر ایک زمانہ میں دنیا بھر کا غوث صرف ایک ہوتا ہے۔ عرش سے لیکر فرش تک تمام مخلوق پر خداوند کریم اسے تصرف عطا کرتا ہے اور تمام اولیاء قطب، اخیار، نجیب، نقیب، ابدال، اوتار وغیرہ کو اس غوث کی خدمت و اطاعت کا ارشاد ہوتا ہے، ان کا عزل و نصب، ترقی اور تنزل محض اس کے تصرف میں ہوتا ہے۔ غوث زماں ان کی تعلیم و ارشاد میں کوتاہی نہیں کرتا۔ اور یہ سب موخر الذکر بزرگوار اسی سے "شریعت، طریقت اور حقیقت" کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اسی غوث کی وجہ سے تمام برکات اور رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نظام کائنات اسی غوث کے دم قدم سے ہے۔ (۲)

یہ افتراء علی اللہ کی وہ قسم ہے جس سے مشرکین عرب بھی واقف نہ تھے۔ قُلْ ھَاتُوا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں تصرف کے اس زعم باطل کی تردید کے لیے وہ عبارتیں پیش کر دی جائیں جو شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "تقویۃ الایمان" میں لکھی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:۔

پھر اگر کوئی سمجھانے والا ان لوگوں سے کہے کہ تم دعویٰ ایمان کا رکھتے ہو اور افعال شرک کے کرتے ہو سو یہ دونوں راہیں ملائے دیتے ہو تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم تو شرک نہیں کرتے بلکہ اپنا عقیدہ انبیاء و اولیاء کی جناب میں ظاہر کرتے ہیں۔ شرک جب ہوتا ہے کہ ہم ان انبیاءؑ

---

(۱) ماہنامہ زندگی جنوری ۱۹۸۱ء بحوالہ مکتوب ۴۳، ج ۲ مکتوبات امام ربانی

(۲) تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی ص ۱۹-۲۰

اولیاء کو، پیروں و شہیدوں کو اللہ کے برابر سمجھتے، سو یہاں تو ہم نہیں سمجھتے بلکہ ہم ان کو اللہ ہی کا بندہ جانتے ہیں اور اس کی مخلوق، اور یہ قدرت تصرف اسی نے ان کو بخشی ہے۔ اس کی مرضی سے عالم میں تصرف کرتے ہیں اور ان کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے اور ان سے مدد مانگنی عین اسی سے مدد مانگنی ہے اور وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں جو چاہیں سو کریں اور اس کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں اور وکیل، ان کے ملنے سے خدا ملتا ہے اور ان کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور جتنا ہم ان کو جانتے ہیں اتنا ہم اللہ سے نزدیک ہوتے ہیں اور اسی طرح کی خرافاتیں بکتے ہیں اور ان باتوں کا سبب یہ ہے کہ خدا و رسول کے کلام کو چھوڑ کر اپنی عقل کو دخل دیا اور جھوٹی کہانیوں کے پیچھے پڑے اور غلط غلط رسموں کی سند پکڑی اور اگر اللہ و رسول کا کلام تحقیق کرتے تو سمجھ لیتے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی کافر لوگ ایسی باتیں کرتے تھے۔ اللہ صاحب نے ایک نہ مانی اور ان پر غصہ کیا اور ان کو جھوٹا بتایا۔ (۱)

اس عبارت میں تقریباً وہ تمام دلائل آگئے ہیں جو کائنات میں اولیاء کے تصرف کے بارے میں دیے جاتے ہیں۔

اب آیت قرآنی کی تفسیر کے طور پر ان کی عبارتیں پڑھیے۔ سورۃ المومنون کی آیت پیش کر کے لکھا ہے:۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝	کہہ کون ہے وہ شخص جس کے ہاتھ میں ہے تصرف ہر چیز کا اور وہ حمایت کرتا ہے اور اس کے مقابل کوئی حمایت نہیں کر سکتا۔ جو تم جانتے ہو سو وہی کہہ دیں گے کہ اللہ ہے۔ کہہ پھر کہاں سے خبطی ہو جاتے ہو

ف۔ یعنی جب کافروں سے بھی پوچھیے کہ سارے عالم میں تصرف کس کا ہے اور اس کے مقابل کوئی حمایتی کھڑا نہ ہو سکے تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ اللہ ہی کی شان ہے۔ پھر اوروں کو ماننا محض خبط ہے۔

ف۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی اور کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں

(۱) تقویۃ الایمان مع تذکیر الاخوان، ناشر راشد کمپنی دیوبند ص،

کو اللہ کی برابر نہیں جانتے تھے بلکہ اسی کا مخلوق اور اسی کا بندہ سمجھتے تھے اور ان کو اس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے مگر یہی پکارنا اور منتیں ماننی اور نذر و نیاز کرنی اور ان کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا یہی ان کا کفر و شرک تھا سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے گو کہ اس کو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہی سمجھے سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہے۔ سو سمجھنا چاہیے کہ شرک اسی پر موقوف نہیں کہ کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل جانے بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے ذمے نشان بندگی کے ٹھہرائے ہیں وہ چیزیں کسی اور کے واسطے کرنی جیسے سجدہ کرنا اور اس کے نام کا جانور کرنا اور اس کی منت ماننی اور مشکل کے وقت پکارنا اور ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور قدرت تصرف کی ثابت کرنا سو ان باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے گو کہ پھر اللہ ہی سے چھوٹا ہی سمجھے اور اس کا مخلوق اور اسی کا بندہ اور اس بات میں اولیاء و انبیاء میں اور جن و شیطان میں اور بھوت و پری میں کچھ فرق نہیں یعنی جس سے کوئی یہ معاملہ کرے گا مشرک ہو جاوے گا۔ خواہ انبیاء و اولیاء سے خواہ پیروں و شہیدوں سے خواہ بھوت و پری سے۔ (۱)

وہ آگے لکھتے ہیں:۔

دوسری بات یہ کہ عالم میں ارادے سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور اپنی خواہش سے مارنا اور جلانا، روزی کی کشائش اور تنگی کرنی اور تندرست و بیمار کر دینا، فتح و شکست دینی، اقبال و ادبار دینا، مرادیں پوری کرنی، حاجتیں برلانی، بلائیں ٹالنی، مشکل میں دستگیری کرنی، برے وقت میں پہنچنا، یہ سب اللہ کی شان ہے اور کسی انبیاء و اولیاء کی پیر و شہید کی، بھوت و پری کی یہ شان نہیں۔ جو کوئی کسی کو ایسا تصرف ثابت کرے اور اس سے مرادیں مانگے اور اس توقع پر نذر و نیاز کرے اور اس کی منتیں مانگے اور اس کو مصیبت کے وقت پکارے، سو وہ مشرک ہو جاتا ہے اور اس کو اشراک فی التصرف کہتے ہیں یعنی اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا محض شرک ہے پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے یا یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی طاقت بخشی ہے ہر طرح شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ (۲)

---

(۱) ایضاً ص ۷-۸ (۲) ایضاً ص ۹

سورۂ النحل کی ایک آیت

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا	اور پوجتے ہیں وے اللہ کے ایسوں کو کہ
يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ	نہیں اختیار رکھتے ان کی روزی کا آسمانوں
الْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	سے اور نہ زمین سے کچھ اور نہیں طاقت رکھتے۔

ف یعنی اللہ کی سی تعظیم کرتے ہیں ایسے لوگوں کی کہ ان کا کچھ اختیار نہیں اور ان کی روزی پہنچانے میں کوئی دخل نہیں رکھتے، نہ آسمانوں سے مینھ برسادیں نہ زمین سے کچھ اگا دیں اور ان کو کسی طرح کی قدرت نہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعضے عوام الناس کہتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء یا امام و شہیدوں کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت تو ہے لیکن اللہ کی تقدیر پر وہ شاکر ہیں اور اس کے ادب سے دم نہیں مارتے۔ اگر چاہیں تو ایک دم میں الٹ پلٹ کر دیں لیکن شرع کی تعظیم کر کے چپ بیٹھے ہیں۔ سو یہ بات سب غلط ہے بلکہ کسی کام میں نہ بالفعل ان کو دخل ہے نہ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ (۱)

قرآن کریم کی آیتوں کے بعد دو حدیثیں اور ان کی تشریح بھی پڑھ لیجیے۔

اخرج الترمذی عن انس رضی	مشکوٰۃ کی کتاب الدعوات میں لکھا ہے کہ ترمذی
اللہ عنہ قال قال رسول اللہ	نے ذکر کیا کہ انس نے نقل کیا کہ پیغمبر خدا نے
صلے اللہ علیہ وسلم لیسئل احدکم	فرمایا کہ ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی سب حاجت کی
ربہ حاجتہ کلھا حتی یسئل	چیزیں اپنے رب سے مانگے حتی کہ نمک اسی سے
الملح وحتی یسئلہ شسع نعلہ	مانگے اور جوتے کا تسمہ جب ٹوٹ جائے تو اسی
اذا انقطع	سے مانگے۔

ف یعنی اللہ صاحب کو دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہ سمجھے کہ بڑے بڑے کام تو آپ کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام اور نوکروں اور چاکروں کو حوالے کر دیتے ہیں سو لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کام اور ان کی التجا کرنی ضرور پڑتی ہے۔ سو اللہ کے یہاں کا کارخانہ یوں نہیں بلکہ وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ ایک ہی آن میں کروڑوں کام چھوٹے اور بڑے درست کر سکتا ہے اور اس کی سلطنت میں کسی کی قدرت نہیں

لہ ایضاً ص ۲۵

سو چھوٹی چیز بھی اسی سے مانگنی چاہیے کیونکہ اور کوئی نہ چھوٹی چیز دے سکتا ہے نہ بڑی (۱)

اخرج الشیخان عن عمر قال قال	مشکوۃ کے باب المفاخر میں لکھا ہے کہ بخاری
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	مسلم نے ذکر کیا کہ پیغمبر خدا نے فرمایا کہ مجھ کو
لا تطرونی کما اطرت النصارے	حد سے مت بڑھاؤ جیسا کہ عیسے بن مریم کو
عیسی بن مریم فانما انا عبدہٗ	نصاریٰ نے حد سے بڑھا دیا سو میں تو اس
فقولوا عبد اللہ و	کا بندہ ہی ہوں یہی کہو کہ اللہ کا بندہ ہے
رسولہٗ	اور اس کا رسول

ف۔ جو خوبیاں اور کمالات اللہ نے مجھ کو بخشے ہیں سو بیان کرو وہ سب رسول کہہ دینے میں آجاتے ہیں کیونکہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں اور سارے مراتب اس سے نیچے ہیں مگر آدمی رسول ہو کر آدمی ہی رہتا ہے اور بندہ ہی ہونا اس کا فخر ہے کچھ اس میں خدا کی شان نہیں آجاتی اور خدا کی ذات میں نہیں مل جاتا سو یہ بات کسی بندہ کے حق میں نہ کہنا چاہیے کہ نصاریٰ ایسی ہی باتیں حضرت عیسےؑ کے حق میں کہہ کر کافر ہوگئے اور اللہ کی درگاہ سے راندے گئے سو اسی لیے پیغمبر خدا نے اپنی امت کو فرمایا کہ تم نصاریٰ کی چال نہ چلیو اور اپنے پیغمبر کی تعریف میں حد سے مت بڑھیو کہیں نصاریٰ کی طرح مردود نہ ہو جاؤ لیکن افسوس کہ ان کی امت کے بے ادب لوگوں نے ان کا حکم نہ مانا اور آخر نصاریٰ کی سی باتیں کہنے لگے کیونکہ نصاریٰ بھی حضرت عیسے کو یہی کہتے تھے کہ اللہ ان کے بھیس میں ظاہر ہوا اور وہ ایک طرح سے انسان ہیں اور ایک طرح سے خدا۔ سو بعینہٖ یہی بات بعضوں نے حضرت کی شان میں کہہ ڈالی۔ (۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ۔

بلکہ بعض جھوٹے دغابازوں نے اس بات کو خود پیغمبر خدا کی طرف نسبت کیا ہے کہ انھوں نے خود فرمایا ہے۔ انا احمد بلا میم اور اسی طرح ایک بڑی سی عبارت بنا کر اور اس میں ایسی خرافاتیں جمع کر کے اس کا نام خطبۃ الافتخار رکھا ہے اور اس کو حضرت علیؓ کی طرف نسبت کیا ہے سبحانک ھذا بھتان عظیم۔ اللہ سارے جھوٹوں کا منہ کالا کرے۔ (۳)

---

(۱) ایضاً ص ۳۱ (۲) ایضاً (۳) ایضاً ص ۵۲-۵۴

میں نے بالقصد یہ طویل اقتباسات دیے ہیں اس لیے کہ ان میں توحید کی وہ تعلیم پیش کی گئی ہے جو قرآن و حدیث میں ہے۔ اب ان آیات و احادیث سے مدلل عبارات کو پڑھیے اور اوپر صوفیہ کے دعاوی کو پڑھیے اور دونوں کو ملا کر نتیجہ نکال لیجیے۔ اسلام اس لیے آیا تھا کہ اللہ کے بندوں کو دوسری بہت سی چوکھٹوں سے ہٹا کر ایک چوکھٹ۔ الٰہ واحد اور رب واحد کی چوکھٹ پر جھکائے لیکن فلسفیانہ غیر اسلامی تصوف نے دوبارہ مسلمانوں کو ایک چوکھٹ سے ہٹا کر بہت سی چوکھٹوں پر جھکا ڈالا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ٥

سورۂ یونس کی آیت ۳۱ میں صراحت ہے کہ مشرکین عرب بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مدبر کائنات مانتے تھے وہ اس شرک میں مبتلا نہ تھے کہ رب کائنات اپنے کسی مقرب بندے کو کائنات کی تدبیر حوالہ کر دیتا ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے:۔

"ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے؟ اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے جو ساری کائنات کا انتظام فرماتا ہے؟ تو جواب دیں گے، اللہ، تو ان سے کہو کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں؟" (یونس)

سخت مصیبت کے وقت مشرکین عرب کس کو پکارتے تھے؟

جب تم لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔" (یونس۔ ۲۲۔۲۳)

یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں دہرائی گئی ہے۔ "جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا جس جس کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ (آیت۔ ۶۷)

توحید کیا ہے؟

(انعام الرحمن خان بھوپال)

۱۹؍اکتوبر ۱۹۸۵ء کو قصبہ بیرسیہ کے ایک اجتماع میں یہ تقریر کی گئی تھی بعد میں ٹیپ کی مدد سے اسے مرتب کیا گیا۔ اگرچہ اس میں معمولی سا حذف و اضافہ ہوا ہے مگر ترتیب و مطالب اصل کے مطابق ہیں۔

بعد حمد و صلوٰۃ ——— محترم بھائیو

اس وقت کی تقریر کا عنوان ہے "توحید کیا ہے؟" اس بات پر افسوس کیجیے یا ہنسیے کہ مسلمانوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ توحید کیا ہے۔ اور سمجھنا پڑ رہا ہے کہ توحید یہ ہے، ویسے اپنی عام حالت کو دیکھتے ہوئے تو یہ ایک فضول کام لگتا ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوا۔ الحمدللہ میرے والدین مسلمان تھے۔ میرے کان میں بھی آواز لا الٰہ الا اللہ کی پہنچی۔ میں موحد ہوں کیونکہ اللہ کو ایک مانتا ہوں عمل کی بات میں نہیں کرتا۔ مذہبی زندگی میں میرے اور اس شخص کے درمیان نمایاں فرق ہے جو توحید کو نہیں مانتا وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتا ہے۔ اور میں خدا کا نام لیتا ہوں۔ جب توفیق ہوتی ہے تو میں تلاوت قرآن ہی کی کرتا ہوں، گیتا یا انجیل یا توریت کی نہیں کرتا۔ اس قرآن میں لکھا کیا ہے؟ یہ تو علماء جانیں ہم تو اس کی تلاوت کرتا ہوں، جب قسم کھانے کی ضرورت ہوتی ہے میں اللہ کی اور قرآن ہی کی قسم کھاتا ہوں، کسی اور کی نہیں۔ کیونکہ میں مسلمان ہوں، موحد ہوں۔ جب کوئی منت مانتا ہوں تو کسی دیوی یا دیوتا کے استھان پر نہیں، مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر جاتا ہوں۔ اسی طرز کے وراثت میں ملے ہوئے اسلام نے یہ سوال پیدا کیا ہے کہ توحید کیا ہے اور شاید اسی اسلام کو دیکھ کر حالی نے کہا تھا:—

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر ——— جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر

جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں کہ
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

اگر یہ نہیں تو پھر توحید یہ ہے کہ پرستش اور عبادت خدا کی کرو اور اطاعت اس طاقت کی کرو جس کا حکم وقت پر چل رہا ہو پھر اس کا حکم مانو تو خدا سے ڈر کر مانو۔ تقویٰ اللہ کی کیفیت کے ساتھ خدمت، اطاعت شیطان کی یا اس طاقت کی کرو جو وقت پر حکم چلا رہا ہے۔ اگر اس سے خوف کھا کر اس کی خدمت کروگے تو یہ بات توحید سے میل نہیں کھاتی۔ ایسا نہیں بلکہ خدا کو مطاع مطلق مانتے ہوئے خدا ہی کے خوف سے لرزتے ہوئے اس کے باغیوں کی خدمت و اطاعت کرو کیونکہ تم موحد ہو۔ توحید کے منافی ان چیزوں سے تو بچو جو قدیم سے شرک کہلاتی ہیں لیکن وقت کے جو طاغوت اور شیاطین ہیں تمہیں عام طور پر طاغوت و شیطان نہیں بلکہ حکمراں سمجھا جاتا ہے ان کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کی دنیا الگ ہے اور ہماری الگ۔ اگر ایسا کروگے تو یہ دنیا داری ہوگی جو دینداری کے خلاف ہے۔

ان تصورات کے ساتھ میں موحد ہوں۔ میں دین اور دنیا کی تقسیم کا بھی قائل نہیں ہوں۔ اس کو میں صحیح نہیں سمجھتا کہ مسلمان کی دنیا الگ ہو اور دین الگ۔ اس لیے میری دینداری کی زندگی میں خدا کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا۔ طلاق ہے، عملیہ ہے، وراثت ہے۔ انہی تمام چیزوں کے اندر میں صرف خدا کا حکم مانتا ہوں۔ میری زندگی میں جتنے معاملات بھی پیش آتے ہیں سب کو میں تقویٰ کے نور سے منور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر سیاست میں حصہ لیتا ہوں تو اللہ سے ڈرتے ہوئے دیانت داری کے ساتھ اسی طریقہ پر عمل کرتا ہوں جو رائج ہیں۔ وقت کی سیاست نے جس کو بھی صاحب حاکمیت مانا ہے اسی کو میں بھی عملاً صاحب حاکمیت مانتے ہوئے انہیں طریقوں پر عمل کرتا ہوں جو موجودہ سیاست نے سکھائے ہیں۔ البتہ دیانت و صداقت کو نہیں چھوڑتا۔ چونکہ میرا عقیدہ اور میری رائے یہ ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا الگ الگ نہیں ہیں اس لیے میں اپنے طریقے سے دین دار ہوں اور دنیا کے تمام کاموں میں انہی طریقوں سے حصہ لیتا ہوں جو دنیا میں چل رہے ہیں۔ کیونکہ میں موحد ہوں۔

بھائیو! آپ یہ بات مانیں گے کہ یہ جو کچھ کہا گیا بیشتر مسلمانوں کا طرز فکر یہی ہے اور اگر آپ غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان میں سے بیشتر باتوں میں عقیدہ کا فرق نہیں، فکر اور قصد کا فرق ہے۔ جو لوگ خدا کی حاکمیت پر عقیدہ رکھتے ہوئے حاکمیت عوام کی بنیاد پر چلنے والی سیاست میں حصہ لیتے ہیں ان کے بارے میں یہ سمجھنا غلط ہوگا

کہ وہ عقیدۂ توحید یا حاکمیت الٰہ کے عقیدے سے منحرف ہو گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ غیر شعوری طور پر ایسا کرتے ہیں اور یہ شعور کا نہ ہونا علم کے نہ ہونے سے زیادہ فکر و تصور کے فرق کی وجہ سے ہے۔ اس سے یہ ضروری بات واضح ہو جاتی ہے کہ عقیدے کے صحیح ہونے کے ساتھ ہی فکر و تصور کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو مکمل عقیدہ کے مکمل تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ اور مسلمان قریب قریب ایسی حالت میں مبتلا رہیں گے جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے۔ یحسبون انهم یحسنون صنعا۔

ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ قرآن و سنت ہمارے رہنما ہیں ہم ان سے باہر نہیں جائیں گے۔ لیکن قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی فکر کا فرق ہماری زندگی کے رخ کو، سفر اور حرکت کے رخ کو بدل دیتا ہے مثال کے طور پر میں کسی واعظ کی تقریر سے متاثر ہوتا ہوں وہ واعظ آخرت کا نقشہ کچھ ایسا کھینچتا ہے کہ مجھے جھرجھری آجاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں یہ دنیا تو ناپائدار ہے۔ یہاں سے تو جانا ہی ہے۔ بس آخرت کی فکر کرنا چاہیے اور میں آخرت کی فکر میں دنیا کو شیطان کے چیلے چانٹوں کے لیے چھوڑ کر کسی گوشے کا رخ کرتا ہوں، اس گوشے کا نام کچھ بھی ہو جبکہ قرآن و سنت کے بنائے ہوئے ذہن کو فکر آخرت میدان عمل میں لے جاتی ہے اور بدی کے علمبرداروں سے کشمکش کراتی ہے۔ ایک روز میرے گاؤں کے مکان پر ایک سید صاحب تشریف لائے جن کے تقوے و دینداری کا میں بہت معترف ہوں۔ دوران گفتگو انھوں نے فرمایا۔ جماعت اسلامی والوں میں اتباع سنت کا اہتمام نہیں پایا جاتا میں نے دو گھنٹے تک اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ اسی دوران میں کھانا آیا۔ میں سردی کے موسم میں اصلاح معدہ کے لیے کھانے کے بعد میں گڑ کی ایک ڈلی کھایا کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ آئی۔ اسے دیکھ کر موصوف نے نہایت قدر شناسی کے ساتھ فرمایا۔ "اچھا اتباع سنت کا اتنا اہتمام!" میں دل ہی دل میں ہنسا اور سوچا کہ جب گڑ کی ایک ڈلی سے اتباع سنت کا سرٹیفکیٹ مل رہا ہے تو کیا برا ہے۔ مگر یہ بات میرے مزاج کے خلاف تھی۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ سید صاحب میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر اتباع سنت کی نیت سے میٹھا کھایا جائے تو ثواب ملے گا۔ بشرطیکہ میٹھے کے ساتھ مرچ کھانے کا بھی حوصلہ ہو اگر آپ نے میرے متعلق گڑ کھانے کی وجہ سے اچھی رائے بنائی ہے تو اسے بدل دیجیے۔ میں تو اصلاح معدہ کے لیے گڑ کھاتا ہوں۔ اسی طرح اسی قصبہ بہریہ میں ایک بار میں یہاں کے ایڈیشنل تحصیلدار کے یہاں مہمان تھا جو پوسٹ گریجویٹ بھی ہیں اور فارغ التحصیل عالم بھی۔ ایک اور صاحب بھی مہمان تھے جو صوفی مشرب ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے تحصیلدار صاحب کی اس بات پر گفتگو چھڑ گئی کہ جماعت اسلامی میں روحانیت نہیں ہے۔ میرے کسی جواب سے وہ مطمئن

نہیں ہوئے اور ہم سب سمجھ گئے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سونے سے پہلے جو خیالات دماغ میں بھرے ہوں وہ خواب میں بھی رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے خواب میں دیکھا کہ وہی مجلس جمی ہے اور وہی موضوع چل رہا ہے۔ اس وقت میں نے جو جواب دیا وہ بیداری میں نہیں دے سکا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ہم اس چیز کو روحانیت سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کے الہ ہونے پر ایمان لاکر ہر ایک کی عبادت و اطاعت سے کنارہ کش ہو جائیں نتیجہ میں مدعیان اطاعت ہماری زندگی دوبھر کر دیں اور حالت یہ ہو جائے کہ سوائے خدا کے دنیا کا ہر سہارا ٹوٹ جائے۔ اس بے بسی کے عالم میں جب ہم بلک کر دعا مانگیں گے کہ ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین ○ تو یقین ہے کہ فرشتوں کی صفوں میں کھلبلی مچ جائے گی۔ صبح ہوئی تو مجھے یہ خواب یاد تھا ناشتہ پر میں نے تھوڑے تامل کے بعد اپنا یہ خواب اور یہ جواب سنا دیا تحصیلدار صاحب تو سوچ میں پڑ گئے لیکن صوفی منش بزرگ نے وجد کی سی کیفیت کے ساتھ سر ہلانا شروع کیا اور کچھ ایسے جملے فرماتے رہے کہ ہاں۔ ٹھیک ہے اب چلے تم ۔ مطلب یہ تھا کہ اب تمہارے بزرگ بر آنے لگے۔ اب اڑو گے تم روحانیت کی مقدس فضا میں۔ میں نے جو خواب میں جواب پایا تھا اس پر تو انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ ان کی رائے میں جواب کا خواب میں دینا اہمیت رکھتا تھا ـــــ یہ ہے فکر اور تصور کا فرق ـــــ میں ان کے اور وہ میرے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے عقیدۂ توحید میں فرق ہے لیکن فکر و تصور کے فرق نے دونوں کی حرکت اور ارتقا کا رخ ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں کر دیا

اسی طرح ایک اور فکر و تصور جو ان چیزوں سے بڑھ کر ایک مسلمان کو خطرناک حد تک لے جاتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی مسلمان کے اندر خوف آخرت کی کیفیت ابھرتی ہے تو وہ کسی مزار کی جانب لپکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان بزرگوں کے سہارے میں اپنی آخرت سنوار سکتا ہوں۔ وہ شاید غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ یہ بزرگ جب اپنے دامن گرفتہ لوگوں کی شفاعت کر دیں گے تو اللہ ان کی بات نہیں ٹالے گا اور بخش دے گا۔

مختصر یہ کہ عقیدۂ توحید ایک ہے۔ مگر فکر و تصور کے فرق نے عمل میں اس کی نمود کے لیے بہت سے روپ بنا دیے ہیں حتی کہ ایسی ایسی شکلوں میں بھی یہ عقیدۂ توحید سامنے آتا ہے جسے توحید کہنا مشکل ہے۔

محترم حضرات! آئیے افکار و تصورات کے اس جنگل سے نکل کر ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیں کہ عقیدۂ توحید کیا ہے اور یہ اپنے ماننے والوں کو کیا دیتا ہے؟

انسان کی ہستی کا تجزیہ کیجیے تو اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ کو روحانی و معنوی کہہ سکتے دوسرے کو جسمانی و مادی۔ اس کے معنوی وجود میں عبودیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ اتنا فطری اور

زور دار جذبہ ہے کہ آدمی کا سر کسی نہ کسی کے سامنے اپنے اندرونی تقاضے سے جھکنا چاہتا ہے اور جھکتا ہے جس طرح آدمی کی بھوک ہے۔ اگر اسے صحیح غذا نہیں ملے گی تو وہ چھالوں اور پتیوں سے اپنی بھوک کی آگ کو بجھائے گا۔ اسی طرح آدمی کے سر کو اگر صحیح جگہ نہیں ملے گی تو وہ غلط چوکھٹوں پر جھکے گا۔ مگر جھکے گا۔ آدمی اپنے سینے کے طاق میں ایک من موہنی کو سجانا ہی چاہتا ہے، جس کے سامنے وہ جھکے۔ جس سے وہ محبت کرے۔ جس پر فدا ہو جانے کا جذبہ اپنے دل میں رکھے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے نتیجے میں مذہب وجود میں آتا ہے اور یہ اتنا طاقتور جذبہ ہے کہ اسے کبھی انسان کے دل سے نکالا نہیں جا سکتا۔ کمیونسٹ روس نے اس جذبے کو کچلنے کا وسیع تجربہ کیا ہے۔ اپنے قاہرانہ جبر اور ذہنوں کو ڈھالنے کے تمام طریقے استعمال کرنے کے باوجود وہ اس جذبے کو نہیں مٹا سکا۔ جس روس نے کہا تھا کہ ہم نے خدا کو اپنے حدود سے نکال دیا ہے۔ اسی روس پر جب ہٹلر نے یلغار کی تو گرجوں کے دروازے کھل گئے اور دعائیں مانگی جانے لگیں اور اب تو وہاں مذہب خاص طور پر، عقیدۂ توحید کچھ زیادہ ہی پر پرزے نکال رہا ہے۔

اس موقع پر تفصیل کا نہ یہ موقع ہے اور نہ ضرورت۔ اس وقت میں صرف اس معنے میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ عبودیت کا جذبہ انسان کی سرشت میں پیوست ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہر مذہب میں عبادت و عبودیت کی کچھ شکلیں تھوڑے فرق کے ساتھ مشترک ہیں۔ مگر اسلام ان تمام شکلوں کو حدود کا پابند کر کے ان جذبات کا رخ ایک ہی جانب کر دیتا ہے۔ انسان کسی کے سامنے جھکنا چاہتا ہے کسی کے سامنے سجدے میں گر پڑنا چاہتا ہے اسلام کہتا ہے کہ تیرا یہ چاہنا بالکل ٹھیک ہے۔ مگر تیرے سر کو اسی کے سامنے جھکنا چاہیے جو تجھ سے برتر ہے۔ تو اشرف المخلوقات ہے۔ زمین سے لیکر آسمان تک ہر چیز تجھ سے کمتر ہے۔ تیری ہی خدمت کے لیے پیدا اور مسخر کی گئی ہے۔ اسی لیے تیرے معزز سر کو جھکنا تو ضرور چاہیے لیکن صرف خدا کے سامنے۔ وہی تیرا خالق ہے۔ وہی تیرا پالنہار ہے۔ تیرے سر کو چاہیے کہ اسی کے سامنے جھکے اور کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ ایسے مواقع پر جب اسباب کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں تو تم کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہو۔ تم پھیلاتے نہیں ہو بلکہ وہ خود پھیل جاتے ہیں۔ اسلام کا خدا کہتا ہے کہ یہ ٹھیک تمہاری فطرت کا تقاضا ہے۔ مگر تم کس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو۔ تمہاری جیسی طاقتور ہستی کی مدد کرنے کی طاقت کس میں ہے۔ کسی کے پاس کیا ہے جو تمہاری مرادیں پوری کر سکے۔ خدا کہتا ہے کہ ایسی ذات صرف میری ہے جو تمہاری مدد کرتی ہے اور تمہاری مرادیں پوری کرتی ہے۔ میرے علاوہ تم جس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ گے تو قطع نظر اس سے کہ یہ تمہارے اونچے ہاتھوں کی توہین ہے۔ جس نے تمہیں یہ ہاتھ دیے ہیں اس کی ناشکری ہے

نتیجے کے اعتبار سے بے کار بھی ہے۔ کیونکہ کسی کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سب تمہاری طرح محتاج ہیں بلکہ تم سے زیادہ۔ تمہارا اندرونی جذبہ تقاضا کرتا ہے کہ تم کسی اپنے سے برتر کے لیے قربانی دو۔ کسی منعم کی خاطر بھوکے رہو تمہارے اندرون کا یہ تقاضا بالکل ٹھیک ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ تمہاری وفاداری اور شکر کے جذبات کا رخ کسی اور کی جانب نہیں صرف خدا کی جانب ہونا چاہیے۔ تمہارے سینے میں کسی پر فدا ہو جانے کا جذبہ امنڈتا ہے اس لیے تم کسی کے گرد چکر کاٹتے ہو کسی کے گرد گھومتے ہو۔ اسلام کا خدا کہتا ہے۔ تمہارا یہ جذبہ بالکل صحیح ہے مگر تمہارے اس قیمتی جذبے کا ہدف کوئی اور نہیں۔ دنیا میں تم سے بڑھ کر کوئی نہیں جس پر نثار ہونے کا جذبہ تمہارے شایان شان ہو۔ اس کا مستحق صرف میں ہوں۔ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے۔ مگر میں نے ایک مقام کو اپنی تجلیات کا مرکز بنا دیا ہے۔ تم اس کے گرد گھوم گھوم کر اس کا طواف کر کے اپنے جذبہ فدائیت کو تسکین دو۔ تمہاری فطری شرافت تقاضا کرتی ہے کہ تم کسی کی جناب میں اپنی جان اور اپنا مال پیش کر دو۔ بہت ہی عمدہ جذبہ ہے یہ مگر تمہارا خالق اور تمہارا منعم ہی اس کا مستحق ہے کہ تم اپنے اس جذبۂ شکر کو صرف اسی کے لیے مخصوص رکھو۔ تم اسی کی بندگی کرو۔ اور غور کرو۔ اسی بات کو شیخ سعدی یوں کہتے ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند	تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

ایں ہمہ بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار	شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

یعنی ابر و ہوا اور چاند سورج سب مصروف کار ہیں تاکہ ان کے تعامل کے نتیجے میں تو روٹی حاصل کرے یہ سب ایک تیری خاطر حکم کے تابع ہو کر چکر میں ہیں۔ پھر یہ انصاف نہیں ہوگا کہ تو ہی فرماں برداری نہ کرے۔

دنیا کے ہر مذہب میں خدا کا تصور ہے۔ عبادات کا تصور ہے۔ طہارت کی کچھ ملتی جلتی شکلیں ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں۔ ہر مذہب میں اپنے مانے ہوئے معبود کے سامنے جھکا جاتا ہے۔ سجدہ کیا جاتا ہے۔ اسی کے نام پر قربانی کی جاتی ہے۔ اس کی خاطر بھوکا رہا جاتا ہے۔ نذر پیش کی جاتی ہے۔ اسلام ان تمام شکلوں کو ایک خدا کے لیے مخصوص کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ پہاڑ، یہ دریا، یہ چاند، یہ سورج، یہ دودھ دینے والے جانور، یہ کاٹ کھانے والے سانپ بچھو۔ یہ سب تم سے کمتر ہیں۔ انہیں تمہاری خدمت کے لیے پیدا کیا گیا۔ ان میں سے کسی کے آگے تمہارے ہاتھوں کا پھیلنا، تمہارے معزز سر کا جھکنا تمہارے سر کی توہین ہے۔ ناشکری ہے۔ رذالت ہے۔ شرک ہے۔ تمہارے آگے فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔ تمہارے معزز سر کے لیے یہ بات زیبا دیتی ہے کہ وہ کسی کے سامنے ہرگز نہ جھکے اور اپنے خالق و مالک کے سامنے ضرور جھکے۔ اگر تم پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے وحدہٗ لاشریک لہ خدا کے سامنے جھکے رہے تو

تو اسی معنے میں خود بھی لاشریک بن جاؤ گے۔

اس پہلو سے یعنی عقیدۂ و عبادات کے دائرے میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت توحید کے تقاضے پورے کر رہی ہے وہ مطمئن ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم توحید کے تقاضے پورے کر رہے ہیں تو یقیناً اس دائرے کی حد تک ان کا اطمینان بالکل بجا ہے۔ اس سے کوئی اختلاف نہیں۔ یقیناً اس پہلو سے یعنی عقیدۂ و عبادات کے اندر وہ توحید کے تقاضے عقیدۃً بھی پورے کر رہے ہیں۔ قولاً بھی اور عملاً بھی۔ لیکن جیسا کہ شروع میں عرض کیا۔ انسان کی ہستی کا ایک پہلو اور ہے۔

انسان ایک اجتماع کا جزء، ایک معاشرتی وجود ہے۔ وہ اکیلا پیدا تو ہوتا ہے لیکن اکیلا رہتا نہیں اور نہ رہ سکتا ہے۔ جہاں دو ہوئے کہ ایک معاشرہ بننا شروع ہوا اور اجتماعیت کے تقاضے سامنے آنے لگے۔ باہمی محبت و مروت، مواسات، اتحاد و ائتلاف، ہمدردی و غمخواری، ایثار و خلوص جیسے اوصاف ایک صالح معاشرے کے لوازم اور محاسن ہیں۔ مگر ایک اور چیز اجتماعیت کی لازمی ضرورت ہے۔ اور وہ ہے جبر۔ انسان کی تمدنی اور اجتماعی ضرورت ہے کہ کوئی طاقت ایسی ہو جو انسانی حقوق و حدود مقرر کرے اور ان کو زندہ قوت کے ساتھ مقررہ حدود کا پابند رکھے۔ اگر ایسی کوئی طاقت موجود نہ ہو تو انسان کی ناواقفیت، اس کی خواہشات اور اس کی خود غرضی دوسروں کے حدود میں مداخلت کرے گی۔ جو شخص بھی نسبتاً طاقتور ہوگا وہ بے نتھے سانڈ کی طرح جس ہرے کھیت میں چاہے گا گھس جائے گا اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوگا۔ لوگوں کی نہ عزتیں محفوظ رہیں گی، نہ جانیں نہ مال۔ اسی کو انارکی کہتے ہیں اور تاریخ میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں ملتا کہ کوئی انسانی معاشرہ ایسی انارکی کی حالت میں رہا۔ ہر زمانے میں متمدن انسان کسی نہ کسی طاقت کا تابع رہا ہے۔ اور کوئی نہ کوئی حکمراں طاقت اسے بزور و قوت مقررہ حدود کا پابند رکھنے والی رہی ہے۔ چاہے وہ حکمراں طاقت کسی انسانی معاشرے کے اندر سے ابھری ہو یا کہیں باہر سے آ کر چھا گئی ہو۔ اس سے مختلف حالت یعنی انارکی ناقابل عمل ہی نہیں ناقابل تصور ہے۔ اشتراکی تصورات میں ضرور ایک ایسی حالت کا خواب دیکھا یا دکھایا گیا ہے کہ جب طاقت کے ذریعہ معاشی مساوات قائم کر دی جائے گی تو انسان کی قدریں بدل جائیں گی اور اس کی خود غرضی اور غلط خواہشات فنا ہو جائیں گی۔ اس کے بعد وہ اس کا ضرورتمند نہیں رہے گا کہ کوئی طاقت بزور اسے اپنے حدود میں رکھے اور یہ طاقت جس کا دوسرا نام حکومت ہے سوکھے پتوں کی طرح جھڑ جائے گی۔ لیکن یہ ایک خیالی چیز ہے اور میں نے اسی معنے میں اسے اشتراکی تصوف کہا ہے کہ یہ عالم خیال کی ایک پرواز ہے۔ عمل کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اشتراکی نظام نے تو اور یہ بات واضح کر دی ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کے اعتبار سے اس بات کا محتاج ہے کہ کوئی اس کا سر دھرا ہو جس طرح عورت کی فطرت کا مطالبہ ہے کہ

باقی بر صفحہ ۵۲

رسائل و مسائل

دارالافتاء ریاض کا ایک فتویٰ

(سید احمد قادری)

خط

ہفت روزہ المسلمون میں اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء کا ایک فتویٰ شائع ہوا ہے۔ اس میں مسافر کے لیے ایک ایسے نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے جس میں اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے وطن واپس جانے لگے گا تو بیوی کو طلاق دے دے گا۔ میں اس فتوے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھیج رہا ہوں۔ اس فتوے کی وجہ سے ہم لوگ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ایسے نکاح اور نکاح متعہ میں آخر فرق کیا ہوا؟ دونوں کا مقصد تو ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس فتوے میں ایک آیت بھی پیش کی گئی ہے اور ایک حدیث بھی۔ آپ زندگی نو میں اس کی توضیح کر دیں تو ہم لوگوں کو ذہنی سکون حاصل ہوگا۔

جواب

آپ لوگ اگر دو باتیں ذہن نشین کر لیں تو جواب کے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور شاید ذہنی سکون بھی حاصل ہوگا۔

ایک بات یہ کہ جن چیزوں کا تعلق الفاظ اور اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے ان میں صرف نیت پر کوئی شرعی حکم نہیں لگتا اور نہ وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ مثلاً نماز کی صرف نیت سے نماز وجود میں نہیں آتی۔ نکاح کی صرف نیت کرنے سے نکاح نہیں ہوگا۔ طلاق کی صرف نیت سے طلاق نہیں پڑ جاتی۔ اسی طرح جو چیزیں شرعاً حرام و ناجائز

ہیں۔ محض ان کے ارادے اور نیت سے کوئی شرعی حکم نہیں لگ سکتا۔ شراب پینے کی نیت سے کوئی شخص شرابی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ اس پر حد جاری کی جا سکتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ فتویٰ اور تقویٰ، رخصت اور عزیمت الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر کوئی چیز فتویٰ کی رو سے جائز ہو تو ضروری نہیں کہ تقویٰ کے لحاظ سے بھی وہ درست ہو۔

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ دارالافتاء ریاض (جس کے سرپرست محترم شیخ عبداللہ بن زیاد ہیں) نے جو جواب دیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ صحیح ہے بلکہ بہت محتاط ہے۔ نکاح ان چیزوں میں سے ہے جن کا انعقاد الفاظ سے ہوتا ہے ان کے انعقاد میں نیت فیصلہ کن چیز نہیں ہے۔ جیسے الفاظ استعمال کیے جائیں گے اسی کے لحاظ سے حکم لگے گا۔ اگر الفاظ غلط ہیں تو نکاح غلط ہو گا اور اگر صحیح ہیں تو صحیح ہو گا۔

سائل نے سوال یہ کیا ہے۔

"اگر کوئی شخص سفر کرے اور کچھ مدت تک اس کو وطن سے دور رہنا پڑے، نیز یہ کہ وہ نکاح پر مضطر ہو جائے تو کیا یہ جائز ہو گا کہ وہ اس ارادے سے نکاح کرے کہ جب وطن واپس جائے گا تو بیوی کو طلاق دے دے گا۔

دارالافتاء نے جو جواب دیا ہے اس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے نکاح کی غرض و غایت اور اس کی اصل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھا گیا ہے کہ نکاح کی اصل یہ ہے کہ وہ معلق ہو، محدود وقت کے لیے نہ ہو۔ اس کی غرض و غایت میاں بیوی کے درمیان مودّت و رحمت کا رشتہ پیدا کرنا ہے تاکہ گھر بسے اور زندگی کی گاڑی اچھی طرح چلے۔ دلیل کے طور پر سورۂ روم کی آیت ۲۱ پیش کی گئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

اب اگر کوئی شخص وقت کی تحدید کے ساتھ نکاح کرتا ہے یا اس کی نیت کرتا ہے تو یہ بات نکاح کی غرض و غایت اور اس کی اصل کے خلاف ہے۔

اس تمہید کے بعد جو فتویٰ دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"اگر نکاح کے وقت یہ شرط لگائی گئی ہو کہ یہ کچھ مدت کے لیے ہے یا نکاح سے پہلے یہ بات طے ہو گئی ہو

اور اسی طے شدہ بات پر نکاح ہوا ہو تو یہ ائمہ اربعہ کے نزدیک باطل ہوگا۔ کیونکہ یہ نکاح متعہ ہو گیا۔ لیکن اگر نکاح کے وقت کسی مدت کی شرط نہ لگائی گئی ہو اور نہ نکاح کرنے والے نے اپنی نیت کا ذکر کسی سے کیا ہو تو یہ نکاح امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک جائز ہے اور امام مالک اور امام احمد اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک مکروہ ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ نکاح کے وقت لفظاً کسی مدت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن جو نیت اس نے کی ہے وہ روح نکاح کے خلاف ہے لیکن عقد نکاح صحیح ہے۔ اخیر میں متعہ کی حرمت پر حدیث پیش کی گئی ہے۔

اب آپ لوگ غور کر لیں کہ یہ کتنا محتاط فتویٰ ہے۔ اس فتوے میں لکھا گیا ہے کہ اس طرح کا نکاح امام احمدؒ کے نزدیک مکروہ ہے لیکن ابن قدامہ نے المغنی میں کراہت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

وان تزوجها بغير شرط الا ان	اور اگر وہ بغیر شرط کے اس سے نکاح کرے
في نيته طلاقها بعد شهر او	لیکن اس کی نیت یہ ہو کہ ایک ماہ بعد یا جب
اذا انقضت حاجته في هذا البلد	اس کی ضرورت اس شہر میں پوری ہو جائے
فالنكاح صحيح في قول عامة	گی طلاق دے دے گا۔ تو یہ نکاح جمہور اہل
اهل العلم (المغنی ج۶ ص ۶۴۵)	علم کے نزدیک صحیح ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اس طرح کے نکاح اور متعہ میں کیا فرق ہے؟ تو ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق یہ ہے کہ :-

زیر بحث نکاح چونکہ صحیح ہے اس لیے نکاح صحیح کے تمام احکام اس پر عائد ہوں گے۔ مثلاً طلاق کے بغیر یہ نکاح ختم نہ ہوگا۔ مطلقہ کو دوسرے نکاح کے لیے عدت گزارنی پڑے گی۔ اگر بچہ ہوا تو وہ صحیح النسب ہوگا۔ اس کی پرورش کے اخراجات اس کے باپ کے ذمے ہوں گے۔ وہ بچہ اپنے باپ کا وارث ہوگا۔ اور نکاح متعہ چونکہ حرام ہے۔ اس لیے اس پر نکاح صحیح کے احکام عائد نہیں ہوں گے۔ اس میں طلاق کی ضرورت نہیں پڑتی مدت ختم ہونے کے بعد نکاح آپ سے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ عورت پر عدت بھی نہیں ہے۔

تنقید و تبصرہ

معرکۂ سنت و بدعت

محمد اشفاق حسین۔ سائز بڑا۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، گرد پوش کے ساتھ صفحات حصہ اول ۳۲۵ و حصہ دوم ۲۰۰ قیمت حصہ اول ۱۵/۰ آنے روپیہ حصہ دوم ۱۰/- (دس روپیہ) ناشر: مجلس احیائے توحید و سنت حیدرآباد۔ اے۔ پی

اس ضخیم کتاب کے بڑے حصے کا مطالعہ میں نے کیا ہے۔ مولانا اشفاق حسین صاحب صدر مجلس احیائے توحید و سنت، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی بعض کتابوں پر پہلے بھی زندگی میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے نام سے پہلے یہ عبارت درج ہے:-

سنت کے اثبات، بدعت کی باطل تقسیم اور تحریف دین کے خلاف مدلل اور مفصل او فیصلہ کن کتاب

پہلے حصہ کی فہرست مضامین ساڑھے نو صفحات میں اور دوسرے حصے کی پانچ صفحات میں آئی ہے۔ کتابیات کے عنوان سے ابتداہی میں ان کتابوں اور جن علماء کے اقوال سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے ناموں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ ان کی تعداد ۱۹۱ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں فاضل مصنف نے بہت محنت کی ہے۔ پہلا حصہ ۱۵ ابواب پر اور دوسرا حصہ دو ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب میں ۱۷ ابواب ہیں۔ اس موضوع پر بڑی حد تک یہ ایک جامع کتاب ہے پہلے حصہ میں جو ضخیم ہے، قرآن، احادیث آثار صحابہ، لغت اور اقوال علماء پیش کر کے "بدعت" کی پوری وضاحت کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں بقول مصنف "حاملین شریعت قبوری" کے دلائل کی تردید کی گئی ہے "مجلس احیائے توحید و سنت" کے ذریعہ مولانا محمد اشفاق حسین صاحب بدعت و خرافات اور مشرکانہ عقائد و اعمال کی تردید اور امت کی اصلاح کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے قابل مبارکباد ہیں۔ دوسرے حصے میں فاضل مصنف نے مفتی احمد یار خاں کی کتاب "جاء الحق" میں جو دلائل بدعت کی تقسیم کے صحیح ہونے پر دیئے گئے ہیں ان کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ان کا

کھول کھول کر واضح کیا ہے۔ اس پہلو سے یہ کتاب لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں بدعت کے لغوی اور اصطلاحی و شرعی معانی بیان کیے گئے ہیں اور فاضل مصنف نے اس کا ایک نقشہ بھی بنا دیا ہے۔ بدعت شرعی، بدعت لغوی اور پھر بدعت لغوی کی دو قسمیں لکھی ہیں۔ بدعت حسنہ بدعت سیئہ۔ پھر بدعت حسنہ کی تین قسمیں لکھی ہیں۔ واجب، مندوب، مباح۔ بدعت سیئہ کی دو قسمیں لکھی ہیں حرام۔ مکروہ۔ علمائے امت نے بدعت لغوی کی جو تقسیم کی ہے، یہ نقشہ اسی کے مطابق بنایا گیا ہے۔ مصنف کی توجہ کے لیے چند باتیں عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) جو لوگ بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ کے قائل نہیں ہیں اور جو لوگ اس تقسیم کے قائل ہیں ان دونوں جماعتوں کے جتنے مباحث حقیر تبصرہ نگار کی نظر سے گذرے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جماعتوں کے درمیان نزاع لفظی ہے۔ منکرین بدعت جب "بدعت" بولتے ہیں تو اس سے بدعت شرعی مراد لیتے ہیں اور جب قائلین تقسیم بدعت بولتے ہیں تو اس سے بدعت لغوی مراد لیتے ہیں۔ مفتی احمد یار خاں کی بھی کوئی ایسی عبارت پیش نہیں کی گئی ہے جس میں صراحت کے ساتھ انھوں نے یہ کہا ہو کہ بدعت شرعی اصطلاحی کی دو قسمیں ہیں، حسنہ اور سیئہ۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ لوگ بھی جن کو مصنف "قبور شریعت" کا حامل کہتے ہیں کسی چیز کو بدعت شرعی تسلیم کرکے اس کو حسنہ قرار نہیں دیتے بلکہ ان کی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں بدعت شرعی کے دائرے میں داخل ہیں ان کو وہ بدعت شرعی نہیں سمجھتے بلکہ بدعت لغوی سمجھ کر اس کو حسنہ قرار دیتے ہیں۔ تبصرہ نگار کے نزدیک زیادہ مفید بات یہ ہے کہ اس سوراخ کا منہ بند کیا جائے جہاں سے بدعات و خرافات کے دھارے نکل رہے ہیں۔

(۲) حصہ اول کے ص ۹۷ پر یہ ذیلی عنوان ہے:۔ "علم ظاہر و علم باطن کی باطل تفریق" اس کے تحت علامہ برکلی رومیؒ کی کتاب طریقہ محمدیہ سے یہ عبارت لکھی ہے:۔

"ہمارے زمانے کے بعض مدعیان تصوف کا جو یہ وطیرہ ہے کہ جب ان کے خلاف شریعت کاموں کو برا کہا جاتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کی حرمت صرف علم ظاہر میں ہے اور ہم اصحاب علم باطن میں سے ہیں اور یہ چیزیں اس میں حلال ہیں اور تم ظاہر پرست لوگ تو احکام شریعت کو کتاب سے نکالتے ہو اور ہم براہ راست صاحب کتاب صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرلیتے ہیں۔ سو یہ محض بددینی اور خالص گمراہی ہے کیونکہ اس میں شریعت محمدی کا استخفاف ہے۔ پس جو شخص کسی سے یہ بات سنے اس پر ضروری ہے کہ اس کا رد کرے اور بلا شک و تردد اس کے باطل ہونے کا یقین رکھے ورنہ وہ بھی ان کے زمرے میں داخل ہوگا۔

اس کے نیچے مصنف نے مولانا محمد منظور نعمانی کی یہ عبارت نقل کی ہے :۔

واضح رہے کہ شریعت و طریقت کی یہ تفریق اور علم ظاہر و باطن کی یہ اصطلاح صرف بعد کے گمراہ صوفیوں کی ایجاد ہے ورنہ اکابر صوفیہ کا دامن تقدس اس سے پاک ہے۔ ان حضرات نے صاف صاف تصریحیں فرمائی ہیں کہ شریعت محمدی اور کتاب و سنت کے سوا سلوک کا کوئی راستہ نہیں جن خوش نصیبوں کو ان حضرات کی کتابیں دیکھنے کی توفیق ہوئی ہے ان پر یہ تصریحات مخفی نہ ہوں گی "

(الفرقان اپریل ۱۹۵۷ء)

اس عبارت میں اس کی کوئی نشان دہی نہیں ہے کہ گمراہ صوفیوں میں کون لوگ داخل ہیں اور اکابر صوفیہ کون ہیں۔ تبصرہ نگار نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے شیخ اکبر ابن عربی سے لے کر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک صوفیائے کرام کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جس میں علم ظاہر اور علم باطن کی تقسیم موجود نہ ہو۔ جن کتابوں میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ شریعت محمدی اور کتاب و سنت کے سوا سلوک کا کوئی راستہ نہیں۔ انہیں کتابوں میں پوری صراحت کے ساتھ علم ظاہر و باطن کی تقسیم بھی موجود ہے۔ یہ حقیر فاضل مصنف کو مشورہ دیتا ہے کہ جن لوگوں کو "اکابر صوفیہ" کہا جاتا ہے ان کی تصوف میں لکھی ہوئی کتابوں کا خود مطالعہ کریں۔ غالی عقیدتمندوں کی تحریروں پر اعتماد نہ کریں۔

(۳) حصہ دوم ص ۴۷ ، ۴۸ پر منیٰ میں قصر یا پوری نماز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے :۔

"چونکہ اس اضافے کا کوئی معقول سبب موجود نہ تھا اس لیے اس بدعت کی صحابہ کرامؓ نے مخالفت کی جو بدعت لغوی حسنہ نہ بن سکی بلکہ بدعت شرعی اور گمراہی قرار پائی "

اس عبارت پر نظر ثانی کی ضرورت ہے منیٰ میں پوری نماز ادا کرنے کو مطلقاً بدعت شرعی اور گمراہی قرار دینا بالکل غلط بات ہے۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ نماز قصر مسافر کے لیے ہے مقیم کے لیے نہیں۔ امام ثوریؒ، امام ابوحنیفہ شافعیؒ، ابوثورؒ، داؤد رحمہم اللہ کے نزدیک اہل مکہ کے لیے منیٰ میں نماز قصر جائز نہیں ہے۔

(۴) ص ۱۰۶ حصہ دوم پر "ترویح الجنان و الجنۃ" کے حوالہ سے لکھا گیا ہے :۔

" لغوی بدعت ہر اس نو ایجاد کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہوئی ہو عام اس سے کہ عبادت ہو یا عادت۔ اور شرعی بدعت وہ ہے جو قرون ثلاثہ کے بعد پیدا ہوئی ہے "

لغوی و شرعی بدعت کی یہ تعریف غلط ہے۔ ان دونوں کی تعریف میں "زمانہ" کا دخل نہیں ہے۔ لغۃً ہر نئی

چیز بدعت ہے اور شرعاً ہر وہ چیز بدعت ہے جس کی کوئی دلیل شریعت میں موجود نہ ہو اور اس کا تعلق دینی امور سے ہو

من احدث فی امرنا ھذا ما — جس نے ہمارے اس امر (دین) میں ایسی نئی بات
لیس منہ فھو ردٌ — پیدا کی جو اس سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے

یہ شرعی و اصطلاحی بدعت کی ایک جامع تعریف ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ یہ کتاب مجموعی اعتبار سے قابل مطالعہ و استفادہ ہے۔

روشن حیات شاہ رشاد عثمانی۔ صفحات ۱۰۴، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی، گرد پوش کے ساتھ مجلد قیمت دس روپیہ۔ ناشر: مرکز تحقیق و مطالعہ اسلامی ادارہ مدینۃ العلوم۔ ذاکر نگر۔ ڈاک خانہ آزاد نگر جمشید پور ۸۳۲۱۱۰

یہ کتاب بیت الرشاد۔ نیا کریم گنج۔ گیا۔ بہار سے بھی مل سکتی ہے۔

اس کتاب کے شروع میں "نور کا مینارہ" کے عنوان سے ڈاکٹر صغرا اظہار چشتی صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی مختصر تحریر ہے۔ اس کے بعد شاہ محمد طاہر عثمانی فردوسی، صاحب سجادہ، امامیہ مجیبیہ فردوسیہ سملہ پاک کا پیش لفظ ہے۔ پھر مرتب کتاب نے اس کتاب کا تعارف کرایا ہے۔ ضلع اورنگ آباد، ریاست بہار میں ایک قدیم بستی سملہ ہے جس میں صوفیہ کا ایک عثمانی خانوادہ آباد ہے۔ اس بستی کے پانچ بزرگوں کے حالات اس کتاب میں اکٹھا کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلے مرتب کتاب کے جد امجد شاہ محمد قاسم عثمانی رحمۃ اللہ کے حالات ہیں۔ حقیر تبصرہ نگار کی بستی اکبر شریف سے سملہ پاک کی رشتہ داری کا تعلق بھی بہت قدیم ہے۔

تبصرہ نگار سے شاہ محمد قاسم رحمۃ اللہ سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ ان کی سادگی سے متاثر ہوا ہے۔ اس دور میں موجودہ تصوف کا بھی ذوق تھا۔ اس لیے اس نے بعض اوراد میں ان سے اجازت بھی حاصل کی تھی۔ میں نے اسی زمانے میں سنا تھا کہ شاہ محمد قاسم صاحب اپنے مریدوں سے جہاد پر بھی بیعت لیتے تھے۔ اس کتاب سے اس کی تصدیق ہوئی۔ انھوں نے خود جہاد پر بھی بیعت کی تھی (ص ۲۱)

وہ جماعت اسلامی کے لٹریچر کو بھی پسند کرتے تھے۔ اقامت دین کی جدوجہد کے سلسلے میں بھی ان کا ذہن صاف تھا۔ ان کے مکاتیب "نقش دوام" کے نام سے دار الکتاب گیا نے شائع کیے ہیں۔ اس کے ایک مکتوب میں انھوں نے لکھا ہے۔

آپ قیام دین کو دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ نماز سے اگر رضائے الٰہی مقصود نہیں تو نماز سے بڑھ کر

کوئی چیز "دنیا" نہیں ہے اور اگر حصول سلطنت سے "رضائے الٰہی" مقصود ہے تو حصول سلطنت سے بڑھ کر کوئی چیز "دین" نہیں ہے۔ (ص ۴۲)

مسلمان عورت امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد۔ سائز بڑا صفحات ۱۶۰۔ کاغذ کتابت سادہ پُرکار بہتر طباعت آفسٹ کی قیمت پندرہ روپیے۔ ناشر: فردوس پبلیکیشنز کشن گنج۔ تیلی واڑہ دہلی ملے

پہلی دفعہ یہ کتاب آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس وقت ضرورت کے پیش نظر اس کو پھر اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ مولانا آزاد کے جان دار قلم کی پہلی تراوش ہے۔ اس کا دیباچہ مولانا محمد لطیف ندوی نے لکھا ہے۔ وہ بجا طور پر لکھتے ہیں:۔

"پیش نظر کتاب فرید وجدی کی عربی تصنیف "المراۃ المسلمۃ" کا اردو ترجمہ ہے جو اولیں ثمرہ ہے مولانا آزاد کی ادبی مساعی کا اور تصنیفی صلاحیتوں کا، اس کو ترجمہ ہم واقعیت کے لحاظ سے کہتے ہیں ورنہ اس کو فرید وجدی کی کتاب کا اردو ایڈیشن کہنا چاہیے۔"

فرید وجدی نے جو متعدد یورپین زبانوں سے واقف تھے، یہ کتاب مصر کے تجدد پسند مسلمانوں کی تردید میں لکھی تھی اور ان لوگوں کے سامنے یورپ کے عالموں اور دانشوروں کے اقوال پیش کیے تھے جو ان تجدد پسندوں کے فی الواقع اعتقادی حیثیت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس کتاب نے جدید تعلیم یافتہ افراد کو زیادہ متاثر کیا تھا اور آج بھی ایسے ہی لوگوں کو زیادہ متاثر کر سکتی ہے۔ چونکہ ابھی مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کی کش مکش جاری ہے اس لیے کتاب اپنے مضامین کے لحاظ سے پرانی نہیں بلکہ تازہ ہے۔ امید ہے کہ لوگ اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

(بقیہ صفحہ ۴۶)

اس کا ایک سرپوش ہو، ایک ڈھکن ہو جس کے سایہ میں رہ کر وہ سکون حاصل کرے۔ اسی ڈھکن کو شوہر کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح انسانی سوسائٹی کی ضرورت، اس کی فطرت ایک شوہر کی طلبگار ہے جس کے سایہ میں وہ بے فکر ہو کر رہے۔ جس کی فرماں برداری کرے۔ بلکہ عورتوں میں تو ایسے نمونے ملتے ہیں کہ کسی پس ماندہ یا ترقی یافتہ عورت نے کسی نہ کسی طرح اپنی پوری زندگی شوہر کے بغیر گزار دی لیکن انسانی معاشرہ بغیر کسی حکمراں طاقت کے ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا

ایسی کوئی مثال نہ موجودہ زمانے میں ملتی ہے نہ تاریخ میں، نہ انسان کی عقل ایسی حالت کو سوچ سکتی۔ انسانی اجتماع کی یہ ضرورت مختلف زمانوں، مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے پوری ہوتی رہی ہے۔ (باقی)

بقیہ صفحہ (۸)

اور مواقع میسر ہوسکیں تو ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی استعمال کیے جائیں۔

(۳) اس وقت کل ہندپیمانے پر نظام قضا قائم کرنے کے مواقع تو نہیں ہیں لیکن شرعی پنچائتیں مختلف مقامات پر قائم کی جاسکتی ہیں۔ اس وقت یہ کام بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے پورے ملک میں ایک مہم چلاکر ابتدائی مرحلے میں بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں شرعی پنچایتیں قائم کرنی چاہییں۔ یہ پنچائتیں کم سے تین افراد اور زیادہ سے زیادہ سات افراد پر مشتمل ہونی چاہئیں۔ اگر مثال کے طور پر تین افراد ہوں تو ایک عالم دین، ایک وکیل یا موجودہ قوانین سے واقف کوئی فرد اور ایک ثقہ معتبر شخص پر مشتمل شرعی پنچایت ہونا چاہیے اور اگر تین سے زیادہ افراد ہوں تو اسی تناسب سے اشخاص اس میں ہونے چاہئیں۔ ان پنچائتوں کے کچھ قواعد وضوابط بھی مرتب کر لینے چاہئیں تاکہ ان کے درمیان یکسانیت رہے۔

(۴) ایک مہم چلاکر مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مقدمات انہیں شرعی پنچائتوں کے ذریعے طے کرائیں۔ اور جہاں جہاں یہ شرعی پنچائتیں قائم ہوں مسلمانوں میں ان کا تعارف بھی کرانا چاہیے یعنی مسلمانوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کہاں کہاں شرعی پنچائتیں قائم ہیں اور ان کے قواعد وضوابط کیا ہیں تاکہ آسانی سے وہ اپنا مقدمہ پیش کرسکیں۔

(۵) یہ بات بھی ہم مسلمانوں کی ذمہ داری میں داخل ہے کہ تحفظ شریعت کے لیے ہم جو کچھ کریں سنجیدگی، معقولیت اور ہوش مندی کے ساتھ کریں۔ تقریریں ہوں یا تحریریں ان میں غیر ضروری اشتعال انگیزی اور جوش خود ہمارے مقصد کے لیے انتہائی مضر ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو پوری طرح اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(۶) اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مسلم پرسنل لا بورڈ ایک ایسا پلیٹ فارم بن گیا ہے جس پر مسلمانوں کے تمام طبقات اکٹھا ہیں۔ ہمیں اس اتحاد کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ کوئی ادارہ اس طرح نظر انداز ہو جائے کہ اس کی مناسب نمائندگی اس بورڈ میں باقی نہ رہے اور وہ اسے محسوس کرکے اس سے الگ تھلگ رہنے کی بات سوچنے لگے۔

لاجواب هوائی
بے مثال پائیداری
QAMAR ENTERPRISE
CALCUTTA-39 • PATNA-8

MONTHLY Regd. No. D.NO. (DN)-348
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN R.N. NO. 42893/84
NEW DELHI-110002 DEC. 85

صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس میں چھپا۔